حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کا مجموعہ

مواعظِ اشرفیہ

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبۂ تھانوی دفتر رسالہ الابقاء
مولوی مسافر خانہ ایم اے جناح روڈ کراچی ۱
فون: ۷۷۷۷۶۲۰، ۷۷۷۰۰۹۴

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلہ التبلیغ کا وعظ المسمّٰی بہ

تقلیل الطّعام

بصورۃ الصّیام

حکیم الامّۃ مجدد الملّۃ حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمّد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ / ایم۔اے جناح روڈ کراچی ۱

صرف چند حضرات نے الابقاء کا خیال فرما کر چند خریدار بنائے حالت یہ ہے کہ تقریباً سولہ نسخے الابقار ہر ماہ بچ جاتے ہیں ہر کام کرنے والا کہہ رہا ہے اجرت بڑھاؤ۔ بتلایئے کہاں سے بڑھاؤں۔ قارون کا خزانہ کاغذ پریس اور کاتب کے لئے ہو تو کام چلے۔ براہ کرم الابقاء کا خیال فرمایئے اور جدید خریدار بنایئے اگر اللہ نہ کرے یہی حال رہی تو یہ ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھ جائیگا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تقلیل الطَّعَام - بصورۃ الصِّیام

الاشتات	المستمعون	منضبط	من الذین	ماذا	لم	کیف	کم	متیٰ	این
متفرقات	سامعین کی تعداد	کس نے لکھا	کون لوگ سنے	کیا مضمون تھا	کیوں ہوا	کس طرح ہوا	کتنا ہوا	کب ہوا	کہاں ہوا
الحمد للہ کہ آج یکم محرم ۱۳۴۳ھ سے ان مواعظ کی تسوید تفصیلی کا کام شروع ہو گیا حق تعالیٰ اتمام کی توفیق عطا فرماویں اور یہ کام مکرمی جناب حاجی محمد یوسف صاحب ۴۹ پارک لین رنگون کی ہمت سے شروع ہوا۔ انھوں نے حضرت حکیم الامۃ دام ظلہم کے جملہ مواعظ کی تسوید کا کام فرمایا ہے حق تعالیٰ ان کے ارادہ کو پورا فرمائے اور انکی دین و دنیا میں ترقی و کامیابی عطا فرمائے اور حضرت حکیم الامۃ دام ظلہم کے فیوض و برکات کو تادیر ہمارے سروں پر سایہ افگن رکھے کہ واقعی ان بیش بہا جواہرات کی اشاعت سے امت کی اصلاح بہت کچھ متوقع ہے ۱۲ جامع	تقریباً ۱۵۰	ظفر احمد تھانوی کان اللہ لہ و عفا عنہ	سب عورتیں اور سالکین خصوصاً۔	روزہ کا فضیلت ہونا ... اس کی حقیقت ... تقلیل طعام ہے۔ [illegible]	رمضان المبارک میں ... تقلیل طعام کی ضرورت ... [illegible] فرمائیں۔	کھڑے ہو کر	۲ گھنٹے، ختم ۴ بجے ہوا	۷ رمضان المبارک سنہ ۱۳۴۲ھ بروز جمعہ بعد نماز جمعہ (شروع ۲ بجے)	مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

(دعاء[1]) الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد

[1] حضرت حکیم الامۃ دام مجدہم کا معمول ہے کہ وعظ شروع کرنے سے پہلے ہاتھ اٹھا کر دعا فرمایا کرتے ہیں اس کے بعد خطبہ ماثورہ پڑھ کر وعظ شروع فرماتے ہیں قلت و ذکر العلامہ الشعرانی فی البحر المورود اخذ علینا العہد اذا خطبنا او وعظنا ان نقول فی انفسنا قبل الاخذ فی الکلام بحضور القلب دستور یا اللہ ثلاث مرات دستور یا رسول اللہ ثلاث مرات و دستور یا اصحاب الوقت فان ذلک یزید قوۃ فی الکلام و مدد اہ قلت و قد جربت ذلک مرارا ولا یجوز ذلک لکل احد ۱۲ جامع

ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد ۔ فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وان اللہ لمع المحسنین۔

ہر چند کہ اس رمضان میں بیان کا ارادہ نہ تھا دو وجہ سے ایک اس وجہ سے کہ آج کل لوگوں کی طبائع میں تاثر کا مادہ نہیں رہا ایک ہوا[له] پھیل رہی ہے جس کی وجہ سے عام طبائع ادھر مشغول ہیں۔ لوگوں کو بیان بھی وہی پسند ہوتا ہے جو اس ہوا کے موافق ہو مسائل شرعیہ کا بیان اور خالص احکام کا بیان آج کل لوگوں کو پسند نہیں رہا، یہ تو ان کا حال ہے جو اس ہوا سے متاثر ہو چکے ہیں۔ اور جو اس سے پوری طرح متاثر نہیں ہوئے ان میں بھی ایک خاص عارض سے تاثر کا مادہ کم ہو گیا کیونکہ اس ہوا کا اثر ایسا پھیلا ہوا ہے کہ قلوب عام طور پر مشوش ہیں، جو لوگ گوشہ نشین اور عزلت گزین ہیں جن کو بجز ذکر وشغل اور اللہ اللہ کرنے کے کچھ کام نہیں ان کو بھی یہ شکایت ہے کہ ذکر میں دل نہیں لگتا انوار نہیں معلوم ہوتے وجہ یہ ہے کہ قلوب میں تشویش عام ہے طمانیتِ قلب مفقود ہو گئی اس ہوا کی ظلمت کچھ ایسی ہے کہ جن کے قلوب مطمئن ہیں ان کی بھی وہ حالت نہیں ہے جو اس سے پہلے تھی کیونکہ اس ہوا کا منشا دین نہیں اگر اس کا منشا دین ہوتا تو اس میں ایک نور ہوتا ظلمت نہ ہوتی اگر کسی دینی کام کی وجہ سے تشویش لاحق ہوتی ہے تو تجربہ ہے کہ اس سے نور قلب

[له] اس ہوا سے تحریک ہندو مسلم اتحاد وحصول سوراج مراد ہے جو اس وقت قدرے عروج پر تھی ۱۲ جامع

میں کمی نہیں آتی بلکہ نور بڑھتا ہے ہاں جس تشویش عام کا منشار دنیا ہو اس سے بے شک ظلمت بڑھتی ہے جس کا اثر کم و بیش سب پر ہوتا ہے ان پر بھی جو اس تشویش میں مبتلا ہوں اور ان پر بھی جو اس سے الگ ہوں کیونکہ عموم بلوہ کی وجہ سے قریب قریب سب ہی مشوش ہوتے ہیں کوئی کم کوئی زیادہ تو ظلمت کا اثر بھی سب کے قلوب پر ہوتا ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ اس ہوا کے حق نہ ہونے کی یہ بھی ایک کافی دلیل ہے کہ اس سے قلوب میں ظلمت بڑھ رہی ہے احکام الٰہیہ سے متاثر ہونے کا مادہ کم ہو گیا ہے ایک تو یہ وجہ تھی بیان کا ارادہ نہ ہونے کی کیونکہ جب سامع کے اندر تاثر ہی نہ ہو یا کم ہو تو بیان کرنے والے کی طبیعت کیونکر بڑھے ؎

فہم سخن تا نکند مستمع قوت طبع از متکلم مجو

جب تک سننے والا کلام کا سمجھنے والا نہیں ہوتا۔ بولنے والے کی قوت گویائی کو تلاش مت کرو)

دوسری وجہ یہ تھی کہ کوئی مضمون ذہن میں نہ تھا اور جو مضامین تھے وہ مکرر تھے اس لئے اس رمضان میں بیان کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا لیکن بعض خیر خواہوں کی رائے ہوئی کہ کچھ بیان ضرور ہونا چاہیئے۔ اور ان دونوں وجہوں کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ اس وقت بعض لوگوں میں تو اس ہوا کا اثر ہی نہیں رہا۔ اب بہت کچھ سکون ہو چلا ہے اور جن میں وہ اثر ہے بھی تو ضعیف ہے جس میں بیان سے تغیر ممکن ہے۔ اس لئے امید ہے کہ سامعین پر بیان کا اثر ضرور ہوگا، سب پر نہ ہو تو بعض پر تو ضرور ہی ہوگا اس لئے مایوسی کیوں ہو۔

رہا مضامین کا مکرر ہونا تو مکرر میں حرج ہی کیا ہے، آخر کھانا بھی تو روزانہ مکرر ہوتا ہے جب تکرار کی وجہ سے غذائے جسمانی ترک نہیں کی جاتی تو غذائے روحانی کیوں ترک کی جائے۔ دوسرے مضامین مکرر میں بھی اکثر طرز بیان جدا ہوتا ہے جس سے نفع جدید ہوتا ہے۔ الغرض مخلصین کی اس تقریر سے بیان کا کچھ کچھ ارادہ ہوا کیونکہ ان کی درخواست سے طلب مترشح ہوتی تھی تو میں نے خیال کیا کہ اگر ایک جماعت متاثر بھی نہ ہوگی تو کم از کم یہ مخلصین تو بیان سے متاثر ہوں گے۔ پھر دوسروں کی وجہ سے طالبین کا کیوں نقصان کیا جائے اور ان کو مسائل شرعیہ سے کیوں محروم رکھا جاوے اور کیا عجب ہے کہ ان کی طلب کی برکت سے دوسروں پر بھی اثر ہو جائے۔ اس کے بعد پھر مضمون بھی ذہن میں آ گیا تو تردد جزم سے بدل گیا اور بیان کا قصد کر ہی لیا۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ امید ہے کہ حسب معمول رمضان رمضان ہر جمعہ کو بیان ہوتا رہے گا۔

اس وقت جو آیت میں نے تلاوت کی ہے اس میں بظاہر رمضان کے متعلقات صیام و قیام وغیرہ کا ذکر نہ ہونے سے شاید سامعین کو تشویش ہوئی ہو کہ اس وقت کا بیان مناسب وقت نہ ہوگا حالانکہ وہ اس انتظار میں بھی تھے کہ رمضان کے احکام بیان کئے جائیں گے تو وہ مطمئن رہیں کہ بیان احکام رمضان ہی کا ہوگا اور اس وقت روزہ ہی کا بیان ہوگا لیکن اس آیت میں بالذات روزہ کا بیان نہیں بلکہ اس میں اس زمانہ کی عبادات کی روح مذکور ہے تو جب عبادات رمضان کی روح بیان کی جائے گی تو صورت بھی اس کی ساتھ ساتھ تبعاً

بیان ہو جائے گی اور اگر صورت کا بیان نہ بھی ہوا تب بھی حرج نہیں کیونکہ مقصود تو روح ہوا کرتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ صورت بے کار ہے اس کی ضرورت نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ روح کا اہتمام صورت سے زیادہ ہوا کرتا ہے ورنہ مقصود دونوں ہیں۔ بیکار کوئی نہیں کیونکہ سب جانتے ہیں کہ گو انسان میں اصل چیز روح ہے مگر با اینہمہ جسم کو بیکار کوئی نہیں سمجھتا ورنہ چاہیئے کہ اپنے بدن کی صحت و عافیت کا مطلق خیال نہ کیا جائے۔ بیماری میں دوا دارو بھی نہ کی جائے کیونکہ بیماری سے جسم ہی ہلاک ہوگا روح تو ہلاک نہ ہوگی وہ تو جسم کے بغیر بھی باقی رہے گی مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں کوئی اس قاعدہ سے کام نہیں لیتا کہ اصل مقصود روح ہے صورت کی کیا ضرورت ہے۔ بلکہ یہاں روح اور جسم دونوں کو مقصود سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح سمجھو کہ احکام شرعیہ میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں عمل کی یہ روح ہے وہاں بھی صورت اور روح دونوں مقصود ہیں بیکار کوئی نہیں بلکہ اس روح کا حصول خاص اس صورت پر موقوف ہوتا ہے کہ بدون اس عمل کے روح مقصود حاصل ہو ہی نہیں سکتی اس لئے مقصود دونوں ہوں گے گو یہ ضرور ہے کہ روح کا اہتمام صورت سے زیادہ ہونا چاہیئے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ صورت محض بیکار ہے جیسا کہ بعض ملاحدہ اور جہال صوفیہ کا خیال ہے۔

اب سنئے کہ وہ روح کیا ہے جس کا اس آیت میں بیان ہے سو مقصود بالذات اس آیت میں مجاہدہ کا بیان ہے اور یہی روح ہے عبادات رمضان کی بلکہ تمام عبادات کی بلکہ تمام شریعت کی کیونکہ سارے دین کا خلاصہ مجاہدہ ہی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ مجاہدہ کہتے ہیں لغت میں مشقت کو اور اصطلاح

یں مجاہدہ کا نام ہے مخالفت نفس، اس کا حاصل بھی مشقت ہی ہے کیونکہ مخالفت نفس میں تعب ضرور ہوتا ہے۔ اور دین کا خلاصہ بھی مشقت ہی ہے کیونکہ اس میں ایک گونہ نفس کے اوپر پابندی لازم ہوتی ہے اور نفس پر پابندی گراں ہے وہ تو طبعی طور پر آزادی کا طالب ہے اسی لئے نفس پر اعمال دینیہ شاق ہوتے ہیں اور اسی لئے دین کا نام تکلیف ہے اور احکام شرعیہ کو احکام تکلیفیہ کہا جاتا ہے اور عبد کو مکلف کہتے ہیں گو تکلیف باعث راحت ہے مگر سب کو نہیں بلکہ خواص کو راحت کا سبب ہے ورنہ عوام کو تو دین پر چلنے سے تکلیف ہی ہوتی ہے جس کی یہ وجہ نہیں کہ احکام شرعیہ واقع میں دشوار ہیں یا طاقت سے باہر ہیں اگر ایسا ہوتا تو خواص کے لئے باعث راحت کیونکر ہو جاتے جو کام فی نفسہٖ دشوار ہوتا ہے، وہ تو سب ہی کے لئے دشوار ہوتا ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ خواص کیلئے دین پر چلنا ذرا بھی دشوار نہیں معلوم ہوا کہ دین فی نفسہٖ تو دشوار نہیں بلکہ ایک عارض کی وجہ سے دشوار ہے وہ عارض یہ ہے کہ عوام کے نفوس پابندی کے عادی نہیں بلکہ آزادی کے عادی ہیں تو بس دین کی دشواری اور تکلیف کا اصل یہ ہے کہ اس میں آزادی نہیں بلکہ تقیید ہے اور ظاہر ہے کہ محض اتنی بات سے کسی قانون کو سخت اور دشوار نہیں کہا جا سکتا کیونکہ پابندی تو ہر قانون میں ہوتی ہے اگر محض پابندی کا نام دشواری ہے تو ایک ڈاکو کو بھی یہ کہنے کا حق ہے کہ میں قانون سلطنت کو اس لئے نہیں مانتا کہ وہ دشوار ہے اور دشواری یہ ہے کہ اس میں مجھے پابند کیا جاتا ہے اور میرے جذبات کو دبایا جاتا ہے تو کیا کوئی عاقل اس کی اس بات کو تسلیم کر کے اسے معذور اور قانون کو دشوار مان لے گا

ہرگز نہیں تو پھر ہم محض تقلید کی وجہ سے دین کو دشوار کیسے مان لیں ہاں یہ ضرور ہے کہ جن لوگوں کی طبائع آزاد ہیں ان کو دین کی پابندی گراں ہوتی ہے مگر یہ گرانی دین میں نہیں ہے بلکہ یہ خود آپ کے اندر ہے جیسے بچہ کو روٹی کھانا اور دودھ کا چھوڑنا گراں ہوتا ہے اور وہ دودھ چھوڑتے ہوئے کیسا روتا اور مچلتا ہے تو کیا اس سے روٹی کا کھانا دشوار ہو جائے گا ہرگز نہیں ورنہ پھر آج سے بچوں پر یہ ظلم کرنا چھوڑ دیجئے اور ان کو ساری عمر ماں ہی کا دودھ پینے دیجئے مگر ایسا کوئی نہیں کرتا بلکہ یہاں سب یہ کہتے ہیں کہ روٹی کھانا تو بہت سہل ہے مگر بچہ کو اس لئے گراں ہے کہ وہ دودھ کا عادی ہو رہا ہے جہاں وہ عادت چھوٹی پھر اس سے پوچھئے گا کہ روٹی کھانے میں کیا دشواری ہے اب تو اس کی یہ حالت ہوگی کہ رات دن روٹی روٹی پکارے گا اور اس کے بغیر چین نہ آئے گا اور ماں کے دودھ سے ایسی نفرت ہو جائے گی کہ خوشامد بھی کرو گے تو پاس نہ جائے گا میں کہتا ہوں کہ یہی حال دین کی دشواری کا ہے کہ جب تک آپ آزادی کے عادی ہیں اسی وقت تک یہ گراں ہے اور جس دن آپ پابندی کے عادی ہو گئے اس دن آپ خود کہہ دیں گے کہ دین پر چلنا تو بہت ہی آسان ہے اور جب آپ کو احکام شرعیہ میں لذت آنے لگے گی اس وقت تو آپ پابندی کے ایسے عاشق ہوں گے کہ آزادی کے نام سے نفرت ہو جائے گی جیسے بچہ کے منہ کو روٹی کا مزہ لگنے کے بعد ماں کے دودھ سے نفرت ہو جاتی ہے۔ بہرحال گو دین میں چلنا باعث راحت ہے اور یہ تقلید ہزاروں لذتوں کا سبب ہے مگر یہ خواص کے لئے ہے عوام کے لئے تو تکلیف ہی ہے اسی لئے عاقل بالغ کو مکلف اور دین کو تکلیف کہا جاتا ہے۔ اور یہی حاصل ہے مجاہدہ کا تو سارے دین کا خلاصہ مجاہدہ ہوا۔ اور عبادات رمضان بھی

احکام دین میں سے ہیں تو ان کا خلاصہ اور روح بھی مجاہدہ ہوا شاید آپ یہ کہیں کہ اس تقریر سے آیت کا خاص تعلق عبادات رمضان سے ظاہر نہ ہوا بلکہ عام تعلق ظاہر ہوا جو تمام احکام سے برابر ہے تو سنئے کہ اس آیت کو عبادات رمضان سے دو تعلق ہیں ایک تو عام تعلق ہے جو اس وجہ سے ہے کہ یہ عبادات بھی احکام دین میں سے ہیں اور سارے دین کا خلاصہ مجاہدہ ہے۔ دوسرا خاص تعلق ہے وہ یہ کہ ان عبادات میں بہ نسبت دوسرے احکام کے مشقت زیادہ ہے تو مجاہدہ کو ان سے زیادہ خصوصیت ہے۔ نیز دوسرے احکام میں تو مجاہدہ کے اقسام میں سے ایک یا دو قسم ہی موجود ہوتی ہیں اور عبادات رمضان میں سب اقسام مجتمع کردی گئی ہیں گویا رمضان میں مجاہدہ کی تکمیل کردی گئی ہے اس وجہ سے آیت کو عبادات رمضان سے خاص تعلق ہے اور اس کی تفصیل عنقریب معلوم ہو جائے گی کہ مجاہدہ کے اقسام کیا کیا ہیں اور ان سب کو رمضان میں کیونکر جمع کیا گیا ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ مجاہدہ میں دو قسم کے کام ہوتے ہیں بعض تروک ہیں جو چھوڑنے کے قابل ہیں اور بعض اعمال ہیں جو کرنے کے قابل ہیں۔ معاصی تو سب کے سب تروک ہیں۔ مثلاً زبان کا گناہ، نگاہ کا گناہ، معدہ کا گناہ، دل کا گناہ یہ تو چھوڑے جاتے ہیں اور طاعات اعمال ہیں جن کو کرنا پڑتا ہے جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔ حقوق معاشرت، حقوق زوجیت وغیرہ اور چونکہ یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ مجاہدہ سارے دین کا خلاصہ ہے تو متعلق دین کے بھی یہی دو جز ہوتے ایک طاعات جن کو کرنا پڑتا ہے دوسرے معاصی جن کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ پھر طاعات کی دو قسمیں ہیں ایک واجبہ دوسری مستحبہ یہ دونوں کرنے کے قابل ہیں اور دونوں کا

بجا لانا مجاہدہ میں داخل ہے بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مستحب کے کرنے میں بہ نسبت واجب کے زیادہ مجاہدہ ہے۔ کیونکہ قاعدہ طبعیہ ہے کہ جس کام کو انسان اپنے اوپر لازم سمجھ لیتا ہے کہ اس کو ضرور ہی کرنا ہے اس کے کرنے میں زیادہ مشقت نہیں ہوتی اور جس کام کو اپنے اوپر لازم نہ سمجھے بلکہ اپنے کو اس میں مخیر سمجھے اس کا کرنا گراں ہوتا ہے خصوصاً اس میں پابندی تو بہت ہی گراں ہوتی ہے۔ اس لئے مجھ سے بعض سالکین نے بیان کیا اور میں خود بھی اپنا حال دیکھتا ہوں کہ فرائض کا ادا کرنا اتنا گراں نہیں ہوتا جتنا رات کا اُٹھنا گراں ہوتا ہے کیونکہ رات کو جاگنا اور تہجد پڑھنا ہمارے ذمہ لازم نہیں صرف سنّت یا مستحب ہے اس لئے مستحبات کا بجا لانا بھی مجاہدہ میں داخل ہے۔ اور اسی لئے صوفیہ نے لکھا ہے کہ سالک کو علاوہ فرائض و واجبات کے کچھ سُنن و مستحبات کا بھی التزام کرنا چاہیئے۔ کیونکہ مجاہدہ بدون اس کے کامل نہیں ہوتا۔ ہمارے حاجی صاحب نے بھی اس کی وصیت فرمائی ہے۔ تو اب محل دین کے تین اجزاء ہوئے۔

(۱) معاصی۔ (۲) طاعات واجبہ (۳) طاعات مستحبہ۔ شاید یہاں کسی کو یہ اشکال پیدا ہو کہ جس طرح اعمال کی دو قسمیں ہیں ایک واجب دوسری مستحب اسی طرح محل تروک کی بھی دو قسمیں ہونی چاہئیں۔ ایک وہ جن کا ترک واجب ہے۔ دوسری وہ جن کا ترک مستحب ہے۔ جس کا ترک واجب ہے وہ تو حرام اور مکروہ تحریمی ہے۔ اور جس کا ترک مستحب ہے وہ مکروہ تنزیہی ہے تو اس طرح اجزائے دین چار ہوگئے تین نہ ہوئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب محل تروک کی تفسیر معاصی سے کر دی گئی تو اب اس کی دو قسمیں نہیں ہوسکتیں کہ ایک معاصی تو وہ ہوں جن کا ترک واجب ہے۔ اور ایک معاصی

وہ ہوں جن کا ترک مستحب ہے کیونکہ جس کا ترک مستحب ہو وہ معصیت ہی نہیں معصیت وہی ہے جس کا ترک واجب ہو بخلاف اعمال کے جس کی تفسیر طاعات سے کی گئی ہے کہ اس میں دو قسمیں موجود ہیں بعض وہ طاعات ہیں جن کا فعل واجب ہے اور بعض وہ ہیں جن کا فعل مستحب ہے رہا یہ اشکال کہ ناجائز کی بھی تو دو قسمیں ہیں ایک حرام ہے ایک مکروہ اس کا جواب یہ ہے کہ ناجائز بالمعنی الاعم کی تو دو قسمیں ہو سکتی ہیں مگر معصیت کی کہ وہ مفہوم میں ناجائز سے اخص ہے دو قسمیں نہیں ہو سکتیں جس کو معصیت کہا جائے گا۔ اس کی دو قسمیں نہیں ہوں گی بلکہ اس کا ترک واجب ہی ہوگا تو اس صورت میں بہت سے مکروہ تنزیہی معاصی میں داخل نہ ہوگا یہ تو مشہور کی بناء پر ہے اور اگر اس کو بھی معصیت مانا جائے تو اس کا ترک بھی ضروری ہوگا گو ضرورت میں تفاوت ہو اور یہی صحیح ہے کیونکہ مکروہ تنزیہی بھی ضروری الترک ہے اس لئے کہ خدا تعالے اس پر بھی مواخذہ فرما سکتے ہیں اور جس چیز میں مواخذہ کا اندیشہ ہو وہ معمولی بات نہیں۔ پس خدا تعالےٰ کی نافرمانی گو قلیل ہی ہو اس کا ترک ضروری ہونا چاہیئے۔ دوسرے فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ صغائر گو اخف الصغائر ہی ہو اصرار سے کبائر ہو جاتے ہیں تو اس درجہ میں مکروہ تنزیہی فقہاء کے نزدیک بھی ضروری الترک ہے۔ تیسرے یہ کہ مکروہ تنزیہی کا ارتکاب بسا اوقات مکروہ تحریمی کے ارتکاب کی طرف مفضی ہو جاتا ہے کیونکہ جو شخص مکروہ تنزیہی کے ارتکاب پر اقدام کرے گا وہ اس کو معمولی بات سمجھے گا اور جب نفس میں یہ بات پیدا ہو گئی کہ وہ ادنیٰ معصیت کو معمولی بات سمجھنے لگے تو اس میں خوف کا مادہ کم ہو جاتا ہے جس سے نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ اس کو مکروہ تحریمی

کے ارتکاب پر بھی جرأت ہو جاتی ہے اور قاعدہ ہے کہ مقدمۃ الحرام حرام۔ حرام کا مقدمہ بھی حرام ہوتا ہے۔ اس لئے مکروہ تنزیہی گو فی نفسہ حرام نہ ہو مگر اس مقدمہ پر نظر کر کے اس کا ترک بھی ضروری ہے اسی لئے حدیث میں ہے۔

لا یبلغ المؤمن درجۃ المتقین حتی یترك مالا باس به حذرا مما به باس (اوکما قال) یعنی تقویٰ کامل یہ ہے کہ جس چیز میں اندیشہ بھی نہ ہو اس کو اس چیز سے بچنے کے لئے چھوڑ دے جس میں اندیشہ ہے اور یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہو گئی جو یہ پوچھا کرتے ہیں کہ یہ کام گناہ صغیرہ ہے یا گناہ کبیرہ مجھ سے جب کوئی یہ پوچھتا ہے تو میں تعیین قسم سے جواب نہیں دیتا بلکہ اس سے سوال کرتا ہوں کہ اگر یہ گناہ صغیرہ ہوا تو کیا تمہارا ارادہ اس کے ارتکاب کا ہے اگر اس نے کہا نہیں تو میں کہتا ہوں کہ پھر تمہارا اس سوال سے مقصود کیا ہے۔ اور اگر کہتا ہے کہ جی ہاں گناہ صغیرا ہوا تو میں ارتکاب کا قصد رکھتا ہوں تو میں کہہ دیتا ہوں کہ تم قابل خطاب نہیں ہو۔ بندۂ خدا کیا تم اس کو گوارا کر سکتے ہو کہ تمہارے چھپر میں ایک چھوٹی سی چنگاری لگادی جائے، حالانکہ اس کی حقیقت ہی کیا ہے چھوٹی چنگاری تو اکثر خود ہی بجھ جاتی ہے اس میں کچھ زیادہ اندیشہ نہیں مگر باینہمہ کوئی شخص ذرا سی چنگاری کو بھی اپنے چھپر کے لئے گوارا نہیں کرتا اور یہی کہا جاتا ہے کہ صاحب خدا بری گھڑی نہ لائے، بعض دفعہ یہ چھوٹی سی چنگاری غضب ڈھا دیتی ہے۔ افسوس ایک چار روپیہ کے چھپر کی تو اتنی قدر اور ایسی احتیاط اور متاع ایمان کی ایسی بے قدری کہ اس میں گناہ صغیرہ کی چنگاری لگانا گوارا ہے۔ یہاں یہ اندیشہ کیوں نہیں ہوتا کہ بعض دفعہ

چھوٹی سی چنگاری بھی غضب ڈھا دیتی ہے اسی لئے اہل مجاہدہ نے تروک کی دو قسمیں نہیں کیں بلکہ وہ تمام افعال متروکہ کو ضروری الترک سمجھتے ہیں خواہ وہ حرام ہوں یا مکروہ تنزیہی پس ثابت ہوگیا کہ اجزاء دین کی تین قسمیں ہیں (۱) طاعات واجبہ (۲) طاعات مستحبہ (۳) معاصی من حیث الترک اور چار اقسام ہونے کا جو احتمال تھا وہ محض عقلی احتمال تھا ورنہ حقیقت میں مکروہ تنزیہی بھی معاصی بالمعنی الاعم میں داخل ہے اور اس کا ترک بھی ضروری ہے اور یہی تین اجزاء مجاہدہ کے بھی ہیں۔ پس مجاہدہ کی حقیقت یہ ہوئی کہ اعمال واجبہ ومستحبہ کو بجالائے اور معاصی سے اجتناب کرے اسی کا بیان اس آیت میں ہے والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وان اللہ لمع المحسنین۔

ترجمہ آیت کا یہ ہے۔کہ جو لوگ ہمارے راستہ میں مجاہدہ اور محنت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستے دکھلادیں گے فینا میں یا تو فی سببیہ ہے یعنے جاھدوا لاجلنا۔ اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ جو ہمارے واسطے محنت برداشت کرتے ہیں یا ظرفیہ ہے تو مضاف مقدر ہے یعنے جاھدوا فی دیننا ترجمہ یہ ہوگا کہ جو ہمارے دین میں محنت کرتے ہیں اور دین خدا کا راستہ ہے چنانچہ دین کا لقب ارشاد ہے صراط اللہ الذی لہ ما فی السموٰت الخ اس لئے میں نے اولاً ترجمہ میں کہا تھا کہ جو لوگ ہمارے راستہ میں مجاہدہ کرتے ہیں۔ اگر فی سببیہ ہے تو اس قید کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہدایت سبیل کا وعدہ اس مجاہدہ کے لئے ہے جو محض ہمارے لئے مجاہدہ کرے ریاوغیرہ کے لئے نہ کرے اور اگر ظرفیہ ہے تو فائدہ قید کا یہ ہوگا کہ یہ وعدہ ہر مجاہدہ کرنے والے کے لئے نہیں بلکہ اس شخص کے لئے ہے کہ جو ہمارے راستے کے موافق

یعنے شریعت کے مطابق مجاہدہ کرے کیونکہ خدا کے لئے تو جوگی اور راہب بھی مجاہدہ کرتے ہیں مگر ان کو وصول نصیب نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کا مجاہدہ خلافِ شریعت ہے۔ گو بعض دفعہ یہ لوگ ایسے مجاہدے کرتے ہیں کہ مسلمان اس کا عشر بھی نہیں کرتے مگر سب بیکار ہے، مسلمان کو شریعت کے موافق سہل سہل مجاہدوں میں جو قرب حاصل ہوتا ہے وہ کفار کو سخت سے سخت مجاہدوں سے عمر بھر بھی نصیب نہیں ہوسکتا وجہ اس کی یہ ہے کہ مسلمان کا مجاہدہ خدا کے راستہ پر ہے اور کفار کا مجاہدہ خلاف طریق ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ کفار میں جو لوگ ریاضت و مجاہدہ کرنے والے ہیں وہ بہ نسبت عام کفار کے راستہ سے بہت دور ہیں کیونکہ غلط راستہ پر تو دونوں ہیں مگر عام کفار تو اس غلط راستہ پر آہستہ آہستہ چل رہے ہیں اور مرتاضین بہت تیزی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اور قاعدہ ہے کہ جو شخص غلط راستہ پر تیزی کے ساتھ چلے گا وہ سیدھے راستہ سے بہت دور ہو جائے گا بخلاف اس کے جو غلط راستہ پر آہستہ آہستہ چل رہا ہے گو وہ بھی سیدھے راستہ سے دور ہے مگر زیادہ دور نہیں ہوا اسی لئے عام کفار کا اسلام کی طرف کسی وقت مائل ہو جانا زیادہ متوقع ہے بہ نسبت ان کے خواص کے چنانچہ یہ جوگی اور سنیاسی وغیرہ بہت ہی کم اسلام لاتے ہیں اور راز اس میں یہ ہے کہ مجاہدات سے کچھ نفسیاتی کیفیات ان پر وارد ہونے لگتی ہیں بعضوں کو وقائع مستقبلہ کا کشف بھی ہونے لگتا ہے اور گو ان چیزوں کو قربِ حق میں کچھ دخل نہیں مگر وہ لوگ اپنی جہالت سے اُن کو مقصود سمجھتے ہیں اور جب بزعم خود ان کو مقصود حاصل ہو گیا تو اب وہ اپنے طریق کفر پر پہلے سے زیادہ پختہ ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھ لیتے

ہیں کہ حصول مقصود کے لئے ہمارا طریقہ کافی ہے اور عام کفار کو چونکہ یہ باتیں پیش نہیں آتیں اس لئے ان کو اپنے طریق کے حق ہونے کا ویسا جزم نہیں ہوتا جیسا اہل ریاضت کو ہوتا ہے۔ یہی راز ہے اس میں کہ ہمارے حضرات نے ہندوؤں کو ذکر شغل کی تعلیم کرنے سے منع فرمایا ہے گو نا واقف لوگوں کی یہ رائے ہے کہ ان کو خدا کا نام بتلا دینا چاہیئے اس میں حرج کیا ہے شاید کسی وقت رفتہ رفتہ اسلام کی طرف آجائے۔ مگر محقق جانتا ہے کہ حالت کفر میں ذکر شغل کرنے سے وہ اسلام سے قریب نہ ہوگا بلکہ پہلے سے زیادہ دور ہوگا، کیونکہ ذکر شغل سے اس پر کیفیات نفسانیہ کا ورود ہوگا جن کو وہ مقصود سمجھے گا، اس کے بعد یہ خیال جم جائے گا کہ میں اپنے کفر پر رہ کر بھی مقصود کو حاصل کرسکتا ہوں تو اب اس کے اسلام کی کوئی امید نہیں۔ یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو ان جوگیوں کو عام کفار سے اچھا سمجھتے ہیں۔

اور بعض لوگ غضب کرتے ہیں کہ ان لوگوں کو صاحب باطن سمجھتے ہیں۔ چنانچہ آجکل ایک رئیس[۱] المشرکین کے ساتھ بہت سے مسلمانوں کو اسی قسم کا اعتقاد ہے اور اس کی کرامتیں بیان کی جاتی ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان لوگوں نے بس مطلق مجاہدات کا نام تصوف رکھ لیا ہے اور چند تصرفات کو ثمرۂ تصوف سمجھ لیا ہے حالانکہ تصوف نام ہے مجاہدہ بطریق الاسلام کا جس کا ثمرہ رضا و قرب حق ہے کفار کے مجاہدوں کو تصوف سے کیا نسبت اور ان نفسانی تصرفات کو قرب حق سے کیا تعلق یہ تو ادنیٰ مشق سے ایک مسمریزم والا بھی کرسکتا ہے

---

[۱] مراد گاندھی ہے ۱۲ جامع

تو بس وہ بھی صوفی ہو گئے ۔ افسوس یہ ہے کہ اس غلطی میں بہت سے لکھے پڑھے مبتلا ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے مسائل تصوف کو کسی محقق سے حاصل نہیں کیا محض سُنی سُنائی باتوں پر اعتماد کرلیا ہے اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کافر کو ان لوگوں نے موحد کدھر سے بنا لیا حالانکہ وہ صاف صاف کہتا ہے کہ میں پکا ہندو ہوں بس وہی مثال ہے مدعی سُست گواہ چست ۔ اور یہاں سے ان سالکین کی غلطی بھی واضح ہو گئی ۔ جو ان کیفیات و تصرفات اور کشف وغیرہ کو مقصود سمجھتے ہیں یاد رکھو کہ ان کیفیات اور کشف کو مقصود سے کچھ تعلق نہیں کیونکہ یہ نفسانی کیفیات تو یکسوئی سے ہر شخص کو حاصل ہو سکتی ہیں (جن کیفیات کو قرب میں کچھ دخل ہے وہ ان نفسانی کیفیات سے بالکل جدا ہیں اور یہ وہ کیفیات ہیں جو تجلی صفات الٰہیہ سے سالک پر وارد ہوتی ہیں باقی ذوق و شوق کا غلبہ یا یکسوئی کا بڑھ جانا یہ سب نفسانی کیفیات ہیں ان کو مقصود سے کچھ نسبت نہیں ہاں اگر یہ شخص صحیح راستہ پر چل رہا ہے تو ان نفسانی کیفیات سے طریق میں سہولت ہو جاتی ہے باقی انھیں کو مقصود سمجھ لینا یہ مقصود سے بے خبری کی دلیل ہے ۔ ۱۲)

یاد رکھو کہ تصوف سے اصل مقصود یہ ہے کہ اعمال شرعیہ یعنی طاعات واجبہ و مستحبہ کا بجالانا اور معاصی سے اجتناب کرنا یہ بندہ کی طبیعت ثانیہ بن جائے بس یہ وہ چیز ہے جس سے قرب و رضا حق حاصل ہوتی ہے کیفیات و کشفیات کو اس سے کچھ تعلق نہیں اگر ایک شخص اداطاعات و اجتناب عن المعاصی میں پختہ ہو وہ کامل صوفی ہے گو کیفیات کچھ بھی اس پر وارد نہ ہوتی ہوں اور جس پر کیفیات بکثرت وارد ہوتی ہوں

کشف و تصرف میں بھی ملکہ رکھتا ہو مگر اوامر و نواہی میں پختگی حاصل نہ ہو وہ صوفی نہیں خوب سمجھ لو بس یہ وہ معیار ہے جس میں کبھی غلطی نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد ارشاد ہے وان اللہ لمع المحسنین بعض نے اس کو اس مجاہدہ کے مقصود پر محمول کیا ہے ان کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مجاہدہ کرتے ہیں اول ان کو راستہ بتلا دیا جاتا ہے پھر جب وہ راستہ طے کر لیتے ہیں اس وقت ان کو نسبتِ احسان حاصل ہو جاتی ہے جس سے ان کے ساتھ معیت الٰہیہ قائم ہو جاتی ہے اب وصول ہو گیا خلاصہ یہ ہوا کہ الذین جاھدوا فینا میں طریق کا بیان تھا اور ان اللہ لمع المحسنین میں مقصود کا بیان ہے مگر میرے نزدیک یہاں صریح طور پر مذکور نہیں اور ان اللہ لمع المحسنین بھی طریق ہی کے متعلق ہے اور صریح اس لئے کہا کہ آگے میں یہ دعوے کروں گا کہ ہدایت سے یہاں ایصال مراد ہے ارارت طریق مراد نہیں اور ایصال کے ضمن میں ظاہر ہے کہ وصول کا بھی ذکر ہو گیا جو کہ مقصود ہے مگر یہ ذکر تبعًا وضمنًا ہے نہ کہ قصداً و استقلالاً۔ اب سنئے کہ میرے نزدیک ان اللہ لمع المحسنین کو طریق کے ساتھ کس طرح تعلق ہے بات یہ ہے کہ جب الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا میں یہ وعدہ کیا گیا کہ جو لوگ مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستہ پر پہنچا دیتے ہیں اس کو سن کر کسی کو یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ راستہ تو بہت طویل ہے کیونکہ خدا کا راستہ ہے جو کہ ورار الورار ثم ورار الورار ہیں تو ان تک پہنچنے کا راستہ بھی بہت دور و دراز ہو گا چنانچہ مولانا فرماتے ہیں ؎

اے برادر بے نہایت در گہیست   ہر چہ بروے میرسی بروی مایست

(اے بھائی حق تعالیٰ کی بارگاہ غیر متناہی ہے۔ پس جس مقام پر بھی پہنچ جاؤ اس پر

قناعت مت کرو آگے بڑھو)

اور ایک محقق کہتے ہیں۔

نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا کہ میبالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

(عشق کا راستہ دوڑنے سے ہرگز قطع نہیں ہوتا کہ یہ راستہ مثل درخت انگور کاٹنے سے اور بڑھتا ہے یعنی غیر محدود راستہ ہے)

تو اس بنار پر اس راستہ کا تو قطع ہونا محال ہے تو اس کو اختیار کون کرے اور اس کے لئے مجاہدہ کرنے سے کیا حاصل جب طے ہی نہیں ہوسکتا عارف شیرازی نے ایک جگہ درازی طریق ہی سے پریشان ہو کر فرمایا ہے ؎

تو دستگیر شو اے خضر پے خجستہ کہ من پیادہ میروم و ہمرہاں سوار انند

(اے خضر (مرشد طریق) ہم خستہ حالوں کی دستگیری فرمایئے کیونکہ ہم تو پیدل چل رہے ہیں اور ہمارے رفقاء سواری پر تیز رفتار ہیں)

یہاں دوسروں کو سوار اپنے لحاظ سے فرمادیا کہ دوسرے میری نسبت سے ذرا تیز چل رہے ہیں باقی فی نفسہ یہاں کوئی سوار نہیں اس راستہ کو طے کرنے کے لئے سب پیادہ ہی ہیں کسی کے پاس کوئی سواری ایسی نہیں جو اس کو طے کرسکے چنانچہ اسی لئے ایک شعر میں سب کو صیغہ جمع میں جمع کرکے یوں فرمایا ہے۔ ع

مابداں مقصد عالی نتوانیم رسید (ہم اس مقصد عالی تک پہنچنے سے قاصر ہیں) اس میں سب کی نسبت یہی فرمایا ہے کہ ہم اس مقصد عالی تک نہیں پہونچ سکتے یہاں سوار و پیادہ کی کوئی خصوصیت نہیں بیان فرمائی بس اس راستہ میں جو لوگ سوار بھی ہیں وہ ایسے سوار ہیں جیسے بچے نئے پر سوار ہوا کرتے ہیں آپ نے بچوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ لکڑی کا گھوڑا بنا کر بھاگے بھاگے پھرا کرتے ہیں تو کیا

اس سواری سے وہ امریکہ پہنچ سکتے ہیں ہرگز نہیں امریکہ تو کیا پہنچتے جلال آباد تک بھی نہیں جا سکتے تو ان اللہ لمع المحسنین میں اس اشکال کا جواب دیا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ تم گھبراؤ نہیں جب تم مجاہدہ کروگے ہم تم کو منزل مقصود پر پہنچاویں گے اور راستہ اس طرح قطع ہوگا کہ ہم خود تمہارے ساتھ ہوں گے جب تم تھک جاؤ گے تو ہم تم کو گود میں اٹھا کر پہنچا دیں گے اسی کو وہی عارف جنھوں نے ؏

مابداں مقصد عالی نتوانیم رسید

(ہم اس منزل مقصود تک پہنچنے سے قاصر ہیں البتہ اگر آپ کا لطف بھی کچھ قدم طالبین کی طرف آگے رکھے تو راستہ دم میں قطع ہو سکتا ہے)

طریق کی درازی اور اپنے ضعف پر نظر کرکے فرمایا تھا۔ آگے کہتے ہیں کہ ہاں ایک صورت ہے پہنچنے کی وہ کیا ؏

ہاں مگر پیش نہد لطف شما گامے چند

کہ آپ کا لطف بھی کچھ قدم آگے رکھے تو پھر دم بھر میں راستہ طے ہے تو اس آیت میں ان اللہ لمع المحسنین ایسا ہے جیسے آپ ایک بچہ سے جو گھٹنیوں چلتا ہے یہ کہیں کہ جلال آباد پہونچ جانا ظاہر ہے کہ اس کے لئے اس کی کوئی صورت نہیں۔ بچہ کہتا ہے کہ میں چلتا ہوں لیکن اگر تھک گیا تو کیا ہوگا اس پر مربی کہتا ہے کہ جب تم تھک جاؤ گے ہم گود میں اٹھالیں گے بس اب اس کی ہمت بندھ جاتی ہے پھر وہ دو چار ہی قدم چلتا ہے کہ مربی کو شفقت کا جوش آتا ہے وہ جلدی ہی اسے گود میں لے لیتا ہے یہی مطلب اس جملہ کا ہے کہ تم محنت کرو ہم تمہاری انگلی پکڑ کر لے چلیں گے

ؐ یہ ایک قصبہ ہے تھانہ بھون سے دو میل پر ۱۲ منہ

ہم تمہارے ساتھ ساتھ چلیں گے اور قاعدہ ہے کہ جب مربی بچہ کی انگلی پکڑ لیتا ہے تو وہ بے فکر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم بے فکر رہو ہم تم کو خود لے کر چلیں گے تنہا نہ چھوڑیں گے۔ انگلی پکڑ کر لے چلنے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔

عالمگیر کے زمانہ میں ایک راجہ کا انتقال ہو گیا اس کے ایک نابالغ لڑکا تھا اس لئے تخت کا مدعی بھائی ہوا مگر وزراء چاہتے تھے کہ تخت کا مالک لڑکا ہو لیکن اس کی امید کسی کو نہ تھی سب کا یہی خیال تھا کہ عالمگیر تخت کا مالک بھائی کو بنا دیں گے اور نابالغ لڑکے کو محروم کر دیں گے۔ وزراء نے یہ تدبیر کی کہ اس نابالغ لڑکے کو اپنے ساتھ لے کر دہلی چلے کہ شاید عالمگیر کو صورت دیکھ کر رحم آجائے۔ تمام راستہ وزیر اعظم اس لڑکے کو آداب شاہی وضروریات سکھاتا جارہا تھا کہ یوں سلام کرنا اور عالمگیر یہ سوال کریں تو یہ جواب دینا یہ بات پوچھیں تو تم یہ کہنا۔ جب وزیر سب کچھ پڑھا چکا اور دہلی میں داخل ہوئے تو لڑکے نے کہا کہ بھلا اگر عالمگیر نے ان سوالات کے علاوہ کوئی اور سوال کیا تو میں کیا جواب دوں گا۔ وزیر اس ذہانت سے دنگ رہ گیا اس نے کہا صاحبزادے جس خدا نے تمہارے دل میں اس وقت یہ سوال ڈالا ہے وہ وقت پر عالمگیر کی بات کا جواب بھی تیرے دل میں ڈالدے گا۔ بس اب میں مطمئن ہوں غرض یہ لوگ بچہ کو لیکر عالمگیرؒ کے پاس حاضر ہوئے عالمگیر اس وقت زنانہ محل میں حوض کے کنارے پر غسل کر رہے تھے اطلاع ہونے پر اندر ہی بلا لیا وہ حاضر ہوا اور سلام کیا انہوں نے کھیل کے طور پر اس بچہ کے دونوں ہاتھ پکڑ کے حوض میں لٹکا دیا اور کہا چھوڑ دوں بچہ ہنسا عالمگیر سمجھے کہ بے وقوف معلوم ہوتا ہے بھلا یہ ہنسنے کا کونسا موقعہ تھا پوچھا ہنستے کیوں ہو بات کا جواب دو بچہ نے جواب دیا کہ

حضور کی بات پر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ حضور کی تو یہ شان ہے کہ آپ جس کی انگلی پکڑ لیں وہ بھی ہلاک نہیں ہو سکتا اور میرے تو دونوں ہاتھ آپ کے ہاتھ میں ہیں بھلا میں کیونکر ڈوب سکتا ہوں، پھر مجھ کو کاہے سے ڈراتے ہیں۔ عالمگیر کو اس جواب پر وجد آگیا اور فرمایا لڑکا بہت ہوشیار ہے۔ تخت کا مالک اسی کو بنایا جاتا ہے۔

تو صاحبو! جب ایک بیچارہ عاجز عالمگیر جس کا ہاتھ پکڑ لے وہ ہلاک نہیں ہو سکتا تو خدا تعالیٰ جس کا ہاتھ پکڑ لیں وہ کیونکر ہلاک ہو سکتا ہے۔ (اس وقت حضرت مولانا پر خاص حالت تھی اور سامعین کا عجیب حال تھا، جامع) یقیناً ہلاک نہیں ہو سکتا۔ پس گو یہ راستہ بہت طویل ہے اور نہایت خطرناک۔ مگر معیت حق کی وجہ سے پھولوں ہلکا ہو جاتا ہے اور بہت نزدیک ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ مجاہدہ کرنے والے کون ہیں جن کے ساتھ معیت حق ہوتی ہے والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا کے بعد ان اللہ لمع المحسنین بڑھا کر اس پر بھی تنبیہ فرمادی کہ ہم ہر مجاہدہ کرنے والے کے ساتھ نہیں ہوتے بلکہ جو محسن ہو ہم اس کے ہمراہ ہوں گے۔ بعض لوگ مطلقاً زیادہ مجاہدہ کرنے والوں کو مقرب سمجھتے ہیں خوب سمجھ لو کہ زیادہ چکی پیسنے پر قرب کا مدار نہیں بلکہ اس کا مدار احسان پر ہے چکی پیسنے پر مجھے یاد آیا کہ ایک بار حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ کے ایک مدرس کو معزول کرنا چاہا کیونکہ ان کی ترتیب تعلیم اچھی نہ تھی۔ مہتمم صاحب نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ ان کو معزول نہ کیا جائے کیونکہ یہ محنتی بہت ہیں تو مولانا نے فرمایا کہ اگر زیادہ محنتی ہونا ہی معیار انتخاب ہے تو پسنہاری مجھ سے زیادہ محنتی ہے اور ارزاں بھی ہے

پھر مجھے چالیس پچاس روپئے کا مدرس کیوں بنا رکھا ہے میری جگہ ایک سبتھاری کو بٹھلا دیا ہوتا وہ مجھ سے زیادہ محنت کرے گی اور دو آنہ روز لیا کرے گی (سبحان اللہ کیا علوم ہیں ان حضرات کے ۱۲ جامع) آجکل یہ بڑا خبط ہے کہ محنتی ہونے کو کمال کا معیار سمجھتے ہیں یاد رکھو زیادہ مجاہدوں پر قرب کا مدار نہیں نہ یہ معیار کمال ہے بلکہ اس طریق میں اصل مدار احسان پر ہے جس کے لغوی معنے نیکو کردن عبادت ہے اور جس کی تفسیر اخلاص سے کی گئی ہے اور حقیقت اس کی ایک حدیث میں بیان کی گئی ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک یعنی تعبد اللہ مشابہا بانك تراہ۔ مطلب یہ ہے کہ خداتعالیٰ کی ایسی عبادت کرو جیسی اُس حالت میں کرتے جبکہ اس کو دیکھتے ہوتے کیونکہ تم اگر اس کو نہیں دیکھتے تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے اور اس کا بھی مقتضا وہی ہے جو تمہارے دیکھنے کی حالت کا مقتضا ہے اور خدا کا تم کو دیکھنا یقینی ہے پس اس لئے ایسی ہی عبادت کرو جیسی اس کو دیکھ کر کرتے چنانچہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کو دیکھتے ہوئے عبادت نہایت کامل ہو گی جیسے سڑک کوٹنے والا مزدور اگر حاکم کو سامنے سے آتا ہوا دیکھ لے تو اس وقت خوب کام کرتا ہے لیکن اگر مزدور کو حاکم خود بھی نظر نہ آئے گا مگر کسی معتبر ذریعے سے اسے معلوم ہو جائے کہ حاکم میرے کام کو دیکھ رہا ہے تو اس وقت بھی اس کی وہی حالت ہو گی جو آنکھوں کے سامنے حاکم کو دیکھنے کے بعد ہوتی اور مسلمان کے لئے خدا ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے بڑھ کر کیا چیز ہو سکتی ہے۔ جب قرآن وحدیث میں اس کی تصریح ہو چکی کہ حق تعالیٰ بندوں کے افعال کو دیکھ رہے ہیں تو ان کی حالت عبادت میں وہی ہونی چاہیئے جو حق تعالےٰ کو دیکھ کر ہوتی اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کو دیکھنے کے بعد بہت ہی اچھی طریق سے عبادت ہوتی اور وہ اچھا ہوتا

یہ ہے کہ ظاہراً ارکان اس کے مکمل ہوں اور باطنیاً اس میں ریا وغیرہ کا خیال پاس بھی نہیں آ سکتا اس وقت تو اپنی بھی خبر نہ رہے گی دوسروں کی تو کیا خبر ہو گی جن کو عمل دکھلانے کا خیال ہو ؎

چو سلطانِ عزت علم برکشد ؎ جہاں سر بجیب عدم درکشد

(جب وہ سلطان عزت کسی دل میں جھنڈا اپنے قرب کا لہرا دیتا ہے تو اس کی نظر میں یہ جہاں کلعدم ہو جاتا ہے)

اور یہی حاصل ہے اخلاص کا اس حدیث کی ایک تفسیر مشہور اس کے علاوہ بھی ہے وہ یہ کہ بعض لوگوں نے اس کے دو جملوں سے اس میں دو مرتبے نکالے ہیں اور وہ دو مرتبے گو فی نفسہ صحیح ہیں مگر نہ معلوم حدیث کے الفاظ کی دلالت ان پر کیسے ہو گئی۔ اس تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اول تو عبادت اس طرح کرنی چاہیئے جیسے گویا تم خدا تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو یہ تو اعلیٰ مرتبہ ہے اور اگر ایسی عبادت نہ ہو سکے تو کم از کم ایسی ہی کرو جیسے خدا تعالیٰ تم کو دیکھ رہے ہیں گویا جملہ اولیٰ میں تو مشاہدہ کی تعلیم ہے کہ عبادت میں حق تعالیٰ کو قلب سے دیکھنا چاہیئے اور دوسرے جملہ میں مراقبہ روایت کی تعلیم ہے کہ عبادت میں یہ تصور کر لیا کرو کہ حق تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں مگر یہ معنے حدیث کے مدلول نہیں ہو سکتے۔ اگر یہ مطلب ہوتا تو عبارت یوں ہوتی فان لم تعبد کانك تراہ فاعبدہ بانہ یراك کیونکہ مرتبہ اولیٰ ان تعبد اللہ کانك تراہ میں تشبیہ ہے اس کے بعد مرتبہ ثانیہ فان لم تکن تراہ میں اسی تشبیہ کی نفی ہو گی اور معنے یہ ہوں گے فان تعبد کانك تراہ اور یہ نفی صحیح نہیں کیونکہ بزعم مفسر اس تشبیہ کا مدار تو تصور اور خیال پر ہے کہ ایسی عبادت کرو گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو اور تصور میں بڑی وسعت ہے اور ایسا فرض بہت سہل ہے تو اس کی نفی کی کیا ضرورت ہے

لہٰذا فان لم تکن تراہ کو تشبیہ رؤیت کی نفی پر محمول نہیں کیا جا سکتا اور اس صورت میں یہ دوسرا مرتبہ پہلے مرتبے کے مقابل نہیں اس لیے اس کے یہ معنے بیان کرنا کہ اگر تم حالت مشابہ رؤیت الٰہی پر قادر نہ ہو تو یہی تصور کرو کہ حق تعالیٰ تم کو دیکھ رہے ہیں۔

الفاظ سے نہایت بعید ہے پس صحیح یہ ہے کہ حدیث میں نہ مراقبے کی تعلیم ہے نہ مراقبے کے دو درجے مذکور ہیں بلکہ دوسرا جملہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک پہلے جملہ کی علت ہے جس کی تقریر آتی ہے اور فا تعلیلیہ کلام عرب میں بکثرت مستعمل ہے اور علت بیان کرنے کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ ان تعبد اللہ کانک تراہ پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ جب ہم خدا تعالے کو دیکھتے ہی نہیں تو ایسی عبادت کیونکر کریں جیسی خدا کو دیکھ کر کرتے تو جملہ ثانیہ میں اس شبہ کا جواب دیا گیا اور بتلایا گیا کہ بدون خدا کو دیکھے ہوئے بھی ویسی عبادت ہو سکتی ہے جیسے دیکھنے کے بعد ہوتی کیونکہ اگر تم نہیں دیکھتے تو اس کا تو یقین ہے کہ وہ دیکھتے ہی ہیں اور اس یقین کا بھی اثر وہی ہے جو تمہارے دیکھنے کا اثر ہوتا اس کی وضاحت کے لئے میں ایک قصہ بیان کرتا ہوں مولوی محمد سعید صاحب کیرانوی مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ نے مجھ سے اپنا واقعہ بیان کیا کہ جب میں قسطنطنیہ گیا اور سلطان عبدالحمید خاں رحمۃ اللہ علیہ کے ایوان کی طرف چلا تو اول تو میں بے فکری کے ساتھ چلا جب قصر شاہی میں قدم رکھا اس وقت یہ تحقیق ہوا کہ سلطان کا جو خاص کمرہ ہے سلطان اس کمرہ میں کبھی سیر و تفریح کے لئے آ بیٹھتے ہیں اس وقت اس میدان میں چلنے والے سب ان کے سامنے ہوتے ہیں۔ مولوی محمد سعید صاحب کہتے تھے کہ بس یہ تصوّر کر کے کہ شاید اس وقت سلطان مجھے دیکھ رہے ہوں

میری یہ حالت تھی کہ قدم نہ اٹھتا تھا اور میں گردن جھکائے نہایت ادب سے چل رہا تھا اس میدان میں چاروں طرف پھول پھلواری اور عمدہ عمدہ درخت لگے ہوئے تھے مگر میں نے ایسی نگاہیں نیچی کیں کہ کسی چیز کو بھی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی۔ حالانکہ اس وقت تک نہ میں نے سلطان کو دیکھا تھا نہ یہ یقین تھا کہ وہ مجھ کو اس وقت دیکھ رہے ہیں، محض احتمال تھا کہ شاید دیکھ رہے ہوں مگر اس احتمال ہی سے میری وہ حالت تھی جس کو میں بیان نہیں کرسکتا۔

اے صاحبو! جب ایک ادنیٰ بادشاہ کے احتمال رؤیت سے یہ حال ہوتا ہے تو حق تعالیٰ کی یقینی رویت کے استحضار سے کیسا حال ہونا چاہیئے اس کو خود سمجھ لیجئے لہٰذا فان لم تکن تراہ جملہ اولے کے لئے علت ہونا اس مثال سے بخوبی واضح ہوگیا۔ الغرض احسان کے یہ معنی ہیں کہ حق تعالیٰ کی عبادت ایسے خلوص واستحضار سے بجالائے گویا کہ یہ ان کو دیکھ رہا ہے۔ عبادت میں جس شخص کی یہ حالت ہو وہ محسن ہے اور ایسے ہی لوگوں کے لئے معیت حق کا وعدہ ہے۔ ہر مجاہدہ کرنے والے کے لئے اس کا وعدہ نہیں پس مجاہدہ کو احسان کے ساتھ مقید کردینے سے معنے یہ ہو گئے کہ جو لوگ اخلاص واحسان کے ساتھ مجاہدہ کرتے ہیں ان کے حق میں وعدہ ہے لنھدینھم سُبلنا کہ ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے اور اسی تقیید سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ اس میں ہدایت سے ارارت طریق مراد نہیں بلکہ ایصال علی الطریق مراد ہے۔ کیونکہ ارارت طریق صرف مجاہدین محسنین کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر مسلمان کو عام ہے اور سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ لنھدینھم سبلنا مجاہدہ مقید بالاحسان کی جزا ہے پس لامحالہ ہدایت سے وہ معنے مراد

لینے چاہئیں جو ایسے مجاہدہ کی جزا ہو کر ایسے مجاہدین کے ساتھ مخصوص ہو اور وہ دوسرے ہی معنے ہو سکتے ہیں یعنی ایصال علی الطریق خلاصہ یہ ہے کہ راستہ بنانے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ مسافر کو علامات و نشانات بتلا دیئے جائیں کہ اس راستہ میں پہلے ایک کنواں آئے گا پھر فلاں سمت کو چلنا وہاں ایک درخت ملے گا پھر ایک پہاڑ آئے گا وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد مسافر ان علامات کو یاد کر کے چل پڑے تو اس صورت میں بھٹکنے کی بہت گنجائش ہے اور پریشانی تو ہے ہی جب تک وہ علامات نظر نہ آئیں اس وقت تک چلنے والے کو اطمینان نہیں ہوتا ہر قدم پر غلطی کا شبہ ہوتا ہے۔ اور ایک صورت یہ ہے کہ کسی نے آپ سے راستہ پوچھا اور آپ نے بجائے علامات بتلانے کے یہ کیا کہ خود ساتھ ہو لئے کہ تم میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ اس صورت میں مسافر کا دل کتنا بڑھے گا اور وہ کیسا بے فکر ہو جائے گا خود ہی سوچ لیجئے پس لنھدینھم میں ہدایت سے یہی دوسرے معنے مراد ہیں کہ جو لوگ اخلاص کے ساتھ مجاہدہ کرتے ہیں حق تعالیٰ ان کو ہاتھ پکڑ کر پہنچا دیتے ہیں رستہ بتلانے پر اکتفا نہیں فرماتے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بلا اختیار عبد کو اضطراری طور پر پہنچا دیں گے شاید کوئی صاحب یہ سمجھے ہوں کہ جب حق تعالیٰ ہاتھ پکڑ لیں گے اور خدا سے ہاتھ چھڑانا محال ہے تو پھر ہمارے اختیار کی کیا ضرورت ہے اب تو لامحالہ پہنچ ہی جائیں گے سو یہ سمجھنا صحیح نہیں کیونکہ اس صورت میں پہونچنے والوں کا کیا کمال ہوا اور قاصرین کی کیا کوتاہی ہوئی بلکہ حق تعالیٰ کے اس پہنچانے میں بھی بندہ کے اختیار کا لحاظ ہے جب تک بندہ میں ارادہ طلب رہتی ہے اس وقت تک تو وہ ہاتھ پکڑے رہتے ہیں اور جب اس میں ارادہ نہیں ہوتا فوراً ہاتھ جوڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ صاف ارشاد ہے انلزمکموھا وانتم لھا کارھون کیا ہم

اپنی رحمت کو تمہارے اوپر چپکا دیں گو تم اُن سے کراہت ہی کرتے ہو ایسا نہیں ہوگا بلکہ جب تک تم میں طلب رہے گی اسی وقت تک ہماری طرف سے عنایات کی بارش ہوگی۔ البتہ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بندہ کا کام صرف قصدِ مصمم ہے پھر عمل میں یہ لو مضطرب ہوجاتا ہے اور پھر تو کھینچ تان کر پہنچا ہی دیتے ہیں۔ چنانچہ جو شخص نماز کا عامل ہے وہ قصد کے ہوتے ہوئے اس کے ترک پر قادر نہیں مگر شرط یہ ہے کہ قصد پیدا ہونے کے بعد اخیر تک باقی بھی رہے اگر کسی وقت قصد فوت ہوجائے گا تو اسی وقت سے عمل میں خلل آجائے گا اور وصول میسّر نہ ہوگا۔ اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ ہم تو بار بار نماز کا قصد کرتے ہیں پھر بھی عمل صادر نہیں ہوتا تو وہ سمجھ لیں کہ ان کے اندر ابھی تک قصد ہی پیدا نہیں ہوا محض تمنا کا درجہ پیدا ہوا ہے اور تمنا میں اور قصد میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہاں تک تو آیت کی تفسیر بھی اور اس تقریر سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ مجاہدہ کی حقیقت ارتکاب طاعات واجتناب معاصی ہے، مگر اس پر ایک شبہ وارد ہوتا ہے میں اس کو بھی حل کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اہلِ سلوک نے بالاجماع مجاہدہ کی ایک اور قسم بیان کی ہے جو نہ ارتکاب طاعات میں داخل ہے نہ ترک معاصی کی فرد ہے۔ اور وہ قسم مجاہدہ کی ایسی مشہور اور صوفیہ کے کلام میں اس کثرت سے مذکور ہے کہ لفظ مجاہدہ سے متبادر وہی مفہوم ہونے لگی ہے۔ اور جو حقیقت اس وقت بیان کی گئی ہے وہ اس درجہ میں متبادر نہیں ہوتی چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ مجاہدہ کے چار رکن ہیں۔ (۱) تقلیل طعام (۲) تقلیل منام۔ (۳) تقلیل کلام (۴) تقلیل اختلاط مع الانام۔ اور تقلیل کا لفظ تو میں کہہ رہا ہوں وہ تو ترک ہی سے تعبیر کرتے ہیں مگر مراد ان کی بھی تقلیل ہی ہے جس کو

ترک سے اس لئے تعبیر کیا کہ بمر گش گیرتا بہ تپ راضی شود اگر وہ تقلیل کا لفظ استعمال کرتے تو ہم لوگوں کو گنجائش ملتی کہ ذراسی قلت کر کے اپنے کو مجاہد سمجھ لیا کرتے اور جب ترک کا لفظ اختیار کیا تو ہم ان کے چھوڑنے کا قصد کریں گے اور ترک کلی ہو نہیں سکے گا اس لئے لامحالہ تقلیل کے اس درجہ پر جا ٹھہریں گے جو ان کا مقصود ہے اب اشکال یہ ہے کہ مجاہدہ کی یہ قسم نہ تو اعمال میں داخل ہے کیونکہ اعمال اشیاء وجودیہ ہیں اور یہ ارکان اربعہ وجودی نہیں بلکہ عدمی ہیں چنانچہ اہل سلوک کا ان کو ترک سے تعبیر کرنا اس کی کافی دلیل ہے اور نہ یہ تروک میں داخل ہیں کیونکہ اوپر تروک کی تفسیر ترک معاصی سے کی گئی ہے اور ان ارکان اربعہ میں جو ترک ہے وہ مباحات پر دائر ہو رہا ہے کیونکہ کھانا سونا بولنا ملنا جلنا بقدر ضرورت تو واجب ہے اس کا ترک تو مراد ہی نہیں اور جس کا ترک مراد ہے یعنے زائد از ضرورت وہ گناہ نہیں بلکہ امور مباحہ ہیں ممکن ہے کہ یہاں کوئی یہ احتمال پیدا کرے کہ جس طرح تم نے اعمال کی دو قسمیں کی ہیں ایک عمل واجب۔ ایک عمل مستحب اسی طرح ہم تروک کی دو قسمیں کریں گے ایک ترک معصیت دوسرے ترک مباح تو اب ان ارکان اربعہ کا تروک سے خارج ہونا لازم نہ آئے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مجاہدہ میں وہی چیزیں داخل ہو سکتی ہیں جن کو قرب و ثواب میں دخل ہو چونکہ عمل مستحب پر ثواب ملتا ہے اس لئے وہ تو مجاہدہ کی قسم بن سکتا ہے اور مباح میں کچھ ثواب نہیں نہ عملاً نہ ترکاً اس لئے ترک مباح مجاہدہ میں داخل نہیں ہو سکتا اور یہی وجہ ہے کہ جانب اعمال میں صرف عمل واجب و عمل مستحب کو بیان کیا گیا ہے عمل مباح کو بیان نہیں کیا گیا اور بعض روایات سے جو عمل مباح پر ثواب ملنا معلوم ہوتا ہے وہ نیت مخصوصہ کے ساتھ مقید ہے اور اس قید کے بعد وہ مستحب میں داخل ہو جاتا ہے۔ مباح نہیں رہتا۔ غرض یہ مسلم ہے کہ مباحات کو قرب و ثواب

میں کچھ دخل نہیں نہ عملاً نہ ترکاً ۱۲ جامع)
تو اب یہ اشکال باقی رہا کہ ترک مباح مجاہدہ کی قسم کیونکر بن گیا پھر یہ کسی ایک یا دو شخصوں کا قول نہیں بلکہ سارے اہلِ طریق کا اس پر اجماع ہے اور مجاہدہ کا ضروری ہونا مسلّم ہے تو گویا ان کی ضرورت پر اتفاق ہے اور جس طرح اہلِ ظاہر کا اجماع حجت ہے اسی طرح اہلِ باطن کا اجماع بھی حجت ہے کیونکہ تصوف بھی فقہ کی ایک فرد ہے۔ جیسا کہ اہلِ اصول نے امام ابو حنیفہ رح سے اس کی تصریح کی ہے کہ الفقہ معرفۃ النفس مالها وما عليها (فقہ نام ہے نفس کی معرفت کا جو اس کے لئے مفید اور جو مضر ہیں)
تو صوفیہ بھی فقہاء امت میں داخل ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ مسائل ظاہرہ میں فقہاء ظاہر کا اجماع تو حجّت ہو اور اور مسائل سلوک میں فقہاء باطن کا اجماع حجت نہ ہو تو اب اشکال ہر طرح پختہ ہو گیا۔ اب اس کا جواب سنئے بات یہ ہے کہ مجاہدہ تو حقیقت میں ترکِ معاصی کا نام ہے ترک مباحات حقیقت میں مجاہدہ نہیں لیکن یہ حضرات طبائع کے خواص وکیفیات کو خوب جانتے ہیں جیسے اطباء ظاہر اجسام کے خواص وکیفیات کو جانتے ہیں تو ان حضرات نے طبائع بشری کی خاصیت پر نظر کر کے یہ دیکھا کہ مجاہدہ مطلوبہ (یعنی ارتکاب طاعات واجتناب معاصی) میں بغیر ان ارکانِ اربعہ کے سہولت نہیں ہوتی۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جو لوگ مشک کی طرح پیٹ کو آنٹ کر آتے ہیں ان کو تراویح پڑھنا موت ہے وہ تو الم ترکیف ہی کی مسجد ڈھونڈھتے پھرتے ہیں جب یہ بقر سے زیادہ کھائیں گے تو سورۂ بقرہ ان سے کہاں سنی جائے گی آجکل خانقاہ میں تراویح الم ترکیف ہی سے ہوتی ہے مگر پھر بھی امام سے بعض لوگوں کی درخواست ہے کہ ذرا تیز پڑھا کرو سجدے رکوع میں دیر نہ کیا کرو ان یاروں کو مسئلہ کا پتہ

نہیں چلا ورنہ یہ الم ترکیب میں بھی دو رکعتیں کرتے کیونکہ فقہا نے لکھا ہے
کہ سورۂ فاتحہ کے بعد اٹھارہ حرفوں کی آیت سے واجب ادا ہو جاتا ہے
اس سے کم میں تو واجب ادا نہیں ہوتا اور اس طرح الم ترکیب میں دو رکعتیں
بخوبی ہو سکتی ہیں۔ زیادہ کھانے کا یہ اثر تو اعمال پر ہوتا ہے پھر ان ہی بزرگوں
کو لوگوں کی طبائع کا اندازہ کرکے یہ بھی معلوم ہوا کہ گناہ بھی زیادہ تر کھانے
ہی سے ہوتے ہیں کھانے والا ترکِ معاصی پر کم قادر ہوتا ہے اور جو لوگ
کم کھاتے ہیں ان کو تقاضائے معصیت کم ہوتا ہے وہ اگر بچنا چاہیں تو
سہولت سے بچ سکتے ہیں کیونکہ ان میں قوت بہیمیہ ضعیف ہوتی ہے جیسے بڈھا
جس میں یہ قوت ضعیف ہوتی ہے اگر زنا سے بچنا چاہے تو بآسانی بچ سکتا ہے
اسی لئے حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ کو تین شخصوں سے زیادہ بغض ہے۔
ملک کذاب و شیخ زانٍ و عائل مستکبر۔ یعنی (۱) بادشاہ جھوٹ
بولنے والا کیونکہ عام لوگ اگر جھوٹ بولیں تو وہ حاجت کا بہانہ کر سکتے ہیں
کہ صاحب کیا کریں بدون جھوٹ کے کام نہیں چل سکتا۔ مگر بادشاہ کو کس
بلا نے گھیرا وہ کیوں جھوٹ بولتا ہے اس کے اوپر کس کا دباؤ ہے یا اس کو
کس کے پاس مقدمہ لیجانا پڑتا ہے۔ پس بادشاہ کا جھوٹ بولنا محض خباثتِ
نفس ہے۔ اسی طرح (۲) بڈھا زنا کرنے والا اس پر بھی خدا کا غضب زیادہ
ہے کیونکہ جوان تو کچھ عذر کر سکتا ہے کہ فرطِ شبقؔ سے میری عقل پر پردہ پڑ گیا
تھا مگر بڈھے پر کیا آفت آئی اسے کونسا شبق تھا وہ تو پہلا سبق سب بھول چکا
گیا۔ اب تو وہ نہ معلوم کتنی دیر میں نفس کو آمادہ کرے گا کیونکہ غریب مُردہ ہو چکا
ہے۔ جیسے ایک بڈھے قاضی نے کسی کم عمر لڑکی سے نکاح کیا تھا جو ابھی ان

عہ یعنی زیادتی خواہش جماع ۱۲

یا توں کو نہ جانتی تھی انھوں نے یہ کہہ کر راضی کیا کہ ایسا کام ایک بار کرنے سے سو کافروں کے مارنے کا ثواب ہوتا ہے وہ بیچاری راضی ہوگئی دو تین روز کے بعد پھر یہ مسئلہ بیان کیا وہ پھر راضی ہوگئی۔ اس کے بعد جب یہ جوان ہوگئی اور وہ زیادہ بوڑھے ہوگئے تو اب اس نے خود کہنا شروع کیا کہ قاضی جی آؤ کافروں کو ماریں خیر قاضی جی جہاد کو تیار ہوگئے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اس نے پھر کہا قاضی جی نے پھر بھی ہمت کی جب کئی دفعہ یہ قصہ ہوا تو قاضی جی گھبرا کر باہر چلے گئے۔ بیوی نے لڑکے کے ہاتھ کہلا کر بھیجا کہ قاضی جی کافروں نے بہت زور کر رکھا ہے تو قاضی جی صاحب نے جواب میں کہلا بھیجا کہ ہم نے ان کافروں سے صلح کر لی ہے بس یہی حال بڈھے کے نفس کا ہوتا ہے کہ وہ بھی ان کافروں سے صلح کر چکا ہے اب اس کا زنا پر اقدام کرنا سوائے شرارتِ نفس کے اور کچھ نہیں۔ (۳) اور عائل متکبر کی مذمت اس لئے ہے تونگر کے پاس تو تکبر کا کچھ سامان بظاہر موجود ہے مفلس قلاش کس بات پر اینٹھتا ہے یہ خواہ مخواہ فرعون بے سامان بنا جاتا ہے۔ جیسے ایک شخص غریب تھا مگر لوگوں پر یہ ظاہر کرتا تھا کہ میں روزانہ گھی دودھ اور قورمہ پلاؤ کھاتا ہوں اور لوگوں کو دکھانے کے لئے مونچھوں کو تیل مل کر نکلا کرتا تھا تاکہ لوگ سمجھیں کہ پلاؤ کا گھی لگ رہا ہے۔ ایک دن جو آپ نے چراغ میں سے مونچھوں کو تیل لگایا تو چراغ کی بتی بھی ساتھ میں آگئی اور داڑھی میں الجھی رہ گئی اس شان سے جب آپ باہر نکلے تو اس دن سب قلعی کھل گئی تو غریب ہو کر متکبر بننا نہایت حماقت ہے۔ غریبی کا تو مقتضا ہی تواضع ہے ؎

تواضع ز گردن فرازاں نکوست ؎ گدا اگر تواضع کند خوئے اوست

(معززلوگوں کا تواضع کرنا کمال ہے اگر گدا تواضع کرتا ہے تو یہ تو اس کی عادت ہی ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ فقیر و مفلس کی عادت تواضع ہی ہوا کرتی ہے۔ یہ گفتگو تو حدیث کے

متعلق تھی میں یہ کہہ رہا تھا کہ کم کھانے والا گناہوں سے بسہولت بچ سکتا ہے جیسے بڑھا زنا سے آسانی کے ساتھ بچ سکتا ہے۔ الغرض غور سے دیکھا جائے تو سب گناہ زیادہ کھانے ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔ جیسے مولوی سالار بخش صاحب وعظ میں گناہوں کی فہرست گنوا کر فرمایا کرتے تھے کہ یہ سب فساد مرچوں کا ہے۔ ان کے نزدیک سب گناہ مرچوں ہی کی وجہ سے ہوتے تھے لوگ تو اس کو ہنسی میں اڑاتے ہیں مگر میں نے اس کلام کی یہ تاویل کی ہے کہ مرچ سے کھانا لذیذ ہو جاتا ہے اور لذت کی وجہ سے بہت کھایا جاتا ہے اور بہت کھانا گناہوں کا سبب ہے۔ اس طرح مرچوں کو اس فساد میں دخل ہو گیا۔

خیر مرچوں کا فساد تو ہو یا نہ ہو لیکن یہ کلام محقق ہے کہ اکثر گناہ زیادہ کھانے سے ہوتے ہیں۔ یہ ساری باتیں مستی ہی میں سوجھتی ہیں کہ کسی کو گھور لیا۔ کسی کو چھیڑ دیا۔ کسی کے عاشق ہو گئے۔ بھوکے کو یہ مستیاں نہیں سوجھتیں جس کے گھر میں سال بھر کا غلہ بھرا ہوا ہو وہ تو عورتوں ہی کو گھورے گا اور کیا کرے گا کیونکہ معاش کی طرف سے بیفکری ہے کام کچھ ہے نہیں تو اب انہی قصوں میں وقت گذارتے ہیں ہاں اگر کبھی ان مستوں پر مقدمات قائم ہو جاتے ہیں اس وقت ساری مستی نکل جاتی ہے اب نہ کسی کو گھورنے کی مہلت ہے نہ عشق ظاہر کرنے کی ہمّت ہے ہر وقت مقدمہ کی فکر لگی رہتی ہے اور اس فکر میں کھانا پینا سونا بھی حرام ہو جاتا ہے۔ اسی لئے بزرگوں نے لکھا ہے کہ انسان کو بیکار نہ رہنا چاہیئے کسی نہ کسی کام میں لگا رہنا چاہیئے۔ دین کا کام نہ ہو سکے تو دنیا ہی کے کسی مباح کام میں لگا رہے کیونکہ مشغولی میں نفس کو مستی نہیں سوجھتی توجہ کام کی طرف رہتی ہے اور بیکاری میں چاروں طرف ذہن دوڑتا ہے اس راز کو حکام نے بھی سمجھا ہے۔ (باقی انشاء اللہ آئندہ)

(محمد عبدالمنان خوشنود ... نے جید پریس ... سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ ... روڈ ... سے شائع کیا)

ضروری اطلاع: اکثر خریداروں کا پتہ بدل جاتا ہے۔ وہ لوگ اپنا جدید پتہ تو لکھدیتے ہیں مگر سابقہ پتہ اور خریداری نمبر نہیں لکھتے اور کئی کئی ماہ کے بعد پتہ بدلنے کی اطلاع دیتے ہیں براہ کرم پتہ بدلنے کی فوری اطلاع دیا کریں تاکہ قدیم پتہ پر رسالہ نہ جاسکے ورنہ آپ کا نقصان ہوگا جس کا ادارہ ذمہ دار نہیں۔

چنانچہ جو لوگ معطل و بیکار رہتے ہیں پولیس زیادہ تر انہی کی نگہداشت میں رہتی ہے اور ایسے ہی لوگوں کا نام آوارہ گردوں میں لکھا رہتا ہے اور جب کوئی واردات ہوتی ہے ایسے ہی لوگوں کو پکڑا جاتا ہے۔ تو گویا حکام کے نزدیک بھی بیکاری بدمعاشی کا سبب ہے اور ظاہر بات ہے کہ جس شخص کو کوئی دھندا ہوگا وہ فضول پھندوں میں کیا خاک پھنسے گا اسے اپنے کام ہی سے فرصت نہ ہوگی جس کو ہر روز گھاس کھودنے کی فکر ہے وہ عورتوں کو کہاں گھورنے جائے گا اور یہاں سے معلوم ہوا کہ مسلمان کے ساتھ کسی فکر کا لگا ہونا بڑی نعمت ہے۔ یہ بہت سے گناہوں کا وقایہ ہے خواہ دنیا ہی کا فکر ہو۔ پس غریبوں کو اس نعمت پر شکر کرنا چاہیئے کہ حق تعالیٰ نے ان کو بے فکری نہیں دی امیروں کو دیکھ دیکھ کر غریبوں کی رال ٹپکتی ہے کہ ہائے ہم بھی ایسے ہی بے فکر ہوتے مگر یہ خبر نہیں کہ وہ اس بے فکری سے سیکڑوں گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور تم روٹی کی فکر میں ہزاروں گناہوں سے بچے ہوئے ہو۔ خوب کہا ہے ؎

آنکس کہ تو نگرت نمی گرداند   او مصلحت تو از تو بہتر داند

(جو ذات پاک تجھے امیر نہیں بناتی وہ تیری مصلحت کو تجھ سے زیادہ بہتر جانتی ہے)

زیادہ کھانے میں علاوہ اس نقصان کے کہ وہ گناہوں کا سبب ہوتا ہے اور بھی بہت نقصان ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی شخص ہمت کر کے گناہوں سے بچا بھی رہے تو یہ نقصان تو اُسے بھی ہوگا کہ نیند زیادہ آئے گی کم کھانے میں نیند کم آتی ہے۔ پیٹ تن کر جب سوؤ گے تو نیند بھی تن کر آئے گی۔

اور کچھ بھوک رکھ کر کھاؤ گے تو رات میں دو تین دفعہ خود بخود آنکھ کھل جائے گی کیونکہ نیند سے وہ تھوڑے بہت کھانا بھی جو کھایا تھا جلدی ہضم ہو جائے گا پھر جب پیٹ کمر سے لگ جائے گا تو ایک کروٹ پر لیٹا نہ جائے گا بار بار کروٹیں بدلو گے اور کئی بار آنکھ کھل کھل جائے گی پھر چونکہ یہ مسلمان ہے اس لئے ذکراللہ میں لگ جائے گا اور سوچے گا کہ یہ وقت اور کسی کام کا تو ہے نہیں اور صبح ہونے میں دیر ہے تو بیکار کیوں جاگے لاؤ کچھ اللہ اللہ ہی کرلو تو کم کھانے والے کو طاعات کی توفیق زیادہ ہوتی ہے اور زیادہ کھانے والا تو صبح کو بھی مشکل سے اٹھے گا اس لئے اس شخص کی طاعات بہت کم ہوں گی اور اگر بہت کھانیوالا اتفاق سے کسی رات کو جاگ بھی گیا تو کھانے کا کسل ایسا ہوتا ہے کہ اسکو چار پائی سے اٹھنے کی ہمّت نہیں ہوتی اور اگر اُٹھ بھی گیا اور وضو کر کے نماز یا ذکر میں لگ گیا تو تھوڑی دیر میں نیند کے جھونکے ایسے آئیں گے کہ سجدہ میں پڑ کر خبر بھی نہ رہے گی یا گردن جھکا کر سوتا رہے گا۔ زیادہ کھانے میں دین کا نقصان تو ہے ہی دنیا کا بھی نقصان ہے کیونکہ کھانے میں اس شخص کی رقم زیادہ خرچ ہوتی ہے ایک شخص فی وقت دس روٹی کھاتا ہے اور ایک چار روٹی کھاتا ہے دونوں کے خرچ میں آدھوں آدھ کا تفاوت ہوگا۔ پھر بہت کھانے والے کو غذا اچھی طرح ہضم نہیں ہوتی آئے دن بدہضمی کی شکایت رہتی ہے جس سے طرح طرح کی بیماریوں کا شکار رہتا ہے تو دواؤں میں بہت رقم خرچ ہوتی ہے اور کم کھانے والے کو غذا اچھی طرح ہضم ہوتی ہے اس کی تندرستی بنی رہتی ہے تو دواؤں میں اس کے روپئے نہیں اٹھتے۔ شیخ سعدی نے لکھا ہے کہ ایک نصرانی بادشاہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت ایک طبیب کو بھیجا تھا کہ یہ مدینہ والوں کا علاج کیا کرے گا آپ نے طبیب کو

واپس کر دیا اور فرمایا کہ ہم لوگ بغیر بھوک کے کھاتے نہیں ہیں اور بھوک رکھ کر کھانا چھوڑ دیتے ہیں اس لئے ہم کو طبیب کی ضرورت نہیں۔ (قلت اخرجہ فی السیرۃ الحلبیۃ قال ورد فی روایۃ انہ اھدی مقوقس عظیم القبط الیہ طبیبًا لیداوی مرض المسلمین فقال ارجع الی بلدك فلاحاجۃ لنابك فانا قوم لا ناکل حتی نجوع ونقوم عنہ ولم نشبع منہ او کما قال ۱۲ جامع)

واقعی اس دستور العمل پر عمل کر کے دیکھئے سب بیماریاں خود ہی بھاگ جائیں گی۔ کبھی اتفاقی طور پر بیماری آجائے تو اور بات ہے لیکن مجموعہ امراض تو نہ ہوگا۔ مگر آجکل لوگوں کی عادت یہ ہے کہ بھوک لگنے کا کھانا کھانے میں انتظار نہیں کرتے بلکہ اکثر وقت آنے کی رعایت سے کھاتے ہیں کہ کھانا گرم گرم ہے دیر میں کھائیں گے تو ٹھنڈا ہو جائے گا لاؤ ابھی کھالیں۔ جی ہاں اس وقت کھانا تو گرم ہے مگر کھانے والا سرد ہی ہو جائے گا کیونکہ بے بھوک کھانے سے حرارت غریزیہ منطفی ہو جاتی ہے معدہ میں تداخل ہو جاتا ہے بھلا کھانا ابھی ہضم نہیں ہوا تھا کہ دوسرا اور پہنچ گیا اب معدہ پریشان ہوتا ہے کہ کسے ہضم کروں اور خصوصًا یہ امراء کے مشیر تو بہت غضب کرتے ہیں کہ رئیس صاحب کو بھوک نہیں ہے وہ کھانے سے انکار کر رہے

؎ میں کہتا ہوں کہ احتمالاً مقوقس کی اس فعل میں ایک گہری چال تھی وہ اس طبیب کے ذریعے سے غالبًا اہل مدینہ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتا تھا کیونکہ عادۃً محسن کی طرف طبیعت کا میلان ضرور ہو جاتا ہے اور طبیب مریض کے حق میں بڑا محسن ہوتا ہے تو لامحالہ مریضوں کی اسکی طرف میلان ہوگا احسان میں ایک کشش ہے جس سے انسان بالاضطرار محسن کی طرف منجذب ہو جاتا ہے پھر رفتہ رفتہ طبیب کی عظمت دل میں ہو جاتی ہے پھر اس کے مذہب سے نفرت نہیں رہتی حتی کہ اس کے قبول کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ آجکل متمدن حکومتوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کا یہی طریقہ اختیار کیا کہ پہلے اپنے شفاخانے کھولتے اور غریبوں کا مفت علاج کرتے ہیں اس کے بعد کھلم کھلا مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی دقیقہ پر نظر کر کے نصرانی طبیب کو مدینہ منورہ میں نہیں رہنے دیا اور گو مسلمانوں کو طبیب کی زیادہ ضرورت نہ تھی مگر استغنا بھی نہ تھا آخر امراض تو صحابہ کو بھی پیش آتے تھے باوجودیکہ وہ اصولِ حفظ صحت کے پابند تھے ۱۲ جامع۔

ہیں تو مشیر اپنے پیٹ بھرنے کے لئے انھیں رائے دیتے ہیں کہ نہیں حضور کچھ تو کھا لیجئے فاقہ کرنا اچھا نہیں تھوڑا بہت کھا کر نمک سلیمانی استعمال کر لیجئے گا یا سوڈے کی بوتل پی لیجئے گا سب ہضم ہو جائے گا۔ اس پر چاروں طرف سے تائید ہوتی ہے۔ کثرت رائے کے بعد وہ کھانا آتا ہے۔ رئیس صاحب تو دو چار ہی لقمے کھاتے ہیں باقی سب ان مشیروں کے پیٹوں میں اترتا ہے پھر اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ رئیس صاحب کا معدہ بھاڑے کا ٹٹو ہو جاتا ہے کہ بدون نمک سلیمانی یا سوڈے کی بوتل کے کھانا ہضم ہی نہیں کر سکتا۔ بعضے یہ تدبیر کرتے ہیں کہ سالن میں لیمو نچوڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضور اب کھایئے دیکھئے کیسا مزہ آگیا ہے لیمو نچوڑنے سے رئیس صاحب کی بھی رال ٹپک پڑتی ہے۔ اور وہ جوں توں کھا لیتے ہیں۔ لیمو نچوڑنے پر مجھے ایک لیمو نچوڑ کی حکایت یاد آئی ایک شخص کی عادت تھی کہ وہ سرائے میں بیٹھا رہتا تھا اور دو تین لیمو اپنے پاس رکھتا تھا جب کوئی ذی ثروت مسافر سرائے میں کھانا کھانے بیٹھتا یہ جا کر اس کے پیالہ میں لیمو نچوڑ دیتا کہ دیکھئے حضور اس سے سالن کیسا مزہ دار ہو گیا ہے اس کے بعد یا تو وہی ان کو بلا لیتا یا یہ خود ہی کھانے لگتے"، لوگ مروت سے کچھ نہ کہتے اور یہ مفت سفت پیٹ بھر لیتا بس اس کا یہی پیشہ تھا کہ ایک پیسہ کے لیموئیں دونوں وقت پیٹ بھر لیا کرتا تھا ایک مرتبہ کوئی مسافر دل چلا بھی آٹھہرا اس کے پیالہ میں جو اس نے لیمو نچوڑا اور ساتھ کھانا شروع کیا تو اس نے زور سے ایک دھپ رسید کیا تو یہ لیمو نچوڑ کیا کہتا ہے کہ میرے ابا جان بھی مجھے یوں ہی مار مار کر کھلایا کرتے تھے آپ نے وہ زمانہ یاد دلا دیا اور بے حیا پھر بھی کھانے سے نہ رکا مسافر بھی خاموش ہو رہا کہ جب اس نے مجھے باپ بنا لیا تو اب کیا کہوں۔ واقعی یہ پیٹ بھی سب کچھ

کرا دیتا ہے کھانے کے حریص کو نہ حیا رہے نہ شرم۔ یہ تو ہنسی کی بات تھی میں یہ کہہ رہا تھا کہ کھانا خوب بھوک لگنے پر کھانا چاہیئے یہ نہیں کہ اس کے لئے مشورے اور کمیٹیاں کی جائیں اور کثرت رائے پر فیصلہ کر کے کھا لیا جائے چاہے بھوک ہو یا نہ ہو اس لئے میں کھانے پر اصرار کرنے کو بہت بڑا سمجھتا ہوں کسی کو بے بھوک کھلانا زہر دینا ہے۔ لوگوں میں مرض ہوا کرتا ہے کہ اصرار کر کر کے کھلایا کرتے ہیں خاص کر عورتیں بچوں کو بہت بری طرح ٹھسا تی ہیں۔ ایک صاحب نے یہاں غضب کیا کہ ان کے بچے نے روزہ رکھا تھا افطار میں اس نے پانی بہت پی لیا تو روٹی نہ کھائی باپ نے کہا میاں کچھ تو کھالو اس نے انکار کیا تو کہا اچھا دودھ ہی پی لو اس نے دودھ پی لیا بس روزہ کی گرمی کے بعد جو دودھ معدہ میں پہنچا ہے اس نے فوراً اخلاط میں گڑبڑ پیدا کی اور بچہ ایسا سخت بیمار ہوا کہ مرنے سے بچ گیا۔ تو بچوں کو اصرار کر کے کھلانا اور زیادہ برُا ہے وہ تو خود ہی کھانے کے بہت حریص ہوتے ہیں اگر بچہ کبھی انکار کرے تو سمجھ لو کہ یا تو اس نے بہت ہی کھا لیا ہے یا کسی مرض کی وجہ سے انکار کرتا ہے۔ اب تم اصرار کر کے ہرگز نہ کھلاؤ یہ تو زیادہ کھانے کے نقصانات تھے مگر اس میں ایک خوبی بھی ہے (یہ لطیفہ کے طور پر فرمایا) وہ یہ کہ زیادہ کھانے والے کو خدا کی نعمت کی قدر بہت ہوتی ہے یہ کھانے پر بڑی محبت سے گرتا ہے اس لئے میں زیادہ کھانے والوں کو قدر دانِ نعمت کہا کرتا ہوں۔ کم کھانے والے کھانے پر اس طرح نہیں گرتے تو ان کو اس نعمت کی قدر زیادہ نہیں جیسے حضرت حاجی صاحب نے ایک موقع پر ایسا ہی فرمایا تھا۔ قصہ یہ ہے کہ حضرت کے ایک مقرب مرید کو کسی شخص نے اپنے مال کی تقسیم کے لئے وصی بنایا تھا کہ اس کے مستحقین میں تقسیم کر دیا جائے۔ انھوں نے یہ چاہا کہ حضرت کی رائے کے موافق تقسیم کروں۔ چنانچہ مستحقین کے نام ایک پرچہ لکھ کر لائے اور

حضرت سے عرض کیا کہ میں نے یہ مال ان لوگوں میں تقسیم کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ حضرت کی کیا رائے ہے۔ اس پرچہ میں سارے نام ان لوگوں کے تھے جو متوکل تھے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم نے فلاں فلاں کے نام نہیں لکھے وہ کہنے لگے کہ حضرت وہ تو امراء سے مل کر مانگ لیتے ہیں سوال کرکے کھا لیتے ہیں اور یہ لوگ کسی سے مانگنے نہیں جاتے ان کی یہ حالت ہے یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف کہ صورت دیکھ کر ناواقف لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بڑے مالدار ہیں جبھی تو کسی سے سوال نہیں کرتے اس لئے میں نے ان کو ترجیح دی کہ یہ کسی سے مانگنے نہیں جاتے۔ حضرت نے فرمایا سبحان اللہ جو نعمت کے قدر دان ہیں تم ان کو تو دیتے نہیں (جن کو پیسہ پیسہ عزیز ہے جو اس کے لئے عزت و آبرو بھی خرچ کر دیتے ہیں) اور ان کو دیتے ہو جن کو سلطنت کی بھی پروا نہیں۔ دوسرے یہ بھیک مانگنے والے اس لئے بھی زیادہ قابل رحم ہے کہ خدا تعالے بھی ان کے خاص ذمہ دار نہیں چنانچہ ارشاد ہے من جعل ھمومہ ھما واحدا ھم الآخرۃ کفی اللہ ھمومہ کلھا ومن تشعبت بہ الھموم لم یبال اللہ فی ای وادھلک (او کما قال) (جو شخص سارے فکروں کو چھوڑ کر ایک فکر اختیار کرلے یعنی آخرت کی فکر تو حق تعالیٰ اس کے سب فکروں کی کفایت کرتے ہیں اور جو خود مختلف افکار میں مبتلا ہو حق تعالیٰ کو اس کی پروا نہیں کہ یہ کس جنگل میں جا کر ہلاک ہوتا ہے ۱۲ جامع) اور متوکلین کے بارہ میں نص موجود ہے ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ جو خدا پر توکل کرے خدا اسے کافی ہے تو جس کا خدا ذمہ دار ہے۔ آپ کو اس کی تو فکر ہوئی اور جس کا خدا بھی ذمہ دار نہیں اس کی فکر نہ ہوئی۔ سبحان اللہ عارفین کے علوم کیسے پاکیزہ ہوتے ہیں ان کی نظر حقیقت پر پہنچی ہے ورنہ ظاہر میں تو متوکلین کی حالت زیادہ قابل رحم معلوم ہوتی ہے مگر حاجی صاحب نے

لطیفہ کے پیرایہ میں بتلادیا کہ جو سچا متوکل ہے اس کو کسی کے اہتمام کی ضرورت نہیں ارحم الراحمین اس پر رحم کرنے کے لئے کافی ہے۔ باقی جو جھوٹا متوکل ہو وہ محض مدعی ہے اس کا ذکر نہیں جیسے بعض لوگ توکل کا دعویٰ کرتے ہیں (یہ ایک واقعہ ہے) اور جب پریشانی پیش آتی ہے تو سوداگروں کو خطوط لکھتے کہ آجکل جاڑے کے کپڑے نہیں ہیں اتنی رقم نہیں جو بنالوں قوت دماغ کے لئے دودھ کی بھی ضرورت ہے مگر وسعت نہیں آپ دعا کریں کہ حق تعالیٰ سب باتوں کا انتظام فرمادیں۔ سبحان اللہ دعا کے واسطے بھی سوداگر ہی رہ گئے تھے اگر سچ مچ دعا کرانا ہی مقصود تھا تو غرباء سے کرائی ہوتی اور متوکل تو اپنی ضروریات کے لئے کسی سے دعا کرانے کی ضرورت کیا ہے خدا سے خود کیوں نہیں دعا کرتا ان حرکتوں سے توکل کا نام بھی کیوں بدنام کرتا ہے۔ بس یہ شخص مخلوق کو بے وقوف سمجھتا ہے کہ وہ اس طرح لکھنے کو سوال نہ سمجھیں گے مگر آجکل دنیا کے معاملہ میں ہر شخص عقلمند ہے اور یہ تو کوئی ایسی دقیق بات بھی نہیں جس کو کوئی نہ سمجھ سکے کھلی ہوئی بات ہے کہ اپنی حاجات ظاہر کرکے دعا کرانے کا مطلب بجز سوال کے اور کیا ہے اگر اس پر بھی توکل چلا جارہا ہے۔ توکل کیا ہوا بی بی تمیزہ کا وضو ہوگیا۔ بی بی تمیزہ ایک فاحشہ عورت تھی کسی بزرگ نے اس کو نماز کی تاکید کی اور اپنے سامنے وضو بھی کرادیا کہ اس طرح وضو کیا کرتے ہیں۔ نماز بھی سکھلادی ایک مدت کے بعد وہ بزرگ پھر اس کے پاس سے گذرے۔ پوچھا بی تمیزہ نماز پڑھتی ہو۔ کہا حضور روز پانچوں وقت پابندی سے پڑھتی ہوں۔ پوچھا وضو بھی کرتی ہو کہنے لگی کہ وضو تو اس روز آپ نے کرادیا تھا۔ اللہ کی بندی اسی وضو سے برسوں نماز پڑھتی رہی۔ بس جس طرح اس کا وضو نہ سونے سے ٹوٹتا تھا

نہ پیشاب پاخانہ سے نہ زنا کاری سے اسی طرح آجکل بعض لوگوں کا توکل ہے کہ سوال بھی کر لیں اور متوکل کے متوکل بنے رہیں استغفر اللہ۔ غرض میں کہہ رہا تھا کہ جو امراء نمک اور چورن کے سہارے کھانا کھاتے ہیں وہ مرض کو خریدتے ہیں اسی طرح جو لوگ مشتہیات سے قوت جماع کو بڑھاتے ہیں وہ اپنی صحت برباد کرتے ہیں اس کے لئے بھی یہی قاعدہ ہونا چاہیئے کہ بدون سخت تقاضے کے بی بی کے پاس نہ جائیں مشتہیات کے استعمال سے قوت زیادہ نہیں ہوتی ہاں استسقاء ہو جاتا ہے جیسے استسقاء والا کتنا ہی پانی پی لے مگر پیاس نہیں بجھتی یہی حال ان لوگوں کا ہو جاتا ہے کہ کثرتِ مقاربت سے بھی ان کی پیاس نہیں بجھتی تو یہ صحت کی دلیل نہیں بلکہ سخت مرض ہے جس کا انجام خطرناک ہے اطباء نے استسقاء کی بیماری تو لکھی ہے مگر استطعام کا مرض کسی نے نہیں لکھا مگر ہم نے یہ مرض بھی دیکھا ہے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کا کھانے سے پیٹ نہیں بھرتا وہ کھاتے ہیں اور قے کرتے ہیں اور قے کر کے پھر کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ تو بزرگوں نے زیادہ کھانے کے یہ نقصانات دیکھے اس لئے ترکِ طعام کو مجاہدہ میں داخل کیا اور دوسری چیز تھی زیادہ سونا سو زیادہ سونے میں یہ نقصان ہے کہ اس سے برودت بڑھ جاتی ہے جس سے قوت فکریہ کم ہو جاتی ہے اور قوت فکریہ کی کمی سے دنیا اور دین دونوں کے کام خراب ہوتے ہیں۔ نیز اس سے امور انتظامیہ میں بہت خلل پڑتا ہے ایسے شخص کو پابندی اوقات کبھی نصیب نہیں ہوتی سوچتا یہ ہے کہ آج سویرے اُٹھ کر فلاں فلاں کام کروں گا نیند آئی تو وقت کے بہت بعد آنکھ کھلی اب اس کام کو دوسرے کاموں کے وقت میں کرتا ہے۔ دوسرے کاموں کو کل پر رکھتا ہے پھر دوسرے

دل ارادہ کرتا ہے کہ آج دوپہر کو ایک گھنٹہ سوؤں گا پھر سویرے اٹھ کر کچھ کام کروں گا۔ وہاں ڈھائی گھنٹہ کے بعد آنکھ کھلی تو پھر سارا انظام درہم برہم ہو گیا روز یہی قصہ رہتا ہے۔ اس لئے یہ شخص کبھی منتظم نہیں ہو سکتا اور بے انتظامی جڑ ہے بہت سی خرابیوں کی اِس سے دین کو بھی ضرر پہنچتا ہے اور دنیا کو بھی چنانچہ آجکل ہمارے بھائی دوسری قوموں کو دیکھ دیکھ کر ترقی کی ہوس کرتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھتے کہ ان کی ترقی کا راز کیا ہے اس کو بھی اختیار کریں یاد رکھو ہر کام میں ترقی انتظام سے ہوتی ہے جو کام جماعت کے متعلق ہو اس میں انتظام اتحاد و اتفاق سے ہوتا ہے جب سب کام کرنے والے متفق ہوں اور ہر ہر شخص منتظم ہو اس وقت ترقی ہو سکتی ہے مگر ہمارے بھائیوں کا سارا انتظام تقریروں اور تحریروں تک ہوتا ہے تجویزیں بہت لمبی لمبی اور خوشنما ہوتی ہیں مگر جب کام شروع کریں گے تو اس بے انتظامی سے جو چار دن بھی نہ چل سکے اور اس کا تجربہ کر لیا جائے کہ انتظام وہی شخص کر سکتا ہے جو کم سوتا ہو۔ سویرے اٹھتا ہو علاوہ ازیں زیادہ سونے میں جس قدر وقت صرف ہو گا اس میں کچھ کام نہ ہو گا نہ دنیا کا نہ دین کا یہ سارا وقت بیکار جاتا ہے بس جتنا وقت طبعی نیند کا ہے (جس کی مقدار اطباء نے ۷ گھنٹہ لکھی ہے ۱۲ جامع) وہ تو ضرورت میں صرف ہوا باقی سب رائیگاں گیا تو زیادہ سونے سے دنیا کی بھی کمی اور دین کا بھی نقصان ایسے شخص کی اکثر نمازیں بے وقت یا تنگ وقت میں ادا ہوتی ہیں خصوصاً عشاء اور فجر اور تہجد تو اُسے کہاں نصیب۔ اب تیسری چیز ہے زیادہ بولنا

بزرگوں نے اس میں یہ نقصان دیکھا کہ اس کے ہوتے ہوئے گناہوں سے بچنا مشکل ہے۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جو لوگ زیادہ بک بک کرتے ہیں وہ جھوٹ اور غیبت میں ضرور مبتلا ہو جاتے ہیں اور کثرتِ کلام کے ساتھ ہر بات سوچ کر کرنا جو تدبیر ہے معاصی لسان سے بچنے کی دشوار ہے۔ اور اگر بالفرض کوئی شخص گناہوں سے بچا بھی رہا تو ایک نقصان سے تو کسی طرح بچ ہی نہیں سکتا وہ نقصان کیا ہے ؎

دل ز پرگفتن بمیرد در بدن　　گرچہ گفتارت بود دُرِّ عدن

(دل زیادہ بولنے سے بدن میں مردہ ہو جاتا ہے اگرچہ تیری گفتگو عدن کے موتی ہی جیسے کیوں نہ ہوں) یعنی کثرتِ کلام[1] سے دل مرجاتا ہے ظلمت پیدا ہوتی ہے قساوتِ قلب پیدا ہو جاتی ہے اور یہ وہ بلا ہے جس کے بعد کسی گناہ میں مبتلا ہو جانا بھی بعید نہیں ساری طاعات کا مدار حیاتِ قلب پر ہے۔ نیک کاموں کی توفیق نورِ قلب سے ہوتی ہے اور تمام معاصی کا منشا قساوت وظلمتِ قلب ہی ہے۔ جب قلب میں حیات ونور ہی نہ رہا بلکہ اس کے بجائے قساوت وظلمت پیدا ہوگئی تو اب یہ شخص سب گناہوں کے لئے قابل ہو جاتا ہے۔ پس کثرتِ کلام کے ساتھ گناہوں سے بچنا چند دن کا ہوتا ہے پھر معاصی کی طرف میلان ہونے لگتا ہے۔ اب رہی چوتھی چیز یعنی زیادہ میل جول سو اس میں یہ نقصان ہے کہ جتنا وقت اختلاط میں صرف ہوتا ہے اتنی دیر یہ شخص بیکار رہتا ہے۔ دین کا کوئی کام اس

---

[1] اس سے مراد وہ کثرت ہے جو اقوال مباحہ میں ہو اور اگر اصلاح خلق وتربیت طالبین کے لئے ہو جس میں احکام شرعیہ ومسائل سلوک کی تحقیق بھی داخل ہے وہ اس سے خارج ہے کیونکہ یہ کثرت اقوال مباحہ میں نہیں بلکہ اقوال واجبہ یا مستحبہ میں ہے اور ایسے اقوال سب داخل ذکر ہیں اور ذکر سے حیات قلب اور نور میں ترقی ہوتی ہے فافہم ۱۲ جامع

سے نہیں ہوتا رہا یہ کہ مسلمانوں سے ملنے میں بھی تو ثواب ہے تو اس سے مراد بقدر ضرورت ملنا ہے۔ اپنے پاس آنے والوں کی تواضع دس پندرہ منٹ میں ہو سکتی ہے اس کے لئے گھنٹے صرف کرنا وقت کو ضائع کرنا ہے زیادہ میل جول میں معمولات کی پابندی نہیں ہو سکتی ایک کام لے کر بیٹھے تھے کوئی ملنے آگیا تو کام رخصت ہوا اب باتوں میں گھنٹے لگا دیئے جاتے ہیں جس سے سارے کاموں کا پٹھڑا ہو جاتا ہے تو ایسا شخص ہمیشہ پریشان رہتا ہے۔ اور میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ بے انتظامی دنیا اور دین دونوں کے لئے مضر ہے دوسرے اختلاط میں خاموشی دشوار ہے خواہ مخواہ بولنا ہی پڑتا ہے جس میں اکثر غیبت و شکایت میں بھی ابتلا ہو جاتا ہے۔ تیسرے کثرتِ اختلاط سے باہم دوستی ہو جاتی ہے جس میں بعض دفعہ اپنے راز دوسرے پر ظاہر ہو جاتے ہیں پھر یہ دوست اپنے دوسرے دوستوں پر ان رازوں کو ظاہر کر دیتا ہے کیونکہ اس کو ان پر ویسا ہی اعتقاد تھا جیسا تم کو اس پر مگر بعض دفعہ ان میں تمہارا کوئی دشمن ہوتا ہے جو راز کو معلوم کر کے تم کو ضرر پہنچا دیتا ہے۔ نیز بعض دفعہ خود آپ کا دوست ہی بدل جاتا ہے اور دوست جب دشمنی پر آمادہ ہوتا ہے تو وہ اور دشمنوں سے زیادہ ایذا دیتا ہے۔ اسی لئے عرب کی مثل ہے اتق شر من احسنت الیہ یعنی جس پر تم نے احسان کیا ہو اس کے شر سے بچتے رہو۔ اور آجکل یہ کچھ بعید نہیں کیونکہ اس زمانہ میں دوستی اور محبت اکثر اغراض کے لئے ہوتی ہے، جب تک غرض پوری ہوتی رہی دوست ہیں اور جس دن اغراض میں کمی آئی اس دن سے دشمن ہیں۔ چنانچہ تجربہ ہو گیا کہ جن لوگوں پر پورا اعتماد تھا کہ یہ دوستی سے کبھی منہ

بدلیں گے وہ بھی اپنی اعــراض میں کسی وقت نقصان دیکھ کر بالکل بدل گئے اور ایسے بدلے کہ دشمن سے بھی بدتر دشمن بن گئے پھر دشمنی سے دنیــا کا ضرر تو ہوتا ہی ہے دین کا بھی نقصان ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں اطمینان قلب فوت ہوجاتا ہے اور اطمینان قلب سب کاموں کی جڑ ہے دین کا تو کوئی کام بدون اطمینانِ قلب کے اچھی طرح ہو ہی نہیں سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ اس کے بغیر دنیا کا بھی کوئی کام نہیں ہوتا تو اختلاط میں یہ کتــنا بڑا ضرر ہے۔ ہمارے حاجی صاحب کو جمعیت قلب کا بہت اہتمام تھا اسی لئے حضرت نے سالکین کو وصیت کی ہے کہ کسی سے نہ دوستی بڑھائیں نہ دشمنی پیدا کریں بس سب سے معمولی صاحب سلامت رکھیں۔ کیونکہ دشمنی تو پریشانی قلب کا سبب ہے اور آجکل دوستی بھی اس کا سبب ہوجاتی ہے (جیساکہ میں نے ابھی بیان کیا ۱۲)

اس تفصیل سے آپ کو زیادہ کھانے زیادہ سونے زیادہ بولنے زیادہ میل جول بڑھانے کے نقصانات اور مضرتیں بخوبی معلوم ہو گئی ہوں گی۔ پس گو یہ چاروں فی نفسہ مباح ہیں مگر ایسے مباح ہیں کہ تمام گناہوں کا سلسلۂ نسب انہی تک پہنچتا ہے۔ اس لئے بزرگوں نے ان کے ترک کو مجاہدہ میں داخل کیا خلاصہ یہ ہوا کہ مجاہدہ تو ترک معاصی ہی ہے مگر ترک معاصی عادۃً ان ترک اربعہ مباحہ پر موقوف ہے تو ان کا ترک بھی مجاہدہ ہے (لان مقدمۃ الواجب واجب جس پر واجب موقوف ہو وہ بھی واجب ہوتا ہے ۱۲)

الحمد للہ اس تقریر سے ان ارکان اربعہ کا مجاہدہ میں داخل ہونا واضح ہوگیا اور تقسیم مذکور پر بھی اشکال نہ رہا کیونکہ حاصل تقریر کا یہ ہوا کہ مجاہدہ

حقیقیہ تو ارتکاب طاعات و اجتناب معاصی ہی کا نام ہے اور اس معنی کر یہ ارکان اربعہ مجاہدہ میں داخل نہیں تھے مگر چونکہ اجتناب معاصی عادۃً انہی پر موقوف ہے اس لئے حکماً یہ بھی مجاہدہ میں داخل ہو گئے تو اب مجاہدہ کی دو قسمیں ہو گئیں۔

(۱) مجاہدہ حقیقیہ یعنی فعل طاعات و ترک معاصی۔ (۲) مجاہدہ حکمیہ یعنی ترک المباحات التی تجر الی المعاصی و الی ترك الطاعات (یعنی ان مباحات کا چھوڑنا جو ارتکاب معاصی و ترک طاعات کی طرف مفضی ہوتے ہیں اور وہ یہی چار مباحات ہیں جن کا ذکر بالتفصیل اوپر ہو چکا ہے ۱۲ جامع)

ایسے مباحات کا ترک کرنا یہ حکمی مجاہدہ ہے۔ اور چونکہ بوجہ مقدمہ ہونے کے یہ حقیقی ہی کے حکم میں ہے اس لئے اس کے فضائل بھی وہی ہیں جو حقیقی کے فضائل ہیں اور اس کا اہتمام بھی ویسا ہی ضروری ہے جیسا حقیقی مجاہدہ کا اہتمام ضروری ہے۔ اب یہاں ایک اشکال وارد ہوگا وہ یہ کہ جب ان مباحات اربعہ کا ترک کرنا حقیقی مجاہدہ نہیں بلکہ حکمی ہے تو اس کی کیا وجہ کہ صوفیہ نے مجاہدہ کے بیان میں حقیقی سے تعرض ہی نہ کیا بلکہ محض مجاہدۂ حکمی کے بیان پر اکتفا کر گئے حالانکہ حقیقی احق بالذکر تھا تو بات یہ ہے کہ مجاہدہ حقیقیہ کا مجاہدہ ہونا تو ظاہر تھا اس کے بیان کی ضرورت نہیں سمجھی کیونکہ بیان اسی بات کو کیا جاتا ہے جو خود سمجھ میں نہ آ سکے اور جو بات از خود سمجھ میں آ سکے اس کو بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے اور اس قاعدہ کو صوفیہ نے سُنّت نبویہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور عادت الٰہیہ سے اخذ کیا چنانچہ شریعت نے اسی بات کا امر کیا ہے جس کی طرف از خود توجہ نہ ہو اور اسی بات سے منع کیا ہے جس سے لوگ کم بچتے ہوں۔ چنانچہ شراب نوشی سے منع کیا ہے۔

پیشاب نوشی سے نہیں منع کیا کیونکہ شراب نوشی میں لوگوں کو ابتلا تھا اور پیشاب. بھلا کون پیتا ہے تو اُس سے منع کرنے کی ضرورت تھی اِس سے منع کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس سے تو انسان کی طبیعت خود بھی بچتی ہے ہاں پیشاب لگ جانے کے احکام شریعت نے بیان کئے ہیں کیونکہ اس میں ابتلا متوقع ہے اسی عادت وسنّت کے موافق صوفیہ نے مجاہدہ حقیقیہ سے تعرض نہیں کیا کیونکہ جانتے تھے کہ اس کا مجاہدہ ہونا کسی مسلمان پر مخفی نہ ہوگا اصل وجہ تو اس کے بیان نہ کرنے کی یہ تھی مگر اب جاہل صوفیہ بلکہ بہت سے لکھے پڑھے صوفی بھی اسی غلطی میں مبتلا ہیں کہ وہ مجاہدہ بس انہی ارکان اربعہ کو سمجھتے ہیں جن کا تعلق مباحات سے ہے اور اعمال واجبہ اور ترکِ معاصی کا کچھ بھی اہتمام نہیں کرتے۔ چنانچہ ایک صوفی رات بھر جاگتے تھے اور اس غرض کے لئے افیون کھایا کرتے تھے سبحان اللہ سونے سے تو پرہیز جو فی نفسہٖ مباح تھا اور نشہ کی چیز سے پرہیز نہیں جو حرام اور اقل درجہ مکروہ تحریمی تو ضرور ہے، کیونکہ افیون بقدر سکر کھانا حرام ہے اور اگر قدر سکر سے کم ہو تو ضرورت کے وقت جائز ہے بلا ضرورت مکروہ ہے اور جاگنا کونسی ضرورت ہے جس کے لئے افیون کا استعمال جائز ہو جائے۔ بس ان حضرات کی وہی مثال تھی کہ گڑ کھادیں اور گلگلوں سے پرہیز جیسے آجکل بعضے مولوی ان باتوں سے تو منع کرتے ہیں جن کو وہ خود بھی پہلے جائز سمجھتے اور کرتے آتے تھے اور ان باتوں سے نہیں روکتے جن کو ہمیشہ سے حرام سمجھتے تھے۔ اور اگر کسی نے کسی کام کے متعلق ان سے کہا بھی کہ یہ تو گناہ ہے شرک ہے اس سے بھی تو منع کرنا چاہیئے۔ تو یہ جواب دیدیتے ہیں

میاں اس وقت تو کام ہونے دو گناہ کو بعد میں دیکھ لیا جائے گا۔ یہی مذاق اس صوفی کا تھا کہ اس وقت تو جاگنا چاہیئے افیون کے گناہ کو بعد میں دیکھ لیا جائے گا۔ بھلا ان علماء سے کوئی پوچھے کہ جب تم گناہوں سے مخلوق کو نہیں روکتے تو مباحات سے کیوں روکتے ہو اور جو شخص ان مباحات کا ارتکاب کرے اس پر ملامت اور طعن کیوں کرتے ہو گناہوں میں تو اتنا تساہل اور مباحات سے اتنا اجتناب یہ تو وہی مثال ہوئی جیسے ایک شخص نے کسی عورت سے زنا کیا تھا اُسے حمل رہ گیا بچہ ہوا۔ بدنامی ہوئی کسی دوست نے کہا کمبخت تونے عزل ہی کرلیا ہوتا جو اس بدنامی کی تو نوبت نہ آتی تو آپ کیا کہتے ہیں کہ ہاں خیال تو ہوا تھا مگر میں نے یہ سُنا تھا کہ عزل مکروہ ہے، اس لئے نہ کیا جی ہاں اور زنا تو بہت حلال تھا واہیات مثال تو گندی ہے مگر آجکل کی حالت کے مطابق ہے۔ بہرحال مجاہدہ کی دونوں ہی قسموں کا اہتمام لازم ہے اور یہاں سے علماء خشک کی غلطی بھی ظاہر ہوگئی جو صرف اعمال واجبہ و ترکِ معاصی ہی کا اہتمام کرتے ہیں مجاہدہ حکمی کا بالکل اہتمام نہیں کرتے بلکہ اس کو مجاہدہ شرعیہ سے خارج سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ترک مباحات مجاہدہ کیونکر ہوگیا سو میں بتلا چکا ہوں کہ مجاہدہ حقیقیہ عادۃً ان مباحات کے ترک ہی پر موقوف ہے بدون اس کے ارتکاب طاعات و ترک معاصی میں سہولت نہیں ہوتی اور مقدمہ مامور بہ کا مامور بہ ہوتا ہے تو یہ بھی مجاہدہ شرعیہ میں داخل ہے اور اس کا اہتمام بھی ویسا ہی ضروری ہے بلکہ ایک اعتبار سے مجاہدہ حقیقیہ سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ ؎

سرچشمہ شاید گرفتن بہ میل ؛ چو پر شد نہ شاید گذشتن بہ پیل

(کسی چشمہ کی ابتدا کو سرمہ کی سلائی سے بھی بند کر سکتے ہیں لیکن اگر وہ پانی سے پُر ہو گیا تو ہاتھی کے گذرنے سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا)

قاعدہ یہی ہے کہ مقاصد سے زیادہ مقدمات کا اہتمام کیا جاتا ہے تب مقاصد حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ نحو و صرف میں اس قدر محنت کی جاتی ہے کہ علوم مقصودہ میں اس کی آدھی محنت بھی نہیں کی جاتی۔ بعض دفعہ مطالعہ کا اتنا اہتمام کیا جاتا ہے کہ سبق کا بھی اتنا اہتمام نہیں کیا جاتا کیونکہ وہ مفتاح استعداد ہے۔ اگر مطالعہ کی استعداد پیدا ہوگئی تو سبق کو بدون استاد کے بھی سمجھ لے گا۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے لاتقربوا الزنا فرمایا ہے (کہ زنا کے پاس مت جاؤ ۱۲) لاتفعلوا الزنا نہیں فرمایا لاتقربوا الزنا سے مقدمات زنا سب حرام ہوگئے جیسے نگاہ کرنا تصور کرنا۔ خلوت میں نامحرم کے پاس بیٹھنا اس کو ہاتھ لگانا وغیرہ وغیرہ کیونکہ اگر ان مقدمات کو حرام نہ کیا جاتا تو لوگ ان میں تساہل کرتے اور مقدمات میں مبتلا ہو کر پھر بچنا مشکل ہے پھر تو وہ یہ کہے گا ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ٔ   باز می گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

(دریا کی گہرائی میں ایک تختہ سے باندھ دیا ہے اور پھر کہتا ہے کہ تو دامن ترمت کر ہوشیار رہنا)

نامحرم کے ساتھ خلوت میں بیٹھ کر پھر معصیت سے بچا رہنا بہت ہی دشوار ہے شیطان کا مقولہ ہے جو اس نے بعضے بزرگوں سے کہا تھا کہ اگر خلوت میں جنیدؒ جیسا مرد اور رابعہؒ بصری جیسی عورت جمع ہو جاویں تو میں ان کے خیالات بھی خراب کر دوں پھر ہماری اور آپ کی تو کیا ہستی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ کی یہ بڑی رحمت ہے کہ جس کام سے منع کرنا چاہا اس کے مقدمات کو بھی حرام کر دیا۔ اگر مقدمات حرام نہ ہوتے تو پھر معاصی سے بچنا بہت لوگوں کے

حق میں گویا تکلیف مالا یطاق ہوجاتا گویا بھلا ایک بھوکا آدمی تنہا گھر کے اندر دسترخوان بچھا ہے اور روٹی کے سامنے بیٹھا رہے اور روٹی سے صبر کئے رہے بہت مشکل ہے۔ ہاں روزہ دار ہو تو شاید بچا رہے۔ اور اگر روزہ بھی نہ ہو یا یہ شخص روزہ کی فرضیت ہی کا قائل نہ ہو تو پھر بھوکا اس حال میں کھانے سے رکنا دشوار ہے شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ۔ ؎

ملحدِ گرسنہ در خانہ خالی برخواں عقل باور نکند کز رمضاں اندیشد

(منکر خدا بھوک کا مارا کسی خالی گھر میں کھانے لگے ہوئے دسترخوان پر ہو تو عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ وہ رمضان کے احترام سے باز رہے گا)

اسی لئے حق تعالیٰ نے نظر بد سے بھی منع کر دیا گو اس میں کلفت بہت ہوتی ہے خاصکر دفعۃً نگاہ پڑ جانے کے بعد اس کو فوراً پھیر لینا بڑا گراں گذرتا ہے مگر یہ کلفت تو ایک ساعت کے لئے ہے اگر نگاہ بھر کر دیکھ لیتا تو شاید ساری عمر کا وبال ہوجاتا جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے ؎

درون سینہ من زخم بے نشاں زدہٗ بحیرتم کہ عجب تیر بے کماں زدہٗ

(میرے سینہ کے اندر تو نے زخم بے نشان لگایا ہے میں حیرت زدہ ہوں کہ تو نے عجیب تیر بے کماں مارا ہے۔)

واقعی تیر نگاہ بہت سخت ہوتا ہے یہ تو بعض دفعہ دل میں بیٹھ کر نکلنا جانتا ہی نہیں۔ چنانچہ بعض لوگ اس نگاہ کی بدولت ایمان سے بھی گئے شیخ ابن القیمؒ نے لکھا ہے کہ ایک شخص ایک لڑکے پر عاشق تھا محبوب اس سے بیرخی کرتا تھا حتیٰ کہ اسی غم میں وہ مرنے لگا کسی نے معشوق کو اطلاع دی اس کو رحم آیا اور اس کے ملنے کے لئے چلا کسی نے عاشق کو خبر کر دی کہ وہ آرہا ہے یا تو مر رہا تھا یا سنتے ہی اُٹھ بیٹھا لڑکے نے راستہ میں پہونچ کر کہ میری

بدنامی ہوگی ارادہ ملتوی کردیا اور اپنے گھر کا راستہ لیا اور اس شعر پر عمل کیا ؎

کہا اس بت سے مرتا ہے وہ مومن　　کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

کسی نے عاشق کو اس کی بھی اطلاع کر دی کہ وہ تو اپنے گھر کو لوٹ گیا بس یہ سنتے ہی گر پڑا اور نزاع شروع ہوگیا لوگوں نے کلمۂ توحید کی تلقین کی تو بجائے کلمہ کے معشوق کو خطاب کرکے کہتا ہے ؎

رضاك اشھی الی فوادی　　من رحمة الخالق الجلیل

(دلبراں جب اپنی ادا دلبری سے اپنی نزاکت حسن کا اظہار کرتے ہیں تو بڑے بڑے زاہدوں کے ایمان میں رخنہ ڈالتے ہیں)

اور اسی پر ختم ہوگیا نعوذ باللہ۔ اسی طرح میرے شناسا ایک بوڑھے قاضی صاحب نمازی ثقہ تہجد گذار تسبیح گردان کسی یہودی پر عاشق تھے خود مجھ سے کہتے تھے کہ صاحب میرا تو نہ دین رہا نہ مذہب رہا میرا تو وہی دین ہے جو اس کا ہے اگر وہ مسلمان ہے تو میں مسلمان ہوں اگر وہ یہودی ہے تو میں یہودی ہوں اگر نصرانی ہے تو میں نصرانی ہوں انا للہ وانا الیہ راجعون میں نے کہا توبہ کیجئے خیر توبہ کرلی لوگ اس نظر بد کو ہلکی بات سمجھتے ہیں مگر یہی کمبخت جڑ ہے سارے ناپاک عشق کی جس میں کبھی ایمان تک بھی برباد ہوجاتا ہے تو کیا اب بھی یہ ہلکی چیز ہے یہ تو بہت سخت احتیاط کے قابل ہے کسی نے خوب کہا ہے ؎

دلبراں گر دلبری زیباں کنند　　زاہداں را رخنہ در ایماں کنند

اس لئے مجاہدہ حکمیہ کو غیر ضروری سمجھنا زاہدان خشک کی غلطی ہے جیسا حقیقی مجاہدہ کا اہتمام نہ کرنا۔ جہلاء صوفیہ کی غلطی ہے یہاں تک مجاہدہ کی حقیقت اور اس کے اقسام معلوم ہوگئے اور اس پر جو اشکالات وارد ہوتے تھے ان کا جواب بھی ہوگیا۔ اب سمجھئے کہ مجھے اصل میں

طاعات کی حکمت بیان کرنا مقصود ہے جو اس زمانہ میں (یعنی رمضان میں) کی جاتی ہیں تو حق تعالیٰ نے اول یہ مضمون قلب میں ڈالا کہ مشترک حکمت ان افعال کی مجاہدہ ہے اور یہ مضمون اجمالاً متقدمین کے کلام میں بھی موجود ہے پھر یہ بات ذہن میں آئی کہ مجاہدہ کی دو قسمیں ہیں حقیقی اور حکمی۔ اس کے بعد میرے دل پر یہ بات وارد ہوئی کہ ان عبادات میں تفصیل حکمت یہی چار مجاہدے ہیں جن کو صوفیہ مجاہدہ کے ارکان اربعہ قرار دیتے ہیں چنانچہ ان عبادات میں ایک تو روزہ ہے اس کی حکمت تقلیل طعام ہے۔ دوسری تراویح ہے اس کی روح تقلیل منام ہے۔ تیسری عبادت ان ایام کی تلاوت قرآن ہے۔ تلاوت قرآن کو ان ایام سے خاص خصوصیت ہے اس کا ثبوت فعل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے۔ احادیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جبرئیل علیہ السلام رمضان میں قرآن کا دور کرتے تھے اس سے معلوم ہوا کہ تراویح کے علاوہ بھی آپ اس زمانہ میں تلاوت قرآن زیادہ کرتے اور قرآن کا اہتمام بہت فرماتے تھے کیونکہ دور کرنا خاص اہتمام ہے تو گویا اس طرح رمضان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تلاوتِ قرآن زیادہ کرائی گئی ہے اور کثرتِ تلاوت کے لئے تقلیل کلام لازم ہے۔ جب آدمی قرآن پڑھتا رہے گا تو یقیناً باتوں میں کمی آئے گی تو تلاوتِ قرآن کی روح تقلیل کلام ہے۔ چوتھی عبادت اخیر رمضان میں اعتکاف ہے اس کی روح تقلیل اختلاط مع الانام ہے کیونکہ اول تو بہت لوگ مسجد میں آتے ہی نہیں جیسے ایک گنوار کا قصہ ہے اس کا بچھڑا چھوٹ کر مسجد میں گھس آیا وہ اس کے پیچھے پیچھے آیا تو مسجد کا ملاّ بُرا بھلا کہنے لگا کہ لوگ نہ نماز پڑھیں نہ کچھ کریں اور جانوروں کو مسجد میں چھوڑ دیتے ہیں تو گنوار کہتا ہے کہ بس زیادہ کیوں بڑبڑ لگائی ہے

دیکھا ہے ایسے لوگوں کے بیوقوف جانور تھا آگیا کبھی ہمیں بھی آتے نزدیک تو مسجد میں آتا آدمیوں کا کام ہی نہیں جانوروں کا کام ہے ایسے تو بھلا مسجد میں کیوں آنے لگے اور جو لوگ آتے بھی ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ بس نماز پڑھی اور اپنے گھر کا رستہ لیا مسجد میں ان کا دل لگتا ہی نہیں جو نماز کے بعد کچھ دیر بیٹھیں اللہ اللہ کریں یا قرآن پڑھیں وہ تو نہ معلوم نماز کے لئے بھی دس پانچ منٹ کس مصیبت سے مسجد میں ٹھہرتے ہیں۔ دن بھر چوپایوں میں باتیں بناتے رہتے ہیں اس سے ان کے کسی کام میں حرج نہیں ہوتا اور مسجد میں اگر امام نے نمازیوں کے انتظار کے لئے جماعت میں کچھ دیر کردی تو اس پر اعتراض ہوتے ہیں کہ ہمیں قید ہی کرلیا۔ ہمارے کام کا حرج ہورہا ہے۔ چنانچہ کانپور میں ایک شخص کہتے تھے کہ میں تراویح پڑھ کر گھر جاتا تھا ایک مسجد میں سے تراویح پڑھ کر لوگ نکل رہے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ تراویح کیا ہے قرنطینہ ہے جب ان لوگوں کو نماز پڑھنا بھی قرنطینہ معلوم ہوتا ہے تو نماز کے بعد تو وہ کیا مسجد میں ٹھہریں گے اسی لئے الم ترکیف کی مسجد ڈھونڈتے پھرتے ہیں تاکہ جلدی سے فراغت کرکے گھر کا رستہ لیں۔

بزرگوں نے کہا ہے۔ المؤمن فی المسجد کالسمک فی الماء والمنافق فی المسجد کالطیر فی القفس۔ یعنی مؤمن کی حالت مسجد میں ایسی ہوتی ہے جیسے مچھلی پانی میں ہو کہ اس کو مسجد میں آکر راحت وسکون حاصل ہوتا ہے اور منافق کی حالت مسجد میں ایسی ہوتی ہے جیسے پرندہ پنجرے میں قید ہو

قلت و یشھد لہ حدیث اذا رأیتم الرجل یتعاھد المسجد فاشھدوا لہ بالایمان فان اللہ تعالیٰ یقول انما یعمر مساجد اللہ من اٰمن باللہ

الآیۃ اخرجہ احمد وابن منیع والترمذی وابن ماجۃ والدارمی وابن مردویہ من حدیث ابی الہیثم عن ابی سعید مرفوعًا بھذا وقال الترمذی انہ حسن غریب صححہ ابن حزیمۃ وابن حبان والحاکم ولفظ الدیلمی عن معاذ بن جبل بہ مرفوعًا اذا رائیتم الرجل یلزم المسجد فلا تحرجوا ان تشہد وا لہ ان مومن اھ مقاصد حسنہ ص ۱۸ قلت ولما کان لزوم المسجد وتعاھدہ من علامۃ الایمان کان عکسہ من علامۃ النفاق ویستثنیٰ منہ من لا یقدر علیٰ زیاد المکث فی المسجد لغلبۃ ھیبتہ حضرۃ اللہ علیہ فمثلہ یخرج من المسجد سریعًا کما فرغ من الفرض فھو مؤمن کامل حقا لکون قلبہ متعلقا بالمسجد دائما وملازمًا لہ ولو لم یلازمہ بالمکث الطویل اولعل راخر ۱۲ جامع

الحمدللہ ہماری جماعت کا لقب مخالفین نے مسجد کا بینڈھا رکھا ہے کہ ان کو مسجد کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں ہر وقت مسجد ہی میں پڑے رہتے ہیں اس میں انھوں نے ہمارے مومن کامل ہونے کا اقرار کرلیا۔ والفضل ماشہدت بہ الاعداء وہ تو طعن کی نیت سے کہتے ہیں، مگر ہم اس لقب سے خوش ہیں۔

کیرانہ میں ایک طالب علم کو کسی نے کہا تھا کہ وہ آرہے ہیں مسجد کے بینڈھے تو اس نے خوب جواب دیا کہ پھر بھی دنیا کے کتوں سے تو افضل ہیں (الدنیا جیفۃ وطالبھا کلاب ۱۲) خبر بھی ہے یہ مسجد کے بینڈھے کیسے ہیں یہ ایسے بینڈھے ہیں کہ جب ان کو دین کی مستی سوجھتی ہے تو سارے عالم پر حکومت کرتے ہیں ؎

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں کہ ناز بر فلک وحکم بر ستارہ کنم

(گدائے میکدہ ہوں مگر وقت مستی مجھے دیکھو کہ آسمان پر ناز اور ستاروں پر حکمرانی کرتا ہوں)

اور فرماتے ہیں ؎

مبیں حقیر گدایانِ عشق راکیں قوم ۔۔۔ شہان بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

(گدایان عشق الٰہی کو حقیر مت جانو کہ یہ اللہ والے شہان بے کمر و خسروان بے کُلاہ ہوتے ہیں)

اور فرماتے ہیں ؎

بسفالیں کاسۂ رنداں بخواری منگرید ۔۔۔ کیں حریفاں خدمتِ جام جہاں بیں کردہ اند

(رندان بادۂ حقیقی کے کاسۂ سفالیں کو حقارت سے مت دیکھو کہ ان حضرات نے عاشقان حق کے میکدہ کی خدمت کی ہے۔ یعنی ان کی صحبت میں رہے ہیں")

اور یہ باتیں ہی باتیں نہیں بلکہ اہل اللہ نے کر کے دکھلا دیا ہے کہ ان کے سامنے سلاطین کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ ایک بار حضرت شاہ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس غالباً جہانگیر حاضر ہوئے۔ اس وقت شاہ صاحب اپنے حجرہ میں تھے اور باہر ایک خادم کو اپنی ایک گدڑی دے رکھی تھی کہ اس کی جوئیں دیکھ دے۔ خادم نے جو بادشاہ کی سواری دیکھی دوڑ کر حجرہ کی کنڈی ہلائی کہ حضرت جلدی کواڑ کھولئے۔ شاہ صاحب اٹھے اور کواڑ کھول کر پوچھا کیا ہے، کہا بادشاہ کی سواری آگئی۔ فرمایا لاحول ولا قوۃ الا باللہ تو عجیب مہمل ہے میں تو سمجھا کوئی بڑی سی جوں پائی ہوگی اس کے دکھلانے کو بلاتا ہے۔ یہ کہہ کر پھر اپنی جگہ جا بیٹھے۔ بادشاہ نے حاضری کی اجازت چاہی آپ نے اجازت دی مگر اس شان سے کہ پہلے تو پیر سکوڑ رکھے تھے، بادشاہ کے آتے ہی پیر پھیلا دیئے بادشاہ کے ساتھ ایک خشک مولوی بھی تھے ان کو یہ حرکت بہت ناگوار ہوئی کہ یہ درویش بڑے ہی بے تہذیب ہوتے ہیں ان کو کسی کا بھی کچھ ادب نہیں۔ پوچھا شاہ صاحب آپ نے پیر کیوں پھیلا دیئے۔ فرمایا جب سے ہاتھ سکوڑ لئے پاؤں پھیلا دیئے

سبحان اللہ کیا مسکت اور با معنے جواب تھا یعنی جو لوگ بادشاہوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں وہ ان کی تعظیم کے لئے پیر سمیٹ لیا کرتے ہیں مگر جس نے ہاتھ سمیٹ لئے ہوں اس کو پیر پھیلانے کا حق ہے۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے کہا کہ سلطانِ اسلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں آپ کے ذمہ ان کی تعظیم واجب تھی۔ فرمایا یہ تمہارے بادشاہوں کے تم تعظیم کرو۔ میرے تو غلامانِ غلام ہیں اس پر تو مولوی صاحب جھلا ہی اٹھے پوچھا یہ آپ کے غلامانِ غلام کدھر سے ہیں فرمایا کہ یہ ہوا و ہوس کے غلام ہیں اور ہوا و ہوس میرے غلام ہیں تو یہ میرے غلامانِ غلام ہوئے آپ نے دیکھا کہ یہ مسجد کے پینڈھے کیسے ہوتے ہیں۔ یہ خلق سے ایسے مستغنی ہوتے ہیں کہ بادشاہوں کو بھی منہ نہیں لگاتے وہ اپنی اسی کھال میں مست ہیں آخر کیوں نہ ہوں وہ ہیں کس کے دیوانے ؎

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم ؛ مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(ہم اگرچہ تہیدست اور دیوانہ ہیں مگر اس ساقی ازل کے اور اس کے پیمانہ کے مست ہیں)

اور جو کوئی ان کو طعن کی نیت سے دیوانہ کہتے ہے وہ اس کے جواب میں یوں کہتے ہیں ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد ؛ مرعسس را دید در خانہ نشد

(وہی دیوانہ ہے جو ان کا دیوانہ نہیں ہے کوتوال کو دیکھا اور گھر کے اندر نہ بھاگا تو یہ خود نادانی ہے)

بخدا اس دیوانگی پر ہزاروں عقلیں قربان ہیں اسی تجربہ کو مولانا فرماتے ہیں ؎

آزمودم عقل دور اندیش را ؛ بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(عقل دور اندیش کو ہم نے بہت آزمایا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے کو دیوانہ بنا لیا)

ایک اور بزرگ کی حکایت ہے کہ ان کی خدمت میں ایک بادشاہ حاضر ہوا جب وہ خانقاہ کے دروازہ پر پہونچا اور اندر جانے کا ارادہ کیا فوراً نقیب نے

ٹوکا کہ بلا اجازت اندر جانے کی ممانعت ہے تم یہاں ہی ٹھہرو میں شیخ سے اجازت لے کر آؤں تب جانا۔ بادشاہ جھلا ہی تو گیا مگر شیخ کے خیال سے خاموش رہا کیونکہ معتقد بن کر حاضر ہوا تھا یہ بزرگوں کے خدام بھی بڑے دلیر ہوتے ہیں یہ اپنے شیخ کے حکم کے سامنے نہ کسی رئیس کی پرواکرتے ہیں نہ بادشاہ کی چنانچہ نقیب نے شیخ کو بادشاہ کے آنے کی اطلاع دی انھوں نے اندر آنے کی اجازت دیدی تب بادشاہ صاحب اندر پہونچے جھلایا ہوا تو تھا ہی جاتے فوراً یہ مصرع پڑھا ؎ درِ درویش را دربان نہ باید ٭

(درویش کے دروازے پر دربان نہ چاہیئے۔)

کیونکہ دربان تو بادشاہوں کے یہاں ہوا کرتے ہیں فقیروں کو اس سے کیا واسطہ تو بزرگ نے برجستہ جواب دیا ؎

بباید تا سگِ دنیا نیاید ٭ (چاہیئے تاکہ دنیا کے کُتّے نہ آئیں)

یعنی یہ دربان آدمیوں کی روک ٹوک کے لئے نہیں ہے بلکہ کتوں کو رد کنے کے لئے ہے اور شانِ درویشی کے خلاف دربان بمعنی اول ہے نہ بمعنی ثانی بادشاہ نے اعتراض کرکے کیسی منہ کی کھائی۔ آخر اہل اللہ کس سے ڈریں اور کیوں ڈریں بس وہ تو ایک سے ڈرتے ہیں اس کے سوا کسی سے ڈرنے کی ان کو ضرورت نہیں آخر لوگ ان کا کیا کرلیں گے بیش بریں نیست کہ مار ڈالیں گے سو یہ تو ان کا عین مقصود ہے وہ تو اس دن خوشیاں منائیں گے جس دن روح بدن سے مفارقت کریگی ان کی تو یہ حالت ہے کہ غلبہ شوق لقا میں موت کی تمنا کیا کرتے ہیں۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

خرّم آں روز کزیں منزلِ ویراں بروم ٭ راحتِ جاں طلبم وزپئے جاناں بروم

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے　　تا در میکدہ شاداں دغزل خواں بروم

(میں بہت خوش ہوں گا جس دن اس منزل ویراں یعنی دنیا سے میں رخصت ہوں گا اور حق تعالیٰ کی لقاء سے اپنی جان کی راحت پالوں گا۔　میں نے نذر کیا ہے کہ اگر کسی دن محبوب حقیقی کا غم مجھے مل گیا تو کسی اللہ والے کے پاس شاداں دغزلخواں جا پڑوں گا)

یہ نری شاعری نہیں بلکہ سچا حال ہے واقعی سالک کو سچ مچ موت کی تمنا ہی ہوتی ہے اور یہ تمنا خلاف شرع نہیں تمنائے موت وہ ممنوع ہے جو کسی دنیوی تکلیف کی وجہ سے ہو چنانچہ حدیث میں لضر نزل بہ کی قید موجود ہے باقی اشتیاق لقاء میں تمنائے موت ہونا یہ تو ولایت خداوندی کی دلیل ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں قل یاایھا الذین ھادواان زعمتم انکم اولیاء للہ من دون الناس فتمنوا الموت ان کنتم صادقین ہ دعوے ولایت پر تمنائے موت کا مطالبہ فرماتے ہیں جس سے صاف معلوم ہوا کہ حصول ولایت کے لئے تمنائے موت لازم ہے۔ تو جو چیز لوگوں کے نزدیک سب سے بڑی کلفت ہے عارف کے نزدیک وہ محبوب ہے تو پھر کسی سے کیوں ڈرے نیز عارف کو یقین ہوتا ہے کہ مخلوق مجھ کو نفع یا ضرر کچھ نہیں دے سکتی جو کچھ ہوگا خدا کے حکم سے ہوگا اس لئے اس کو نہ کسی سے طمع ہوتی ہے نہ خوف۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

موحد چہ بر پائے ریزی زرش　٭　چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نہ باشد زکس　٭　ہمیں است بنیاد توحید و بس

(لہ جس کو توحید کی دولت ملتی ہے اس کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کے پاؤں پر اگر سونے کا تم نے ڈھیر ڈالدیا اس کے سر پر تلوار ہندی رکھ دو تو نہ تو پہلے شخص سے اس کو امید و طمع ہوگی اور نہ دوسرے شخص سے کوئی خوف ہوگا)

جب توحید کامل ہو جاتی ہے تو یہی حال ہوتا ہے کہ موحد خدا کے سوا کسی کو

نافع ضار نہیں سمجھتا اس لئے مخلوق سے بالکل بے فکر ہو جاتا ہے پھر یہ لوگ عوام سے تو کیا ڈرتے بادشاہوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے پھر افسوس ہے کہ لوگ ان سے اپنی رائیوں میں موافقت چاہتے ہیں اور دباؤ ڈال کر ان کو اپنا تابع بنانا چاہتے ہیں۔ ایں خیال ست و محال ست و جنوں۔ شاید کسی کو یہاں پر یہ شبہ ہو کہ بعض دفعہ بزرگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ اپنی جان کی بہت زیادہ حفاظت کرتے ہیں دماغ میں تیل لگاتے ہیں تاکہ ضعف نہ ہو جائے۔ مضرات سے پرہیز کرتے ہیں تاکہ بیمار نہ ہو جائیں، خطرات سے بچتے ہیں تاکہ کہیں جیل خانہ میں نہ پہنچ جائیں خاردار طریق میں نہیں چلتے کہ کہیں کانٹا نہ لگ جائے اس سے شبہ ہوتا ہے کہ وہ خطرات سے ڈرتے ہیں حالانکہ یہ ابھی کہا تھا کہ ان کو بجز خدا کے کسی کا خوف نہیں ہوتا تو بات یہ ہے کہ ؎

در نیابد حال پختہ ہیچ خام ٭ پس سخن کوتاہ باید والسلام

(کوئی خام شخص پختہ کار کے مقام کو نہیں سمجھ سکتا پس بات مختصر کرتا ہوں اور سلام کہتا ہوں)

کامل کے حال کا اندازہ عوام کو نہیں ہو سکتا وہ اس کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں اور اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ ؎

ہر کسے از ظن خود شد یار من ٭ وز درون من نجست اسرار من

(ہر شخص اپنے گمان و قیاس کے مطابق میرا یار ہوا لیکن میرے اندرونی اسرار کو کوئی شخص تلاش نہیں کرتا)

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ جان میں دو حیثیتیں ہیں ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ اپنی جان ہے اس لحاظ سے وہ ان کو عزیز نہیں (کیونکہ وہ کسی چیز کو اپنی سمجھتے ہی نہیں ۱۲)

دوسری یہ حیثیت ہے کہ یہ سرکار کی دی ہوئی مشین ہے اس لحاظ سے وہ عزیز و محبوب ہے۔ کیونکہ سرکاری چیز ہے جو ہم کو امانت کے طور پر دی گئی ہے اور اس کی حفاظت کا حکم کیا گیا ہے اور اسی لحاظ سے عارف کبھی اپنی مدح بھی کیا کرتا ہے۔ ناواقف یہ سمجھتے ہیں کہ اپنی مدح کر رہا ہے مگر حقیقت میں وہ خدا کی چیز کی مدح کر رہا ہے جو خدا ہی کی مدح ہے۔ چنانچہ حضرت غوث اعظمؒ فرماتے ہیں ؎

شکر للہ کہ نمردیم و رسیدیم بدوست ✽ آفریں باد بریں ہمّت مردانۂ ما

دیکھئے اپنی ہمت کی تعریف ہو رہی ہے کہ خدا کا شکر ہے ہم محبوب تک پہونچ گئے اور وصال سے پہلے نہیں مرے ہماری اس ہمّت مردانہ پر آفریں ہے مگر حقیقت میں خدا کی نعمت پر آفریں ہو رہی ہے کہ اس نے ہم کو ایسی ہمّت دی اس لحاظ سے وہ ہماری چیز تھوڑا ہی ہے بلکہ سرکاری عطا ہے اسی طرح ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است ✽ اُفتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را ✽ کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

لہ (میں اپنی آنکھوں پر ناز کرتا ہوں کہ انھوں نے تیرا جمال دیکھا ہے اور میں اپنے پاؤں کو بوسہ دیتا ہوں کہ یہ تیری گلی میں پہونچے ہیں۔ ۲ہ ہر دم ہزار بوسہ اپنے ہاتھوں کو دیتا ہوں کہ انھوں نے تیرے دامن کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا ہے)

چونکہ ان ہاتھ پیروں سے طاعات کی توفیق ہوئی اور وہ وصال محبوب کا ذریعہ بن گئیں اس لحاظ سے اپنے ہاتھوں کو بوسہ دیتے اور پیروں کو چومتے ہیں کہ شاباش تم نے بڑا کام کیا یہ بھی اصل میں عطائے محبوب کی مدح ہے مولوی فخر الحسن صاحب گنگوہی فرماتے تھے کہ وہ مکہ مکرمہ میں ایک بزرگ کی خدمت میں

حاضر تھے۔ معتقد لوگ ان کی تعریف کر رہے تھے اور وہ خوش ہو رہے تھے مولوی صاحب کے دل میں خطرہ ہوا کہ یہ کیسے بزرگ ہیں جو اپنی تعریف سے خوش ہو رہے ہیں بزرگ کو خطرہ پر اطلاع ہو گئی فرمایا کہ میری تعریف تھوڑا ہی ہو رہی ہے یہ تو میرے محبوب کی تعریف ہو رہی ہے کہ اس نے مجھے ایسا بنایا اور یہ کمالات عطا کئے ورنہ میں کیا اپنے باپ کے گھر سے یہ کمالات لایا تھا جو ان کو اپنے کمالات سمجھوں۔ البتہ صرف زاہد وہ اتنی نظر نہیں رکھتا اس لئے ان چیزوں کی قدر نہیں کرتا چنانچہ مثنوی میں مولانا نقل فرماتے ہیں [۹]

زاہدے را گفت یارے در عمل ؛ کم گری تا چشم را ناید خلل

(ایک زاہد سے کسی نے کہا کہ کم رویا کرتا کہ تیری آنکھیں خراب نہ ہوں)

گفت زاہد از دو بیروں نیست حال ؛ چشم بیند یا نہ بیند آں جمال

(کہا کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو آنکھیں جمال محبوب دیکھ لیں گی یا نہ دیکھیں گی)

گر[۱] بہ بیند نورِ حق را چہ غم است ؛ در وصال حق دو دیدہ کے کم است

وَر[۲] نہ بیند نورِ حق را گو برو ؛ ایں چنیں چشم شقی گو کور شو

(۱ اگر جمال حق کو دیکھ لیا تو کیا غم ہے اللہ تعالیٰ کی وصال کی لذت کے مقابلہ میں دو آنکھیں کیا ہیں

(۲ اور اگر ان آنکھوں نے جمال محبوب نہ دیکھا تو ایسی آنکھوں کو جو منحوس ہیں نہ ہونا ہی بہتر ہے)

تو زاہد کی نظر اس پر ہوتی ہے کہ وہ میری نظر ہے اور اگر کوئی عارف ہوتا تو اس کی نظر اس پر ہوتی کہ ہمارے گھر کی کونسی چیز ہے ؎

نیاوردم از خانہ چیزے نخست ؛ تو دادی ہمہ چیز و من چیز تست

(میں اپنے گھر سے کوئی چیز نہیں لایا ہوں جو چیز ہمارے پاس ہے سب آپ کی عطا ہے اور میں خود بھی آپ ہی کا ہوں)

وہ اگر روتا بھی تو حدود کے اندر روتا جیسے سرکاری چیز کا استعمال حد کے اندر کیا جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سید العاشقین ہیں مگر آنکھوں کی آپ اتنی خاطر فرماتے تھے کہ کان یکتحل ثلثا فی ھذہ و ثلثا فی ھذہ یعنی سرمہ کی تین سلائی ایک آنکھ

یں لگاتے اور تین سلائی دوسری یں۔ اسی طرح آپ سے کبھی یہ ثابت نہیں کہ رات بھر جاگے ہوں اور امت کے لئے ارشاد فرماتے ہیں۔
ان لنفسك عليك حقا وان لعينك عليك حقا الحديث کہ تمہاری جان کا بھی تم پر کچھ حق ہے اور تمہاری آنکھ کا بھی تم پر کچھ حق ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ یہ چیزیں ہماری نہیں ہیں ورنہ ہم کو ان میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار ہوتا بلکہ سرکاری چیزیں ہیں جن کے کچھ حقوق سرکار نے مقرر فرمادیئے ہیں جن کی رعایت ہمارے ذمہ ضروری ہے۔ اس لئے عارف اپنی جان میں خلافِ حکم کوئی تصرف نہیں کرتا یہ راز ہے اس کا کہ عارف کسی وقت تو جان کی ذرا پروا نہیں کرتا اور کسی وقت بہت حفاظت کرتا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ جہاں حکمِ شریعت ہوتا ہے وہاں تو وہ جان کی پروا نہیں کرتا اور جہاں حکم نہیں ہوتا یا ممانعت ہوتی ہے وہاں جان کی حفاظت کرتا ہے کیونکہ شریعت نے بعض وقت جان کو خطرہ میں ڈالنے سے منع بھی فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے لاتلقوا بايديكم الى التهلكة جس سے فقہاء نے یہ مستنبط فرمایا ہے کہ جس جگہ امید نفع موہوم اور ضرر کا یقین یا غلبہ ظن ہو وہاں جان کو ڈالنا القار نفس فی الہلاکت ہے جو شرعاً ممنوع ہے۔ نیز حدیث مرفوع میں ہے جس کو ترمذی نے روایت کیا ہے لا ينبغي للمؤمن ان يذل نفسه قالوا يا رسول الله وكيف يذل نفسه قال يتحمل من البلاء لما لا يطيقه اھ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمان کے لئے اپنے نفس کو ذلیل کرنا مناسب نہیں۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مسلمان اپنے کو خود ذلیل کیسے کرتا ہے فرمایا کہ ایسی بلاء اپنے سر دھر لے جس کے تحمل کی اس میں طاقت نہیں۔ سبحان اللہ! کیا عجیب تعلیم ہے کہ کام اتنا ہی اپنے

ذمہ لو جس کو کر سکو خوامخواہ ڈینگیں نہ مارو اور اپنی چادر سے باہر پیر نہ نکالو کہ اس کا انجام بجز ذلت کے کچھ نہیں۔ دشمنوں کو ہنسنے کا موقعہ ملتا ہے کہ بس کچھ ہو تو نہ سکا بڑے دعوے کرتے تھے کہ ایک سال میں یہ ہو جائیگا واللہ مسلمان کے لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں ساری سیاست موجود ہے مگر کوئی قدر دان بھی ہو دیکھ لیجئے اسی ارشاد کی مخالفت کر کے مسلمانوں کی آجکل کیا حالت ہو رہی ہے کہ دشمن بھی ان پر ہنستے ہیں تو عاقل ایسے موقعہ پر ضرور اپنی جان و آبرو کی حفاظت کرے گا کہ جہاں شریعت نے جان کو خطرہ میں ڈالنے اور اپنے کو ذلیل کرنے سے منع فرمایا ہو خوب سمجھ لو یہ ساری گفتگو اس پر چلی تھی کہ لوگ ملانوں کو مسجد کے مینڈھے کہتے ہیں میں نے کہا تھا کہ یہ لقب تو ہمارے لئے باعث فخر ہے ہم اس سے برا نہیں مانتے کیونکہ اس میں ہمارے لئے ایک اقراری فضیلت ہے پھر میں کہتا ہوں کہ یہ مسجد کے مینڈھے تم سے ظاہری مسکین میں بھی اچھے ہیں کیونکہ مسجد خدا کا گھر تو ہے ہی اس لئے برکات میں تو دوسرے مساکن سے احسن ہی ہے لیکن وہ ظاہری شان و شوکت میں بھی تمہارے اکثر گھروں سے افضل ہے عمارت بھی چونہ گچ کی ہے ہر روز اس کی صفائی ہوتی رہتی ہے جھاڑ دی جاتی ہے اور ہر سال ایک مرتبہ پوتا پھیرا جاتا ہے پھر بعض مسجدوں میں مینارا ور گنبد بھی ہوتے ہیں جیسے بادشاہ کا قلعہ ہو پھر بادشاہوں کے قلعہ میں تو گھوڑوں بیلوں۔ خچروں کے پیشاب پاخانہ کی بدبو بھی ہوتی ہے۔ مسجد اس سے بھی پاک ہے اور زیادہ فضائل بیان کرنے کو جی بھی نہیں چاہتا کیونکہ ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی ؛ بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(مدعی سے اسرار عشق و مستی مت کہو اس متکبر خود بیں کو خود پرستی کے رنج میں مرنے دو)

کہیں یہ فضائل معلوم کرکے تم بھی مسجد ہی میں نہ آپڑو پھر ہماری راحت میں خلل پڑے ۔ پس تم اپنے محلوں ہی میں خوش رہو اور ہمیں مسجدوں ہی میں رہنے دو۔ غرض جب لوگوں کو مسجد سے اتنا توحش ہے تو معتکف تو اکثر ٹواں ٹوں ہی بیٹھا رہے گا (یعنی اکیلا رہے گا ۱۲) اس کی تنہائی میں خلل کون ڈالے گا تو لامحالہ اعتکاف میں قلت اختلاط مع الانام ہو جائے گا یہ روح ہے اعتکاف کی. یہ مضمون میرے ذہن میں ابھی یعنی دو چار روز ہوئے آیا تھا اس سے پہلے اس طرف کبھی ذہن نہیں گیا یہ نعمت حق تعالیٰ نے ابھی عطا فرمائی ہے میں نے جب بیان کا ارادہ کیا تو اول احیاء العلوم بھی دیکھی تھی مگر اس میں امام نے رمضان کے آداب و احکام و اسرار اقویاء کے مناسب لکھے ہیں اس میں اکثر مجاہدات اسی زمانہ متقدمین کے مناسب ہیں۔ اس زمانہ متاخرین کے موافق نہیں اصول تو اب بھی وہی ہیں جو پہلے تھے اصول کبھی نہیں بدلا کرتے مگر طریق معالجہ تبدل زمان سے بدل جاتے ہیں اطباء اس کو جانتے ہیں کہ طب یونانی کے اصول تو اب بھی بحالہا ہیں مگر طرق علاج میں زمانہ کے تبدل سے تغیر ہو جاتا ہے۔ تو تعلیمیافتہ طبقہ اس میں غلطی کرتا ہے وہ اصول کو بھی تبدل زمان سے بدلنا چاہتے ہیں اور اصول کو طرق پر قیاس کرتے ہیں کہ جیسے طرق مجاہدہ پہلے اور تھے اور اب اور ہیں اسی طرح علماء کو مسائل شرع میں ضرورت وقت کا لحاظ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں مگر یہ قیاس مع الفارق ہے۔ کیونکہ اصول کلی ہوتے ہیں اور کلیات اس تغیر سے محفوظ ہیں اور طرق جزئی ہوتے ہیں اور جزئیات میں یہ تغیر ہو سکتا ہے۔ غرض اس وجہ سے احیاء العلوم کے مضامین سے دلچسپی نہ ہوئی اور نہ بیان کے وقت اس کے مضامین کچھ یاد آئے کیونکہ وہ آجکل کے مناسب نہ تھے اور اسی لئے میں اپنے احباب کو ان کتابوں کے

دیکھنے سے منع بھی کیا کرتا ہوں کہ خواہ مخواہ دیکھ کر عمل کی ہوس ہوگی اور اس کے موافق عمل کی ہمت آجکل کے طبائع میں ہے نہیں تو اس سے بجز پریشانی بڑھنے کے اور کچھ نفع نہ ہوگا۔ سو میں ان کتابوں کے مطالعہ سے اس لئے نہیں روکتا کہ وہ قابل مطالعہ نہیں بلکہ اس لئے روکتا ہوں کہ ہم ان کے مطالعہ کے قابل نہیں۔ بہرحال یہ مضمون جو میں نے بیان کیا ہے کتابی مضمون نہیں میری نظر سے آج تک کسی کتاب میں نہیں گذرا اور نہ میرے ذہن میں اس سے پہلے کبھی آیا پس یہ مضمون نو وارد ہے کہ حق تعالٰے کی طرف سے نیا آیا ہوا ہے اشارۃ الی الحدیث انہ حدیث عہد بربہ ۱۲ جامع) اس کی قدر کرنا چاہیئے گو یہ مسالہ سے خالی ہے جوشیلا نہیں ہے مگر وہی مضمون ہے اور بات یہ ہے کہ حقائق صحیحہ میں جوش خروش ہوا بھی نہیں کرتا وہ تو سادے اور پھیکے ہی ہوا کرتے ہیں جوشیلے مضامین زیادہ تر وہ ہوتے ہیں جن میں خارج سے نمک مرچ لگایا جائے۔ دیکھئے احادیث و قرآن کے۔ منہ ایہر، کیسے سادے ہوتے ہیں اور دیوان حافظ و مثنوی کے مضامین جوشیلے ہیں تو مقاصد میں جوش نہیں ہوا کرتا یہ تو مقدمات میں یا عوارض میں ہوا کرتا ہے اس لئے ان پر نظر نہ کرنا چاہیئے حقیقت پر نظر رکھنا چاہیئے۔ غرض حق تعالیٰ نے عبادات رمضان میں آپ کو ان چاروں مجاہدات کی روح سے کامیاب فرمانا چاہا ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک عبادت روزہ ہے جس کی حقیقت ہے ترک طعام و ترکِ شراب و ترکِ وقاع۔ (جماع)

لہ یعنی عوارض کے رنگ کا نہیں ہوتا گو دوسرے رنگ کا ہو جو اس سے بھی الذہ اقوی ہے جیسے چٹنی میں ایک خاص لذت ہے جو معجون صحت و قوت بخش میں نہیں لیکن اس صحت و قوت کے بعد جو طبیعت میں نشاط و فرح پیدا ہوگا وہ اس چٹنی میں کوسوں بھی نہیں ۱۲ منہ

صوفیہ نے ترکِ وقاع کو مجاہدہ میں اس لئے شمار نہیں کیا کہ ترکِ طعام و شراب اس کو مستلزم ہے چنانچہ تجربہ ہے کہ جو شخص کھانا کم کھائے گا اس کو شہوت وقاع کم ہوگی دوسرے مجاہدہ کا حاصل کسر قوت بہیمیہ ہے اور اس میں ترکِ وقاع کو دخل نہیں بلکہ برعکس وقاع کو اس میں دخل ہے کیونکہ قوت بہیمیہ جماع سے منکسر ہوتی ہے ترکِ جماع سے تو اس کو قوت ہوتی ہے لہذا ترکِ وقاع صوفیہ کا مبحوث عنہ نہیں ہاں اس کو قیام صحت جسم میں ضرور دخل ہے یعنی کثرت جماع صحت کے لئے مضر ہے اس لحاظ سے اطباء نے اس سے بحث کی ہے اور چونکہ کثرتِ جماع ایک عارض دین کے لئے بھی مضر ہے وہ عارض یہ کہ صحت کی خرابی سے بعض دفعہ دین کے کاموں میں بھی خلل آجاتا ہے اس جہت سے بزرگوں نے بھی ترکِ وقاع کی وصیت کی ہے چنانچہ ایک بزرگ کا ارشاد ہے ؎

احفظ منیك ان یصب فانہ ماء الحیاۃ یصب فی الارحام

(اپنی منی کی حفاظت کر یعنی کثرت جماع سے احتیاط رکھو کہ یہ آب حیات ہے جو ارحام میں ڈالا جاتا ہے)

شیخ شیرازی فرماتے ہیں ؎

بہ بے رغبتی شہوت انگیختن ؛ برغبت بود خون خود ریختن

(بے رغبتی کے باوجود جماع کرنے کے لئے بتکلف شہوت کو ابھارنا اپنے خون کو رائیگاں خرچ کرسکنے مترادف ہے)

مجھ سے ایک محقق صوفی نے کہا تھا کہ بی بی سے کم ملنا چاہیئے کیونکہ کثرت جماع سے حرارت غریزیہ کم ہوتی ہے اور سالک کو حرارت غریزیہ کی حفاظت ضروری ہے کیونکہ اس سے طبیعت کو انتعاش والتہاب ہوتا ہے جس سے عشق کی گرم بازاری ہوتی ہے مگر یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ ترکِ وقاع سے جو التہاب ہوتا ہے وہ نفسانی التہاب ہوتا ہے روحانی نہیں جس کی بابت

حدیث میں ہے جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ تفصیل اس کی یہ ہے کہ عشق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک عشق طبعی دوسری عشق عقلی اور مقصود اصلی عشق عقلی ہے عشق طبعی مقصود نہیں گو مقصود کے لئے مفید و معین ضرور ہے پس حرارت غریزیہ کے انتعاش سے عشق طبعی میں زیادتی ہوتی ہے عشق عقلی میں ترقی نہیں ہوتی بلکہ اس کی ترقی معرفت کے بڑھنے سے ہوتی ہے چنانچہ بڑھاپے میں ہرچند کہ عارف کی حرارت غریزیہ کم ہو جاتی ہے مگر اس عشقِ عقلی میں کمی نہیں آتی بلکہ اس وقت چونکہ معرفت کامل ہوتی ہے اس لئے اس وقت جوانی سے بھی زیادہ عشق عقلی کامل ہوتا ہے اسی کو عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

ہرچند پیر وخستہ دل و بس ناتواں شدم ؛ ہرگہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

(ہرچند کہ پیر و کمزور ناتواں ہوں لیکن جب آپ کے چہرہ کو دیکھتا ہوں تو جوان ہو جاتا ہوں)

اور راز اس میں یہ ہے کہ عشق عقلی کا تعلق روح سے ہے اور عشق طبعی کا نفس سے اور بڑھاپے میں نفس تو کمزور ہو جاتا ہے مگر روح کمزور نہیں ہوتی بلکہ عارف کی روح بڑھاپے میں جوانی سے بھی زیادہ قوی ہو جاتی ہے کیونکہ قوتِ روح کا مدار معرفت پر ہے اور معرفت بڑھاپے میں کامل ہوتی ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

خود قوی تر میشود خمرِ کہن ؛ خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

(پرانی شراب قوی ہو جاتی ہے خاص کر وہ شراب یعنی روحانی کیف اور لذۃ طاعات جو من جانبِ اللہ عطا ہوتی ہے وہ بڑھاپے میں اور تیز ہو جاتی ہے)

شرابِ معرفت کا تو خاصہ یہ ہے کہ یہ جتنی پرانی ہوتی ہے اتنی ہی تیز ہوتی ہے۔ پس بڑھاپے میں طاعات کی روحانی لذت کم نہیں ہوئی بلکہ زیادہ

ہوتی ہے اور حدیث جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ میں بھی روحانی لذت مراد ہے نفسانی لذت مراد نہیں جس میں حرارت غریزہ کے انتعاش سے التہاب ہوتا ہے اور یہاں سے سالکین کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر کسی وقت طاعات و ذکر کی لذت کم ہو جائے تو پریشان نہ ہوں کیونکہ یہ وہ لذت نہیں ہے جس کی بابت مولانا کا ارشاد ہے ؎

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود ٭ گر ز باغِ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم ٹوٹ پڑتے ہیں اگر ان کے باغِ دل سے ایک خلال بھی کم ہو جائے)

مولانا کی مراد یہ ہے کہ اگر کسی وقت آثار قرب میں کچھ کمی ہو جاتی ہے تو سالک کے دل پر غم کا پہاڑ ٹوٹ جاتا ہے اور آثار قرب میں کمی معصیت یا غفلت سے ہوتی ہے۔ پس جو سالک معصیت اور غفلت میں مبتلا نہیں ہے اور پھر اس کو طاعات و ذکر میں لذت پہلے سے کم ہو جائے وہ بے فکر رہے کیونکہ یہ نفسانی لذت تھی جس کی کمی سے قرب میں کچھ کمی نہیں آتی اور نفسانی لذت کا قاعدہ یہ ہے کہ شروع میں جوش پر ہوتی ہے پھر مداومت ذکر سے جوش کم ہو جاتا ہے مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک ذاکر نے شکایت کی کہ حضرت اب ذکر میں پہلے جیسی لذت نہیں آتی فرمایا تم نے سُنا نہیں کہ پُرانی جورو اماں ہو جاتی ہے۔ سبحان اللہ کیا عجیب مثال دی۔ حاصل جواب کا وہی ہے کہ یہ لذت نفسانی ہے جس کا جوش کچھ دنوں رہا کرتا ہے جیسے بیوی کے ساتھ جوش محبت چند روز رہتا ہے اور سال دو سال گذرنے کے بعد وہ پہلا سا جوش نہیں رہتا البتہ اُنس پہلے سے زیادہ ہو جاتا ہو جاتا بلکہ جس بیوی کے ساتھ صحبت طویلہ رہی ہو اس کی محبت رگ رگ میں سرایت کر جاتی ہے۔ یہی حال ذکر کا ہے کہ زمانِ طویل کے بعد جوش تو کم

ہو جاتا ہے مگر اُنس بڑھ جاتا ہے۔ اور پُرانی جو رو کے امّاں ہو جانے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ ہندوستان میں ایک کابلی رئیس تھے جن کے لئے حکومت کی طرف سے کچھ جاگیر و معافی تھی اور حکام میں ان کی بہت وقعت تھی۔ بڑھاپے میں ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا تو حاکم ضلع تعزیت کے لئے آیا اور کہا آغا صاحب ہم کو آپ کی بی بی کے انتقال کا بہت صدمہ ہے تو وہ رونے لگے اور کہا کلکٹر صاحب وہ ہمارا بی بی نہ تھا اماں تھا ہم کو روٹی کھلاتا تھا بدن دباتا تھا۔ واقعی بوڑھے کی بیوی تو اماں ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ کام کے دونوں نہیں رہتے بس وہ حال ہوتا ہے کہ لینے دینے کے منہ میں خاک محبت رکھیں پاک اب ان کا تعلق نفسانی غرض کے لئے نہیں ہوتا محض پاک محبت ہوتی ہے۔ تو سالک کو چاہیئے کہ ان نفسانی کیفیات کو مقصود نہ سمجھے بلکہ ذکر اور طاعات کو مقصود سمجھے ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب ؛ کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

(فراق اور وصل کیا چیز ہے رضائے دوست طلب کیجئے کہ اس محبوب حقیقی سے اس کے غیر کی طلب باعث حیف وافسوس ہے)

اور حصول و رضا کا ذریعہ طاعات و ذکر میں منحصر ہے بس ان پر دوام رکھے خواہ لذت ہو یا نہ ہو البتہ اگر کسی کو یہ کیفیات بھی حاصل ہو جائیں تو ان کی قدر کریں بلا وجہ ضائع نہ کرے۔ اور قدر کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جماع میں تقلیل کرے کہ اس کو ان نفسانی کیفیات کے بقا میں بڑا دخل ہے۔ کیونکہ احتباس مادۂ منویہ سے انتعاش والتہاب ہوتا ہے جو سبب ہوتا ہے نشاط و سرور کا جس سے طاعات میں لذت آتی ہے اور لذت سے دوام طاعات

کی امید ہے اس طرح بالواسطہ ترک وقاع بھی سلوک میں مفید ہوتا ہے تو صوفیہ نے اس کو مجاہدات میں تو داخل نہیں کیا لیکن اس واسطہ پر نظر کر کے اس کی وصیت کی ہے۔ بہرحال اس تقریر سے اشکال مذکور کا جواب نکل آیا۔ غرض روزہ کی روح تقلیل طعام ہے اب سمجھو کہ قلت طعام کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ کھانا کھاؤ اور کم کھاؤ مثلاً جس کی غذا آدھ سیر ہے وہ پاؤ بھر کھائے جس کی پاؤ بھر ہے وہ آدھ پاؤ کھائے۔ اکثر صوفیہ کی نظر تو یہیں تک رہی اور ان کو ان احادیث سے تائید مل گئی جن میں جوع کی فضیلت اور شبع کی مذمت ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے اکثرھم شبعا فی الدنیا اطولھم جوعا یوم القیمۃ یعنی جو دنیا میں زیادہ پیٹ بھرے گا وہ قیامت کے دن زیادہ بھوکا رہے گا۔ اس قسم کی احادیث سے ان حضرات نے جوع کی فضیلت اور شبع کی مذمت مستنبط کر کے یہ فرمایا کہ تقلیل طعام کے معنے یہ ہیں کہ پیٹ بھر کے کھانا نہ کھائے بلکہ بھوکا رہا کرے چنانچہ ان حضرات نے یہاں تک لکھا ہے کہ جو شخص رمضان میں افطار و سحر کے وقت پیٹ بھر کے کھانا کھاتا ہے اس نے حقیقت صوم و روح صوم کو باطل کر دیا زیادہ لوگ اسی طرف ہیں۔ لیکن شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ شارع علیہ السلام نے تقلیل طعام کو تجویز کیا ہی نہیں بلکہ شارع نے کھانے کے اوقات معتادہ کو بدل کر ان میں فصل زیادہ تجویز کیا ہے اور اس تبدل عادت و زیادت فصل سے جو نفس کو تکلیف ہوتی ہے اسی کو شریعت نے تقلیل طعام کے قائم مقام سمجھا ہے اھ۔ اور یہ دوسری صورت ہے تقلیل طعام کی پس کم کھانا اور بھوکا رہنا یہ شرعی مجاہدہ نہیں اور رمضان میں پیٹ بھر کے کھانا

روح صوم کو کچھ مضر نہیں میں نے شاہ صاحب سے پہلے کسی کا قول نہیں دیکھا اور یہ مضمون اولاً خود بخود میرے قلب پر وارد ہوا تھا اس وقت تک میں نے شاہ صاحب کا قول بھی نہیں دیکھا تھا اور میں نے توکلا علی اللہ ایک وعظ میں اس کو بیان بھی کر دیا تھا بعد میں شاہ صاحب کے قول سے تائید ملی تو میں بہت خوش ہوا کہ الحمد للہ میں اس قول میں متفرد نہیں ہوں بلکہ امت کا ایک بہت بڑا محقق میرے ساتھ ہے ممکن ہے کسی اور نے بھی اس کی تصریح کی ہو مگر میں نے شاہ صاحب سے پہلے کسی کے کلام میں یہ مضمون نہیں دیکھا اور میری نظر کتابوں پر زیادہ ہے بھی نہیں صرف درسیات پر تھوڑی بہت نظر ہے اور درسیات بھی میں نے اس طرح ختم کی ہیں کہ ایک کتاب جماعت نے ختم کر لی اور میں زیادہ غیر حاضر رہا تو جماعت کے ختم کرنے سے میرے حق میں بھی وہ کتاب ختم ہو گئی بہر حال میرے نزدیک تقلیل طعام کی صورت شریعت میں یہ نہیں ہے کہ کھانا سامنے رکھا ہوا اور تم پیٹ بھر کے نہ کھاؤ بلکہ اس کی صورت صرف یہ ہے کہ اوقات طعام میں فصل کر دو جیسا کہ روزہ میں ہوتا ہے پھر افطار و سحر میں پیٹ بھر کے کھالو تو اس کا کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ تجربہ ہے کہ سحر میں پیٹ بھر کے کھا لینے سے بھی دوپہر کو اپنے وقت پر بھوک کا تقاضا ضرور ہوتا ہے اور روزہ کی وجہ سے جب نہیں کھا سکتے تو نفس کو کلفت ہوتی ہے بس یہی شرعی مجاہدہ ہے لیکن میں اس میں اپنے نفس کو متہم سمجھتا ہوں دوسرے علماء بھی اس میں غور کر لیں لیکن وہ ایسے نہ ہوں جو کھانے کے طالب ہوں اور اگر سب ایسے ہی ہوئے تو وہی مثال ہو گی کہ امام بھی ننگا اور مقتدی بھی ننگے مگر دوسرا ان کی اقتدا نہیں کر سکتا۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے سوال کیا تھا کہ حضرت ان لوگوں کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے جن کی بی بیاں باہر پھرتی ہیں فرمایا تمہاری

بیبیاں بھی نامحرموں کے سامنے آتی ہیں پھوپھی زاد، ماموں زاد، خالہ زاد بھائیوں سے پردہ نہیں کرتیں۔ دیور جیٹھ کے سامنے آتی ہیں تو امام بھی ننگا مقتدی بھی ننگے اور جب سب ننگے ہوں تو نماز درست ہے اس لئے سب کی نماز صحیح ہے پس تقلیل طعام جو مجاہدہ کے ارکان اربعہ میں سے ایک رکن ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ سالک روزے زیادہ رکھا کرے یہ معنی نہیں کہ روزہ رکھ کر یا بغیر روزہ ہی کے بھوکا رہا کرے اور یہ تفسیر اس لئے راجح ہے کہ شریعت نے اسی کو مشروع کیا ہے دوسری صورت کا وجود شریعت میں نہیں نیز یہ اس لئے بھی راجح ہے کہ اس میں راحت ہے دن بھر روزہ رکھ کر جب افطار میں پیٹ بھر کے کھائے گا تو نفس اور جسم کو راحت حاصل ہوگی اور اگر افطار میں بھی بھوکا رہا تو کیا خاک راحت ملے گی۔ اور جب مجاہدہ بھی سہل نہ ہوا تو مقصود کیونکر حاصل ہوگا کیونکہ نظریات کی انتہا تو بدیہیات پر ہوتی ہے اگر بدیہیات بھی نظری ہو جائیں تو نتیجہ کیسے برآمد ہوگا اس لئے ضروری ہے کہ مجاہدہ دشوار نہ ہو بلکہ سہل ہو ورنہ طاعات کی سہولت کے لئے تو مجاہدہ اختیار کیا تھا اور مجاہدہ بھی دشوار ہوا تو اب اس کی سہولت کے لئے کوئی اور مجاہدہ تجویز ہونا چاہیئے اس طرح تو سلسلہ غیر متناہی چلے گا۔ تیسرے یہ کہ امام غزالی نے روزہ میں ایک حکمت یہ بیان کی ہے کہ اس میں تشبہ بالملائکہ ہے جیسے ملائکہ کھانا نہیں کھاتے پانی نہیں پیتے اسی طرح روزہ دار ہوتا ہے میں کہتا ہوں اس سے بھی میرے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے کیونکہ جیسے ملائکہ میں احتیاج طعام نہیں ہے، اسی طرح ان میں سوزش جوع بھی نہیں ہے پس جو شخص روزہ رکھ کر افطار وسحر میں تقلیل طعام کر کے بھوکا رہے وہ ملائکہ کے زیادہ مشابہ نہیں ہوا کیونکہ گو وہ کھانے سے رکا ہوا ہے مگر سوزش جوع میں مبتلا ہے بلکہ ملائکہ کے

مشابہ وہ شخص ہے جو سحر و افطار میں اچھی طرح مگر اعتدال کے ساتھ کھانا کھاتا ہے اس میں روزہ کے وقت نہ سوزش جوع زیادہ ہوگی نہ کسل طعام چوتھے یہ کہ صعوبت کا برداشت کرنا بامید سہولت آسان ہے اور اگر صعوبت کے بعد بھی صعوبت ہی رہی تو برداشت مشکل ہے اور سہولت ایک اخروی ہے ایک دنیوی اور ظاہر ہے کہ صعوبت عاجلہ کے بعد علاوہ سہولت آجلہ کے سہولت عاجلہ بھی کچھ ہونی چاہیئے کیونکہ عام طبائع صرف سہولتِ آجلہ کے بھروسے صعوبت عاجلہ کو برداشت نہیں کرسکتیں اور سہولت عاجلہ اسی صورت میں ہے کہ روزہ کے بعد پیٹ بھر کر کھالے کی اجازت دی جائے ورنہ جب تم ہمیشہ بھوکے ہی اٹھو گے تو سہولت کیا خاک ہوئی اس طرح سے صعوبت کا تحمل دشوار ہوجاوے گا. پانچویں یہ کہ اس صورت میں مجاہدہ ادوم ہے. جو شخص روزہ رکھ کر اچھی طرح کھائے پیئے گا وہ تقلیل غذا کا عادی نہ ہوگا اور جو بھوکا رہ رہ کر تقلیل طعام کرے گا وہ چند دن میں اس کا عادی ہوجائیگا پھر وہ زیادہ کھانا بھی چاہے تو نہ کھاسکے گا اب یہ تقلیل مجاہدہ نہ رہے گی اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روز روز کے روزہ سے منع فرمایا ہے۔ اول تو آپ نے مہینہ میں تین روزے تجویز فرمائے ہیں (ایام بیض کے) اور جس کو اس سے زیادہ ہمّت ہو تو اس کے لئے ہفتہ میں دو دن تجویز فرمائے ہیں کہ ہر پیر۔ جمعرات کو روزہ رکھا کرے کیونکہ ان دنوں میں مخلوق کے اعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوتے ہیں اگر کوئی اس سے بھی زیادہ ہمت رکھتا ہو تو اس کے لئے ارشاد ہے احب الصوم الی اللہ صوم داؤد کان یصوم یوما ویفطر یوما کہ صوم داؤد اختیار کرے۔ یہ حق تعالیٰ کو بہت محبوب ہے جس کی صورت یہ ہے کہ ایک دن روزہ رکھے ایک دن افطار کرے اس طرح قیامت تک بھی روزہ کی عادت نہیں ہوسکتی ایک صحابی نے اس پر بھی زیادتی چاہی تھی وہ ہر دن روزہ رکھنا چاہتے

تھے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ بس صوم داؤد سے بہتر اور کوئی نہیں ہے اور ایک حدیث میں صوم دہر کی نسبت صاف تصریح ہے لاصام ولا افطر مطلب یہ کہ جو شخص سال بھر تک روزہ ہی رکھا کرے اس نے روزہ رکھا کیونکہ عادت ہونے سے غرض حاصل نہ ہوئی اور نہ افطار کیا یعنی ظاہراً اس میں صوم دہر سے منع فرما دیا اور خود بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی ثابت نہیں کہ آپ نے پورے سال بھر روزے رکھے ہوں اور راز اس میں یہ ہے کہ عادت صوم کے بعد اس کا نفع باقی نہیں رہتا اسی طرح صوفیہ لے جو صورت بیان کی ہے کہ غذا کم کرتا رہے اور اکثر اوقات بھوکا رہا کرے چند روز کے بعد معدہ اس کا عادی ہو جاتا ہے تو مجاہدہ کا نفع باقی نہیں رہتا بلکہ جسمانی امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے اس طریقہ کو اختیار کیا ان کی صحت عمر بھر کیلئے خراب ہوگئی بخلاف اس صورت کے کہ سال میں ایک مہینہ روزے رکھے اور زیادہ ہمت ہو تو رمضان کے علاوہ بھی ہر مہینہ میں تین چار دن روزہ رکھ لیا کرے اور افطار میں اچھی طرح کھا لیا کرے اس سے صحت پر کچھ اثر نہیں ہوتا بلکہ تندرستی قائم رہتی ہے اور روزہ بدن کے لئے تنقیہ کا کام دیتا ہے رہا یہ کہ پھر ان احادیث کا کیا مطلب ہے جن میں شبع کی مذمت اور جوع کی فضیلت ہے اس کا جواب یہ ہے کہ شبع کے دو درجے ہیں ایک طبعی اور ایک اس سے زیادہ یعنی ایک تو پیٹ بھرنا ہے یہ تو شبع طبعی ہے اور ایک پیٹ ٹھنسنا کہ بھوک دفع ہوگئی مگر نیت ہی نہیں بھرتی خوامخواہ پیٹ کو آنٹتا چلا جاتا ہے تو حدیث میں جس شبع کی مذمت ہے وہ وہ ہے جو شبع طبعی سے زیادہ[1] ہو جس سے بدہضمی اور ہیضہ ہو جائے جس کو بعض لوگ مبارک مرض سمجھتے ہیں جیسے ایک اعرابی کی حکایت ہے کہ ایک گاؤں میں ہیضہ ہوا تھا تو وہاں کے آدمی بھاگ بھاگ کر اس اعرابی کے گاؤں میں آرہے تھے یہاں قحط

---

[1] قلت ویؤیدہ قولہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثرہم شبعاً دلم لیقل من شبع منہم ۱۲ جامع

پڑ رہا تھا کہ لوگوں کو روٹی بھی میسر نہ تھی اعرابی نے پوچھا کہ تم لوگ کیوں بھاگے آرہے ہو کہا گاؤں میں ہیضہ پھیل رہا ہے۔ اعرابی نے کہا کہ ہیضہ کیا ہوتا ہے لوگوں نے بتلادیا کہ زیادہ کھانے سے بدہضمی ہوجاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ افسوس یہ مبارک مرض ہمکو کبھی نہ ہوا تو شریعت نے اس شبع سے منع فرمایا ہے جس سے یہ مبارک مرض پیدا ہو شبع طبعی سے منع نہیں فرمایا اور جوع کی جو فضیلت وارد ہے تو میرے نزدیک اس سے اختیاری جوع مراد نہیں بلکہ غیر اختیاری مراد ہے یعنے یہ اس بھوک کے فضائل نہیں ہیں جو باوجود غلہ گھر ہونے کے اختیار کی جائی بلکہ کسی شخص پر فاقہ آپڑے تنگدستی ہو تو اس کی تسلی کے لئے یہ فضائل بیان کردیئے گئے ہیں کہ مسلمان کو فاقہ میں پریشان نہ ہونا چاہیئے اس سے اس کو ثواب ملتا ہے۔ درجات میں ترقی ہوتی ہے اور یہ فضائل جوع میرے نزدیک ایسے ہی ہیں[له] جیسے احادیث میں بیماری کے فضائل اور اس پر ثواب بیان کیا گیا ہے یقیناً اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خود بیمار پڑجایا کرے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر اتفاقاً بیمار ہوجائے تو ان فضائل سے اس وقت تسلی کرلیا کرے اور اس کی تائید میرے پاس قرآن سے ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ولنبلونکم بشیٔ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات وبشر الصٰبرین ۝

یعنی ہم تم کو آزمائیں گے کسی قدر خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے اور صبر کرنے والوں کو بشارت دیجئے۔ اس میں حق تعالیٰ نے بندوں کو

له قلت ویؤید قول الشیخ ہذا ما ذکرہ مجدد عصرہ العلامۃ المحدث علی بن سلطان القاریؒ فی شرح الشمائل للترمذی ناقلا عن ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ بما نصہ ومن جہلۃ الصوفیۃ من یقلل المطعم واکل الدسم حتی ییبس بدنہ ویعذب نفسہ بلبس الصوف ویمتنع من الماء البارد وما ہذہ طریقۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا طریق صحابتہم واتباعہم وانما کانوا یجوعون اذا لم یجدوا شیأ فاذا وجدوا اکلوا وقد کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یاکل اللحم ویحبہ ویاکل الدجاج ویحب الحلواء ویستعذب لہ الماء البارد فان الماء الحار یوذی المعدۃ ولا یروی وکان رجل یقول لا آکل الخبیص لانی لا اقوم لشکرہ فقال الحسن البصری ہذا رجل احمق وہل یقوم بشکر الماء البارد وقد کان سفیان الثوری اذا سافر حمل معہ فی سفرتہ اللحم المشوی والفالوذج انتہی ومحلہ قولہ تعالیٰ قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق وقال تعالیٰ یاایہا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحا اھ (ص ۲۰۴ ج ۱) جامع

مطلع فرمایا ہے کہ تمہارے اوپر یہ مصائب نازل ہوں گے ان پر صبر کرنا تو اس آیت میں حق تعالیٰ نے جوع کو بھی مصائب میں شمار فرمایا ہے تو بس جوع کے فضائل ویسے ہی ہیں جیسے اور مصائب کے فضائل ہیں اور دیگر مصائب میں اتفاق ہے کہ ان سے غیر اختیاری مصائب مراد ہیں یہ مطلب نہیں کہ مصائب کو خود اپنے اوپر لادا کرے اسی طرح جوع سے مراد غیر اختیاری ہے ان فضائل کا یہ مطلب نہیں کہ اناج غلّہ گھر میں ہوتے ہوئے بھوکا رہا کرے رمضان میں افطار و سحر کے وقت پیٹ بھر کے کھانے میں یہ بھی راز ہے کہ بھوک کے بعد سیر ہو کر کھانے والا صابر بھی ہے اور شاکر بھی ہے[له] تو اس کی یہ حالت ہوتی ہے مرج البحرین یلتقیان دونوں دریا ملے چلے رہتے ہیں اور جو شخص بھوکا رہتا ہے وہ صرف صابر ہے شاکر نہیں۔ اور ایک راز یہ ہے کہ اچھی طرح کھانے والا اور عمدہ غذائیں کھانے والا نعمت الٰہی کا مشاہدہ زیادہ کرتا ہے جس سے حق تعالیٰ کے ساتھ محبت پیدا ہوتی ہے اور یہ نصف سلوک ہے پہلے زمانہ میں شاید خوف زیادہ قائد اعمال ہوتا ہو اس لئے تقلیل غذا سے نفع ہوتا ہوگا کیونکہ جوع میں ہر وقت استحضار ہے عقوبت کا لیکن آجکل تو محبت زیادہ قائد ہے اور وہ اچھی طرح کھانے پینے ہی سے بڑھتی ہے اس لئے ضرورت ہے شیخ کو محقق ہونے کی یہ نہیں کہ جو کتابوں میں لکھا ہو اسی کے موافق علاج کرنے لگے بلکہ اپنے زمانہ کی حالت سے بھی باخبر ہونا چاہیئے۔ بعض شیوخ کی عادت ہوتی ہے کہ سب طالبین کو ایک ہی

[له] قال السید ابو الحسن الشاذلی قدس سرہٗ الذی یشرب الماء البارد یحمد اللہ من وسط قلبہ اھ یعنے ومرتبۃ الشکر اتم من حالۃ الصبر فان الاول یورث المحبۃ نعم اذا لم یوجد فمقامہ الصبر اھ کذا فی شرح الشمائل للمجد القاری ص ۲۰۴ ج ۱ جامع ۔

مجاہدہ تعلیم کرتے ہیں اور ایک ہی ذکر بتلاتے ہیں چاہے کسی سے ہو سکے یا نہ ہوسکے۔ عارف شیرازی ایسے مشائخ کی شکایت فرماتے ہیں جو ضعفاء کی رعایت نہیں کرتے ؎

خستگاں راچو طلب باشد و قوت نبود ؛ گر تو بیداد کنی شرط مروت نبود

(کمزوروں کو اگر طلب ہے اور قوت رسائی منزل کی نہیں ہے تو اے راہبر اگر تو سختی راہ میں ان کو بتلاکرتا ہے تو یہ خلاف شفقت و مروت ہوگا)

مولانا فرماتے ہیں ؎

طفل را گر نان دہی بر جائے شیر ؛ طفل مسکیں را ازاں نان مردہ گیر

(تو بچہ کو اگر دودھ کے بجائے روٹی دے گا تو اس مسکین کمزور بچے کو تو روٹی سے مار ڈالے گا)

اور فرماتے ہیں ؎

چار پارا قدر طاقت بار نہ ؛ بر ضعیفاں قدر ہمت کار نہ

(جانور پر بقدر طاقت بوجھ رکھو اور کمزوروں پر ان کی ہمت کے اندازے سے بار رکھو)

ہمارے حاجی صاحب کے یہاں ہر شخص کے مناسب نسخے تجویز ہوتے تھے کسی کو خوف کے راستہ سے پہونچایا کسی کو محبت کے راستہ سے کسی کو کثرت ذکر تعلیم کیا کسی کو تلاوت و نوافل بتلائے جس کے جو مناسب ہوا بتلادیا اور اسی سے بحمداللہ کامیابی ہوتی تھی اور جو لوگ سب کو ایک لاٹھی ہانکتے ہیں وہ بڑا ظلم کرتے ہیں۔ بہرحال اچھی طرح کھانا پینا جالب محبت ہے اور بھوکا رہنا کہ وہ خود ایک عقوبت ہے سبب خوف ہے اور محبت بہ نسبت خوف کے زیادہ قائد اعمال ہے اور قائد الی الاعمال ہونے کے سبب ہی خوف میں مقصودیت ہے

اس میں بالذات مقصودیت نہیں اور اس قائد ہونے میں محبت اس سے اقوی ہے تو اس کے اسباب زیادہ مطلوب ہوں گے۔
یہاں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ خوف تو جزو ایمان ہے اس لحاظ سے وہ بالذات مقصود ہوا تو سمجھ لینا چاہیئے کہ خوف جو ایمان میں داخل ہے وہ خوف عقلی ہے بمعنی یحتمل ان یدخل النار یعنی یہ مضمون دل میں حاضر رہے کہ شاید ہم کو جہنم میں بھیج دیا جائے یہ بھی آدھا سلوک ہے رہا خوف طبعی وہ بالذات مقصود نہیں بلکہ وہ اس لئے مقصود ہے کہ اعمال کی طرف قائد ہے اور اس درجہ میں عشق اُس سے بڑھا ہوا ہے اس عشق سے زیادہ کوئی قائد نہیں کیونکہ ایک دم سے سب تعلقات مانعہ کو فنا کر دیتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق آں شعلہ است کہ چوں برفروخت ؛ ہرچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
(عشق وہ آگ ہے جو روشن ہونے کے بعد معشوق کے ماسوا کو جلا کر خاک کر دیتا ہے)
تیغ لا در قتل غیر حق براند ؛ درنگر آخر کہ بعد لا چہ ماند
(لا الہ کی تلوار سے غیر حق کو قتل کر اور پھر دیکھ کہ اس کے بعد کیا باقی رہتا ہے)
ماند الا اللہ باقی جملہ رفت ؛ مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت
(یعنی صرف الا اللہ باقی رہے گا اور باقی سب فنا ہو جاوے گا۔ مرحبا اے عشق کہ تو ہر غیر محبوب کو جلا دینے والا ہے۔)

ایک مقام پر دل کھول کر عشق کی مدح فرماتے ہیں ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما ؛ اے طبیب جملہ علتہائے ما
(اے عشق تو شاد رہ کہ بہت اچھی بیماری ہے کہ تو تمام بیماریوں کے لئے طبیب ہے۔)

اے دوائے نخوت و ناموس ما ✿ اے تو افلاطون و جالینوس ما

(اے عشق تو تکبر اور نخوت اور ناموس کی دوا ہے اور تو ہمارے لئے افلاطون اور جالینوس ہے)

واقعی عشق سے زیادہ تکبر و نخوت کو کوئی چیز نہیں نکالتی اور فرماتے ہیں ؎

عشق جان طور آمد عاشقا ✿ طور مست و خر موسیٰ صاعقا

(طور پہاڑ میں جب عشق آیا تو طور مست ہوگیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوکر گر پڑے تجلّی حق سے)

اور فرماتے ہیں ؎

جملہ معشوق است و عاشق پردۂ ✿ زندہ معشوق است و عاشق مردۂ

(ہر طرف محبوب حقیقی کے نشانات ہیں عاشق خود حجاب ہے اور محبوب تو زندہ ہے اور عاشق فانی اور مردہ ہے۔)

اب اس شعر میں چونکہ بات دور پہنچ گئی یعنی وحدۃ الوجود کا مسئلہ آگیا جو کہ عوام کے لئے مضر ہے اس لئے عشق کی تعریف ختم کرتے ہیں اور اس ختم کرنے میں اپنا عذر بیان کرتے ہیں ؎

سر پنہاں است اندر زیر و بم ✿ فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

(راز پوشیدہ ہے زیر و بم میں اگر میں راز ظاہر کردوں تو تمام عالم درہم برہم ہوجائے)

یہاں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ جو لوگ زیادہ کھاتے پیتے ہیں وہ زیادہ معاصی میں مبتلا ہیں خدا کے ساتھ محبت و عشق کا ان میں نام بھی نہیں اگر زیادہ کھانے پینے سے محبت الٰہی پیدا ہوا کرتی تو سب سے

زیادہ امراء و رؤسا کو خدا سے محبت ہوتی اور وہی زیادہ مطیع ہوتے مگر مشاہدہ اس کے خلاف ہے اس کا جواب یہ ہے کہ طبائع سلیمہ کا تو خاصہ یہی ہے کہ جتنا مشاہدہ نعم زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی منعم کی محبت میں گھلتا ہے اور اطاعت کی کوشش کرتا ہے ہاں اگر طبائع میں کجی ہے تو پھر اس میں مستی پیدا ہوگی جیسا کہ بعض امراء میں اس کا مشاہدہ ہے مگر محل کی عدم قابلیت سے اگر مؤثر کا اثر ظاہر نہ ہو تو یہ مؤثر کا قصور نہیں بلکہ محل کا قصور ہے۔ شیخ فرماتے ہیں ؎

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست ؛ در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

(بارش اپنی لطافت طبع کے لحاظ سے ایک ہی حقیقت رکھتی ہے مگر باغ میں اسی سے لالہ پوسن پیدا ہوتے ہیں اور زمین شور میں خس و خاشاک اور کانٹے اُگتے ہیں۔)

بارش کتنی پاکیزہ اور لطیف چیز ہے مگر قابلیت و عدم قابلیت محل کا یہ اثر ہے کہ بارش سے کہیں تو پھول پھلواری اور عمدہ عمدہ پھل پیدا ہوتے ہیں اور کہیں خس و خاشاک اور کانٹے اور خاردار درخت اُگتے ہیں تو کیا اس سے بارش کو کوئی مضر کہہ سکتا ہے ہرگز نہیں بس یہی حال انعامات کی بارش کا ہے اگر طبیعت میں سلامتی ہو تو آدمی ٹھنڈا پانی پیکر حیا سے زمین میں گڑ جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ مجھ گنہگار پر یہ انعام کہ مجھے ٹھنڈا پانی دیا برف دیا حالانکہ میں تو گناہوں کی وجہ سے اس قابل تھا کہ مجھے غارت کر دیا جاتا سو انعام کا اصل اثر تو یہی ہے ہاں کسی کی طبیعت ہی میں خباثت بھری ہو تو اس سے بحث نہیں اور ایسے خبیث النفس کو جب انعامات سے خدا کی طرف جذب حاصل نہ ہوا اسے بھوکے رہ کر کیا خاک تعلق پیدا ہوگا بلکہ انعامات کے ساتھ گو اس کی طاعات کی توفیق نہیں ہوئی اور معاصی میں مبتلا ہے مگر اس کا ایمان تو محفوظ رہتا ہے۔ اور اگر یہ شخص بھوکا رہے تو اس کے ایمان ہی زائل ہونے کا اندیشہ ہے چنانچہ کثرت سے واقعات اس کے شاہد ہیں بہر حال جن لوگوں میں زیادہ کھانے پینے کی وجہ سے معاصی کا ظہور دیکھا جاتا ہے وہاں بھی کھانا پینا فی الجملہ مفید ہو رہا ہے کہ ایمان ہی کی حفاظت ہو گئی چنانچہ آپ نے کھاتے پیتے رئیسوں کو مرتد ہوتے کم دیکھا ہوگا جو لوگ مرتد ہوتے ہیں وہ اکثر وہی لوگ ہیں جو بھوکے رہنے والے فاقہ زدہ تھے۔

پس آجکل یہ مجاہدہ مناسب نہیں کہ طالبوں کو بھوکا مارا جائے بلکہ مشاہدہ نعم کے ساتھ مجاہدہ کرانا چاہیئے اول ان کو حسی نعمتوں سے بھاؤ کھانے پینے کی اچھی طرح اجازت دو پھر وہ معنوی نعمتوں کی بھی قدر کریگا اور نعمتوں کے مشاہدہ سے جب اس میں محبت پیدا ہو جائے گی تو پھر وہ کسی مصیبت سے پریشان نہ ہوگا اور یوں کہے گا ؎

ناخوش تو خوش بود برجانِ من ؛ دل فدائے یار دل رنجانِ من

(اے محبوب آپ کی ناخوشی یعنی آپ کی طرف سے رنج بھی ہمارے لئے خوشی ہے کیونکہ یہ دل محبوب پر فدا ہے پس ان کی طرف سے ناخوشگوار حالات سے بھی راضی ہے)

لہذا روزہ رکھ کر افطار و سحر میں خوب کھاؤ اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ صاحب جب سحری میں خوب ٹھونس لیا تو روزہ میں مجاہدہ ہی کیا ہوا میں کہتا ہوں افسوس تم اپنے نفس کی حالت سے بھی غافل ہو صاحب نفس کو اپنی عادت کے بدلنے سے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ تجربہ ہے کہ سحری میں چاہے آپ کتنا ہی کھالیں مگر روزہ کی وجہ سے ضعف ضرور ہوتا ہے پہلے بھی یہ مضمون آچکا ہے خصوصاً رمضان کے اخیر حصہ میں ہر شخص کے چہرہ سے ضعف کے آثار مترشح ہوتے ہیں۔ غرض جو لوگ سحری میں اچھی طرح کھانے والے ہیں رمضان کا اثر ان پر بھی ضرور ہوتا ہے۔ اسی لئے شارع نے صوم کو مجاہدہ میں داخل کر لیا مگر یہ لطیف مجاہدہ ہے جو لطیف طبائع کے لئے موزوں ہے اور سخت طبیعت والوں کے لئے دوسرا مجاہدہ ہے۔ ان کے واسطے امام غزالی کی کتاب علاج ہے جس میں تاکید ہے تقلیل مقدار طعام کی لطیف اور کثیف طبیعت پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔

دیوبند کے ایک رئیس کے یہاں تقریب تھی جس میں عمدہ عمدہ کھانے پلاؤ زردہ فیرینی وغیرہ پکے تھے۔ اتفاق سے بیگار میں ان کی رعیت کے چمار آئے تھے ان کو بھی کھانا دلوا دیا گیا تو پلاؤ زردہ کو انھوں نے ناک منہ چڑھا کر کھایا کیونکہ وہ گنوار ان کھانوں کا پورا لطف کیا جانیں لیکن

جب فیرینی چکھی تو ان سے نہ رہا گیا آپس میں کہنے لگے کہ یہ تھوک سا کیے ہے (کیا ہے؟) بھلا وہ گڑ کے کھانے والے ان کو فیرنی کی لطیف شیرینی کیا محسوس ہوتی ان کے منہ کو وہ پھیکی ہی لگی اس لئے تھوک سے تشبیہ دی ایسے ہی جو لوگ سخت طبیعت رکھتے ہوں ان کیلئے واقعی مجاہدہ صوم کافی نہ ہوگا مگر آجکل ایسی سخت طبیعتیں کہاں ہیں آجکل تو سارے نازک ہی نازک ہیں۔ امام غزالی کی تحقیق اس زمانہ کے مناسب ہوگی اس وقت قویٰ مضبوط تھے آجکل کے مناسب نہیں کیونکہ مجاہدہ سے مقصود کسر قوت بہیمیہ ہے اور اب تو قوت بہیمیہ خود ہی ٹوٹی ہوئی ہے اس پر بھی مخلوق کو بھوکا رہنے کو تعلیم کرنا اس مثل کا مصداق ہوجائے گا کہ مرے کو مارے شاہ مدار۔ البتہ ان احادیث پر نظر کر کے جن میں کثرت شبع کی مذمت ہے اور محققین کے اقوال میں غور کر کے اتنی بات ضروری معلوم ہوتی ہے کہ شبع طبعی سے زیادہ نہ کھاوے اناڑی کی طرح بندوق نہ بھرے بعض لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ تراویح بیٹھ کر پڑھنا کیسا ہے میں اس کا جواب دیا کرتا ہوں کہ جس نے افطار میں ناک تک پانی بھرا ہوا اور گلے تک کھانا ٹھونسا ہو اُسے ناجائز ہے کیونکہ وہ اپنے ہاتھوں معذور بنا اور جس نے عادت کے موافق پیٹ بھر کے کھایا ہو اُسے جائز ہے۔ کیونکہ وہ واقعی معذور ہے۔ فقہاء نے بھی سحری میں اتنا کھانے سے منع کیا ہے جس سے روزہ میں کھٹی ڈکاریں آویں۔ اور یہ جبھی ہوگا جب شبع طبعی سے زیادہ کھاوے گا سو اتنا کھانا مکروہ ہے ہاں معمول کیموافق پیٹ بھر کے کھانے کا مضائقہ نہیں اور یہ جو بعض صوفیہ نے جن پر فلسفیت غالب ہے لکھدیا ہے کہ جو شخص رمضان میں بھی اور دنوں کی طرح پیٹ بھر کے کھائے اس نے روح صوم کو باطل کردیا میرے نزدیک غلط ہے میں شرح صدر کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ بالکل غلط ہے۔ اگر پیٹ بھر کے کھانا صوم کو مضر ہوتا تو بخدا شارع اس کو ممنوعات صوم میں ضرور قرار دیتے کیونکہ یہ ضرر کچھ کم نہیں ہے کہ روح عبادت ہی باطل ہوجائے اگر حرام بھی نہ کرتے تو کم از کم مکروہ ہی قرار دیتے مگر ممنوعات صوم میں شارع نے شبع کا

ذکر تک کہیں نہیں کیا آخر جو چیزیں روح صوم کو مضر تھیں شارع نے ان کو بیان کیا ہی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ من لم یدع قول الزور والعمل بہ فلیس للہ حاجۃ فی ان یدع طعامہ وشرابہ یعنی جو شخص جھوٹ بولنا اور غلط باتوں پر عمل کرنا نہ چھوڑے (اس میں سب معاصی آگئے ۱۲) تو خدا کو اس کے بھوکا پیاسا رہنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ تو دیکھئے قول زور مفطر صوم نہیں جھوٹ بولنے سے روزہ ٹوٹتا نہیں مگر چونکہ روح صوم کو مضر تھا اس لئے شارع نے اس کا مضر ہونا ظاہر کر دیا اگر شبع بھی روح صوم کو مضر تھا تو شارع نے اس سے کیونکر تعرض نہیں فرمایا جب شارع نے اس سے تعرض نہیں کیا تو ہم دل کھول کر کہتے ہیں کہ شبع روح صوم کو کچھ مضر نہیں جس کو غلاف کعبہ کے اندر سے کعبہ نظر آرہا ہو وہ تو کعبہ ہی کی طرف منہ کرے گا اس کو غلاف کی طرف منہ کرنے کی کیا ضرورت ہے ایسے ہی جب مجکو حقیقت منکشف ہوگئی تو میں وہی کہوں گا جو میں سمجھا ہوں ممکن ہے کسی محقق کے نزدیک یہ تحقیق صحیح نہ ہو تو ان کو وہ علم مبارک ہو جو ان کے پاس ہے اور چونکہ وہ ان کا اجتہاد ہے اس لئے اجر اُن کو بھی ملے گا۔ پس اب میں ختم کرتا ہوں الحمدللہ یہ بات ثابت ہوگئی کہ تقلیل طعام میں جتنی صورتیں مجاہدہ کی نکل سکتی ہیں روزہ ان سب میں افضل ہے۔ باقی کے متعلق انشاء اللہ آئندہ بیان کروں گا اور مناسبت مضمون کے اعتبار سے اس بیان کا نام تقلیل الطعام۔ بصورۃ الصیام) تجویز کرتا ہوں۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو برکات صوم سے متمتع فرماوے اور فہم سلیم اور عمل کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ والحمد للہ رب العٰلمین وصلے اللہ علیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد

وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلۂ التبلیغ کا وعظ المسمّٰی بہ

تقلیل المنام — بصورۃ القیام

وھو الجزو الثانی من المجموعۃ الملقبۃ بہ

ابواب المجاھدہ — واسباب المشاھدہ

حکیم الاُمّت مجدّد الملّت حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ

ناشر

محمّد عبد المنّان غفر لہٗ

مکتبۂ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ / ایم۔ اے جناح روڈ کراچی

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ المسمّٰی بہ

تقلیل المنام ۔ بصورۃ القیام

وھو الجزء الثانی من المجموعۃ الملقبۃ بہ

ابواب المجاہدہ واسباب المشاہدہ

این	متٰی	کم	کیف	لم	ماذا	من ضبط	لای شان	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کس طرح ہوا	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	کس نے ضبط کیا	کس طبقہ کیلئے مفید ہے	سامعین کی تعداد	متفرقات
مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون	۱۲ رمضان المبارک ۱۳۴۳ھ بعد نماز جمعہ	۲ گھنٹہ	کھڑے ہو کر	رمضان سبب ہوا اعمال مجاہدہ العامہ کا داعی ہے	تقلیل منام کی جو صورت شریعت نے تراویح کی صورت میں تجویز کی ہے اس کے بیان میں تقلیل منام کی تفصیل بیان ہوئی	احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ وعن والدیہ	سالکین کو عموماً اور مجاہدین کو خصوصاً	تقریباً ۱۰۰	اس وعظ کی تسوید تفصیلی ۱۱ محرم ۱۳۴۳ھ بروز پنجشنبہ شروع ہوئی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا

ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وان اللہ لمع المحسنین۔

غالباً سامعین کو یاد ہوگا کہ گذشتہ جمعہ کو بھی یہی آیت پڑھی گئی تھی اور اس کی تفسیر میں بہت سے ضروری مضامین بیان ہوئے تھے۔ مگر راس و اساس سب کا مجاہدہ تھا جس کے چار ارکان بتلائے گئے تھے۔ تقلیل[۱] طعام۔ تقلیل[۲] منام۔ تقلیل[۳] کلام و تقلیل[۴] الاختلاط مع الانام۔ اور یہ دعوےٰ کیا گیا تھا کہ تقلیل طعام کو شریعت نے روزہ کی صورت میں مقرر فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ جو صورتیں اہل مجاہدہ نے تقلیل طعام کی اختیار کر رکھی ہیں شریعت میں اس کی مقصودیت کی اصل نہیں اور اس کے ضمن میں وجوہ ترجیح مجاہدہ شرعیہ کی مجاہدہ عرفیہ پر بیان کی گئی تھیں جن کا عدد اس وقت یاد نہیں اور اس وقت دو وجوہ ترجیح اور یاد آئے وہ یہ کہ مجاہدہ عرفیہ مظنہ ہے فتنہ و غائلہ کا اور مجاہدہ شرعیہ میں یہ احتمال نہیں تفصیل اس کی یہ ہے کہ جو طریقہ مجاہدہ تقلیل طعام کا مرتاضین میں مستعمل ہے کہ کوئی ایک وقت کھانا کھاتا ہے کوئی دو وقت کھاتا ہے تو غذا میں بہت کمی کر دیتا ہے اس طریقہ سے عجب و ناز پیدا ہو جاتا ہے وہ اپنے آپ کو بزرگ خیال کرنے لگتا ہے کہ میں بڑا صاحب مجاہدہ ہوں کہ دوسروں سے کم کھاتا ہوں۔ اور جو اس سے زیادہ کھاتے ہیں ان کو وہ بہائم و جانور سمجھتا ہے کہ یہ لوگ خاک مجاہدہ نہیں کرتے اور گو عجب کا علاج ممکن ہے مگر مشاہدہ یہی ہے کہ عجب کا اکثر علاج نہیں کیا جاتا۔ اور علاج کرے کیونکر

وہ تو اپنی حالت کو اچھی سمجھتا ہے کیونکہ عجب کے معنے ہی یہ ہیں کہ اپنی حالت کو اچھا سمجھے اور جب وہ اپنی حالت کو اچھا سمجھیگا تو علاج کیسے کرے گا اور اگر علاج کرنا بھی چاہے تو ایک مانع قوی ایسا ہے جس کی وجہ سے ضعفاء کو علاج کی ہمت نہیں ہوتی۔ اصول سے اس عجب کا علاج (جو کم کھانے سے پیدا ہوا ہو) یہ ہے کہ خوب کھانے لگے مگر اس میں ان کو یہ عار دامنگیر ہوتی ہے کہ تیرا کم کھانا تو مشہور ہو چکا ہے اب اگر کھانے پر گرے گا اور خوب کھانے لگے گا تو لوگ کہیں گے کہ بس اپنی اصل کی طرف لوٹ آئے ایک وقت کھانے پر نباہ نہ ہوسکا۔ اب یہ شخص محض مخلوق کے دکھانے کو ایک وقت کھاتا ہے تاکہ اس کا مجاہدہ لوگوں میں بنا رہے اور یہ ریا کا شعبہ ہے اس کا علاج بھی وہی ہے کہ خوب کھانے لگے اور ایک وقت کی جگہ دو وقت کھانے لگے یہ علاج ایسا ہے کہ جو امر اس سے مانع ہے یہ اس کا بھی رافع ہے مگر اس کے لئے ہمت کی ضرورت ہے کہ ایک دفعہ کو ننگ و ناموس کی پروا نہ کرے ان کو چولھے میں ڈالے اس کا خیال نہ کرے کہ لوگ کیا کہیں گے پھر تو اس علاج میں کچھ دشواری نہیں دشواری اُسی وقت تک ہے جب تک ریا و عجب دل میں بھرے ہوئے ہیں اور یہ بڑے سنگین امراض ہیں بزرگوں نے لکھا ہے کہ ریا و عجب قلب میں سے سب سے اخیر میں نکلتے ہیں واقعی ان دونوں سے بہت ہی کم لوگ بچے ہوئے ہیں ورنہ اکثر لوگوں کے تو رگ رگ میں عجب و ریا و کبر گھسا ہوا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات ریا سے بچنے کی صورت میں ریا ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض ذاکرین جن کو ذکر جہر تعلیم کیا جاتا ہے وہ یوں کہتے ہیں کہ حضرت اس میں تو ریا ہوتی ہے۔ یعنی ہم کو ذکر خفی کی اجازت دیدی جائے مگر یاد رکھو اس میں نفس کا ایک کید ہے۔ میرے

مطلب نہیں کہ سبھی میں کید ہوتا ہے بلکہ اس کا مدار شیخ محقق کی رائے پر ہے جس کیلئے شیخ ہی خود ذکر خفی تجویز کرے اس میں تو کید نہیں اور جس کے لئے شیخ جہر تجویز کرے اور طالب خفی کو تجویز کرے تو اس میں کید ہے اور وہ کید یہ ہے کہ یہ شخص یوں چاہتا ہے کہ میں ذکر میں آزاد ہوں لوگ میری ناغہ سے مطلع نہ ہوں اور یہ آزادی ذکر خفی ہی میں ہو سکتی ہے اگر تم سال بھر بھی ذکر نہ کرو تو ملنے ملانے والے یہی سمجھتے رہیں گے کہ چپکے چپکے کام کر لیتے ہوں گے اور ذکر جہر میں اگر ایک رات بھی آنکھ نہ کھلی تو سارا محلہ جان جائے گا کہ آج آنکھ نہیں کھلی بس سارا زور شور ختم ہو گیا تو اس میں ناغہ کا فوراً بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ اس لئے جب کوئی مجھ سے کہتا ہے کہ ذکر جہر میں تو ریا ہوتی ہے میں کہہ دیتا ہوں جس دن ناغہ ہو گا اس دن تواضع بھی پیدا ہو جائے گی خود شرماؤ گے کہ میری ناغہ کی سب کو اطلاع ہو گئی اور ذکر خفی میں یہ تواضع کہاں نصیب چاہے روز ناغہ کرتے رہو لوگ سمجھیں گے کہ مولانا ذکر خفی کیا کرتے ہیں اس لئے آواز نہیں آتی چاہے مولانا سو ہی رہے ہوں۔ اس لئے یہ وسوسے واہیات اور فضول ہیں کہ ذکر جہر میں ریا ہوتی ہے اس کا منشا بھی ریا و عجب ہی ہے کہ تم اپنے نقص کو لوگوں سے چھپانا چاہتے ہو اور اس کا علاج یہی ہے کہ جہر کیا کرو الغرض تقلیل طعام کی جو صورت مرتاضین میں مستعمل ہے اس میں عجب و کبر کا بڑا اغائلہ ہے اور اس کا علاج محققین کے اصول پر خوب کھاتا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ اگر کسی عبادت میں عجب کا احتمال ہو تو اس کو ترک کر دے اس طرح تو سب عبادات چھوٹ جائیں گی بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب کسی عبادت کے دو طریقے ہوں جن میں سے ایک میں تو عجب کا مظنہ ہو اور دوسرے میں عجب کا احتمال بھی نہ ہو تو دوسرا طریق بہتر ہے اور شریعت نے جو صورت تقلیل طعام کی مقرر کی ہے (کہ روزہ میں صرف کھانے کے

اوقات کو بدل دو غذا میں کمی نہ کرو (۱) اس میں عجب تو کیا پیدا ہوتا بلکہ اس کا مقابل تواضع پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ افطار کے وقت ایسا روزہ دار ٹھنڈے پانی پر برف پر اور مختلف قسم کے کھانوں پر گرتا ہے۔ رمضان میں اکثر گھروں میں اور دنوں سے زیادہ کھانے پکتے ہیں۔ روٹی دال کے علاوہ گوشت اور پھلکیاں اور چنے کے دانے وغیرہ بھی پکائے جاتے ہیں پھر احباب کو بھی کچھ بھیجدیتے ہیں خصوص موذن تو رمضان میں ایسے مختلف کھانے کھاتے ہیں کہ امراء سے بھی اچھے پڑجاتے ہیں تو جو شخص اتنی چیزوں پر گرے گا تو اس میں عجب کیا پیدا ہوتا وہ تو اپنے کو بہت ہی شرمندہ پائے گا کہ آج میں کتنا کھا گیا لوگ کیا کہتے ہوں گے اور پھر مزا یہ ہے کہ اس کے ساتھ مجاہدہ بھی حاصل ہو گیا چنانچہ اس کا پہلے بیان ہو چکا ہے اور ایک مفسدہ مجاہدہ عرفیہ میں وہ ہے جس کو میں اپنے احباب کے سامنے اکثر کہتا رہتا ہوں اور اس کو میں نصف العلم کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ مجاہدہ عرفیہ والا اپنے اعمال کو زیادہ اور نعماء الٰہیہ کو کم سمجھتا ہے اور دوسرے لوگوں کو اعمال میں کم اور نعماء سے زیادہ منتفع ہونے والا خیال کرتا ہے۔ نیز خیال کرتا ہے لوگ لذات سے منتفع ہیں اور میں لذات سے الگ ہوں حالانکہ تقلیل طعام تو مجاہدہ ہے مگر ترک لذات مجاہدہ نہیں (۲) یہ محض اہل ریاضت کی عادت ہے جو دلیل شرعی نہیں ہو سکتی شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں دیکھئے الذالاشیاء دنیا میں وقاع ہے لیکن شریعت نے بضمن نکاح اس کی ترغیب دی ہے۔ حدیث شریف میں ہے یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج اور ترغیب نکاح سے محض شہوت ہی مقصود نہیں بلکہ لذت بھی مراد ہے۔ ورنہ کسر شہوت کی تو اور بھی صورتیں تھیں چنانچہ رہبانیت ہے اختصار ہے کافور کھا لینا ہے بعض صحابہ نے اپنے اجتہاد سے یاروں کو دیکھ کر اختصار کی اجازت چاہی تھی تو حضور صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم نے نہایت سختی سے منع فرمایا۔ پھر شریعت میں ع۔ ل سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اس میں شیخ کا مل ولذت اکمل نہیں ہوتی اگر نکاح سے محض کسر شہوت ہی مقصود ہوتی تو ع۔ل پر انکار نہ کیا جاتا اور گو بعض نصوص سے اس ترغیب سے مقصود تو الد ہے لیکن وہ خود موقوف ہے لذت پر تو مشروط کی ترغیب شرط کی ترغیب ہے پھر نکاح کی ترغیب کے بعد کثرت وقاع سے بھی شریعت نے منع نہیں کیا، چنانچہ قلت وکثرت طعام کے لئے تو کچھ حدود حدیث میں وارد بھی ہیں۔ ثلث لطعامہ۔ وثلث لشرابہ و ثلث لنفسہ کہ تہائی پیٹ کھانے میں بھرے اور تہائی پانی میں اور تہائی سانس کے لئے رکھے ۱۲) مگر کثرت وقع کے لئے شریعت میں کوئی حد وارد نہیں شریعت نے اس سے بحث ہی نہیں کی کہ یہ طبی مسئلہ ہے اس سے اطبا بحث کرتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ کثرت وقاع سے باطن کو ضرر نہیں ہوتا ورنہ شریعت اس سے ضرور بحث کرتی پھر اہل شریعت کا طرز عمل دیکھو تو ان میں سب سے بڑے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ تقلیل طعام تو آپ نے کی ہے لیکن تقلیل وقاع کا آپ کے یہاں اہتمام نہ تھا آپ کے پاس نو بیبیاں تھیں اور دو خاص باندیاں ملا کر گیارہ کا عدد پورا ہو گیا تو بعض دفعہ آپ نے ایک رات میں سب سے فراغت کی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ قوت بھی اور لوگوں سے بہت زیادہ تھی۔ حضرات صحابہؓ فرماتے ہیں کہ ہم باہم کہا کرتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تیس مردوں کی قوت ہے اور بعض روایات میں چالیس بھی آیا ہے۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے آپ کو امت سے زیادہ بیبیاں رکھنے کی اجازت دی۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نو پر اکتفا کیا یہ بھی آپ کا صبر تھا ورنہ آپ کو تو تیس چالیس نکاح کرنے چاہئیں تھے اپنی قوت کے موافق مگر مخالفین نو ہی پر شور مچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ نے بہت نکاح کئے حالانکہ کثرت وقلت امولہ

اضافیہ ہیں تمہاری قوت کے اعتبار سے اگر یہ مقدار زیادہ ہے تو کیا یہ عدد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت کے اعتبار سے بھی زیادہ ہے ہر گز نہیں آپ کی قوت کے لحاظ سے تو یہ کچھ بھی نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرت وقاع سے احتراز نہیں فرمایا۔ اگر یہ مضر باطن ہوتا تو آپ ضرور اس سے احتراز کرتے اس پر شاید کوئی یوں کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے باطنی ضرر نہ تھا اس لئے آپ احتراز نہ کرتے تھے مگر ہم کو احتراز کرنا چاہیئے تو میں کہتا ہوں کہ یہ وہی بات ہے جس کا جواب خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمادیا جس کا قصہ احادیث میں اس طرح ہے کہ حضرات ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے بعض صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات پوچھے انھوں نے ظاہر فرمادیا جس کا حاصل یہ تھا کہ آپ رات کو کچھ دیر سوتے ہیں۔ کچھ دیر جاگتے ہیں کچھ دیر عبادت کرتے ہیں کچھ وقت بیبیوں کی باتوں میں صرف کر دیتے ہیں کبھی روزہ رکھتے ہیں کبھی افطار کرتے ہیں۔ راوی کہتے ہیں فکانھم تقالوھا وقالوا این نحن من النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقد غفر اللہ ما تقدم من ذنبہ وما تأخر فقال احدھم اما انا فاصلی اللیل ابداً وقال اٰخر انا اصوم النھار ابداً ولا افطر وقال الاٰخر انا اعتزل النساء فلا اتزوج ابداً۔

یعنی ان حضرات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستور العمل کو سہل دیکھ کر قلیل سمجھا اور کہنے لگے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو زیادہ عمل کی ضرورت نہیں اور تقلیل عمل مضر نہیں۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے آپ کے سب اگلے پچھلے گناہ بخش دیئے ہیں (بالفرض اگر ہوں ورنہ آپ میں گناہ کا وجود ہی نہ تھا ۱۲) لیکن ہم کو بوجہ اپنے نقصان مرتبہ کے زیادہ عمل کی ضرورت ہے۔ اس لئے ایک نے قسم کھالی کہ میں تو آج سے تمام رات نہ سوؤں گا یہ عمل شاق تو اس نے اختیار کیا۔ دوسرے بولے کہ میں ساری عمر روزے ہی رکھا کروں گا تیسرے بولے کہ میں کبھی نکاح ہی نہ کروں گا صحابہ کی بھی عجب حالت تھی کہ حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو قلیل دیکھ کر یہ خیال نہیں پیدا ہوا کہ لاؤ ہم بھی کم ہی کیا کریں کیوں مصیبت میں پڑے۔ واقعی ہم تو اپنے مرشد کی عبادت کم دیکھ کر یہی کہیں کہ ہم کو بھی زیادہ کی کیا ضرورت ہے۔ مگر صحابہؓ نے اس کے برعکس یہ کہا کہ گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کم کریں مگر ہم کو زیادہ ہی کرنا چاہیئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور ان حضرات کے خیالات کی غلطی ظاہر فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ تم نے ایسا ایسا کہا یاد رکھو میں تم سے زیادہ حق تعالیٰ سے ڈرتا ہوں لیکن باوجود اس کے اصوم وافطر وا صلی وارقد واتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی متفق علیہ یعنی میں کبھی روزہ رکھتا ہوں کبھی افطار کرتا ہوں اور کچھ جاگتا ہوں کچھ سوتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں (یہی میری سنت ہے) اور جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ تو دیکھئے ان صحابہ کے خیال کا یہی حاصل تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لذات کے استعمال سے ضرر نہیں ہوتا۔ مگر ہم کو ضرر ہوگا اس لئے ہمیں لذات سے بچنا چاہیئے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال کو خلاف سنت بتلایا۔ پس ثابت ہوا کہ کثرت وقاع سے ضرر کا اعتقاد رکھنا دین میں بدعت ایجاد کرنا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کثرت وقاع میں ہر شخص کو اپنی قوت کا اندازہ کر لینا ضروری ہے۔ اسراف تو ہر شے میں مذموم ہے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کے طرز عمل کو دیکھا جاوے۔ تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ رمضان میں افطار کر کے عشاء کے وقت تک گیارہ عورتوں سے فارغ ہوا کرتے تھے ان میں باندیاں بھی تھیں شاید کوئی یہ کہے کہ مغرب سے عشاء تک وقت ہی کیا ہوتا ہے جس میں گیارہ سے فراغت کر لیتے تھے اور اگر جلدی جلدی فارغ ہوتے تھے تو یہ ان کے ضعف کی دلیل ہے اس کا جواب یہ ہے کہ صحابہ کے زمانہ میں عشاء کی نماز دیر میں ہوتی تھی اس لئے ان کو کافی وقت ملتا تھا اور ہم اس لئے جلدی پڑھتے ہیں کہ شاید زیادہ دیر

کرنے سے کوئی نماز ہی کو نہ آوے اور ہم کسی کو کیوں کہیں ہمیں سب سے پہلے اپنا ہی احتمال ہے کہ شاید ہم ہی نہ آویں۔ غرض کہ صحابہ کا کثرت وقاع میں یہ طرز عمل تھا۔ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ یہ وہ بزرگ ہیں جو اتباع سنت و زہد و عبادت میں صحابہ کے اندر ممتاز تھے۔ ان کے طرز سے بھی معلوم ہوا کہ کثرت وقاع زہد و عبادت کے خلاف نہیں اور نہ باطن کو مضر ہے اور یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی لذت نہیں۔ جب شریعت نے اس سے نہیں روکا بلکہ ترغیب دی ہے تو ثابت ہو گیا کہ ترک لذات کو مجاہدہ میں کوئی دخل نہیں یہ محض اہل ریاضت کا معمول ہے اگر اس میں اعتقاد فاسد نہ ہو تو ایک طبی معالجہ ہے۔ بس افطار میں شربت و برف پینا خلاف مجاہدہ ہرگز نہیں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجاہدہ عرفیہ والے کی نظر اپنے مجاہدہ پر ہو جاتی ہے وہ اپنے کو نعماء الٰہیہ سے بہ نسبت دوسروں کے کم منتفع سمجھتا ہے اور زیادہ کھانے والا اس بلا میں مبتلا نہیں ہوتا وہ تو اپنے کو سر سے پیر تک خدا کی نعمتوں میں غرق پاتا ہے اور پھر سمجھتا ہے کہ میں مجاہدہ کیا خاک کرتا ہوں روزہ افطار کر کے تو میں نے اتنا کھا لیا کہ دو آدمی بھی اتنا نہ کھاتے اس لئے اس میں تواضع کی شان پیدا ہوتی ہے اور جو تقلیل طعام کرنے والا اپنے کو نعماء الٰہیہ سے کم منتفع ہونے والا سمجھتا ہے وہ احمق بس خدا کی نعمتوں کو روٹیوں ہی میں منحصر سمجھتا ہے حالانکہ اس کے سوا اور ہزاروں نعمتیں خدا کی اس پر ہیں جن میں یہ شخص سر سے پیر تک غرق ہے۔ مثلاً درندوں اور سانپ بچھو سے حفاظت کی جاتی ہے یہ کتنی بڑی نعمت ہے خدا نے لباس دیا یہ نعمت ہے علم دیا یہ نعمت ہے عزت و جاہ دی یہ نعمت ہے، اپنے ذکر کی توفیق دی یہ نعمت ہے، مکان دیا بیوی بچے دیئے یہ نعمت ہے ہم زبان لوگوں میں رکھا یہ نعمت ہے اور اس نعمت کی

قدر بہت ہی کم لوگ جانتے ہیں۔ مگر جب کہیں غیر ملک میں سفر کا اتفاق ہو جہاں کی زبان آپ نہ جانتے ہوں اور نہ وہاں کوئی آپ کی زبان جانتا ہو تب اس کی قدر معلوم ہوتی ہے کہ ہم زبانوں میں ہونا کتنی بڑی نعمت ہے۔ ایک حاجی اپنا قصہ بیان کرتے تھے کہ وہ حج کو جاتے ہوئے راستہ میں سوئیس پر اتر پڑے وہاں اردو داں کوئی نہ تھا۔ اب یہ اپنے لئے مکان اور کھانے کا انتظام کرنا چاہتے ہیں مگر ان کی سمجھے کون بیحد پریشان ہوئے ایک شخص نے صرف ہندی داں کا پتہ بتلانے کے لئے ان سے چار روپیہ اجرت کے لئے وہ ڈاک خانہ کا ملازم تھا یہودی تب یہ اس کے پاس پہنچے۔ اور نہ معلوم پہلے شخص سے اجرت کا معاملہ کیونکر طے کیا ہوگا اور کس طرح اشاروں میں یہ مفہوم ادا کیا ہوگا کہ میں کسی ہندی داں سے ملنا چاہتا ہوں کیا خبر زبان باہر نکالی ہوگی یا کس طرح سمجھایا ہوگا۔ زبان باہر نکالنے پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک شخص ہرن خرید کر لایا کسی نے اس کی قیمت پوچھی اس کی قیمت گیارہ روپئے بتلانا چاہتا تھا مگر یہ لغت یاد نہیں آیا اس لئے اس نے گیارہ روپیہ کا عدد اس طرح بتلایا کہ اول ایک ہاتھ کی انگلیاں کھول کر پانچ کا عدد بتلایا پھر دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے پانچ اور بتلانا چاہا تو رسی ہرن کی منہ میں پکڑ لی دس تو یہ ہوئے پھر گیارھواں بتلانے کے لئے جیب باہر نکالدی ترکیب تو اچھی تھی مگر نتیجہ یہ ہوا کہ ہرن بھاگ گیا۔ تو صاحبو زبان کا نطق بھی خدا تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے جس کو ہم رات دن قینچی کی طرح چلاتے رہتے ہیں۔ پھر زبان دینے کے بعد ہم زبانوں میں رکھنا یہ بھی بڑی نعمت ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ہر کہ او از ہم زبانے شد جدا ٭ بے نوا شد گرچہ دارد صد نوا

(جو شخص اپنے ہم زبان سے جُدا ہو جاتا ہے تو وہ سیکڑوں مضامین قلب میں رکھتے ہوئے بھی بے زبان اور بے آواز رہتا ہے)

مولانا نے تو کسی اور حالت پر فرمایا ہے۔ مگر اس حالت پر بھی یہ چسپاں ہوتا ہے مولانا کی مراد تو ہم زبان سے ہم زبان باطنی یعنے ہمراز ہے شیخ محقق ہو جماعت ذاکرین ہو۔ کہ جب ذاکر اپنے شیخ یا اپنی جماعت سے الگ ہوتا ہے تو سخت الجھن میں پڑجاتا ہے۔ واقعی نااہلوں میں پھنسکر اپنی جماعت کی قدر ہوتی ہے تو مولانا کی مراد ہمزبان سے ہمزبان باطن ہے۔ کیونکہ اس طریق میں ظاہری ہمزبان کی ضرورت نہیں اگر طالب و شیخ کی زبان جدا جدا ہو جب بھی فیض ہوتا ہے۔ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں ایک رومی شیخ آئے تھے جن کا نام تھا سعد آفندی۔ حضرت اس وقت مثنوی پڑھارہے تھے اور تقریر اردو ہی میں فرمایا کرتے تھے مگر وہ محظوظ تھے۔ ایک خادم نے حضرت سے عرض کیا کہ اگر یہ اردو سمجھتے تو ان کو اور زیادہ حظ آتا۔ حضرت نے فرمایا کہ اس حظ کے لئے اس زبان کی ضرورت نہیں اور یہ شعر پڑھا ؎

پارسی گو گرچہ تازی خوشتر ست ٭ عشق را خود صد زبان دیگر است

(فارسی میں بات کر دگرچہ عربی زبان خوشتر اور افضل ہے۔ عشق کے لئے سیکڑوں زبانیں اور بھی ہوتی ہیں)

بوئے آں دلبر چو پراں می شود ٭ ایں زبانہا جملہ حیراں می شود

(اس محبوب حقیقی کی خوشبوئے قرب جب دل محسوس کرتا ہے تو اس کو ظاہر کرنے کے لئے جملہ زبانیں قاصر اور محو حیرت ہوجاتی ہیں)

تو دیکھئے ہمزبانوں میں ہوناکتنی بڑی نعمت ہے مگر وہ احمق ان نعمتوں پر نظر نہیں کرتا وہ صرف دو روٹیوں ہی کو نعمت سمجھتا ہے حالانکہ حق تعالے کی نعمتیں اتنی ہیں کہ وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا جس کا ادنیٰ طریقۂ امتحان وہ ہے جو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے بیان فرمایا ہے۔ ہر نفسے کو فرو می رود ممد حیات است

وچوں می آید مفرح ذات پس در ہر نفسے دو نعمت موجود است و در ہر نعمتے شکرے واجب یعنی جو سانس اندر جاتا ہے۔ معین حیات ہے اور جو سانس باہر آتا ہے وہ روح کا مفرح ہے اس لئے ہر سانس میں دو نعمتیں ہیں اور ہر نعمت پر شکر واجب ہے اب خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا احصار کیونکر ہو سکتا ہے تم جتنی مقدار معین کروگے ہر سانس پہلی میزان کو غلط کر دے گا بلکہ خود یہ سانس ہی ایک نعمت ایسی ہے کہ اس کا بھی احصار نہیں ہو سکتا بعض لوگوں نے حبس دم کرکے اس نعمت سے منتفع ہوتے ہیں بھی تقلیل کی ہے مگر اس نعمت میں تقلیل کا قصد کرنا ان کا بیہودہ پن ہے۔ اور میں حبس دم کو بیہودہ نہیں کہتا بلکہ اس خیال کو بیہودہ کہتا ہوں۔ یعنی تقلیل نعمت کے خیال سے حبس دم کرنے کو ورنہ حبس دم کو بعض اغراض محمودہ کے لئے بزرگوں نے بھی کیا ہے۔ شیخ ابوسعید گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے تو ایک مرتبہ ایک تجلی کے اشتیاق میں جو ایک بار پہلے حاصل ہوئی تھی حبس دم کرکے یہاں تک عزم کرلیا کہ جب تک تجلی نہ ہوگی سانس نہ چھوڑوں گا۔ جب بہت دیر ہوگئی اضطراراً شدت کے ساتھ جو سانس چھوٹا ہے اس کے صدمہ سے پسلی ٹوٹ گئی اس وقت وہ تجلی ظاہر ہوئی اور اس میں ایک ہاتھ ظاہر ہوا جس میں معجون کی طرح کوئی دوا تھی وہ ان کے منہ میں ڈالدی گئی۔ اس کے کھاتے ہی پسلی جُڑ گئی اور اسی حالت میں یہ بھی حکم دیا گیا کہ چوزہ کا شوربا چند روز پیو۔ شیخ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ نے سلطان نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کو جو ان کے شیخ تھے اس واقعہ کی اطلاع دی انہوں نے اسی روز سے چوزہ کے شوربے کا ان کے لئے اہتمام فرمادیا۔ مگر خدا کے لئے کوئی صاحب غلط کشف نہ گھڑنے لگیں کہ روزانہ آ آکر شیخ کو سنایا کریں کہ آج مجھے یہ کھانے کا حکم ہوا ہے۔ آج یہ پینے کا حکم ہوا ہے جیسے آجکل ایک شیخ پورب کی طرف ہیں ان کے یہاں کشف کا بازار بڑا گرم ہے ان کے مریدوں کو

روز ایسے ہی کشف ہوتے ہیں کہ آج حکم ہوا کہ فلاں شخص کو اتنے روپے دیدو۔ فلاں جگہ فاتحہ کردو فلاں جگہ عرس میں شرکت کرو۔ فلاں ملازم کو ترقی دو۔ فلاں کو معزول کردو۔ اور وہ خدا کے بندے سب کو صحیح سمجھتے ہیں سو خوب سمجھ لو کہ شیخ محقق کے یہاں جھوٹے کشف نہیں چل سکتے وہاں قلعی کھل ہی جاتی ہے تو پھر کفش پڑنے لگتے ہیں۔ اور شیخ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ جس خاص تجلی کے اشتیاق میں حبس دم کرکے بیٹھے تھے اس کا پہلی بار حاصل ہونے کا واقعہ یہ ہوا تھا کہ شیخ نظام الدین بلخی رحمۃ اللہ علیہ نے بعد تعلیم ذکر و شغل کے نظر بصیرت سے یہ معلوم کرکے کہ ذکر و شغل سے ان میں عجب ہوگیا ہے سب ذکر و شغل چھوڑوا کر معالجہ کے طور پر شکاری کتوں کی خدمت ان کے سپرد کی تھی۔ ایک مرتبہ یہ ان کتوں کو جنگل میں لے جارہے تھے کہ کتوں نے دور سے کسی شکار کو دیکھا بس اب وہ کہاں تھے وہ بھی ہرن ہوگئے۔ کچھ دور تو شیخ ابوسعید ان کے ساتھ ساتھ بھاگتے رہے جب دیکھا کہ میرے قابو سے باہر ہیں تو اس خوف سے کہ کہیں رسی ہاتھ سے چھوٹ جائے اور کتے بھاگ جائیں تو شیخ کا عتاب ہوگا انھوں نے کتوں کی زنجیر کو اپنی کمر سے باندھ لیا کتوں نے جو زور میں دوڑنا شروع کیا تو بیچارے نہ سنبھل سکے گر پڑے اور اب یہ حال ہے کہ کتے دوڑے چلے جارہے ہیں اور یہ ڈھیلوں پتھروں پر گھسٹتے جارہے ہیں بدن میں کانٹے چبھ رہے ہیں سر میں چوٹ آرہی ہے مگر یہ راضی ہیں۔ اسی حالت میں ان پر ایک خاص تجلی نمودار ہوئی جس کی لذت میں سب تکالیف بھول گئے۔ ادھر حضرت شیخ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ پر ان کی حالت مکشوف ہوئی تو خدام سے فرمایا کہ ابوسعید پر اس وقت خدا کا فضل ہوگیا اور جنگل میں اُسے دولت نصیب ہوگئی جاؤ اس کو اٹھالاؤ پھر اسی وقت شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کی روحانیت سلطان نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کو مکشوف ہوئی کہ شیخ فرمارہے ہیں نظام الدین! محنت لینے کا تو مضائقہ نہیں مگر ہم نے یعنی ہمارے مجاز نے تم سے اتنی محنت نہ لی تھی شیخ نظام الدین شیخ کے اس عتاب سے کانپ اٹھے اور پھر کبھی شیخ ابوسعید سے ایسی محنت نہیں لی۔

(ان شاء اللہ تعالیٰ باقی آئندہ)

تھوڑی دیر میں جو شیخ ابو سعید جنگل سے آئے شیخ نے ان کو پھر ذکر و شغل میں لگا دیا جس کے بعد وہ حبس دم کا قصہ ہوا۔ اس قصہ کے بعد شیخ نے فرمایا ابو سعید جو دولت میں تمہارے گھر سے لایا تھا وہ آج تم کو سونپ رہا ہوں گویا حصول نسبت کی بشارت تھی۔ اسی طرح شیخ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ کے قصہ کی نظیر شیخ سرزی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ بھی ہے جو مولانا نے مثنوی میں بیان فرمایا ہے۔ انھوں نے بھی کسی تجلّی کے شوق میں جب کسی مجاہدہ سے کام نہ چلا حق تعالے سے عرض کیا کہ یا تو وہ تجلی ہو ورنہ میں اپنی حیات کو منقطع کر دوں گا۔ وہاں سے جواب ملا کہ زندگی تیرے قبضہ میں تھوڑا ہی ہے۔ دیکھیں حیات کو کیسے منقطع کر دو گے انھوں نے فوراً اپنے کو پہاڑ کے اوپر سے گرا دیا مگر کچھ بھی نہ ہوا چوٹ تک بھی نہ لگی اب یہ بڑے جھنجلائے اور کہا یہ کیا مصیبت ہے کہ نہ مرنے دیں نہ جینے دیں۔ یہ ناز کا مقام تھا اس لئے ایسے الفاظ کہہ گئے اور ان کے لئے یہ الفاظ خلاف ادب نہ تھے ہر وقت کا جدا ادب ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

گفت[۱]گوئے عاشقاں درکار رب ؛ جوشش عشق است نے ترک ادب

آگے فیصلہ خوب ہے ؎

بے ادب[۲] ترنیست زوکس درجہاں ؛ باادب ترنیست زوکس درنہاں

(۱ و ۲) عاشقان خدا کی گفتگو کبھی جوش عشق سے بظاہر بے ادبی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ تارک ادب نہیں ہوتے اگرچہ بظاہر الفاظ بے ادبی کے غلبۂ محبت سے نکل جاتے ہیں اس لئے دھوکہ نہ کھانا چاہیئے کیونکہ ان کا باطن اوروں سے زیادہ باادب ہوتا ہے)

یعنے باطن میں اس سے بڑھ کر باادب کوئی نہیں اور ظاہر میں اس سے بڑھ کر بے ادب کوئی نہیں کیونکہ ظاہر میں بعض دفعہ اہل ناز ایسے الفاظ کہہ ڈالتے ہیں کہ

دوسرا کہے تو مردود ہو جائے مگر وہ غلبۂ حال کی وجہ سے معذور ہوتے ہیں مگر باطن میں وہ اتنے مودب ہوتے ہیں کہ جان تک فدا کر دیتے ہیں ۔غرض جب پہاڑ پر سے بھی گر کر نہ مرے اور یہ کہا کہ نہ مرنے دیں نہ جینے دیں ۔ تو غیب سے ارشاد ہوا کہ تم خود ہی تجویز کرتے ہو راستہ ہم سے پوچھو۔ جب وہ تجلی نصیب ہو گی پوچھا کہ پھر بتلا دیجئے وہ کیا راستہ ہے حکم ہوا کہ بارہ برس تک بھیک مانگو۔ چنانچہ یہ خلوت ترک کر کے شہر میں آئے اور در بدر بھیک مانگنے میں لگ گئے اور کہیں کہیں دھکے اور مکے بھی کھائے ۔مولانا فرماتے ہیں ؎

ایں چنیں شیخ گدائے کو بکو ٭ عشق آمد لا ابالی فاتقوا

(اتنا بڑا شیخ عشق الٰہی میں گلی در گلی پھر رہا ہے عشق بڑا ہی لا ابالی ہوتا ہے پس ذرا سنبھل کر قدم رکھنا)

بارہ برس جب بھیک مانگنے کے پورے ہو چکے تو حکم ہوا کہ ابھی بارہ برس اور باقی ہیں ۔ اب دینا شروع کرو۔ پوچھا دوں کہاں سے آپ نے جمع کرنے تو دیا ہی نہیں واقعی وہ اپنے عاشقوں کو خوب نچاتے ہیں ۔کسی نے خوب کہا ہے گو الفاظ سخت ہیں ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن ٭ دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن

(عاشقی کیا ہے کہہ دو کہ محبوب کی غلامی کا نام ہے ۔ دل تو دیدے محبوب کو اور خود حیران رہے)

سوئے زلفش نظرے کردن در دیش دیدن ٭ گاہ کافر شدن و گاہ مسلماں بودن

(کبھی محبوب کی زلف کو دیکھے کبھی اس کے چہرہ کو دیکھے ۔اس طرح فنا اور بقا کا مشاہدہ کرتا رہے)

اس میں کفر سے مراد فنا ہے اور اسلام سے مراد بقا یہ صوفیہ کی خاص اصطلاح ہے ولا مشاحۃ فی الاصطلاح جیسے کافر عشقم یعنے فانی عشقم قرآن میں بھی کفر کا اطلاق معنی حسن میں آیا ہے جیسے وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ اور ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں نے اپنی قوم سے کہا تھا كَفَرْنَا بِكُمْ ہم نے تم سے کفر کیا یعنی الگ ہوتے ہیں تو کفر کا لفظ اس شعر میں ظاہری

میں سخت معلوم ہوتا ہے ورنہ معنے اچھے ہیں جیسے ان آیتوں میں اچھے معنے میں کفر کا استعمال ہوا ہے غرض شیخ سرمزی نے پوچھا دوں کہاں سے حکم ہوا کہ اب تمہارے پاس چاروں طرف سے دنیا آوے گی اس کو خرچ کرنا شروع کرد۔ چنانچہ اب ایک جگہ بیٹھ گئے اور فتوحات شروع ہوئیں بارہ برس تک خوب سخاوت کی اس کے بعد وہ نعمت حاصل ہوئی۔ یہ گفتگو حبس دم کے سلسلہ میں آگئی تھی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ سانس ہی ایک ایسی نعمت ہے جس کا احصاء نہیں ہو سکتا مگر جو شخص مجاہدہ عرفیہ اختیار کرتا ہے وہ ان نعمتوں کو نعمت ہی نہیں سمجھتا بس وہ کھانے پینے ہی کو نعمت سمجھتا ہے۔ اور جب اس نے کھانے پینے میں کمی کردی تو وہ اپنے اعمال کو زیادہ سمجھتا ہے اور نعماء الٰہی کو اپنے اوپر کم سمجھتا ہے گویا وہ دو روٹی کم کھانے سے خدا کے خزانہ میں زیادتی کر رہا ہے۔ پاگل وہاں کیا بچت ہوتی۔ ایک ایک جانور اتنا کھاتے والا ہے کہ وہاں تم جیسوں کو پوچھتا کون ہے۔ تمہاری ان دو دو ٹیوں کے کم کرنے سے وہاں کچھ اضافہ نہیں ہوتا۔ پھر جب اس شخص کو اپنے اندر کیفیات و ذوق و شوق کی کمی محسوس ہوتی ہے تو خدا سے اس کے دل میں شکایت پیدا ہوتی ہے کہ میں اتنا مجاہدہ کرتا ہوں پھر بھی میرے حال پر رحم نہیں کیا جاتا حالانکہ ؎

آنکس کہ تو نگرت نمی کرد اند ✿ او مصلحت تو از تو بہتر داند

(جو خدا پاک کہ تجھے مالدار نہیں بناتا ہے وہ تیری مصلحت کو تجھ سے زیادہ جانتا ہے)

نہ معلوم کیفیات پیدا ہوتیں تو تیرا کیا حال ہوتا ادنیٰ بات تو یہ ہے کہ یہ شخص ان کو خدا کا فضل و انعام نہ سمجھے گا بلکہ اپنے مجاہدہ کا ثمرہ اور

اپنا حق سمجھے گا کہ یہ تو ہونا ہی چاہیئے تھا کہ میں اتنی مصیبتیں جھیلتا رہتا ہوں پس مجاہدہ عرفیہ والے کو نعمت باطن ملے تو وہ تو اُس کے نزدیک اس کا حق ہے گویا یوں ہی ہونا چاہیئے تھا اور نہ ملے تو شکایت کرتا رہیگا اور جو زیادہ کھا کر روزہ رکھتا ہے اور افطار میں بھی خوب کھاتا ہے اُسے جب کوئی نعمت باطن حاصل ہوتی ہے اور اس کو اپنا حق یا اپنے مجاہدہ کا ثمرہ نہیں سمجھتا کیونکہ وہ اپنے نزدیک صاحب مجاہدہ ہے ہی نہیں بلکہ وہ ہر نعمت کو محض فضل و انعام حق سمجھے گا اور اگر کچھ ذوق و شوق وکیفیت حاصل نہ ہو تو اس کے دل میں خدا سے شکایت کبھی نہ ہوگی بلکہ اپنے نفس ہی سے شکایت ہوگی کہ کمبخت تو کرتا ہی کیا ہے جو تجھے کچھ حاصل ہوتا تو یہ شخص متواضع بھی ہے اور شاکر بھی اور مجاہدہ عرفیہ والا معجب بھی ہے اور شاکی بھی یہ تو تتمہ ہے ماسبق کا اب میں مجاہدہ کے دوسرے رکن کو بیان کرتا ہوں دوسرا رکن ہے مجاہدہ کا تقلیل منام رمضان اس کا بھی جامع ہے کہ اس میں ایک عبادت ایسی مشروع ہے جو تقلیل منام کو مستلزم ہے اور وہ تراویح ہے جس کا نام قیام رمضان ہے۔ حدیث میں ہے ان اللہ فرض لکم صیامہ وسننت لکم قیامہ، (اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے روزہ فرض فرمایا اور میں نے تمہارے لئے تراویح کو سنت قرار دیا) اس پر سب کو اتفاق ہے کہ مراد قیامہ سے حدیث میں تراویح ہے رہا عدد سو اس وقت اس کے اثبات سے ہم کو بحث نہیں عمل کے لئے ہم کو اتنا کافی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے زمانہ میں بیس رکعت تراویح اور تین وتر جماعت کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔ یہ روایت موطا امام مالک میں گو منقطع ہے مگر عملاً متواتر ہے۔ امت کے عمل نے اس کو متواتر کردیا ہے

بس عمل کے لئے اتنا کافی ہے۔ دیکھئے اگر کوئی پنساری کے پاس دوا لینے جائے تو اس سے یہ نہیں پوچھتا کہ دوا کہاں سے آئی اور اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ وہی دوا ہے جو میں لینا چاہتا ہوں بلکہ اگر شبہ ہوتا ہے تو ایک دو جاننے والوں کو دکھلا کر اطمینان کرلیا جاتا ہے اب اگر کوئی پنساری سے یہ کہے کہ میرا اطمینان تو اس وقت ہوگا جب تم بائع کے دستخط دکھلادوگے کہ تم نے اس سے یہ دوا خریدی ہے تو لوگ یہ کہیں گے کہ اس کو دوا کی ضرورت ہی نہیں اور پنساری بھی صاف کہدے گا کہ مجھے دستخط دکھلانے کی ضرورت نہیں لیتے ہو لو نہیں لیتے ہو مت لو۔ اسی طرح محققین سلف کا طرز یہ ہے کہ وہ مدعی کے لئے مغز زنی نہیں کرتے بس مسئلہ بتلا دیا اور اگر کسی نے اس میں حجتیں نکالیں تو صاف کہدیا کہ کسی دوسرے سے تحقیق کرلو جس پر تم کو اعتماد ہو ہمیں بحث کی ضرورت نہیں۔

مولانا عبدالقیوم صاحب مقیم بھوپال رحمۃ اللہ علیہ سے جب کوئی مسئلہ پوچھتا تو کتاب میں دیکھ کر جواب دیا کرتے تھے اور فرمادیا کرتے تھے کہ کتاب میں یوں لکھا ہے اور جو کوئی حدیث پوچھتا تو فرمادیتے کہ بھائی میں نومسلم نہیں ہوں میرے آباؤ اجداد سب مسلمان تھے اور اسی طرح ان کے آباؤ اجداد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک سب مسلمان تھے تو جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کو دیکھ کر عمل کیا اور جو ان کے بعد تھے انھوں نے اپنے بڑوں کو دیکھ کر عمل کیا اسی طرح سلسلہ یہ سلسلہ ہمارے گھر میں وہی ہوتا آتا رہا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل تھا۔ اس لئے مجھے حدیث ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں اس کی ضرورت تو نومسلموں کو ہے۔ اس جواب کا حاصل وہی قطع نزاع ہے

کہ فضول بحث کو یہ حضرات پسند نہ کرتے تھے۔ بھلا عوام کو اگر بتلا بھی دیا جائے کہ حدیث میں یہ ہے تو ان کو طریق استنباط کا علم کس طرح ہوگا اس میں پھر وہ فقہاء کے محتاج ہوں گے تو پہلے ہی سے فقہاء کے بیان پر کیوں اعتماد نہیں کرتے مولانا عبدالقیوم صاحب بڑے عجیب بزرگ تھے ایک مرتبہ بیگم صاحبہ ان کی زیارت کے لئے آئیں جب رخصت ہوکر گھر کو واپس جانے لگیں تو مولانا نے ان کے جوتے سیدھے کر دیئے وہ کہنے لگیں مولانا آپ نے یہ کیا کیا آپ تو ہمارے بزرگ ہیں میں آپ کی جوتیاں سیدھی کرتی نہ کہ الٹا آپ نے مجھے شرمندہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ تم مجھ سے زیادہ بزرگ ہو۔ انھوں نے عرض کیا تو یہ تو بہ میں کیا چیز ہوں' فرمایا میرے پاس اس کی دلیل ہے وہ یہ کہ میں بیس برس سے وعظ کہہ رہا ہوں کہ بیوہ عورتیں نکاح کرلیں مگر کچھ اثر نہیں ہوا یہ تو میری بزرگی تھی۔ اب تم اپنی بزرگی کا امتحان کر دیکھو ایک اشتہار دیدو کہ جو بیوہ عورت نکاح نہیں کرے گی اس کو سزا ہوگی۔ اور اگر بے سروسامانی کا عذر ہو تو سرکار کی طرف سے اس کے نکاح میں امداد کی جائے گی۔ دیکھو پھر کتنی بیوہ عورتیں نکاح کرتی ہیں۔ بیگم صاحبہ کو علماء کی بڑی قدر تھی فوراً مولانا کے ارشاد کی تعمیل کی۔ اب کیا تھا دھڑا دھڑ نکاح ہونے لگے۔ دیکھئے مولانا نے دین کا کام کس خوبصورتی سے نکالا پھر افسوس ہے کہ ان لوگوں کو تارک عمل بالحدیث کہا جاتا ہے۔ بس لوگوں نے دو چار مسئلوں میں غل شور کرنے کا نام عمل بالحدیث رکھ لیا ہے ورنہ واللہ عامل بالحدیث ہمارے ہی حضرات ہیں۔ البتہ کسی سے الجھنا اور بحث کرنا پسند نہیں کرتے اور اگر کوئی خواہ مخواہ الجھتا ہی ہے تو اس میں اُن کا وہ مذاق ہے جو حاجی صاحب فرماتے تھے جب کوئی تم سے مناظرہ کرے تو سب رطب و یابس جمع کرکے اس کے سامنے رکھدو اور

کہدو کہ ان دلائل میں تم خود فیصلہ کرلو کون قوی ہے کون ضعیف ہے۔ اور کونسی شق حق ہے اور کونسی باطل ہے مجھے فیصلہ کی فرصت نہیں دکیونکہ تمہارے فیصلہ پر وہ پھر نقص وارد کرے گا تو سلسلۂ کلام ختم نہ ہوگا) اور حضرت حاجی صاحب نے اس پر ایک حجام کی حکایت بیان فرمائی کہ وہ کسی کی حجامت بنارہا تھا اس نے کہاکہ میری ڈاڑھی میں سے سفید بال چن دینا اس نے اُسترہ لیکر ساری ڈاڑھی مونڈکر سامنے رکھدی کہ جناب آپ خود سفید و سیاہ کو الگ کرلیجئے مجھے انتخاب کی ضرورت نہیں۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک فحش حکایت مثنوی میں بیان فرمائی ہے کہ ایک شخص بیٹھا ہوا بانسری بجارہا تھا کہ دفعۃً ریح خارج ہوئی تو اس نے بانسری ادھر لگادی کہ بی اگر میرا بجانا تجکو پسند نہیں تو اب تو بجالے۔ حکایت تو ظاہر میں گندی ہے مگر اس کا مطلب عجیب ہے یعنی جب مدعی بک بک کرنے لگے تو تم خاموش ہوجاؤ اور اس سے کہو کہ میاں اب تم بولو ہم خاموش ہوتے ہیں۔ واقعی اس مضمون کے ادا کے لئے اس سے بہتر کوئی حکایت نہ تھی صاحب حق کا بولنا ایسا ہی خوشنما ہے جیسا منہ سے بانسری کا بولنا کیونکہ بانسری خود نہیں بولتی بلکہ اس کے اندر کوئی دوسرا بولتا ہے یہی حال صاحب حق کا ہے کہ وہ خود نہیں بولتا بلکہ حق اس کی زبان سے بولتا ہے۔ بی یسمع۔ بی ینطق۔ بی یبصر الحدیث عارف فرماتے ہیں ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　∴　آنچہ استاد ازل گفت ہمامی گویم

(آئینہ کے پیچھے حق نمائی نے مجھے طوطی صفت بنایا ہے جو کچھ کہ حق تعالیٰ نے بروز ازل ہمارے اندر معلوم موہوب فرمائے ہیں میں انھیں کا ناقل ہوں ہمارا کوئی ذاتی کمال نہیں ہے)

اور جس طرح بانسری کی آواز سے انس و جن و حش و طیور مست ہوجاتے ہیں اسی طرح صاحب حق کی گفتگو ایک عالم کو منور کردیتی ہے اور مدعی کا بولنا ایسا ہی ہے

جیسے مقعد کا بولنا کہ عالم میں اس سے بدعت اور گمراہی اور سرکشی کی سڑاہند پھیل جاتی ہے اس کا تو خاموش ہی رہنا زیبا ہے لیکن اگر وہ بک بک کرنے لگے اور منع کی قدرت نہ ہو تو اس سے الجھو نہیں تم خاموش ہو جاؤ اور اسے بولنے دو اہل بصیرت حق کی خوشبو اور باطل کی بدبو کا خود امتیاز کرلیں گے۔ الغرض عمل کے لئے تو تراویح کا اتنا ثبوت کافی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قولاً اس کو مسنون فرمایا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں صحابہ عملاً تراویح کی بیس رکعتیں پڑھتے تھے عوام کے لئے اتنا کافی ہے اس سے زیادہ تحقیق علماء کا منصب ہے اس وقت اس سے بحث نہیں اس تراویح کا نام قیام رمضان بھی ہے کیونکہ یہ رمضان کے ساتھ مخصوص ہے اور احادیث میں اس کو قیام رمضان سے تعبیر کرنا اس کی دلیل ہے کہ تراویح تہجد سے الگ کوئی عبادت ہے کیونکہ تہجد رمضان کے ساتھ مخصوص نہیں اور اس کے علاوہ اس پر اور بھی دلائل قائم ہیں کہ یہ دونوں الگ الگ عبادتیں ہیں اب اصل مدعا سنئے کہ جس طرح صوم کو تقلیل طعام میں دخل ہے اسی طرح تراویح کو تقلیل منام میں دخل ہے۔ اور جیسا روزہ میں تبدیل عادت کی وجہ سے مجاہدہ کی شان آئی تھی اسی طرح یہاں بھی شریعت نے محض تبدیل عادت سے مجاہدہ کا کام لیا ہے کیونکہ عام عادت یہی ہے کہ اکثر لوگ عشاء کے بعد فوراً سو رہتے ہیں تو نیند کے وقت میں تراویح کا امر کر کے عادت کو بدل دیا۔ جس سے نفس پر گرانی ہوتی ہے جو کہ مجاہدہ ہے۔ پھر قاعدہ ہے کہ نیند کا وقت نکل جانے کے بعد پھر دیر میں نیند آتی ہے اس طرح بھی تقلیل منام ہو جاتی ہے اور اگر کوئی شخص روزانہ دس بجے ہی سونے کا پہلے سے عادی ہو اسے بھی تراویح سے مجاہدہ کا ثمرہ اس طرح حاصل ہو جاتا ہے کہ آزادی کے ساتھ جاگنا گراں نہیں ہوتا مگر تقلید کے ساتھ فوراً ہی گرانی شروع ہو جاتی ہے دیکھئے آپ اپنی خوشی سے ایک جگہ گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں

لیکن اگر کوئی تم سے یہ کہہ جائے کہ میاں گیارہ بجے تک تم یہیں بیٹھے رہنا۔ تو بس اسی وقت سے آپ بھاگنا چاہتے ہیں اور ایک ایک منٹ گراں گذرنے لگتا ہے شریعت نے اس راز کو سمجھا اور محض ذراسی تقلید سے مجاہدہ کا کام لے لیا تو شریعت نے تقلیل منام کے لئے بھی عجیب مجاہدہ تجویز کیا ہے۔ واللہ شریعت پر تو یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ؛ کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا ست

(سر سے پیر تک جہاں بھی نظر ڈالتا ہوں۔ کرشمہ میرے دل کا دامن کھینچتا ہے کہ بس اسی جگہ نظر جمائے رہ)

ایسی سہل شریعت کو پھر لوگ خونخوار کہتے ہیں ان کو خدا کا خوف نہیں آتا اور اگر بالفرض کسی کو شریعت کے احکام میں کچھ گرانی معلوم بھی ہو تو آخر کیا تم کڑوی دوا نہیں پیتے کریلے نہیں کھاتے، تمبا کو نہیں کھاتے جس سے اول اول چکر آتے ہیں مگر عادت کے بعد اس کے بغیر چین نہیں آتا تو یہی سمجھ کر تم ذرا اعمال شریعت کی عادت تو کر لو واللہ پھر یہ خود تم کو چمٹ جائیں گے۔ معشوق اگر منہ نہ لگائے تو اس کی تلخی کیوں جھیلتے ہو اور معشوق تو اکثر تلخ مزاج ہی ہوتے ہیں اگر وہ نرمی سے ملنے لگے تو پھر اس میں اور بازاری عورت میں کیا فرق ہے ؎

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست ؛ بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

(خوبی اسی کرشمہ و ناز کا نام نہیں ہے بہت سی ادائیں معشوقوں کی ایسی ہیں جن کا نام بھی لغت میں نہیں ملتا)

تو جب دنیا کے کاموں میں تلخی اور گرانی کے جھیلنے سے بچے ہوئے نہیں ہو پھر دین ہی کے کاموں میں اس سے بچنا کیوں چاہتے ہو خصوصاً جبکہ یہ تلخی لذیذ بھی ہے جیسے تمبا کو والوں کو اس کی تلخی لذیذ معلوم ہوتی ہے اور اگر تم کو اس کی تلخی میں مزا نہیں آتا تو صبر ہی کر لیا ہوتا جیسا دنیا میں بعض قوانین سخت ہوتے ہیں اور ان پر صبر کیا جاتا ہے۔ عارف

فرماتے ہیں ؎

صبر کن حافظ بتلخی روز و شب ⁂ عاقبت روزے بیابی کام را

(اے حافظ دن و رات کی تلخی پر صبر کر ایک دن انجام کار تو کامیاب ہوجائیگا)

یہ تو ان کے لئے ہے جو عاشق نہیں کہ تلخی کو محسوس کرتے ہیں اور صبر کرتے ہیں اور جو عشاق ہیں ان کے لئے تو حافظ یوں فرماتے ہیں ؎

آں تلخوش کہ صوفی ام الخبائثش خواند ⁂ اشہی لنا و احلی من قبلۃ العذاری

(جس شراب کی تلخی کو صوفی ام الخبائث کہتا ہے مجھے تو محبوب کے بوسہ سے زیادہ شیریں ہے)

یعنی تلخی ہی محسوس نہیں ہوتی۔ تلخوش سے مراد طریق عشق ہے اور زاہد خشک اس کو ام الخبائث اس لئے کہتا ہے کہ عشق میں بعض دفعہ ظاہراً حدود شریعت سے تجاوز ہوجاتا ہے اور حقیقت میں وہ تجاوز نہیں ہوتا مگر اس حقیقت کی زاہد خشک کو خبر نہیں ہوتی اس لئے وہ اہل عشق پر خواہ مخواہ ملامت کرتا ہے اور اسی تلخی کے متعلق مولانا فرماتے ہیں ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من ⁂ دل فدائے یار دل رنجان من

(آپ کی طرف سے ناموافق حالات بھی مجھے اچھے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ آپ پر ہمارا دل فدا ہے پس دل آپ کی مرضی پر تسلیم سر کا لطف لیتا ہے)

غرض عشاق کو احکام شریعت کی تلخی لذیذ معلوم ہوتی ہے جیسے مرچوں کی تیزی لذیذ ہوتی ہے مرچیں کھاتے ہوئے روتے بھی ہیں اور کھاتے بھی جاتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ رونا ہمیشہ محرومی اور رنج ہی سے نہیں ہوتا۔ بلکہ رونا کبھی لذت سے بھی ہوتا ہے۔ کعبہ کو پہلی بار دیکھ کر جو حال ہوتا ہے اس کو یاد کر لیجئے۔ عشق کی خاصیت ہے کہ وصال کے وقت بھی آنکھ قبضہ میں نہیں رہتی اس وقت بھی رونا آتا ہے مگر وہ رونا محرومی کا نہیں بلکہ دوسری ہی قسم کا روتا ہے کعبہ کو دیکھ کر یہ حال تو عام

طور پر ہوتا ہے اور جن کی خاص حالت ہوتی ہے انھوں نے تو اس موقع پر جان دیدی ہے۔ ایک عاشق کا قصہ ہے کہ وہ حج کو جارہے ہیں ہاتھ میں ایک ڈھپلی ہے اس کو بجاتے اور کودتے ناچتے جارہے ہیں۔ اول تو لوگ اس کو مسخرہ سمجھے مگر جب مکہ مکرمہ میں پہنچے اور مطوف کے ساتھ طواف بیت اللہ کو چلے تو جس وقت دروازہ میں سے بیت اللہ پر نظر پڑی ہے تو ان پر وجد طاری ہوا۔ اور یہ شعر پڑھا ؎

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر ٭ کہ مباد بارِ دیگر نہ رسی بدیں تمنا

(جب کوئے دلبر میں پہنچ گئے تو جانِ مضطر کو قربان کردو کہ شاید دوسری بار پھر یہ آرزو پوری ہو کہ نہو) اور گرتے ہی جان نکل گئی بیت اللہ تک پہونچنے بھی نہ پایا غرض رونا کبھی دوسری قسم کا بھی ہوتا ہے جیسے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے حق تعالیٰ کا حکم ہوا ہے کہ تم کو ایک سورت پڑھ کر سناؤں تو وہ دریافت فرماتے ہیں اللہ سمانی کیا خدا تعالیٰ نے میرا نام لیکر فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں تو وہ رونے لگے۔ حضرت حاجی صاحب کی تحقیق ہے کہ یہ رونا گرم بازاری عشق کا ہے۔ اسی کو عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

بلبل برگ گلے خوش رنگ درمنقار داشت ٭ واندراں برگ و نوا خوش نالہائے زار داشت

گفتمش در عین وصل ایں نالہ و فریاد چیست ٭ گفت مارا جلوۂ معشوق دریں کار داشت

(بلبل چونچ میں برگِ گل لئے ہوئے خوشی کا نالہ ہائے زار بلند کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ حالت وصل میں فریاد و نالہ کیوں ہے جواب دیا کہ جلوۂ معشوق نے مجھے اس کام میں لگا رکھا ہے) پس یہ خوشی کا رونا ہے نہ غم کا مولانا فرماتے ہیں ؎

عاشقی زیں ہر دو حالت برتر است

(عاشقی ان دونوں حالتوں سے برتر ہے)

تو شریعت میں اگر تلخی بھی ہوتی وہ بھی لذیذ ہوتی اور اگر لذیذ بھی نہ ہوتی تو اس کو صبر

ہی کا محل سمجھا ہوتا مگر وہاں تو تلخی ہے ہی نہیں وہاں تو سر سے پیر تک حلاوت
ہی حلاوت ہے جس کی دل کشی کا یہ حال ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ؛ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

(سر سے پاؤں تک جہاں بھی نظر ڈالتا ہوں محبوب کے حُسن کا کرشمہ دامن دل کھینچتا ہے کہ بس
اسی جگہ نظر کو جما لے)

غرض شریعت نے رمضان میں صرف بیس رکعت تراویح مقرر کرکے تقلیل منام
کی ایک معتدل صورت کردی جس میں بہت زیادہ جاگنا بھی نہیں پڑتا اتنی دیر
تک تو عام طور پر لوگ جاگتے رہتے ہیں جتنی دیر تراویح میں لگتی ہے مگر تقیید کے
ساتھ جاگنے سے مجاہدہ کا فائدہ حاصل ہو جاتا ہے اور دوسرے طریق میں
مرتاضین آنکھیں پھوڑتے تھے چھت میں رسیاں باندھتے تھے کہ جب نیند
آتی اس میں لٹک جاتے ہیں جس سے نیند اڑ جاتی تھی ان دونوں مجاہدوں میں
ایسا فرق ہے جیسے قند میں اور شیرہ میں۔ اس لطافت کا ادراک لطیف ہی لوگوں
کو ہوتا ہے۔ مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ جیسا شخص چاہیے جس کو شریعت
کی لطافت کا ادراک ہو اگر ان کو اس لطافت کا ادراک نہ ہوتا تو وہ دین کے
ایسے عاشق نہ ہوتے کہ دین کے واسطے جان ہی دے دی۔ آپ کے زمانہ میں
شیعہ کو دہلی کے اندر بہت غلبہ تھا اور یہ لوگ مرزا صاحب کے دشمن تھے۔
جان لینے کو پھرتے تھے جس دن کی صبح کو آپ شہید ہوں گے رات میں آپ کو مکشوف
ہو گیا تھا کہ آج شہادت کا دن ہے۔ تو آپ نے صبح سے پہلے غسل کیا نہادھو کر
سرمہ و عطر لگا کر شہادت کے لئے تیار ہو گئے اور باہر جو تشریف لائے تو بار بار
یہ شعر پڑھتے تھے ؎

سر جدا کرد از تنم یارے کہ با ما یار بود ؛ قصہ کوتہ کرد ورنہ درد سر بسیار بود

(سر جدا کر دیا میرے جسم سے اس یار نے کہ جو میرا یار تھا زندگی میں زندگی کا تسمہ ختم کر دیا کہ مجھے زندگی ایک دردِ سر تھی)

اسی حالت میں مخالفین آئے اور آپ سے کچھ سوالات کئے جواب حق بِلا تو ظالموں نے قرابینوں سے آپ کو شہید کر دیا۔ دفن کے وقت لوگوں نے چاہا کہ پتھر پر کوئی شعر حسب حال کندہ کرا کر قبر پر نصب کریں مگر کوئی شعر حسب حال نہ ملا تو ایک اہلِ دل نے کہا کہ خود ان ہی کے دیوان سے نکالو۔ تو اول ہی دہلہ میں یہ شعر نِکلا ؎

بلوح تربت من یا فتند از غیب تحریری ٭ کہ ایں مقتول را جز بیگناہی نیست تقصیری

(میرے قبر کے پتھر کے لئے یہ غیبی تحریر ان لوگوں نے پالیا کہ یہ مقتول بیگناہ اور بے قصور ہے)

واقعی بہت ہی حسب حال شعر ہے۔ غرض شریعت کی لطافت کو ایسے حضرات سمجھتے تھے تم اگر نہ سمجھ سکو تو تم کو تحقیق کی کیا ضرورت ہے بس خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم سمجھ کر عمل شروع کر دو۔ آخر اگر کوئی فقیر تم کو گولیاں دیدے کہ یہ قوت باہ کی ہیں تو ان کو جلدی سے منہ میں کیوں دبا لیتے ہو (یعنی رکھ لیتے ہو) ہندی مثل ہے کہ آم کھانے سے کام پیڑ گننے سے کیا کام۔ تم کو اسرار کے پیچھے پڑنے سے کیا مطلب تم کو عمل سے کام ہے۔ روزہ میں اور تراویح میں کچھ ہی اسرار ہوں تم کو اس سے کیا بحث۔ مقصود تو رضائے حق ہے اور وہ عمل سے حاصل ہو جاتی ہے اسرار کے جاننے پر رضا موقوف نہیں پھر تم ان کے درپے کیوں ہوتے ہو پھر یہ کیا ضرور ہے کہ جن سے تم پوچھتے ہو ان کو بھی اسرار معلوم ہوں اور اگر معلوم بھی ہوں تو یہ کیا ضرور ہے کہ وہ تم کو بتلا بھی دیں کیوں کہ انکا مذاق یہ ہے کہ وہ ہر ایک کو اسرار نہیں بتلایا کرتے جس کو اہل دیکھتے ہیں اسی کو بتلاتے ہیں اور نا اہل کے متعلق ان کا یہ ارشاد ہے ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی ٭ بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی
مدعی (متکبر) کے ساتھ اسرار و عشق و مستی کی بات مت کرو اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو تاکہ خود پرستی اور تکبر کے غم میں مرتا رہے

مولوی غوث علی صاحب پانی پتی کے پاس ایک خان صاحب آئے اور کہا میں نے سنا ہے کہ آپ کو کیمیا آتی ہے۔ کہا ہاں آتی ہے۔ خان صاحب نے کہا پھر ہمیں بھی بتلا دیجئے کہا نہیں بتلاتے۔ اس نے کہا آخر کیوں نہیں بتلاتے کہا کیا میں تمہارے باوا کا نوکر ہوں۔ پھر کہا خانصاحب خدمتیں کرو بدن دباؤ۔ حقہ بھرو کبھی سال دو سال میں جی چاہ گیا تو بتلا بھی دیں گے۔ جس محنت سے ہم نے حاصل کی ہے تم اس کی آدھی محنت تو دکھلاؤ۔ اسی طرح عارفین برسوں ناک رگڑوا کر جسے اہل سمجھتے ہیں اُسے اسرار پر مطلع کر دیتے ہیں ہر ایک کو نہیں بتلایا کرتے گو جانتے بھی ہوں حافظ رحمۃ اللہ علیہ اسی کو فرماتے ہیں ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ٭ ورنہ در مجلس رانداں خبرے نیست کہ نیست
(مصلحت نہیں کہ پردہ سے راز ظاہر ہو جائے ورنہ اہل اللہ احکام کے اسرار سے باخبر ہوتے ہیں)

مصلحت نیست کی وجہ یہ ہے کہ بعض دفعہ بدون اسرار جانے عمل کرنا زیادہ مفید ہوتا ہے اور اسرار جاننے سے فائدہ کم ہوتا ہے۔ جیسے حکیم اپنے گھر سے بنی بنائی دوا دیدے تو اعتقاد زیادہ ہوتا ہے اور بعض دفعہ وہ ایسی معمولی چیز ہوتی ہے کہ اجزاء معلوم ہو جانے کے بعد اس کی وقعت نہیں رہتی جیسے ایک عالم صاحب کے سر میں شدّت کا درد ہوا۔ انھوں نے ایک درویش سے تعویذ لیا۔ اس کے باندھتے ہی فوراً درد جاتا رہا بڑا تعجب ہوا

ہوا تعویذ کھول کر دیکھا تو اس میں صرف بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھی تھی ان کے خیال میں یہ بات آئی کہ یہ تو میں بھی لکھ سکتا تھا اس خیال کے آتے ہی فوراً درد شروع ہو گیا۔ اب تعویذ کو لاکھ باندھتے ہیں اثر ہی نہیں ہوتا اسی لئے اکثر تعویذ دینے والے تعویذ کو کھول کر دیکھنے سے منع کیا کرتے ہیں تاکہ اعتقاد کم نہ ہو۔ اسی طرح احکام شرعیہ کے اسرار جاننے سے بعض کج فہموں کے دل میں احکام کی وقعت کم ہو جاتی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ بس یہی حکمت مقصود ہے تراویح سے کہ تقیید کے ساتھ جاگنا ہو اس سے اول تو تراویح کی وقعت کم ہوتی ہے پھر وہ الحاد میں پھنستا ہے کہ مقصود تقیید ہے تو ہم کسی دوسرے طریقہ سے تقیید کر لیں گے حالانکہ اول تو حکمت کا اسی میں انحصار نہیں نہ معلوم کتنی حکمتیں ہوں گی پھر یہ حکمت اس قید کے ساتھ مقصود ہے کہ اس خاص عمل کے ساتھ پائی جاوے اس عمل کے بغیر یہ حکمت مطلوب نہیں پس دونوں کا مجموعہ مطلوب ہوا پھر دوسرے طریقہ سے یہ مقصود کیونکر حاصل ہو جائیگا غرض اہل ریاضت تقلیل منام کے لئے جو صورتیں مجاہدات کی اختیار کرتے ہیں ان کو دیکھ کر پھر شرعی مجاہدہ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے شاہانہ علاج کیا ہے کہ نہ آنکھیں پھوڑنے کی ضرورت ہے نہ رسیاں باندھنے کی ضرورت ہے نہ سیاہ مرچیں چبانے کی ضرورت ہے بلکہ بیس رکعت تراویح عشا کے بعد پڑھ کر سو رہو تقلیل منام ہو گیا پھر مزید لطافت یہ کہ تراویح جماعت سے ہوتی ہے الگ الگ جاگنا مشکل تھا جماعت کے ساتھ جاگنا اور بھی سہل ہو گیا پھر بیچ میں نیند آنے لگے تو ہر چار رکعت پر قدرے توقف مستحب کیا گیا جس میں اگر کسی کو نیند آنے لگی تو وہ ٹہل سکتا ہے پانی منہ میں ڈال سکتا ہے باتیں کر کے

نیند کو دفع کرسکتا ہے اس طرح سے بیس رکعت کی مقدار جاگنا کچھ بھی دشوار نہیں پس یہ ویسا ہی علاج ہے جیسا ایک بادشاہ نے طبیب سے کہا تھا کہ میں آج بیمار ہوں میری نبض دیکھ کر علاج کرو مگر شرط یہ ہے کہ مجھے نہ دوا پینی پڑے نہ لگانی پڑے بس ویسے ہی علاج ہو جائے۔طبیب نے نبض دیکھ کر کہا بہتر ہے ایسا ہی علاج ہو جائے گا اس نے گھر جاکر ایک پنکھے پر کچھ دوا چھڑک دی اور شاہی خادم سے کہا کہ بادشاہ کو اس پنکھے سے ہوا کرنا۔ پس پنکھا جھلتے ہی فوراً ہی نیند آگئی اور سانس کے ذریعے سے دوا کا اثر دماغ میں اور دماغ سے دل میں پہنچا تو جب بادشاہ جاگا ہے تو خاصا چوق وچوبند تھا بیماری کا نام کو بھی نشان نہ تھا۔

اسی طرح ایک مرتبہ دہلی میں شاہزادہ نے روزہ رکھا تھا اس کی روزہ کشائی کا بڑی دھوم سے انتظام ہوا گو یہ رسم روزہ کشائی کی بدعت ہے مگر اس وقت اس سے روزہ کی تعظیم ہوتی تھی اور اس بہانہ سے غرباء کو بہت کچھ مل جاتا تھا اسی لئے فقیہ ابو اللیث فرماتے ہیں کہ جب سے ریاکار مر گئے اور مخلصین پیدا ہوئے اس وقت سے لوگ بھوکے مرنے لگے کیونکہ ریاکار بہت کام دین کے کرتے تھے۔ کوئی وقف کرتا تھا کوئی لنگر جاری کرتا تھا کوئی سرائے اور مسافر خانہ بناتا تھا گو یا سب نام و نمود کے لئے ہوتا تھا۔ مگر مخلوق کو تو راحت ہوتی تھی پھر کیا عجب ہے کہ مخلوق کی دعاؤں سے اُن ریاکاروں کی بھی مغفرت ہو گئی ہو۔ تو روزہ کشائی کی رسم ہمارے واسطے تو بدعت ہے لیکن اگر بادشاہ کریں تو ان کے واسطے بدعت نہیں ہے بلکہ غنیمت سمجھا جاوے گا کہ دین کی قدر و عظمت تو انھوں نے کی۔

جیسے کالج علیگڈھ میں مولود شریف ہونے کی بابت میرے ایک دوست نے خوب لطیفہ کہا تھا کہ مولود شریف کی محفل ہمارے لئے تو بدعت ہے مگر کالج میں واجب ہے کیونکہ بددینی کا کچھ انسداد تو ہے۔ مگر اس فتوے کے لئے محقق کی ضرورت ہے ہر شخص کا یہ کام نہیں کہ بدعات کو جائز کرنے لگے۔ غرض روزہ کشائی کا انتظام ہوا بہت کھانے پکوائے گئے ہزاروں آدمیوں کو دعوت دی گئی۔ بچہ نے عصر کے وقت تک تو صبر کیا۔ مگر عصر کے بعد اس نے پانی مانگا کہ میرا پیاس سے بڑا حال ہے بادشاہ کو بڑی پریشانی ہوئی کہ اگر اس وقت اس نے روزہ توڑ دیا تو ساری خوشی خاک میں مل جائے گی اور ساری محنت برباد ہو جائے گی۔ اُدھر بچّے کی حالت کا بھی فکر تھا کہ وہ پیاس سے بے تاب ہے فوراً طبیبوں کو بلایا کہ کوئی تدبیر ایسی کرو جس سے شاہزادہ کی پیاس کو تسکین ہو جائے اور روزہ بھی نہ ٹوٹے سب اطبار عاجز ہو گئے کسی کی سمجھ میں کوئی تدبیر نہ آئی۔ صرف ایک ہندو طبیب کے ذہن میں ایک تدبیر آئی اس نے کہا۔ حضور اسی وقت لیموں منگائے جائیں چنانچہ منگائے گئے اس نے چند لڑکوں کو بلا کر کہا کہ تم شاہزادہ کے سامنے تراش تراش کر کھانا شروع کرو بس دوسروں کو لیمو کھاتے دیکھ کر بچے کے منہ میں پانی بھر آیا طبیب نے کہا اس لعاب کو نگلتے رہو لعاب کے نگلنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اب کیا تھا اب تو منہ میں لعاب کا دریا پیدا ہو گیا اور بچے نے اس کو نگلنا شروع کیا فوراً پیاس کو سکون ہو گیا۔ صاحبو! اس پر تو آپ کو تعجب ہوتا ہے مگر میں بقسم کہتا ہوں کہ شریعت نے امراض باطنہ کے سارے علاج شاہانہ ہی کئے ہیں اور اس طرح ہر چیز کا علاج کر کے دعوے سے فرماتے ہیں الدِّین یسر کہ دین آسان ہے کسی طبیب کا منہ نہیں ہے کہ وہ یہ دعوے کرے الطّب یسر کیونکہ اس میں چیر پھاڑ بھی ہے اپریشن بھی ہے نشتر بھی لگایا جاتا ہے مگر حق تعالےٰ

احکام کو بیان فرما کر ارشاد فرماتے ہیں ما جعل علیکم فی الدین من حرج خدا نے تم پر دین میں کچھ بھی تنگی نہیں کی۔ الہ آباد میں ایک بار اس آیت کا میں نے بیان کیا تھا اور دعوے کیا تھا کہ آج میں اس مسئلہ کو ثابت کر دوں گا کہ دین میں کہیں ذرہ برابر تنگی نہیں اس وعظ میں تو تعلیم یافتہ بہت تھے وہ میرا منہ تکتے تھے مگر جب میں نے تقریر شروع کی اور دلائل بیان کئے تو سب مان گئے اور سب کی گردنیں خم ہو گئیں اس وعظ[1] کے لئے دعا کیجئے کہ جلد طبع ہو جائے اس کے مطالعہ سے اس قسم کے تمام شبہات دور ہو جائیں گے بخدا شریعت میں تنگی نہیں بلکہ جہاں اس کا توہم ہوتا ہے وہ تنگی خود ہمارے اندر ہے ہم اپنی تنگی کو شریعت کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ جیسے ہمارے یہاں ایک گنوار عورت اپنے بچے کو پاخانہ پھرا کر جلدی میں اسے پونچھ پانچھ کر عید کا چاند دیکھنے کھڑی ہو گئی انگلی میں کچھ پاخانہ لگا رہ گیا تھا۔ ناک پر انگلی رکھنے کی عورتوں میں بہت عادت ہے اس نے جو ناک پر انگلی رکھ کر چاند دیکھا تو اپنی انگلی میں سے پاخانہ کی بدبو ناک میں پہنچی تو وہ کہتی ہے کہ اوئی اب کے سڑا ہوا چاند کیوں نکلا۔ جس طرح اس بیوقوف نے اپنی انگلی کی سڑاہند کو چاند کی طرف منسوب کیا تھا یوں ہی ہم لوگ اپنی طبائع کی تنگی کو دین کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ دین تنگ ہے ہم لوگوں کو آئینہ شریعت میں اپنی بھونڈی صورت نظر آ رہی ہے اب لگے آئینہ ہی کو برا کہنے۔ جیسے ایک حبشی چلا جا رہا تھا راستہ میں ایک آئینہ پڑا پایا اٹھا کر جو اپنا منہ دیکھا تو ایک ڈراونی صورت نظر آئی۔ تو آپ آئینہ کو پھینک کر فرماتے ہیں کہ ایسی بری صورت کا تھا جبھی تو کوئی پھینک گیا۔ سبحان اللہ آپ نے آئینہ کو بدصورت قرار دیا مگر اپنی بابت یہ بدگمانی نہ ہوئی کہ شاید میری ہی صورت

[1] الحمد للہ یہ وعظ مسمیٰ بہ نفی الحرج طبع ہو گیا ہے ۱۲ جامع۔

نظر آئی ہو یہی حال ہمارا ہو رہا ہے کہ آئینہ شریعت میں اپنی صورت جب بدنما نظر آتی ہے تو شریعت کا قصور بتلاتے ہیں جیسے ایک بچہ کے ہاتھ سے لوٹے میں روٹی کا ٹکڑا اگر پڑا تھا اس نے جو جھک کر نکالنا چاہا تو پانی میں اسے اپنی صورت نظر آئی اس نے باپ کو پکارا کہ ابا اس نے میری روٹی چھین لی اس نے پوچھا کس نے چھین لی کہا اس نے یہ جو لوٹے میں بیٹھا ہے ابا جان بھی دیکھنے میں آئے کہ لوٹے میں کون بیٹھا ہے وہ جو لوٹے پر جھکے تو پانی میں ان کو اپنی صورت نظر آئی مقطع ڈاڑھی سفید بال تو آپ اس کو خطاب کر کے کہتے ہیں کہ تجھے شرم نہیں آئی یہ لمبی ڈاڑھی لگا کر بچہ کا ٹکڑا چھین لیا تف ہے تیری اوقات پر۔ اسی طرح جس کو شریعت میں شبہ ہو تو درحقیقت وہ شبہ اس کے اندر ہے شریعت میں کوئی شبہ نہیں۔ مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمۃ سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت قرآن شریف میں ارشاد ہے ذالك الكتاب لاریب فیه یہ کتاب کامل ہے اس میں شک نہیں حالانکہ اس میں تو بہت کفار شک کرتے ہیں اور بعض کج فہم مسلمان بھی۔ فرمایا کہ وہ شک ان کے اندر ہے قرآن کے اندر نہیں اور حق تعالیٰ نے لاریب فیه فرمایا ہے لاریب فیهم نہیں فرمایا اس کی ایسی مثال ہے جیسے یرقان والا کہتا ہے ہذا الثوب اصفر (یہ کپڑا زرد ہے ۱۲) مگر طبیب کہتا ہے هذا لاصفرة فيه وانما الصفرة فى عينيك (کہ اس کپڑے میں تو زردی نہیں ہاں تیری آنکھوں میں زردی ہے جس سے تجھ کو ہر چیز زرد نظر آتی ہے ۱۲) بتلایئے یہ کلام سچا ہے یا نہیں یقیناً سچا ہے بس یوں ہی قرآن کا دعوے ہے کہ دین میں تنگی نہیں۔ اب جو کوئی تنگی کا مدعی ہے اس کی نگاہ میں خود تنگی ہے یا فہم میں تنگی ہے۔ صاحبو اگر قرآن کے اس دعوے میں کچھ بھی خامی ہوتی تو یہ آیت ایک عالم کے سامنے جن میں ملاحدہ و فلاسفہ و اہل کتاب سب ہی موجود ہیں دعوے کے ساتھ پیش نہ کی جاتی پھر اوپر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم الدین یسر فرما کر اس کی تاکید

نہ فرمادیتے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عالم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ دین آسان ہے اور ہم بھی حقیقت کے بھروسے پر دعوے کرتے ہیں کہ بیشک دین آسان ہے اسی الدین یسر کا ایک یہ نمونہ ہے کہ شریعت نے تقلیل منام کی صورت تراویح میں تجویز کی اور اس تقلیل کو تہجد سے اور تقویت ہو جاتی ہے خصوصاً لیالی قدر میں کہ ان راتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے تمام اجزاء سے زیادہ جاگنے کا اہتمام فرمایا ہے ان راتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات کو بھی اہتمام کے ساتھ جگاتے تھے پھر ان میں بھی شریعت نے ہماری راحت کی کس قدر رعایت کی ہے کہ لیالی قدر پے در پے نہیں ہیں بلکہ طاق راتیں ہیں یعنی اکیسویں اور تیئسویں اور پچیسویں اور ستائیسویں اور انتیسویں راتیں کہ بیچ میں ایک ایک رات کا فصل رکھا گیا ہے تاکہ ایک رات زیادہ جاگ کر بیچ کی رات میں زیادہ سو لو اور تہجد کے لئے جاگنا خاص رمضان کی راتوں میں کچھ بھی مشکل نہیں کیونکہ سحری کے لئے اکثر لوگ اٹھتے ہی ہیں تو کھانے سے پہلے کچھ رکعتیں نماز کی پڑھ لینا کیا دشوار ہے۔ اسی لئے جو شخص تہجد کا عادی بننا چاہے اس کو رمضان میں عادی بننا نہایت آسان ہے کیونکہ اس میں تہجد کے لئے اٹھنا مشکل نہیں سحری کھانے سب ہی اٹھتے ہیں۔ پھر انشاء اللہ تعالیٰ سال بھر کے لئے عادی ہو جائے گا۔ غرض تراویح اور تہجد کے اہتمام سے تقلیل منام ہو جاتی ہے اور یہ خود دینی مجاہدہ بھی ہے پھر اس میں دینی فوائد کے علاوہ دنیوی فوائد کے بھی ہیں۔ چنانچہ نیند کم ہونے سے رطوبت فضیلہ کم ہوتی ہیں جو صحت کے لئے معین ہے نیز اس سے چہرہ پر نور پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک محدث کا قول ہے من کثرت صلوٰۃ فی اللیل حسن وجہہ فی النہار بعض لوگوں نے اس کو حدیث مرفوع بنایا ہے مگر یہ صحیح نہیں ان لوگوں کو مغالطہ ہوا واقعہ یہ ہے کہ ایک محدث حدیث بیان کر رہے تھے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کذا وکذا درمیان میں ایک بزرگ آگئے جن کے چہرہ پر انوار تھے تو محدث نے ان کی طرف اشارہ کرکے فرمایا من کثرت صلوتہ فی اللیل حسن وجھہ فی النہار کہ جو رات کو نماز زیادہ پڑھے گا دن میں اس کا چہرہ خوبصورت ہو جاوے گا تو بعض لوگ جو پوری مجلس میں حاضر نہ تھے وہ اسی کو حدیث سمجھے حالانکہ حدیث اس کے بعد بیان ہوئی تھی اسی لئے مجلس علم میں اخیر تک رہنا چاہیئے تب صحیح مضمون حاصل ہوتا ہے ورنہ وہی مثال ہوتی ہے کہ آدھا تیتر آدھا بٹیر عالمگیر کے زمانہ میں ایک عورت نے چار آشنا کر رکھے تھے اور ہر ایک سے نکاح بھی کر رکھا تھا مگر ایک شوہر کو دوسرے کی اطلاع نہ تھی عالمگیر کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس عورت کو بلوایا نہایت پریشانی میں جا رہی تھی راستہ میں اسے طالب علم ملے اور کہا کہ اگر تو مجھے اتنے روپے دے تو میں تجھے رہائی کی تدبیر بتلاؤں ورنہ عالمگیر تجھے زندہ نہ چھوڑیں گے اس نے وعدہ کیا کہ جو کہو گے وہ دوں گی تم تدبیر بتلاؤ اس نے کہا یہ کہہ دینا کہ میں نے ایک عالم کے وعظ میں سُنا تھا کہ خوامخواہ بدکاری کی جاتی ہے خدا تعالےٰ نے چار نکاح تک جائز کئے ہیں اور وہ پوچھیں کہ یہ مردوں کے لئے کہا تھا یا عورتوں کے لئے تو کہہ دینا کہ آگے میں نے سُنا نہیں اس نے جا کر یہی بیان کر دیا عالمگیر نے معذور سمجھ کر سزا نہ دی اور آئندہ کے لئے ہدایت کر دی کہ خبردار وعظ کبھی ادھورا نہیں سُنا کرتے یہ تو جملہ معترضہ تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ تہجد سے چہرہ پر نور پیدا ہوتا ہے۔ واللہ اگر تہجد پڑھنے والا حسین بھی نہ ہو تب بھی اس پر حُسن ہوتا ہے ؎

نور حق ظاہر بود اندر ولی ⁂ نیک بیں باشی اگر اہل دلی

(ولی کے اندر نورِ حق تجھے ظاہر ہو جائے گا بشرطیکہ تو نیک ہیں اور اہل دل بھی ہو)
کسی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے ؎

مردِ حقانی کی پیشانی کا نور　　کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

الغرض رات کو جاگنا باعث حسن ظاہری دنورد جہ ہے تو تقلیل منام میں علاوہ مجاہدہ ہونے کے یہ فوائد بھی ہیں پھر اس کے ساتھ شریعت نے ایک اور رعایت کی ہے جس پر سو جان سے فدا ہونے کو جی چاہتا ہے وہ یہ کہ مجاہدہ مرتاضین کے نزدیک تو محض ترک کا نام ہے مثلاً ترک طعام و ترک منام وغیرہ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض ترک پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ افعال بھی مشروع فرمائے ہیں اور مجاہدات حقیقیہ یہ اعمال ہی ہیں اور تروک تو مجاہدہ حکمیہ ہیں یعنی مجاہدات حقیقیہ کے لئے معین ہوتے کے سبب بحکم مجاہدہ ہیں وجہ یہ کہ قرب الی اللہ کے لئے اعمال ہی موضوع ہیں مثلاً روزہ میں صرف ترک طعام پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ اور کام بھی مشروع کئے گئے ہیں۔ عملاً بھی وقولاً بھی عملاً تو یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان حدیث شریف میں وارد ہے۔

کان اجود الناس بالخیر وکان اجود مایکون فی رمضان کان جبریل یلقاہ کل لیلۃ فی رمضان یعرض علیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم القراٰن فاذا لقیہ جبریل کان اجود بالخیر من الریح المرسلۃ

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یوں تو ہر وقت ہی سب سے زیادہ سخی تھے۔ مگر سب سے بڑھ کر رمضان میں آپ سخی ہوتے تھے اور جبریل علیہ السلام ہر شب میں آپ سے ملتے تھے ان کی ملاقات کے وقت آپ ہوا سے بھی زیادہ فیض رساں ہوتے تھے (ہوا کی فیض رسانی کہ اس سے بارش ہوتی ہے

معلوم ہے اس جود میں سے بعض کی تصریح بھی وارد ہے مشکوٰۃ میں بیہقی سے بروایت ابن عباس آیا ہے۔ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا دخل شھر رمضان اطلق کل اسیر و اعطی کل سائل (حضور صلی اللہ علیہ وسلم رمضان مبارک میں ہر قیدی کو آزاد فرما دیتے تھے اور ہر سائل کو عطا فرماتے تھے) اس میں آپ نے عملی تعلیم فرمائی ہے کہ رمضان میں اور دنوں سے زیادہ فیض رساں ہونا چاہیئے اور قولاً یہ کہ آپ ارشاد فرماتے ہیں ھذا شھر المواساۃ ھذا شھر یزاد فیہ رزق المومن من تقرب فیہ بخصلۃ من الخیر کان کمن ادی فریضۃ فیما سواہ و من ادی فریضۃ فیہ کان کمن ادی سبعین فریضۃ فیما سواہ۔ یعنی یہ مہینہ ہمدردی کا ہے اس مہینہ میں مومن کا رزق زیادہ کیا جاتا ہے جو اس میں نفل کام کرے اس کو اور دنوں کے فرض کے برابر ثواب ملے گا اس میں کس قدر ترغیب و تحریص ہے۔ صدقہ خیرات اور اعمالِ صالحہ کی کہ رمضان میں رکعات نافلہ کا ثواب فرض نمازوں کے برابر ملتا ہے۔
صدقہ نافلہ کا ثواب صدقہ مفروضہ کے برابر ملتا ہے اور جو فرض کو اس ماہ میں ادا کرتے ہیں ان کو ستر فرضوں کا ثواب ملتا ہے۔ مگر اس سے بعض لوگوں نے کیسا الٹا مطلب سمجھا کہ بعض لوگ رمضان سے پہلے بعض نیک کاموں کو روکے رکھتے ہیں مثلاً کسی کی زکوٰۃ کا سال شعبان میں پورا ہو گیا اب وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتا رمضان کے انتظار میں روکے رکھتا ہے چاہے رمضان میں اس کو توفیق ہی نہ ہو روپیہ چوری ہی ہو جائے یا رمضان کے انتظار میں محتاج کا قلیہ ہی ہو جائے۔ یاد رکھو شارع کا اس ترغیب سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ رمضان کے انتظار میں نیک کاموں کو روکا جائے بلکہ شارع کا مقصود تاخیر عن رمضان سے روکنا ہے کہ اگر رمضان تک کسی کو توفیق نہ ہوئی ہو تو رمضان میں ہرگز دیر نہ کرے جو کرنا ہو کر

کر ڈالے تقدیم علی رمضان سے روکنا مقصود نہیں۔ وشتّان بینہما (ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے) مگر کم فہمی نے یہ نتیجہ پیدا کیا کہ لوگ رمضان میں خرچ کرنے کے فضائل اور ثواب سن کر اس کے انتظار میں طاعات کو روکنے لگے۔ خوب سمجھ لو کہ تعجیل فی الخیر میں خود بہت۔ بڑا ثواب ہے اور وہ اتنا بڑا ثواب ہے کہ رمضان سے پہلے جو تم خرچ کرو گے تو گو اس میں کمّاً بہ نسبت رمضان میں خرچ کرنے کے ثواب کم ہو مگر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ کیفا وتقریباً الی اللہ وہ تعجیل بہتر ہے اور اس درجہ میں اس کا ثواب رمضان کے ثواب سے بڑھ جائیگا۔ مجھے کوئی تو اطمینان ہے جو میں شرح صدر کے ساتھ اس مضمون کو بیان کر رہا ہوں بس قسم سے زیادہ اطمینان دلانے کا ذریعہ میرے پاس کوئی نہیں تمہیں کیا خبر ہے کہ شعبان میں اگر تم غریب کو زکوٰۃ دیدیتے۔ تو اس وقت اس کے دل سے کیسی دعا نکل جاتی جس کے سامنے ستر رمضان بھی ہیچ ہیں۔ یہی بات تو لوگوں کو معلوم نہیں۔ یاد رکھو جب زکوٰۃ کا سال پورا ہو جائے اس کے بعد تاخیر کرنے میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ اس تاخیر سے گناہ ہوتا ہے یا نہیں بعض وجوب علی الفور کے قائل ہیں ان کے نزدیک تاخیر سے گناہ ہوتا ہے اور بعض وجوب علی التراخی کے قائل ہیں ان کے نزدیک گناہ نہیں ہوتا پس احتیاط اسی میں ہے کہ وجوب کے بعد دیر نہ کی جائے تاکہ سب کے نزدیک گناہ سے محفوظ رہے پھر اگر رمضان کے انتظار میں صدقات کا روکنا موجب ثواب ہوتا تو شریعت نے کہیں تو یہ کہا ہوتا کہ رمضان سے اتنے دن پہلے تمام صدقات کو روکدو جب شریعت نے کہیں یہ نہیں کہا تو اب ہمارا ایسا کرنا یہ زیادۃ فی الدین اور بدعت ہے کہ جس کام کے لئے شریعت نے ثواب بیان نہیں کیا تم اس کو ثواب سمجھ کر کرتے ہو یہ مقادمت ہے حکم شرع کی مگر چونکہ اب تک جہل میں مبتلا تھے علم نہیں تھا اس لئے امید ہے کہ گنہگار نہیں ہوئے ہوگے

ہاں اب جو لوگ ایسا کریں گے وہ گنہگار ہوں گے کیونکہ اب مطلع صاف ہو گیا غرض شریعت نے محض تقلیل طعام بصورت صیام پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ اعمال کی بھی ترغیب دی ہے۔ اسی طرح تقلیل منام میں بھی محض بیداری پر اکتفا نہیں کیا کہ خالی بیٹھے جاگتے رہو بلکہ فرماتے ہیں۔

کانوا قلیلاً من اللیل ما یھجعون ۝ وبالاسحار ھم یستغفرون ۝ نیک بندوں کی تعریف فرماتے ہیں کہ وہ رات کو کم سویا کرتے تھے اور پچھلے حصہ شب میں استغفار کیا کرتے تھے یہاں تو استغفار شروع ہوا دوسری جگہ ارشاد ہے تتجافیٰ جنوبھم عن المضاجع یدعون ربھم خوفاً وطمعاً ۝ ان کے پہلو خوابگاہوں سے الگ رہتے ہیں اپنے پروردگار کو خوف اور امید کے ساتھ پکارتے ہیں یہاں مفسرین کا قول یہ ہے یدعون سے یصلون مراد ہے مطلب یہ کہ رات کو نماز پڑھتے ہیں مگر طرز کلام سے عموم ظاہر ہو رہا ہے لہذا مطلق دعا و ذکر بھی مراد ہو سکتی ہے اسی لئے بزرگوں نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو تہجد کی توفیق نہ ہو تو وہ رات کو کسی وقت جاگ کر تین بار سبحان اللہ کہہ کر ہی سو رہا کرے وہ بھی یدعون ربھم خوفاً وّ طمعاً میں داخل ہو جائے گا بس دو تین بجے جب آنکھ کھل جائے سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ لیا کرے یہ تسبیح بھی کام آ جائے گی حق تعالیٰ کے یہاں بڑی رحمت ہے۔ اسی وسعت رحمت پر قاضی یحییٰ بن اکثم محدث کی حکایت یاد آ گئی کہ جب ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی روح کو حق تعالیٰ کی جناب میں پیش کیا گیا تو ان سے سوالات شروع ہوئے یہ کسی بات کا جواب نہیں دیتے اور ہکا بکا خاموش کھڑے ہیں ادھر سے سختی کے ساتھ حکم ہوا کہ بڈھے بولتا کیوں نہیں تو آپ نے حدیث بیان کرنا شروع کی حدثنا فلان عن فلان عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال ان اللہ یستحی من ذی الشیبۃ المسلم ہم سے

فلاں نے اور ان سے فلاں نے روایت کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ بڈھے مسلمان سے حیا فرماتے ہیں تو میں اس وقت اس لئے خاموش ہوں کہ سوچ رہا ہوں کہ یہاں اس حدیث کے خلاف میرے ساتھ معاملہ کیوں ہو رہا ہے کیا اس حدیث کے راوی ثقہ نہیں یا کیا بات ہے، وہاں سے ارشاد ہوا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں اور تمہارے راوی بھی سب ثقہ جاؤ آج ہم تم کو اسی حدیث کی وجہ سے بخشتے ہیں اور بڈھا سمجھ کر چھوڑے دیتے ہیں ۔

رحمت حق بہانہ می جوید ❊ رحمت حق بہا نمی جوید

(رحمت حق بہانہ ڈھونڈتی ہے۔ رحمت حق قیمت نہیں تلاش کرتی ہے) تو جس طرح قاضی یحییٰ کا حدثنا حدثنا بلکہ بڑھاپا وہاں کام آگیا اسی طرح انشاء اللہ آپ کا رات کو کروٹیں بدلتے ہوئے اللہ اللہ کرلینا بھی کام آجائیگا۔ اور آپ تہجد والوں میں شمار ہو جاویں گے اور بے نماز کے تہجد ہوگی گویا صرف اذان ہی ہوگی جیسے مرغا رات کو اذان دیا کرتا ہے اور نماز نہیں پڑھتا۔ بس آپ کی بھی اذان اذان ہی ہوگی نماز تو ہوگی نہیں مگر خدا کے واسطے اس اذان کی تشبیہ سے اس وقت چلا چلا کر سبحان اللہ یا اللہ اللہ مت کہنے لگنا کہیں سونے والوں کی نیند میں خلل آوے پھر تو وہ پریشان کرنے میں حافظ جنازہ کی اذان ہو جائے گی (یہ اس خانقاہ کے متعلقین میں سے ایک بھولے شخص تھے) جو ایک غیر آباد مسجد میں موذن تھے۔ ایک دفعہ مغرب کے بعد کھانا کھا کر سو گئے زیادہ رات گئے جو آنکھ کھلی تو آپ نے عشاء کی اذان کہی تقریباً بارہ بجے ہوں گے پھر خیال ہوا کہ کوئی صبح کی اذان سمجھ کر سحری سے نہ رک جائے تو اذان کے بعد یہ بھی پکار دیا کہ یہ عشاء کی اذان ہے صبح کی نہیں ہے لوگ پریشان نہ ہوں یعنی مسجد میں نہ آویں پڑے سوتے رہیں اور کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ عبداللہ بن عباس کے موذن نے بھی تو اذان کے اخیر میں

الاصلوا فی الرحال کہا تھا کہ اپنے گھروں ہی میں نماز پڑھ لو مسجد میں آنے کی ضرورت نہیں بات یہ ہے کہ وہ اذان تو بوقت پڑھی اس لئے ادائے سنت کے لئے اعلان کے ساتھ اذان دیکر الاصلوا فی الرحال کہدیا تھا تاکہ لوگ پریشانی سے بچیں۔ بخلاف حافظ جنازہ کی اذان کے کہ بیوقت تھی اس لئے خود پریشانی کا سبب تھی ان سے کوئی پوچھے کہ جب تم کو بلانا مقصود نہیں اور نہ ۱۲۔ بجے لوگ آسکیں تو ایسے وقت میں چلا کر اذان دینے کی کیا ضرورت تھی آہستہ ہی اذان کہہ لی ہوتی اس سے بھی سنت ادا ہو جاتی غرض شریعت نے جاگنے کے ساتھ ذکر استغفار وصلوٰۃ کو بھی مشروع فرمایا ہے محض بیداری پر اکتفا نہیں کیا پھر اس میں بھی کوئی یہ قید نہیں کہ دو بجے اٹھو یا تین بجے اٹھو بس صبح سے پہلے اٹھنا چاہیے۔ حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا ہے ان ربك یعلم انك تقوم ادنیٰ ثلثی اللیل ونصفهٗ وثلثهٗ وطائفة من الذین معك واللہ یقدر اللیل والنہار ط آپ کے پروردگار کو معلوم ہے کہ آپ کبھی دو تہائی رات سے کچھ کم جاگتے ہیں کبھی آدھی رات اور کبھی تہائی رات جاگتے ہیں اور ایک جماعت بھی ان لوگوں میں سے جو آپ کے ساتھ ہے اس کے بعد فرماتے ہیں واللہ یقدر اللیل والنہار کہ رات اور دن کا پورا اندازہ حق تعالیٰ ہی کرتے ہیں یہ جملہ بیکار نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم اندازہ ٹھیک طور پر نہیں کر سکتے کہ ہمیشہ ایک ہی وقت پر اٹھو اس لئے کسی خاص وقت کی تعیین لازم نہیں کی جاتی جب آنکھ کھل جائے اسی وقت اٹھ جانا چاہیئے یہی معنی ہیں اس کے جو فرمایا ہے علم ان لن تحصوہ فتاب علیکم فاقرءوا ما تیسر من القرآن ط اور پھر بیماروں کو اور کسب معاش کرنے والوں کو دقت تھی ان کی آنکھ بعض صبح کے قریب ہی کھلتی ہے تو ارشاد فرماتے ہیں علم ان سیکون منکم مرضٰی وآخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ وآخرون یقاتلون فی سبیل اللہ فاقرءوا ما تیسر منه ط یعنی بیماروں اور مسافروں کو زیادہ

بیداری معاف ہے۔ ان کی جب آنکھ کھل جائے صبح سے پہلے پہلے وہ جتنا قرآن پڑھ سکیں نمازیں پڑھ لیا کریں چاہے دو ہی رکعت پڑھ لیا کریں اس سے بھی کامل ثواب مل جائے گا۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو حدیث میں آتا ہے کہ بعد وتر کے دو رکعت پڑھ لیا کرے اس کی نسبت کفتاہ وارد ہے جس کی ایک تفسیر یہ ہے کہ اس سے بھی تہجد کا ثواب مل جاتا ہے۔ سبحان اللہ ہماری رڈیلوں کی بھی تو رعایت ہے کہ تجارت کے لئے سفر کرو تو طویل بیداری معاف ہے جتنا ہو سکے کر لیا کرو۔ کوئی طبیب ایسا ہے جو یوں کہدے کہ اس نسخہ میں سے آدھا پی لو یا ربع پی لو یا ایک گھونٹ ہی پی لو تو صحت کے لئے کافی ہے ایسا کوئی طبیب نہ ملے گا وہ تو قدحے ہی پلاوے گا۔ مگر حق تعالیٰ ایسے ہیں کہ رعایت پر رعایت فرماتے جاتے ہیں کہ زیادہ نہ ہو سکے تو اخیر شب میں دو رکعت ہی پڑھ لو اتنا بھی نہ ہو سکے تو سونے سے پہلے وتر کے بعد دو رکعت پڑھ لو یا رات کو دو تین بار سبحان اللہ ہی کہہ لو بس کافی ہے۔ غرض یہاں بھی ترک منام کے ساتھ فعل مشروع ہوا ہے محض بیداری پر اکتفا نہیں فرمایا۔ اور اس میں ایک مسئلہ دقیقہ پر تنبیہ فرمادی ہے۔ تمہید اس کی یہ ہے کہ بعض لوگ مجاہدات بمعنے ترک ہی کو مقصود سمجھ جاتے ہیں ان میں بعض تو ملحد ہیں جو ضرورت اعمال ہی کے منکر ہیں اُن سے تو اس وقت بحث نہیں غضب تو یہ ہے کہ بکثرت اہل علم کا بھی یہی حال ہے کو اعتقاد نہ ہو کہ وہ مجاہدات حکمیہ تقلیل طعام و تقلیل منام و تقلیل کلام و تقلیل اختلاط مع الانام کو نہایت اہتمام سے اختیار کرتے ہیں اور گو جانتے ہیں کہ ان سے مقصود سہولت فی الاعمال ہے مگر باوجود اس کے پھر کیفیات کو حالاً مقصود سمجھتے ہیں اور اعمال کو حالاً اصل مقصود نہیں سمجھتے گو ان کا یہ اعتقاد نہ ہو مگر برتاؤ یہی ہے۔

چنانچہ مجاہدات کے بعد جب ان پر کیفیات ذوق وشوق ونشاط کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ کام میں لگے رہتے ہیں اور جہاں کبھی کسی وجہ سے ان کیفیات میں کمی پیدا ہوئی تو اب یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا مجاہدہ ہی بیکار ہوا اور ہمارا رتبہ خدا کے یہاں کم ہوگیا پھر اس خیال کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اعمال ہی سے بے رغبتی ہو جاتی ہے اب اگر جاہل ہے تو اعمال بالکل چھوٹ گئے اور اگر پکے ہوئے تو استغفار میں لگ گئے تاکہ وہ کیفیت عود کر آئے۔ استغفار اچھی چیز ہے مگر اس حالت کا تو علاج نہیں خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم۔ تمہارا وہ خیال ہی غلط ہے کہ میں مردود ہوگیا جس کے تدارک کے لئے استغفار کر رہے ہو نہ مجاہدہ بیکار ہوا نہ تم مردود ہوئے۔

اصل بات یہ ہے کہ کبھی تو ابتداء میں مجاہدہ کا اثر جدت کی وجہ سے زیادہ ہوتا ہے ذوق وشوق کا غلبہ ہوتا ہے اور اب انس کی حالت ہے جس میں غلبہ نہیں رہا اس لئے کیفیات میں کمی ہوگئی تو بھلا استغفار سے حالت انس مبدل بحالت ابتداء کیونکر ہو جائے گی۔ کبھی کبھی بیماری کی وجہ سے کیفیات میں کمی آجاتی ہے استغفار اس کا رافع کیونکر ہوگا۔ کبھی حق تعالیٰ کی طرف سے امتحان ہوتا ہے کہ ہمارا بندہ اپنے لطف کے واسطے ہی کام کرتا ہے یا ہم اس کے مطلوب ہیں اس لئے کیفیات سلب کر لی جاتی ہیں۔ یہاں استغفار سے کیسے کام چلے گا۔ اکثر مشائخ ایسے شخص کو استغفار تعلیم کرتے ہیں اور جب استغفار میں بھی دل نہ لگا تو کچھ اور وظیفہ بتلا دیتے ہیں، جب اس سے بھی جی گھبرایا تو کچھ اور بتلا دیتے ہیں۔ اب یہ شخص مجموعۃ الاوراد ہو جاتا ہے۔ مگر مرض اب بھی جوں کا توں ہے۔ البتہ اگر خوش قسمتی سے اسے کوئی طبیب الٰہی مل گیا وہ ان تعلیمات کو سن کر کہے گا ؎

گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند ؛ آں عمارت نیست ویراں کردہ اند
(اس طبیب روحانی نے کہا کہ ان حکمائے یونان نے جو علاج بھی کیا
وہ سب غلط اور بجائے تعمیر کے تخریب کی راہ ہے)
بیخبر بودند از حالِ دروں ؛ استعیذ اللہ مما یفترون
(یہ لوگ اندر کے حال سے بیخبر ہیں اللہ تعالیٰ سے پناہ چاہتا ہوں جو کچھ یہ لوگ افترا کر رہے ہیں
اور یہ قلت کیفیات کسی معصیت کی وجہ سے تھوڑا ہی تھی جو استغفار بتلا دیا بلکہ
اس کا منشا تو کچھ اور تھا ؎

دید از زاریش کو زار دل ست ؛ تن خوش ست اما گرفتار دل ست
(اس کی زاری سے دل کا راز سمجھ لیا کہ جسم بیمار نہیں دل گرفتار عشق ہے۔)
عاشقی پیدا است از زاری دل ؛ نیست بیماری چو بیماری دل
(عاشقی دل کے زاری سے پیدا ہوتی ہے دل جیسی بیماری دنیا میں نہیں ہے)
اب طبیب الٰہی علاج کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ اس مرض کی دوا یہ ہے کہ تم
ان کیفیات پر التفات ہی نہ کرو اگر کیفیات نہ رہیں نہ سہی خدا تو ہے۔
روزہا گر رفت گو رو باک نیست ؛ تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست
(اگر کیفیات نہ رہیں تو غم نہ کرو خدا تو موجود ہے۔ دن و رات تو آنے جانے والے ہیں
آپ تو باقی ہیں اور آپ کی طرح کون ہے جو تغیرات سے پاک ہے)
طاعات میں صرف خدا کو مطلوب سمجھو کیفیات کو ہرگز مطلوب نہ سمجھو بلکہ جس کو وصال
سمجھ رہے ہو اس پر بھی نظر نہ کرو ہمکو وصال میسر ہوگا یا نہیں تم صرف عمل کو مقصود
سمجھو ہمت سے اسی میں لگے رہو اور زبان حال سے یوں کہتے رہو ؎
یابم اورا یا نہ یابم جستجوئے میکنم ؛ حاصل آید یا نہ آید آرزوئے میکنم
(اسکو پاؤں یا نہ پاؤں جستجو کیے جاتا ہوں۔ اسے حاصل کرلوں یا نہ کرسکوں اسکی آرزو کیا کرتا ہوں)

عارف فرماتے ہیں ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب کہ حیف باشد از و غیر او تمنا ے

(فراق اور وصل کوئی چیز نہیں دوست کی رضا طلب کرو اس کی رضا کے علاوہ کسی چیز کی تمنا کرنا قابل افسوس ہے)۔ اور ؎

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق
ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

(میری خواہش وصال کی ہے اور محبوب کی خواہش فراق کی ہے۔ پس اپنا ارادہ ترک کر دو تاکہ محبوب کی مراد پوری ہو)

ارید وصاله و یرید ہجری فاترک ما ارید لما یرید

(میں ارادہ کرتا ہوں اس کے وصال کا وہ ارادہ کرتا ہے میری جدائی کا پس اپنا ارادہ ترک کرتا ہوں اس کے ارادہ کی کامیابی کی خاطر سے)

عارف کہتا ہے کہ تم کیفیات کو کیا لئے پھرتے ہو ہمارے نزدیک تو فراق و وصل بھی کوئی چیز نہیں بلکہ اصل چیز رضائے محبوب ہے جس کا ذریعہ عمل ہے۔ جب تک تم عمل میں لگے رہوئے ہو رضا حاصل ہے اور جب رضا حاصل ہے تو سب کچھ حاصل ہے چاہے وصال ہو یا نہ ہو کیفیات ہوں یا نہ ہوں اس تعلیم کے بعد راستہ صاف نظر آنے لگتا ہے اور ساری پریشانی ایک منٹ میں جاتی رہتی ہے۔

اس تعلیم کا خلاصہ پھر کہے دیتا ہوں کہ کیفیات پر نظر نہ کرو محقق ایک نکتہ میں علاج کر دیتا ہوں بشرطیکہ اس کا انقیاد کرو ہمارے حاجی صاحب کی یہی تعلیم تھی جب کوئی ذاکر شکایت کرتا کہ حضرت ذکر سے نفع نہیں ہوتا تو فرماتے یہ کیا کچھ کم نفع ہے کہ تم ذکر تو کر رہے ہو حالانکہ خدا کی ایک مخلوق اس سے محروم ہے۔

اب اس تمہید کے بعد سمجھو کہ شریعت نے مجاہدات کے ساتھ اعمال کی قید لگا کر جس نکتہ

پر تنبیہ کی ہے وہ یہ ہے کہ اصل مقصود رضاء الٰہی ہے جس کا طریق عمل ہے اور مجاہدات حکمیہ اس کے لئے محض سبب سہولت ہیں خود مقصود نہیں پس اگر عمل موجود ہوا اور مجاہدہ کے آثار خاصہ مرتب نہ ہوں تو کچھ حرج نہیں اور اگر مجاہدہ کے آثار خاصہ موجود ہوں اور عمل مفقود ہو تو وہ محض بیکار چیز ہیں اس لئے شریعت نے ہر مجاہدہ کے ساتھ ایک نہ ایک عمل بتلا دیا روزہ میں بھی اعمال کی ترغیب دی ہے تاکہ معلوم ہو کہ تقلیل طعام خود مقصود نہیں بلکہ عمل مقصود ہے اور تقلیل منام کی صورت بھی تراویح اور تہجد کی نماز میں تجویز کی ہے تاکہ معلوم ہو کہ محض جاگنا مقصود نہیں بلکہ عمل مقصود ہے۔ پس اگر یہ عمل نہ ہوں تو تقلیل منام کی عادۃ کوئی فائدہ مند چیز نہیں اور اگر اعمال موجود ہیں اور تقلیل منام کا ثمرہ حاصل نہ ہو کیفیات طاری نہ ہوں تو بے فکر رہو غرض شریعت نے کسی مجاہدہ حکمیہ کو مجاہدہ حقیقیہ سے خالی نہیں رکھا اور کسی جگہ محض ترک پر اکتفا نہیں کیا یہ فرق ہے مجاہدہ عرفیہ اور مجاہدہ شرعیہ میں یہ دوسرا رکن تھا مجاہدہ کا جس کے متعلق اس وقت بیان ہوا۔ اب دو رکن اور رہے ان شاء اللہ ان کے متعلق پھر کبھی بیان ہو جائے گا۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور اس بیان کا نام تقلیل المنام بصورۃ القیام تجویز کرتا ہوں۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائے اور عمل کی توفیق عنایت ہو۔ آمین وصلی اللہ علیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ط

اللہ تعالیٰ کا بے انتہا شکر ہے

الابقاء ۱۹۷۸ء کا سال پورا ہو گیا آپ نے جو زر سالانہ ۱۹۷۸ء میں بھیجا تھا وہ ختم ہو گیا۔ اب جدید سال ۱۹۷۹ء کے لئے پندرہ ۱۵ روپے جلد سے جلد ارسال فرما دیں۔ امید کرتا ہوں ۱۹۷۹ء میں بھی اپنی خریداری قائم رکھتے ہوئے اپنے منی آرڈر کے ساتھ جدید خریداروں کا بھی زرسالانہ ارسال فرما کر الابقاء کی توسیع اشاعت میں مدد فرمادیں گے۔ والسلام

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ مسمّٰی بہ

تقلیل الکلام

— بصورۃ —

تلاوۃ کلام الملک العلام

حکیم الاُمّت مجدّد الملّت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر:- محمد عبدالمنان غفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی — دفتر الابقار

مسافر خانہ بندر روڈ / ایم اے جناح روڈ کراچی ۱

ضروری اطلاع:- خط و کتابت کرتے وقت یا پتہ بدلتے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرماویں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ مسمیٰ بہ

تقلیل الکلام

بصورۃ

تلاوۃ کلام الملک العلام

(الوعظ مسمیٰ بہ تقلیل الکلام + بصورۃ تلاوۃ کلام الملک العلام وہو الجزء والثالث من اجزاء ابواب المجاہدہ + واسباب المشاہدہ

این	متےٰ	کم	کیف	لم	ماذا	من ای شان	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کیونکر ہوا	سبب کیا ہوا	کیا مضمون تھا	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون	۱۲ رمضان ۱۳۴۰ھ بعد نماز جمعہ	ساڑھے تین گھنٹے (۳½)	کھڑے ہوکر	ان جملہ مواعظ متحدۃ المعانی کا سبب واحد ہی ہے	شریعت نے تقلیل کلام کی صورت تلاوت قرآن کے ضمن میں مشروع کی ہے اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہوسکتی اور مجاہدہ عرفیہ پر اس کی فضیلت کے وجوہ و دلائل	سب مسلمانوں کو عموماً اور اہل ریاضات کو خصوصاً	احقر ظفر احمد تھانوی عفا اللہ عنہ وکان لہ	تقریباً ۱۰۰	×

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان

ان لاالٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللہ تعالٰی علیہ و علیٰ اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وان اللہ لمع المحسنین۔ یہ وہی آیت ہے جس کی اس کے قبل دو دفعہ تلاوت کی گئی ہے اور آج پھر تلاوت کی گئی ہے کیونکہ اس کے ذیل میں جو مضمون بیان ہو رہا ہے وہ ابھی تمام نہیں ہوا اس سے پہلے بیان ہوچکا ہے کہ مجاہدات حکمیہ کی چار قسمیں ہیں۔ تقلیل طعام۔ تقلیل منام۔ تقلیل کلام۔ تقلیل اختلاط مع الانام۔ ان میں سے دو کا بیان ہوچکا ہے اور دو باقی ہیں اور جن دو کا بیان ہوا ہے وہ مستقلاً نہیں ہوا بلکہ اس حیثیت سے بیان ہوا ہے کہ رمضان کی عبادت میں ان مجاہدات کی رعایت کی گئی ہے۔ اب دو جو باقی ہیں ان کی بھی اسی حیثیت سے تقریر ہوگی جن میں سے آج تقلیل کلام کے متعلق بیان کا ارادہ ہے اگرچہ بعض مقتضیات کی وجہ سے اس وقت تقلیل اختلاط مع الانام کا بیان ہونا چاہیے تھا کیونکہ یہ زمانہ اعتکاف کا ہے لیکن میں نے چند وجوہ سے تقلیل کلام کا بیان مقدم کیا ایک یہ کہ اعتکاف ایک خاص وقتی عبادت ہے جس میں اتنا عموم ضرورت نہیں جتنا تقلیل کلام میں عموم ضرورت ہے۔ اعتکاف سب لوگ نہیں کرسکتے بلکہ اگر سب کرنا چاہیں تو ان کو منع کیا جائے گا۔ کیونکہ اس سے حوائج وضروریات معطل ہوجائیں گی یہی وجہ ہے کہ اعتکاف سنت علی الکفایہ ہے۔ بستی بھر میں ایک آدمی اعتکاف کرلے توکافی ہے۔ اور تقلیل کلام کے مخاطب تمام افراد ہیں۔ فرداً فرداً اور اس پر سب کے سب عمل کرسکتے ہیں کیونکہ تقلیل کلام کی جو حقیقت آگے بیان کی جائے گی اس سے معلوم ہوجائے گا کہ اس پر سب کے عمل کرنے سے کسی ضرورت کا تعطل نہیں ہوسکتا۔ دوسرے تقلیل کلام کی رعایت جس عمل کے ضمن میں کی گئی ہے وہ عمل بھی بہ نسبت اعتکاف کے زیادہ عام ہے۔ چنانچہ آگے بیان کیا جائے گا کہ رمضان میں تلاوت قرآن کے ضمن میں تقلیل الکلام کی رعایت کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ عمل عام ہے تلاوت قرآن کرنے والوں کا عدد سے بہت زیادہ ہے۔ پھر یہ عمل ہر شخص کو اور ہر وقت

سہل ہے اور اعتکاف ہر اک کو آسان نہیں نہ ہر وقت ہو سکتا ہے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول بھی کثرت تلاوت کا تھا اور اعتکاف اس کثرت سے نہ کیا جاتا تھا۔ تیسرے خود قلت اختلاط اور قلت کلام میں فی نفسہٖ قلتِ کلام زیادہ ضروری ہے کیونکہ قلت اختلاط اگر نہ بھی ہو مگر تقلیل کلام کی عادت ہو تو غوائل سے بچ سکتا ہے اور اگر تقلیل کلام نہ ہو تو محض قلت اختلاط سے غوائل سے نہیں بچ سکتا۔ جو شخص زیادہ بک بک کرنے کا عادی ہوتا ہے وہ ایک ہی مجلس میں بہت باتیں گناہ کی کہہ ڈالتا ہے۔ الغرض جن اعمال کے ضمن میں تقلیل کلام و تقلیل اختلاط کی رعایت کی گئی ہے خود ان اعمال میں بھی تفاوت ہے اور خود ان دونوں مجاہدوں میں بھی تفاوت ہے ان وجوہ سے میں نے تقلیل کلام کے بیان کو مقدم کیا لیکن مثل جمعہ گذشتہ کے اس وقت بھی مضمون سابق کا کچھ تتمہ ذہن میں آگیا ہے اور وہ دو تتمے ہیں جن کو پہلے بیان کر دینا مناسب ہے میں نے پہلے بیان کیا تھا کہ شریعت نے محض ان مجاہدات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے ساتھ ساتھ اعمال بھی منضم کر دیئے گئے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ اصل مقصود اعمال ہیں اور مجاہدات تسہیل اعمال کا ذریعہ ہیں پس اگر مجاہدہ کا ثمرہ حاصل نہ ہو یعنی کیفیات نہ ہوں اور اعمال موجود ہوں تو کافی ہے اور اگر اعمال نہ ہوں تو کیفیات کافی نہیں مثلاً ایک شخص نماز پڑھتا ہے روزہ رکھتا ہے زکوٰۃ دیتا ہے، بیوی بچوں کے حقوق ادا کرتا ہے۔ حرام آمدنی سے بچتا ہے کسی کا قرض لے کر نہیں مارتا جھوٹ اور غیبت وغیرہ سے اجتناب کرتا ہے مگر اس کو وہ ثمرات حاصل نہیں جو مجاہدہ پر مرتب ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً غلبۂ ذوق و شوق و یکسوئی وغیرہ نہیں تو یہ شخص بے فکر رہے اس کو مقصود حاصل ہے اور جو مفقود ہے وہ مقصود نہیں اس کا غم نہ کرے اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب اعمال کافی ہیں اور غلبہ ذوق و شوق و یکسوئی وغیرہ کی ضرورت نہیں تو طریق باطن کی کیا ضرورت ہے اعمال تو ہم ویسے بھی کر سکتے ہیں اتنی بات کے لئے مشائخ کی خدمت اور مجاہدات و ریاضات و اذکار و اشغال کی

کیا ضرورت رہی یہ تو بدون اس کے بھی ہو سکتا ہے اس شبہ والے نے مقصود طریق ہی کو نہیں سمجھا یہ شخص محض کیفیات ہی کو مقصود طریق سمجھتا ہے اسی لئے میرے اس کہنے پر کہ یہ کیفیات نہ ہوں تو بے فکر رہو اس کو طریق کے بیکار ہونے کا شبہ ہوا۔ "سخن شناس نہٗ دلبرا خطا اینجاست" میں پھر کہتا ہوں کہ کیفیات مقصود طریق نہیں بلکہ مقصود طریق اعمال ہی نہیں اور یہ کیفیات خود ان اعمال کے تابع ہیں اگر عمل نہ ہو تو یہ کیفیات کبھی باقی نہیں رہ سکتیں تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے مگر جو اعمال مقصود طریق ہیں ان میں یہ شرط ہے کہ ان میں خلوص ہو رہا یہ کہ پھر مقصود طریق کیا ہے تو سنئے کہ مقصود طریق اور خلوص فی الاعمال یہی باطن عمل ہے جس کے متعلق ارشاد ہے۔ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ اور حدیث میں ارشاد ہے ان تعبد اللّٰه کانک تراہ تو آپ نے میرے اس قول سے کہ اعمال کافی ہیں یہ مطلب سمجھا کہ محض ظاہری اعمال کافی ہیں اسی لئے طریق باطن کے بیکار ہونے کا شبہ ہوا حالانکہ میرا مطلب یہ تھا کہ اعمال مع اپنی صورت ظاہرہ اور مع اپنی روح کے موجود ہوں تو کافی ہیں اور روح اعمال خلوص ہے اور تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس خلوص کے حصول میں طرق صوفیہ سے سہولت ہو جاتی ہے علم باطن میں ان ہی طرق کا بیان ہوتا ہے اور اسی کے لئے مشائخ کی صحبت اختیار کی جاتی ہے اور اسی کے لئے اذکار و اشغال بتلائے جاتے ہیں۔ اسی خلوص میں کیفیات ذوق و شوق و یکسوئی سے بھی سہولت ہو جاتی ہے لیکن خلوص ان پر موقوف نہیں خلوص اس کے بغیر بھی حاصل ہو سکتا ہے گو دقت اور مشقت سے ہی ہو مگر ہو سکتا ہے اور طریق باطن سے یہ سہولت حاصل ہو جاتی ہے اور حقیقت اس خلوص کی یہ ہے کہ مثلاً نماز پڑھے تو اس میں ریا نہ ہو عجب نہ ہو قصداً حضار وساوس نہ ہو۔ تو اب اگر کوئی شخص نماز پڑھنے کھڑا ہوا اور سوائے رضائے حق کے اس کی کوئی غرض نہیں اور جو غرض بھی آتی ہے اس کو دفع کرتا ہے اور وساوس بھی دل میں خود نہیں لاتا تو یہ نماز خلوص کے ساتھ تمام ہوئی ہاں اگر یہ شخص کیفیات سے خالی ہے تو اس کے اہتمام میں اس کو مشقت بہت ہو گی لیکن اگر وہ اس مشقت کو

برداشت کرتا رہے اور ہمت کرکے از خود نماز میں کوئی وسوسہ نہ لادے نہ ریا، و عجب کو پاس آنے دے تو مقصود میں یہ شخص کامیاب ہے اور اس کو مشقت کی وجہ سے اجر بھی زیادہ ہوگا جس کی دلیل وہ حدیث ہے الذی یقرأ القرآن وھو بہ ماھر فھو مع السفرۃ الکرام البررۃ والذی یتعتع فیہ وھو علیہ شاق لہ اجران (او کما قال) لیکن اس مشقت کا روزانہ برداشت کرنا آسان نہیں بعض دفعہ آدمی گھبرا جاتا ہے اور نفس کو ڈھیل دیدیتا ہے تو نماز میں اول سے آخر تک وساوس ہی وساوس ہوتے ہیں کبھی عجب بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ ریا میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے سو طریق باطن کی تحصیل سے یہ مشقت باقی نہیں رہتی پھر حضور سہل ہو جاتا اور خلوص آسانی کے ساتھ حاصل ہو جاتا ہے تو طریق باطن بیکار نہ ہوا کیونکہ خلوص جو روح اعمال ہے وہ اس طریق سے بسہولت حاصل ہو جاتا ہے تو اب میرا یہ دعویٰ ثابت ہو گیا کہ اعمال کافی ہیں اور مقصود ہیں اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ طریق بیکار نہیں مقصود میں معین ہے اور برخلاف اس کے جب آدمی یہ عقیدہ کر لیتا ہے کہ کیفیات مقصود ہیں اور اعمال مقصود نہیں تو اس پر دو مفسدے مرتب ہوتے ہیں۔ ایسا تو کون ہوگا جو نماز کو مقصود نہ سمجھے مگر مقصود بالذات و بالعرض میں کلام ہے۔ بعض لوگ اعمال کو ان کیفیات کا وسیلہ سمجھتے ہیں اور مقصود بالذات کیفیات کو سمجھتے ہیں۔ اب ان کی حالت یہ ہے کہ نماز میں کیفیات حاصل ہوئی اور جی لگا تو سمجھتے ہیں کہ آج نماز پڑھی اور اگر جی نہ لگا تو سمجھتے ہیں کہ نماز نہیں پڑھی مگر فرض کو تو ترک نہیں کرتے فرائض کو تو گناہ کے خوف سے ادا کر لیتے ہیں لیکن جو اعمال مندوب ہیں جیسے تلاوت و ذکر اور نوافل وغیرہ ان کو تو چھوڑ ہی بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ تجربہ ہے کہ اکثر ذاکرین کی یہی حالت ہے کہ جب ذکر میں ان کا دل نہیں لگتا تو اس دن ذکر ناغہ کر دیتے ہیں نوافل میں جی گھبرایا تو ان کو بھی چھوڑ دیتے ہیں یاد رکھو یہ حالت سخت خطرناک ہے اگر تم جی لگنے کے ایسے ہی تابع رہو گے تو شیطان تم کو ہمیشہ عبادات و ذکر سے روکتا رہے گا جب وہ دیکھے گا کہ یہ شخص کثرت وساوس سے پریشان ہو کر کام ہی چھوڑ دیتا ہے تو وہ تمہارا پیچھا کبھی نہ چھوڑے گا اور تم کو اعمال سے معطل کر دیگا

ایسے وقت میں وہی شخص کام کر سکتا ہے جو کیفیات کو مقصود نہ سمجھے عمل کو مقصود سمجھے وہ ہر حالت میں کام کرے گا خواہ دل لگے یا نہ لگے ان لوگوں نے ایک شعر یاد کر رکھا ہے جس کو اکثر واعظین وعظ میں پڑھا کرتے ہیں اور اس کو مولانا رومی کی طرف منسوب کرتے ہیں ؎

بر زباں تسبیح در دل گاؤ خر　　　　این چنیں تسبیح کے دارد اثر[1]

(زباں پر تسبیح ہے۔ اور دل میں گائے اور گدھے کا دھیان ہے اس طرح کی تسبیح کب اثر رکھتی ہے)

مگر میرے علم میں یہ مولانا کا شعر نہیں ہے مثنوی میں اس کا پتہ نہیں، غالباً بہاؤالدین عاملی کا شعر ہے اور وہ کوئی محقق نہیں، میرے نزدیک اس شعر کا مضمون بھی صحیح نہیں بلکہ تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ۔ "این چنیں تسبیح ہم دارد اثر" رات دن کا تجربہ ہے کہ ابتدا میں وساوس کی کثرت ہوتی ہی ہے بہت کم ذاکر ایسے ہوں گے جن کی ابتدا میں وسوسے نہ آتے ہوں۔ مگر میں ذاکرین سے کہدیتا ہوں کہ اس طرف التفات نہ کرو وساوس کے ساتھ ہی ذکر کرتے رہو رفتہ رفتہ حضور حاصل ہو جائے گا چنانچہ وہ ذکر مع الوساوس ہی ایک نہ ایک دن اپنا اثر دکھاتا ہے اور زبانی تسبیح اپنا رنگ لاتی ہے اور حضور میسر ہو جاتا ہے۔ پس میں کیسے مان لوں کہ وسوسہ کے ساتھ ذکر نافع نہیں ہوتا ہاں اگر اس شعر میں یہ تاویل کی جائے کہ جو شخص ذکر کے وقت خود وساوس کو جمع کر کے لاتا ہے تو ایسا ذکر مؤثر نہیں تو وہ شعر صحیح ہو سکتا ہے گو ذکر بیکار اب بھی نہیں ثواب تو ملے ہی گا کیونکہ زبان تو ذکر میں مشغول ہے مگر اس صورت میں قلب پر اس کا اثر نہ ہوگا یہ قلب کو از خود دوسری طرف متوجہ کر رہا ہے تو ذکر کی طرف خاک توجہ ہوگی اور جب ذکر کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا تو قلب پر اثر کیسے ہوگا لیکن اگر از خود وساوس نہیں لاتا بلکہ وساوس بلا قصد آتے ہیں اور یہ ان پر التفات نہیں کرتا تو یہ ذکر نافع بھی ہے اور مؤثر بھی اور اس صورۃ میں وہ قول صحیح نہیں بلکہ اس کی نقیض صحیح ہے۔ کہ این چنیں تسبیح ہم دارد اثر۔ اور

[1] اس طرح کی تسبیح بھی اثر رکھتی ہے۔

اگر وساوس مطلقاً مضر ہوتے اور اثر سے مانع ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے
جب صحابہ نے وساوس کی شکایت کی تھی آپ ان سے یہ کیوں فرماتے اوجدتموہ قالوا نعم
قال ذالک صریح الایمان آپ فرماتے ہیں کیا تم کو وسوسے آنے لگے اور تم نے ان کو
اپنے اندر پالیا صحابہ نے عرض کیا ہاں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے فرمایا
کہ یہ تو خالص ایمان ہے مطمئن رہو۔ جو لوگ ذکر میں جی نہ لگنے سے ذکر چھوڑ بیٹھتے ہیں
معلوم ہوتا ہے کہ ان کو خدا سے تعلق ہی نہیں اور اس کی طلب ہی نہیں ورنہ صاحب
بھوکا آدمی کھانا سامنے آنے کے بعد یہ نہیں دیکھا کرتا کہ اس میں نمک ہے یا نہیں بھوکے
کو مزے سے کیا بحث اسے تو کھانے سے کام ہاں جس کا پیٹ بھرا ہوا ہو اس کو یہ نخرے
سوجھتے ہیں، اگر مزہ آیا کھالیا مزہ نہ آیا چھوڑ کر الگ ہو گیا پس تم کو بھی اگر طلب اور
بھوک ہوتی تو تم مزہ کو ہرگز نہ دیکھتے بلکہ تمہارا یہ مذاق ہوتا ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب ✼ کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

(فراق اور وصل کوئی چیز نہیں رضائے دوست طلب کرو محبوب حقیقی کی رضا کے
علاوہ کسی چیز کی طلب قابل افسوس ہے)

صاحب یہ تو خداتعالیٰ کی طرف سے تمہارا امتحان ہے کہ ذکر میں لذت کے طالب ہو
یا ہمارے طالب ہو اگر تم کو خدا سے تعلق اور عشق ہوتا اور اسی کی طلب ہوتی تو یہ
حال ہوتا ؎

"گر مرادت را مذاق شکر است" (اگر تمہارے مراد کی لذت شکر کی طرح ہے)۔
یعنی یہ مسلم لیکن ؎ "بیمرادی ہم مراد دلبر است" (لیکن نامرادی محبوب کی مراد
ہے جو اس سے زیادہ لذیذ ہونی چاہیئے) افسوس تم محبوب کی مراد پر
اپنی مراد کو مقدم کرتے ہو ارے جب وہی چاہتے ہیں کہ وساوس کے ساتھ ہی
ہمارا ذکر کرو تو تم وساوس سے خالی ہونا کیوں چاہتے ہو اور ذکر کے لئے اس
انتظار میں کیوں ہو کہ جی لگے تو کروں ؎

بس زبون وسوسہ باشی دلا ✼ گر طرب را باز دانی از بلا

(یعنی اپنے دل میں بُرا وسوسہ ہے کہ تو عاشق ہو کر طرب اور تعب میں فرق کرتا ہے۔ یعنی عاشق کو محبت کے راستے میں مشقت کو بھی لذیذ سمجھنا چاہیے)

جو شخص طرب اور تعب میں فرق سمجھے وہ ابھی تک وسوسہ نفسانی کا شکار ہے ذاکر کو ہر حال میں اپنا کام کرنا چاہیئے۔ خواہ طرب ہو یا تعب ہو ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب ٭ کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

(فراق اور وصل کوئی چیز نہیں رضائے دوست طلب کر و محبوب حقیقی کی رضا کے علاوہ کسی چیز کی طلب قابل افسوس ہے)

یہ شخص اس کو فراق سمجھتا ہے کہ لذت میں کمی ہو گئی سمجھتا ہے کہ بس میں مردود ہو گیا ارے کیا کیفیت خدا ہے جس کے زوال سے یہ سمجھتا ہے کہ میں خدا سے دور ہو گیا جب یہ خدا نہیں تو پھر اس کے طالب کیوں ہوتے ہو طالب خدا ہو کر غیر پر نظر افسوس کی بات ہے شاید یہاں کوئی ذہین یہ شبہ کرے کہ رضائے خدا کیا ہے ظاہر ہے کہ خدا نہیں تو پھر تم رضا کے طالب کیوں ہو تم بھی طالب غیر خدا ہوئے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ رضا گو عین خدا نہیں مگر غیر بھی نہیں کیونکہ رضا صفات الٰہیہ میں سے ہے۔ اور صفات لا عین لا غیر ہیں یہ تو اجمالی جواب ہے جو اہل علم کے مناسب ہے اور تفصیلی جواب یہ ہے کہ طلب خدا کی تفسیر یہی ہے کہ رضار خدا کو طلب کرے (اِبْتِغَاءَ وَجْهِ اللهِ کے معنی یہی ہیں کہ ابتغاء مرضاۃ اللہ ہو چنانچہ حق تعالٰے نے ایک مقام پر تو یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ فرمایا ہے اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللهِ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ الآیۃ یہاں طلب رضار کا حکم ہے معلوم ہوا کہ ابتغار وجہ اللہ یہی ہے کہ رضاء الٰہی کا طالب ہو اور راز اس میں یہ ہے کہ خدا تعالٰی کی طلب بدون واسطہ صفات کے دشوار ہے۔ کیونکہ ذات کا نہ تصور ہو سکتا ہے نہ اس کا حصول ہو سکتا ہے۔ ذات کا تصور جب ہو گا صفات کے ہی واسطے سے ہو گا اور بلا واسطہ یعنی تصور بالکنہ اس کی ذات کا محال ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

در تصور ذات او را گنج کو　　　نا در آید در تصور مثل او

(ہمارے تصور میں اللہ تعالیٰ کی ذات غیر محدود کیسے آسکتی ہے تصور میں جو کچھ آتا ہے وہ مثل ہے)

عارف شیرازی اسی کی نسبت کہتے ہیں ؎

عنقا شکار کس نہ شود دام باز چیں　　　کیں جا ہمیشہ باد بدست است دام را

(عنقا کا شکار کوئی شخص نہیں کر سکتا جال یہاں سے ہٹالے کہ عنقا کے شکار کی ہوس جس نے کی اس کے جال میں سوا ہوا کے کچھ حاصل نہ ہوا)

کسی شاعر نے اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

بر و ایں دام بر مرغ دگر نہ　　　کہ عنقا را بلند است آشیانہ

(اے مخاطب جا اور جال کسی دوسری چڑیا کے لئے لگا کہ عنقا کا آشیانہ تیرے جال سے بہت بلند ہے)

اسی واسطے عراقی اور غزالی نے ایک روایت نقل کی ہے جس کی تخریج عراقی نے ابو نعیم واصبہانی سے کی ہے لا تفکروا فی اللہ فانکم لن تقدروا قدرہ یعنی خدا کی ذات میں تفکر نہ کرو تم اس کا احاطہ نہیں کر سکو گے تو جس ذات میں تصور بالکنہ محال ہے اس کی طلب بلا واسطہ کیونکر ہو سکتی ہے پس رضا کی طلب یہی طلب خدا ہے اور اسی کی طلب کا امر بھی ہے اگر یہ کہو کہ جنت کی طلب کا بھی تو امر ہے اور وہ یقیناً غیر خدا ہے تو طلب غیر خدا جائز ہوئی تو پھر کیفیات کی طلب میں کیا حرج ہے اگر وہ طلب رضا کے برابر نہیں تو طلب جنت ہی کے مثل سہی اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو جنت کی طلب کا امر درجۂ مقصودیت میں نہیں بلکہ اس کا امر بھی طلب رضا ہی کے لئے ہے کہ جنت چونکہ محل رضا ہے اور رضا مقصود ہے اس لئے محل کو بھی طلب کرنا چاہئے پس محل رضا کی طلب حقیقت میں رضا ہی کی طلب ہے اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے اللّٰھم انی اسئلک رضاک والجنۃ واعوذبک من سخطک والنار اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اول رضا کو طلب کیا پھر جنت کو کیونکہ وہ محل رضا ہے اور

اول غضب الٰہی سے پناہ مانگی ہے پھر جہنم سے کیونکہ وہ محل غضب ہے اس حدیث نے مطلع صاف کر دیا کہ اصل مقصود رضا ہے اور جنت مقصود بالذات نہیں بلکہ محل رضا ہونے کی وجہ سے مطلوب ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

بے تو جنت دوزخ است اے دلربا　　　با تو دوزخ جنت است اے جانفزا

(اے محبوب تیرے بغیر جنت بھی مجھ کو دوزخ ہے اور اگر تو ساتھ رہے تو دوزخ بھی مجھے جنت ہے)

غرض جنت مقصود بالذات تو نہیں سمجھا جاتا بخلاف کیفیات کے کہ اکثر ذاکرین ان کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں چنانچہ جی نہ لگنے کے وقت عمل کو چھوڑ دینا یا ذکر میں کمی کرنا اس کی علامت ہے اس پر مجھے انکار ہے باقی میں کیفیات کو بیکار تو نہیں کہتا ان سے عمل میں سہولت ضرور ہو جاتی ہے لیکن اگر وہ نہ ہوں تو عمل کیوں چھوڑا جائے سہولت سے نہیں صعوبت ہی سے کر لے۔ سو ایک فرق تو طلب جنت و طلب کیفیت میں یہ ہوا۔ دوسرے خود جنت و کیفیات میں ایک فرق ہے اس لئے ان کو متماثل نہیں کہہ سکتے وہ یہ کہ جنت لوازم رضا سے ہے اسی لئے موعود ہے اور کیفیات لوازم رضا سے نہیں اس لئے موعود بھی نہیں تو اس کی مقصودیت سے بھی گھٹی ہوئی ہے اسی لئے اکابر نے فرمایا ہے کہ کیفیات محمود ہیں مقصود نہیں البتہ محمود یا معین مقصود ہونے کے سبب اگر اس کے لئے دعا کی جاوے تو اس کی طلب یعنی دعا کا حرج نہیں تو اعانت طاعت میں اس کا درجہ صرف اس قدر ہے کہ اس سے مقصود یعنی عمل میں قدرے سہولت ہو جاتی ہے جیسے چٹنی سے کھانا آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسا کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ دسترخوان پر چٹنی نہ ہو تو ضروری کھانا ہی چھوڑ دیا جائے کیونکہ اصل مقصود تو غذا ہے چٹنی اس کے ہضم کے لئے معین ہے اس کو غذا کا موقوف علیہ نہیں بنایا جاتا بلکہ گاہے گاہے اگر دسترخوان پر چٹنی نہ آئے تو اچھا ہے تاکہ معدہ اس کا عادی ہو کر کمزور نہ ہو جائے اسی طرح گاہے گاہے کیفیات کا نہ ہونا بھی اچھا ہے تاکہ نفس ان کا عادی نہ ہو جائے۔ پھر ان کے بغیر کام ہی نہ کرے گا حالانکہ طالب کی شان تو یہ ہونی چاہئے کہ کیفیات کا

نہ ہوتا تو کیا اگر غیب سے یہ بھی آواز آجائے کہ تیرا عمل کچھ قبول نہیں تو مردود ہے اور یقین ہو جاوے کہ یہ ندا غیبی ہے جب بھی اپنے کام میں لگا رہے اور ہرگز عمل کو ترک نہ کرے۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شخص کا قصہ لکھا ہے کہ وہ مجاہدات بہت کرتا تھا راتوں کو تہجد پڑھتا تھا مگر اس کو کیفیات تو کیا ہوتیں ایک دن غیب سے اس کو ایسا فضیحت کیا گیا کہ رات کو جب وہ تہجد کے لئے اٹھا تو ہاتف نے آواز دی کہ جو چاہے کر یہاں کچھ قبول نہیں اور یہ آواز اس زور سے آئی کہ اس کے ایک مرید نے بھی سُن لی مگر وہ اللہ کا بندہ اس پر بھی اپنا کام پورا کر کے ہٹا اگلی رات ہوئی تو پھر لوٹا بدھنا لیکر تہجد کو اٹھے مرید نے کہا اجی غیرت بھی کوئی چیز ہے جب وہ کچھ بھی قبول نہیں کرتے تو پھر کاہے کے لئے مصیبت جھیلتے ہو پڑ کے سو بھی رہو مرید کی اصلی رائے یہ نہ تھی کہ شیخ کام چھوڑ دے لیکن اپنے محسن کی حالت پر اس کا جی کڑھا اس لئے یہ بات منہ سے نکل گئی اس کو اپنے شیخ کی حالت پر رنج تھا اب شیخ کا جواب سنئے واقعی طالب ایسے ہوتے ہیں نہ کہ آجکل جیسے کہ ایک دن نماز میں جی نہ لگا تو نہ تہجد ہے نہ ذکر ہے اس نے کہا بیٹا یہ تو معلوم ہے کہ وہ کچھ قبول نہیں کرتے مگر ان کے سوا میرے لئے کوئی دوسرا دروازہ بھی تو نہیں کہ ان کو چھوڑ کر وہاں چلا جاؤں میرے لئے تو بس یہی ایک در ہے اسی پر جان دیدوں گا چاہے وہ قبول کریں یا رد کریں ؎

توانی ازاں دل بپرداختن ـــــ کہ دانی کہ بے او تواں ساختن

(اللہ تعالیٰ کے دروازہ سے بھاگ کر میں کہاں جاؤں بغیر اس دروازہ کے ہمارا کہاں اور ٹھکانا ہے)

بس اس پر رحمت الٰہی کو جوش آگیا اور دوبارہ ندا آئی ؎

قبول ست گرچہ ہنر نیستت ـــــ کہ جز ما پناہے دگر نیستت

(سب قبول ہے اگرچہ ہنر نہیں ہے کہ ہمارے سوا تیرا اور کوئی ٹھکانہ بھی تو نہیں ہے) اب بھی ایک چرکہ لگا دیا کہ ہنر تو کچھ نہیں مگر اس کے لئے قبول کر لیا کہ ہمارے سوا تیرے

لئے پناہ کوئی نہیں۔ مگر اس جرکہ کا مزا عشاق کے دل سے پوچھو ان کو اس پر وجد آتا ہے اور یوں کہتے ہیں ؎

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

(آپ نے برا کہا اور میں خوش ہوں اللہ تعالیٰ آپ کو معاف کرے بہت اچھا کہا یہ تلخ جواب محبوب کے شیریں لبوں سے بہت ہی زیب دیتا ہے)

ایک بزرگ کا قصہ لکھا ہے کہ وہ جب ذکر کے لئے بیٹھتے تو یہ آواز آتی کہ تو کچھ ہی کر مگر کافر ہو کر مرے گا۔ بڑے پریشان ہوئے شیخ بڑی نعمت ہے ان کے شیخ زندہ تھے جا کر حال عرض کیا شیخ نے فرمایا کہ اس آواز پر کچھ خیال نہ کرو یہ دشنام محبت ہے ان کی عادت ہے کہ عاشقوں کو یونہی پریشان کیا کرتے ہیں تم کام کئے جاؤ مگر وہ دشنام غلط نہیں ہوتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مزاح کے متعلق فرماتے ہیں انی لامازح ولکن لااقول الا حقاً۔ کہ میں مزاح کرتا ہوں مگر مزاح میں بھی سچی ہی بات کہتا ہوں تو پھر حق تعالیٰ کی دشنام تو غلط کیونکر ہو سکتی ہے بات یہ ہے کہ یہاں کافر سے معنی مشہور کافر باللہ مراد نہ تھے اور ان بزرگ نے معنی مشہور سمجھ کر ہی پریشانی ظاہر کی بلکہ یہاں کافر سے کافر بالطاغوت مراد تھا چنانچہ یہ اطلاق قرآن شریف میں بھی وارد ہے۔ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ اور یہ معنی اچھے ہیں مگر گول مول لفظ تھا اس لئے وہ بیچارے پریشان ہو گئے اور ایسی باتیں اس لئے فرمادیا کرتے ہیں کہ اس سے طالب کا امتحان ہوتا ہے کہ دیکھیں اب بھی کام میں لگا رہتا ہے یا چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے مگر یہ امتحان اپنے دیکھنے کے لئے نہیں ان کو تو سب کچھ معلوم ہے بلکہ دکھلاتے ہیں کن کو ان کو جنھوں نے انسان کے متعلق کہا تھا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ کہ آپ زمین میں ایسے لوگوں کو خلیفہ بناتے ہیں جو اس میں فساد اور خونریزی کریں گے۔ ان کو دکھلاتے ہیں کہ دیکھ لو یہ مفسد کس شان کے ہیں یہ ہمارے کیسے طالب ہیں اور اسی لئے تبدیل ملائکہ کا وقت نماز کا وقت رکھا گیا حدیث میں آتا ہے کہ ملائکہ کی تبدیلی صبح اور عصر کی نماز کے وقت ہوتی ہے۔

تاکہ ہر دن جاکر عرض کریں ربنا اتیناھم وھم یصلون و فارقناھم وھم یصلون یعنی اے پروردگار ہم نے جاکر بھی تیرے بندوں کو نماز میں مشغول پایا اور آتے ہوئے بھی نماز میں چھوڑا وہ بیچارے گواہی دیتے دیتے تھک بھی گئے ہوں گے مگر پیچھا نہیں چھوڑا گیا۔ روزانہ ان سے سوال ہوتا ہے کہ ہمارے بندوں کو کس حال میں چھوڑا پھر عید بقرعید اور عرفات کے موقعہ پر حق تعالےٰ مسلمانوں کے اجتماعی عبادت پر فرشتوں کے سامنے مباہات فرماتے ہیں کہ دیکھو میرے بندے جوق جوق کیسے چلے آتے ہیں اور جب مجالس وعظ میں جمع ہوتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ دیکھو یہ مجھے کیسا پکار رہے ہیں یہ کیا چاہتے ہیں فرشتے عرض کرتے ہیں کہ یہ آپ کی رضا و مغفرت اور جنت کو طلب کرتے ہیں اور آپ کے غصہ و غضب اور جہنم سے پناہ مانگتے ہیں۔ حق تعالےٰ فرماتے ہیں گواہ رہو میں نے ان سب کو بخشا اور جو یہ مانگتے ہیں میں نے عطا کیا۔ اللہ اللہ ہماری ذراسی بات کی وہاں کیسی قدر ہوتی ہے اور فرشتوں کے سامنے کس طرح اس کو پیش کیا جاتا ہے تاکہ ہر دن ان کو اپنے اس قول کا جواب ملتا رہے اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا الغرض کبھی کیفیات میں اس لئے کمی کردی جاتی ہے تاکہ طالب کا امتحان ہو اور اس امتحان سے اس کے اندر پستی پیدا ہوجاتی ہے کیونکہ اس کو مشاہدہ ہوجاتا ہے کہ میرے اختیار میں کوئی چیز نہیں سب کچھ حق تعالےٰ کے اختیار میں ہے اور پستی وہ چیز ہے جس سے معیت الٰہی بہت جلد حاصل ہوتی ہے۔

حدیث قدسی میں ارشاد[1] ہے انا عند المنکسرۃ قلوبھم میں ان لوگوں کے پاس ہوں جن کے دل ٹوٹے ہوئے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح کیفیات کا ہونا نعمت ہے اسی طرح کسی وقت ان کا بند ہوجانا بھی رحمت ہے کیونکہ سلب کیفیات سے شکستگی قلب حاصل ہوتی ہے اور یہ شکستگی ترقی کا سبب ہے پس سالک کو کیفیات کے ہونے یا نہ ہونے کی پرواہ نہ کرنا چاہیئے جو شخص کیفیات ہی کے مزے میں پڑ جاتا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص سفر کررہا ہو اور کسی خاص منزل پر پہونچنا

[1] فی شرح الاحیاء روی ابو نعیم بسندہ فی الحلیۃ عن مالک بن دینار ۱۴۳ قال قال موسیٰ علیہ السلام یا رب این ابغیک قال عند المنکسرۃ قلوبھم ...

چاہتا ہو راستہ میں گرمی دوپہر کے وقت اُسے ایک دریا ملا یہ اس میں گھسا تو وہاں ٹھنڈک پہونچی اب یہ اس میں سے نکلنا نہیں چاہتا ٹھنڈک کی وجہ سے اسی میں رہنا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں راستہ طے نہیں ہو سکتا اور نہ یہ شخص منزل پر پہونچ سکتا ہے اس کے ساتھ ایک رفیق بھی تھا وہ دریا سے پار ہو گیا اور اس کو پکار رہا ہے کہ جلدی آ یہ کہتا ہے کہ میں تو دریا ہی میں رہوں گا اس نے آکر اس کا ہاتھ پکڑ کر نکال دیا اب خشکی میں آکر اُسے پھر پیاس اور گرمی معلوم ہوئی تو دریا کو یاد کر کے روتا ہے کہ ہائے میں وہاں سے کیوں نکال دیا گیا رفیق کہتا ہے کہ کمبخت تو دریا میں سے نکلکر مقصود کے قریب ہو گیا اگر وہیں رہتا تو منزل پر کبھی نہ پہونچتا۔ اسی طرح سالک کے لئے گاہے گاہے کیفیات کا پیش آنا اس لئے ہے تاکہ کسی قدر کلفت سفر کم ہو جائے اور شدّت کے بعد راحت مل جائے تاکہ آئندہ کے لئے ہمّت تازہ ہو جائے لیکن اگر وہ اسی راحت میں رہنا چاہے تو یقیناً راستہ ہی میں رہ جائے گا اور مقصود تک نہ پہونچیگا تو تم کو کیفیات دیکر پھر سلب اس واسطے کریں تاکہ تم کو آگے بڑھاویں نہ اس لئے کہ نیچے گرادیں مگر تم رو رہے ہو کہ ہائے میری کیفیات کیا ہوئیں میں تو انھیں میں رہتا اس شخص کا وہ حال ہے جیسے کسی نے گدھے کو دیا تھا نمک، اس نے کہا میری آنکھیں ہی پھوڑ دیں حق تعالے تو تم کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں مگر تم کیفیات میں پڑکر راستہ ہی میں رہنا چاہتے ہو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو کہ مجتہد فن اور مجدد وقت تھے فرمایا کرتے تھے کہ یہ انوار و کیفیات حجاب نورانی ہیں اور حجاب نورانی حجاب ظلمانی سے اشد ہے سالک کو یہ سب حجابات پس پشت ڈالنا چاہئیں ان کی طرف ہرگز التفات نہ کرے کیونکہ جس شخص کو بادشاہ سے ملنا ہے وہ نہ بھنگیوں کے مکان پر ٹھہرتا ہے نہ عطاروں کی دکان پر ٹھہرتا ہے بلکہ سیدھا تخت شاہی پر پہونچنا چاہتا ہے تو حجاب ظلمانی تو بھنگیوں کے مکانات ہیں اور حجاب نورانی عطاروں کی دکانات ہیں سالک کو کسی پر توقف نہ کرنا چاہیئے اس کو آگے چلتا رہنا چاہیئے مقصود وراء الوراء ہے ے

اے برادر بے نہایت درگہیست　　انچہ بروے میرسی بروے مایست

(اے بھائی اللہ تعالیٰ کا راستہ غیر متناہی ہے پس اس راستے میں جس مقام پر پہنچ جاؤ اس پر ٹھہرنا مت آگے بڑھ جانا تاکہ ترقی جاری رہے)

اس بلا میں ہر زمانہ میں لوگ مبتلا ہوتے ہیں کہ کیفیات کو مقصود سمجھ کر عمل کو ان کے تابع کرتے تھے کہ ذرا کیفیات میں کمی آئی عمل کو ترک کر دیا مثنوی میں بھی مولانا نے ایک شخص کا قصہ لکھا ہے کہ وہ ذاکر شاغل تھا مگر اُسے کچھ کیفیات وغیرہ حاصل نہ تھیں شیطان نے اسے بہکایا کہ اندھیری کوٹھری میں ٹکریں مارتا ہے ادھر سے نہ کچھ پیام نہ سلام نہ کیفیات نہ واردات یہ عقلمند تہجد اور ذکر وغیرہ سب چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ گیا کہ واقعی اتنے دن کام کرتے کرتے ہو گئے ادھر سے کچھ جواب ہی نہیں رسید ہی نہیں ملتی یہ شخص مراد کا مقام رکھتا تھا اس لئے حق تعالیٰ کی طرف سے اس کو تنبیہہ کی گئی - مرید اور مراد میں فرق یہ ہے کہ مرید ابھی تک عاشق ہی ہے محبوب نہیں بنا اور مراد عاشق بھی ہے محبوب بھی - مرید اعراض کرے تو یہ کہکر دھکے دیدیئے جاتے ہیں ؎

ہر کہ خواہد گو بیاؤ ہر کہ خواہد گو برو　　دار و گیر حاجب و دربان دریں درگاہ نیست

(جو شخص آنا چاہے تو کہدو آجائے اور جو جانا چاہے تو کہدو وہ چلا جائے)

اور مراد اعراض کرے تو اس کو پکڑ کر بلواتے ہیں کیونکہ وہ محبوب بھی ہے جیسے خوبصورت مرغ وحشی کہ وہ بھاگتا ہے مگر دانہ دکھلا کر اس کو جذب کرتے ہیں ایسے ہی محبوب کا قول ہے ؎

مرغ باغ ملکوتیم دریں دیر خراب　　میشود نور تجلائے خدا دانۂ ما

(میں عالم ملکوت کی چڑیا ہوں اس دنیا میں ہمارا دانہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات کے انوار ہیں)

تو جب یہ شخص سب کام چھوڑ کر سو رہا تو حق تعالیٰ کی طرف سے حضرت خضر علیہ السلام کو یا کسی فرشتہ کو حکم ہوا کہ اس احمق کو سمجھاؤ کہ وہ نماز و ذکر وغیرہ کو چھوڑ کر کیوں بیٹھ رہا وہ خواب میں آئے اور پوچھا کہ بھائی تو آج کیوں سو رہا اس نے وہی شکایت کی کہ اتنے دن کام کرتے کرتے ہو گئے وہاں سے کوئی رسید ہی نہیں ملتی نہ سوال ہے نہ جواب اس لئے میں نے سب چھوڑ دیا جواب ارشاد ہوا ؎

گفت آن اللہ تو لبیک ماست
دیں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

(فرمایا کہ اے بندہ تیرا اللہ کہنا ہمارا لبیک ہے اگر تیرا پہلا اللہ قبول نہ ہوتا تو دوسری بار توفیق دوسرے اللہ کی نہ ہوتی یہ نیازمندی اور سوز و گداز کی توفیق ہماری طرف سے قاصد ہیں)

یہ تیرا اللہ اللہ کرنا ہی ہمارا جواب ہے۔ اگر ہم کو تیرا ذکر پسند نہ ہوتا تو ہم تیری زبان سے اپنا نام نکلنے نہ دیتے بلکہ زبان پکڑ لیتے جس سے ایک دفعہ بھی اللہ نہ نکل سکتا بس ایک بار اللہ کہکر جب دوبارہ اس کا نام کی توفیق ہوئی تو سمجھ لو کہ پہلا قبول ہو گیا اور یہی دوسرا ہماری طرف سے جواب ہے علیٰ ہذا تمہارے دل میں جو سوز و درد ہے یہ ہماری طرف سے قاصد ہے اگر ہم کو تعلق نہ ہوتا تو اپنا قاصد تیرے پاس نہ بھیجتے کیونکہ ہمارا قاصد ہر شخص کے پاس نہیں جایا کرتا بلکہ جہاں ہم بھیجنا چاہتے وہیں جاتا ہے اور یہ کیا ضرور ہے کہ قاصد عربی ہی بولتا آوے یہ سوز و درد بھی قاصد ہے یہ وہ سکینہ ہے جس کے متعلق ارشاد ہے هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ اور ذکر کے وقت یہ سکینہ ضرور نازل ہوتا ہے یقیناً ذکر سے پہلے قلب کی جو حالت تھی ذکر کے بعد وہ حالت نہ ہوگی بلکہ کچھ اور حالت ہوگی یہ اسی سکینہ کا اثر ہے جس سے ذکر کے بعد دل میں کبھی ایک ٹھنڈک سی معلوم ہوتی ہے کبھی درد و سوزش محسوس ہوتی ہے یہ سب خدائی قاصد ہیں ان کو بیکار نہ سمجھو اسی کو فرماتے ہیں ؎

گفت آن اللہ تو لبیک ماست
دیں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

(فرمایا کہ اے بندہ تیرا اللہ کہنا ہمارا لبیک ہے اگر تیرا پہلا اللہ قبول نہ ہوتا تو دوسری بار توفیق دوسرے اللہ کی نہ ہوتی یہ نیازمندی اور سوز و گداز کی توفیق ہماری طرف سے قاصد ہیں۔)

اس مضمون کو ہمارے حضرت حاجی صاحب نے ایک بار اس طرح بیان فرمایا کہ اگر ایک آدمی تمہارے گھر پر روزانہ آتا ہو اور تم کو اس کے روک دینے کی قدرت ہو تو اگر تم کو اُس کا آنا ناگوار ہوگا۔ تو تم اس کو صاف صاف روک دو گے کہ آپ یہاں

نہ آیا کریں مجھے تکلیف ہوتی ہے اور اگر باوجود قدرت کے تم اس کو نہ روکو تو یہ اس کی علامت ہے کہ اس کا آنا تم کو ناگوار نہیں بلکہ تم اس کا آنا چاہتے ہو اسی طرح اگر حق تعالیٰ کو تمہارے مسجد میں آنا اور نماز پڑھنا پسند نہ ہوتا تو وہ تم کو خود روک دیتے مگر جب پانچ وقت مسجد میں آنے کی اور نماز میں اپنے سے بات چیت کرنے کی تم کو توفیق دے رکھی ہے تو سمجھ لو کہ تمہارا آنا ان کو ناگوار نہیں ہے اور تمہاری عبادات خدا کے یہاں مقبول ہیں۔ رہا یہ کہ حق تعالیٰ اگر روکنا چاہیں تو کس طرح روکیں گے کیا وہاں سے کوئی سپاہی آئے گا ہاں وہ اس طرح روک دیں گے کہ تم کو نماز کی توفیق ہی نہ ہوگی وہ سپاہی یہی ہے جیسے ایک آقا اور غلام کا قصہ ہے کہ غلام آقا کے ساتھ بازار میں گیا راستہ میں نماز کا وقت آگیا غلام نمازی تھا وہ آقا سے اجازت لے کر مسجد میں نماز کے لئے گیا اور آقا صاحب مسجد کے باہر بیٹھ گئے اب تمام نمازی نماز پڑھ پڑھ کر مسجد سے جا رہے ہیں مگر غلام باہر ہی نہیں آتا اس نے اطمینان سے فرض پڑھے پھر نفلیں شروع کر دیں پھر وظیفہ میں لگ گیا جب بہت دیر ہو گئی تو آقا نے آواز دی کہ میاں اتنی دیر کہاں لگا دی باہر کیوں نہیں آتے غلام نے کہا کہ آنے نہیں دیتے کہا کون نہیں آنے دیتے کہا جو تم کو اندر نہیں آنے دیتا وہ مجھکو باہر نہیں آنے دیتا۔ واقعی جب ان کو کسی کا مسجد میں آنا ناگوار ہوتا ہے تو اس کو مسجد میں قدم رکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔ بہت لوگ برسوں مسجد کے دروازے پر کیا ب بنا کر بیچتے ہیں مگر ایک دن بھی مسجد کے اندر جانے کی توفیق نہیں ہوتی یہ ہے ان کا روکنا وہ اس طرح روکا کرتے ہیں پس جن کو پانچوں وقت نماز کی توفیق ہو رہی ہے وہ امید رکھیں کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ان کی عبادات مقبول ہو رہی ہیں گو ہماری عبادات اس قابل تو نہیں ہیں مگر محض رحمت سے قبول ہو جاتی ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ایں قبول ذکر تو از رحمت است   چوں نماز مستحاضہ رخصت است

(تمہارے ذکر کا قبول ہونا محض اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہے جس طرح استحاضہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی اجازت ہے اور شریعت کے احکام نے اس کو پاک قرار دیا ہے)

کیا غضب کی مثال ہے کہ جس طرح مستحاضہ عورت حقیقت میں ناپاک ہے مگر شریعت اسی حالت میں اس کو نماز کی اجازت دیتی ہے اور احکام میں اس کو پاک شمار کرلیتی ہے۔ اسی طرح ہماری عبادات گو حقیقت میں ناقص ہیں مگر حق تعالےٰ اپنی رحمت سے ان کو قابل بناکر قبول فرمالیتے ہیں اگر قبول نہ فرماتے تو اس کی توفیق ہی نہ دیتے ہمارے حضرت حاجی صاحب کے پاس ایک ذاکر شخص آئے اور آکر عرض کیا کہ حضرت میں نے طائف میں چلہ کیا تھا۔ روزانہ سوالاکھ مرتبہ ذکر کرتا تھا مگر نفع نہیں ہوا شاید حضرت مجھ سے کچھ ناراض تھے جو نفع نہ ہوا۔ حضرت کو جوش آیا اور فرمایا کہ میاں اگر ہم ناراض ہوتے تو سوالاکھ مرتبہ ذکر کی توفیق ہی نہ ہوتی اور تم جو نفع کی شکایت کرتے ہو تو کیا یہ نفع نہیں ہے کہ زبان سے سوالاکھ دفعہ اللہ اللہ نکلتا تھا۔

صاحبو! جب اہل اللہ کے خذلان سے توفیق سلب ہوجاتی ہے تو خدا تعالیٰ کے خذلان کے بعد تو ہم کیا کرسکتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ حضرت نے سچ فرمایا کہ اگر حق تعالےٰ نہ چاہیں تو ایک مرتبہ بھی زبان سے اللہ نہیں نکل سکتا۔ مولانا رومی ایک مقام پر دعا کے بارہ میں فرماتے ہیں ؎

ہم دعا از تو اجابت ہم ز تو　　ایمنی از تو مہابت ہم ز تو

(دعا کی توفیق بھی اے خدا آپ ہی کی طرف سے ہے اور قبولیت بھی آپ ہی کی طرف سے ہے امن اور سکون کا احساس بھی آپ کی طرف سے ہے اور خوف و ہیبت بھی آپ کی طرف سے ہے)

واقعی دعا کی توفیق بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اگر وہ توفیق نہ دیں تو ہماری زبان سے دعا بھی نہیں نکل سکتی یہ ساری گفتگو اس ذاکر کے قصہ پر چل پڑی تھی کہ اس کو شیطان نے بہکایا تھا کہ جب نہ کیفیات ہیں نہ واردات ہیں نہ خطاب ہے نہ جواب ہے تو اندھیری کوٹھری میں ٹکریں مارنے سے کیا فائدہ اور اس لئے اس وسوسہ کی وجہ سے تہجد وذکر چھوڑ دیا تھا یہ قصہ اس پر نقل کیا تھا کہ کیفیات کو مقصود سمجھنے کی غلطی میں ہر زمانہ میں لوگ مبتلا ہوئے ہیں ایک مفسدہ کیفیات کے مقصود سمجھنے میں پہلے کا عکس ہے یعنی بعض

لوگ کیفیات کے حصول کے بعد عمل کو چھوڑ دیتے ہیں جب تک کیفیت حاصل ہے
اس وقت تک عمل کی ضرورت نہیں سمجھتے یہ مطلب نہیں کہ فرائض کو بھی چھوڑ دیتے
ہیں یہ تو ملحدین کرتے ہیں اُن سے اس وقت بحث نہیں جو لوگ اہل حق ہیں وہ فرائض
تو ترک نہیں کرتے مگر حصول کیفیات کے بعد ذکر و نوافل وتلاوت قرآن وغیرہ کو
چھوڑ بیٹھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمیں مقصود تو حاصل ہی ہے پھر اتنی مشقت کی
کیا ضرورت ہے کہ چھ ہزار دفعہ ذکر اسم ذات کریں یا تہجد کے لئے اٹھیں اب تو ملکۂ
یادداشت حاصل ہو گیا ہے اب تو ہمارا سونا بھی ذکر ہے سو جب تک کیفیت ہے
اس وقت تک عمل ہی نہیں کرتے اور جب کیفیت نہ رہی اب پھر ذکر و شغل اور تہجد
وغیرہ شروع کر دیتے ہیں غرض ان لوگوں کے دل میں عجیب عجیب موجیں اٹھتی ہیں کوئی
تو کیفیت کے نہ ہونے سے عمل میں کمی کرتا ہے اور کوئی اس کے ہونے سے عمل میں کوتاہی
کرتا ہے اور نہ ہو تو پھر کوشش کرتا ہے یہ شخص بھی کیفیت ہی کو مقصود سمجھتا ہے چونکہ
وہ عمل ہی سے پیدا ہوئی تھی اس لئے سلب کیفیت یا قلت کیفیت کے وقت عمل کا
اہتمام کرتا ہے یہ بھی غلطی پر ہے بس راستہ پر وہ شخص ہے جو عمل ہی کو مقصود سمجھتا ہے
اور کیفیت ہو یا نہ ہو ہر حال میں عمل پر دوام رکھتا ہے یہ مسئلہ میں نے اس لئے بھی
ظاہر کیا ہے تاکہ مزدوری پیشہ اور کھیتی کرنے والے یہ نہ سمجھیں کہ ہم بھلا کیا ذکر کریں
ہمیں یہ حالات کیا پیش آئیں گے سو خوب سمجھ لو کہ واللہ مقصود تم کو بھی حاصل ہو سکتا
ہے کیونکہ مقصود سب طرق سے خلوص ہے جو بدون ان کیفیات وحالات کے بھی حاصل
ہو سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مقصود ان گردن جھکانے والے صوفیوں کو یکسوئی کے
سبب سہولت کے ساتھ حاصل ہو جاتا ہے اور تم کو ذرا دقت سے اور دیر میں حاصل
ہوگا اور سہولت کا وعدہ کیسے کر لوں اتنا تو میں نے تم سے اناج بھی وصول نہیں کیا
جو تمہاری خاطر صحیح بات کو غلط کر دوں اور یہ کہہ دوں کہ تم کو بھی اسی سہولت سے مقصود
حاصل ہو جائے گا جس صورت سے خانقاہ میں پڑ مرنے والوں کو حاصل ہوتا ہے نہ
بھائی ان کی برابر تو سہولت نہ ہوگی مگر ایسی دقت بھی نہ ہوگی جس کو تم برداشت نہ کر سکو

بس اتنا ہی فرق ہوگا کہ اگر ان کو سال بھر میں مقصود حاصل ہو جاتا ہے تو تم کو دو سال تین سال میں حاصل ہوگا اور ان کو دو سال میں ہوگا تو تم کو چار سال میں ہوگا۔ اور یہ بات ہے کہ ہر شخص اپنے بچھڑے کے دانت خوب جانتا ہے اسی طرح حق تعالیٰ اپنے بندوں کو خوب جانتے ہیں انھوں نے ہر شخص کے مناسب اس کے اندر استعداد رکھی ہے چنانچہ اسی بنا پر خدا تعالیٰ نے تم کو ظاہری رزق بھی مشقت سے دیا ہے کہ جو ہل جوتتے ہو کھیت میں پانی دیتے ہو زمین کو درست کرتے ہو گرمی اور بارش کی تکلیف اٹھاتے ہو تب روٹی ملتی ہے۔ اسی طرح باطنی رزق بھی تم کو مشقت سے ملے گا یہاں بھی تم کو خانقاہ والوں سے زیادہ محنت کرنی پڑے گی جب مقصود حاصل ہوگا تمہارے لئے اسی میں مصلحت ہے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب نے تفسیر مظہری میں ایک حدیث قدسی نقل کی ہے جس کی تخریج مجھ کو یاد نہیں رہی اور وہ تو اگر تخریج بھی نہ کرتے تب بھی وہ بیہقی وقت ہیں حدیث پر ان کی بہت نظر ہے بدون ثبوت کے حدیث نہیں لکھتے اس لئے ہمیں ان کی محض نقل پر بھی اعتماد ہوتا ہے حدیث کا مضمون یہ ہے کہ میرے بعضے بندے بیماری میں مومن رہتے ہیں اگر میں ان کو تندرست کر دوں لبغوا فی الارض تو وہ زمین میں فساد برپا کر دیں میرے بعضے بندے تکلیف و مشقت میں مومن رہتے ہیں اگر میں ان کو راحت دیدوں تو وہ کافر ہو جائیں میرے بعضے بندے راحت ہی میں مومن رہتے ہیں اگر میں تکلیف میں رکھوں تو کافر ہو جائیں تو گانوں والوں کے لئے خدائے تعالیٰ نے مشقت ہی کی استعداد رکھی ہے کہ ان کو رزق ظاہر و رزق باطن دونوں مشقت سے ملتے ہیں باقی یہ سب استعدادیں انھیں کی پیدا کی ہوئی ہیں کسی کو ان کی لم دریافت کرنے کا حق نہیں کہ فلاں میں یہ استعداد کیوں رکھی فلاں میں کیوں نہیں رکھی ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں　　بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

(یہ کس کا دماغ ہے کہ باغبان سے پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا اور گل نے کیا سنا اور صبا نے کیا کام کیا)

اس میں حق تعالیٰ کی حکمتیں ہیں کہ ہر شخص میں مختلف استعداد رکھی ہے یہ مسئلہ قدر کے

متعلق ہے اور عارفین نے فرمایا ہے کہ دو چیزیں ایسی ہیں جن کی حقیقت جنت میں بھی منکشف نہ ہوگی ایک مسئلہ قدر دوسرے کنہ ذات اور اصل میں مسئلہ قدر بھی ذات ہی کی طرف راجع ہے تو جب کنہ ذات کا انکشاف آخرت میں نہ ہوگا تو مسئلہ قدر کا انکشاف بھی وہاں نہ ہوگا۔ اور یہ مسئلہ عدم ادراک کنہ ذات حدیث میں بھی مذکور ہے مگر ملاحسن کی اصطلاحات میں مذکور نہیں اسی لئے طلبہ کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی کیونکہ یہ تو ہر بات کو اصطلاحات معقول میں سمجھنا چاہتے ہیں مگر حدیث کی اصطلاحات ملاحسن کی اصطلاحات سے جدا ہیں سنئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تجلی جنت کے باب میں فرماتے ہیں لا یبقے علے وجھہ الا رداء الکبریاء اس کا بھی وہی مطلب ہے کہ بجز کنہ ذات مخفی ہونے کے وہاں اور کوئی حجاب نہ رہے گا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کنہ ذات کو کبریا سے تعبیر فرمایا ہے کیونکہ کبریاء وعظمت اس کے لئے لازم ذات ہے اور کنہ ذات کا مخفی رہنا یہ اعلیٰ درجہ کی عظمت ہے تو یہ لازم اس سے منفک نہ ہوگا اس لئے وہاں دیدار تو ہوگا اور حق تعالیٰ بے پردہ اس طرح ظاہر ہوں گے جیسے چاند کھلا ہوا ہو مگر ایک پردہ جلال وکبریا کا باقی رہ جائے گا جس کی وجہ سے ہم احاطہ حسن الٰہی کا نہ کر سکیں گے کیونکہ وہ غیر محدود ہے اور ہم محدود ہیں اور محدود غیر محدود کا احاطہ نہیں کر سکتا اس لئے یہ حجاب باقی رہے گا یہ راز تو تحقیقی ہے اور ایک راز عاشقانہ ہے وہ یہ کہ اگر کوئی حجاب باقی نہ رہتا اور خدا کا حسن بھی محبوبان دنیا کے حسن کی طرح محدود ہوتا تو چند روز میں جی بھر جاتا جیسا کہ محبوبان دنیا سے جی بھر جاتا ہے کیونکہ ان کا حسن محدود ہوتا ہے اور ہمارا تمتع بھی محدود ہوتا ہے۔ اگر خدا کا حسن بھی ایسا ہی ہوتا اور غیر محدود نہ ہوتا تو کچھ مدت کے بعد لوگ جنت سے گھبرا کر وہاں سے نکلنے کی تمنا کرتے جیسے ایک اندھے حافظ جی کا قصہ ہے کہ ان کو حوروں کی بہت تمنا تھی روز دعا کرتے تھے کہ اے اللہ حور کو بھیجدے۔ پڑوس میں چند فاحشہ عورتیں رہتی تھیں انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اندھا روز حور کی دعا کرتا ہے لاؤ آج اس سے مذاق کریں اور حوروں کا مزہ چکھائیں ہم میں سے ایک ایک اُس کے پاس جا کے کہ حافظ جی میں حور ہوں مجھے خدا نے بھیجا ہے۔ چنانچہ پہلے ایک آئی اور کہا حافظ جی میں حور ہوں مجھے خدا نے بھیجا ہے۔ آپ کی دعا قبول ہوگئی حافظ جی

بڑے خوش ہوئے اور اس سے منہ کالا کیا وہ نکلی تو دوسری پہنچی خیر حافظ جی اس سے بھی مشغول ہوئے۔ پھر تیسری پہنچی پھر بھی کچھ ہمت کی اب چوتھی پہونچی پھر پانچویں پہنچی تو حافظ جی حوروں کو گالی دے کر گھبرا کر کہتے ہیں کہ کیا ساری حوریں میرے ہی حصہ میں آگئیں، جاؤ اب کسی اور کے پاس جاؤ مجھے حور نہیں چاہیئے میں حوروں سے باز آیا حافظ جی کی اس بات پر کہ مجھے حور نہیں چاہیئے ایک اور حکایت یاد آئی۔

ایک شخص کی عادت تھی کہ وہ جنگل میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر روزدعا کرتا تھا کہ اے اللہ مجھے کھینچ ایک مسخرے نے سُن لیا اس نے اس کی اصلاح کرنی چاہی ایک دن درخت کے اوپر ایک مضبوط رسی لے کر بیٹھ گیا جب اس شخص نے دعا کی کہ اے اللہ مجھے کھینچ تو اس نے رسی میں پھندا بنا کر لٹکا دیا اور آواز بنا کر کہا کہ میرے بندے یہ رسی گلے میں ڈال لے میں کھینچ لوں گا، یہ بڑا خوش ہوا کہ میری دعا قبول ہوگئی اس نے رسی کا پھندا گلے میں ڈال لیا اور مسخرے نے کھینچنا شروع کیا اب جو گلا گھٹا اور سانس رکا تو وہ کہتا ہے کہ اللہ مجھے چھوڑ میں نہیں کھنچتا پھر اس درخت کے پاس بھی نہیں پھٹکا۔ غرض اگر حق تعالٰے کے حسن کا نعوذ باللہ احاطہ ہو جاتا اور کوئی حجاب باقی نہ رہتا تو جنت وبال جان ہو جاتی مگر چونکہ ان کا حسن غیر محدود ہے اس لئے کبھی جی نہ بھرے گا بس وہ حال ہوگا

؎ یزیدك وجهه حسنا اذا ما زدته نظرا

(جتنی دفعہ تو اس محبوب کو دیکھے گا اس کا حسن تجھ کو زیادہ ہی معلوم ہوگا)

جتنی دفعہ دیدار ہوگا نیا ہی حسن معلوم ہوگا تو جیسی کنہ ذات جنت میں منکشف نہ ہوگی آج مسئلہ قدر بھی اور استعداد کا اختلاف مسئلہ قدر کی طرف راجع ہے جب اس کی حقیقت آخرت میں بھی منکشف نہ ہوگی تو دنیا میں کیا امید ہے ہاں بعضوں کو کچھ کچھ اسرار ذوقی طور پر بتلا دیئے گئے ہیں مگر وہ ان کو ظاہر نہیں کر سکتے اگر تقدیر کے اسرار ظاہر ہو جائیں تو بدنفس لوگ اپنے کو معذور قرار دے کر شورش برپا کر دیں اور تمام عالم درہم برہم ہو جائے۔ اسی مثال کو مولانا فرماتے ہیں ؎

سرِّ پنہان است اندر زیر و بم فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

(زیر وبم کے اندر اسرار پوشیدہ ہیں اگر فاش کر دوں تو جہاں کو درہم برہم کر دوں)
شاید اس پر کوئی کہتا ناتمام ہی کہدو صاف صاف نہ کہو تو جواب دیتے ہیں ؎

بالب ومساز خود گر جفتمے ہمچو نے من گفتنیہا گفتمے

(ہاں اہل اور مناسبت والا مل جاوے تو خود تقاضا ہوگا کہ اس سے راز دل کو کہا جائے)

یعنی ناتمام بھی ہر شخص سے نہیں کہہ سکتے بلکہ دمساز سے کہہ سکتے ہیں یعنی اہل سے کہ وہی ہمراز ہے نااہل سے تو ناتمام اسرار بھی بیان نہیں کر سکتے اور بعض دفعہ جو مخاطب کو اہل دیکھ کر بیان کا تقاضا بھی ہوا ہے تب بھی عذر فرمایا ہے چنانچہ ایک مقام پر فرمایا ہے

؎ لاؑ تکلفنی فانی فی الفنا کلت افہامی فلا احصی ثنا

کلؑ شیٔ قالہ غیر المفیق ان تکلف اوتصلف لایلیق

ہرؑ چہ میگوید موافق چوں نبود چوں تکلف نیک نالائق نمود

(۱ہ، ۲ہ، ۳ہ۔ میں مقام فنا میں ہوں حق تعالیٰ کے غیر محدود صفات کا میرا افہام احاطہ نہیں کر سکتے۔ ایک بے ہوش جو کچھ بھی کہے گا وہ نا مناسب رہے گا اگرچہ بات صحیح ہو لیکن تکلف سے بات بے مزہ ہوتی ہے انشراح قلب نہ ہونے سے خاموشی مناسب ہے)

غرض یہ خدا تعالیٰ کے اسرار ہیں کہ کسی میں کیسی استعداد رکھدی کسی میں کیسی اس لئے اس دال کا کسی کو حق نہیں کہ فلاں کو مقصود سہولت سے کیوں دیا اور ہم کو مشقت سے کیوں دیا وہ یہی چاہتے ہیں کہ ایک کو ہنسائیں ایک کو رلائیں کسی کا ہنستے کھیلتے گھر بس جاتا ہے کسی کو برسوں رونے سے بھی جلدی حاصل نہیں ہوتا ؎

بگوش گل چہ سخن گفتۂ کہ خندان ست بعندلیب چہ فرمودۂ کہ نالان ست

(گل کے کان میں کیا کہدیا ہے کہ وہ ہنس رہا ہے (شگفتہ ہے) اور بلبل کے کان میں آپ نے کیا راز کہدیا کہ وہ ہر وقت نالاں ہے)

اور جب سر قدر کا احاطہ نہ ہو سکتا تھا اور حصول اس کی کنہ کا ممتنع تھا تو یہ حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کی رحمت ہے کہ آپ نے ہم کو سوال قدر سے منع ہی فرمادیا اور ارشاد فرمایا کہ جو شخص اس میں بحث کرے گا قیامت کو اس سے پوچھا جاوے گا اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس عمل کا ثواب ہوگا کیونکہ اس میں سب اعمال متساوی ہیں اس کی تخصیص کیا بلکہ محققین کے نزدیک مراد یہ ہے کہ جو شخص تقدیر میں گفتگو کرے گا اس سے قیامت میں یہ پوچھا جائے گا کہ بتلاؤ تقدیر کی حقیقت کیا تحقیق کی اور حقیقت میں معلوم ہوگی نہیں تو یہ شخص جواب سے عاجز ہوکر سزا میں گرفتار ہوگا اور جو اس میں گفتگو نہ کریگا وہ بے کھٹکے ناجی رہے گا نیز تقدیر کا مسئلہ گفتگو سے حل بھی نہیں ہوسکتا اس میں اطمینان و شرح صدر صرف نور باطن سے ہوتا ہے اور جن پر یہ راز خود بخود منکشف ہوگیا ہے کچھ نہ پوچھو ان پر کیا گذرتی ہے اس سے معرفت و معیت حق کا تو مزا ہوتا ہے کیونکہ اس سے معرفت بڑھتی ہے اور حق تعالیٰ کی معیت میں ترقی ہوتی ہے مگر ساتھ ہی بدمزگی بھی ایک خاص قسم کی ہوتی ہے کہ دوسرا شخص اس کا تحمل بھی نہیں کرسکتا وہ یہ کہ ہر وقت دل پر ایک حیرت سی غالب رہتی ہے کبھی جبر کی طرف چلتا ہے کبھی اختیار کی طرف پھر گو محقق نہ جبر پر جمتا ہے نہ اختیار پر بلکہ بین بین رہتا ہے لیکن دل تو حیرت میں ہوتا ہے کبھی ادھر جاتا ہے کبھی اُدھر مولانا علماً اس معیت کو تو یوں فرماتے ہیں ؎

گر بعلم آئیم ما ایوان اوست ۔۔۔ ور بجہل آئیم ما زندان اوست

گر بخواب آئیم مستان ویم ۔۔۔ ور بہ بیداری بدستان ویم

(لہ، لہ اگر صفت علم کی تجلی ہوتی ہے تو ہم اس کے حضوری کے محل میں ہوتے ہیں اور جب وہ تجلی مستور ہوجاتی ہے تو ظلمت جہل کے سبب اگر نیند میں ہوتے ہیں تو غایت تعلق مع اللہ سے ہم انھیں کے مست ہوتے ہیں اور بیداری میں انھیں کے دستِ قدرت کے تحت رہتا ہوں)

اور کیفیات متعارضہ میں معیت کی نسبت فرماتے ہیں ؎

در تردد ہر کہ او آشفتہ است ۔۔۔ حق بگوشش او معمہ گفتہ است

(جو شخص تردد سے پریشان ہے کہ یہ کروں یا وہ کروں تو اس کو مولانا فرماتے ہیں

کہ یہ حق تعالیٰ نے اس کے کان میں معمہ کہدیا ہے کہ اس کو حل کرو)

اور علاً معیت کو یوں فرماتے ہیں ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

(میرے دوست نے میری گردن میں ایک رسی ڈال رکھی ہے اور جدھر اس کا دل چاہتا ہے مجھے لے جاتا ہے)

اور حیرت کی نسبت یوں فرماتے ہیں ؎

گہ چنیں بنماید و گہ ضد ایں جز کہ حیرانی نباشد کار دیں

(کبھی اس طرح دکھاتا ہے کبھی اس کے خلاف دکھاتا ہے بس اس طرح مجھے محبت کے راستے میں محو حیرت رکھتے ہیں۔)

غرض تقدیر کے باب میں نہ گفتگو کرنا چاہئیے اور نہ اس کی لم دریافت کرنا چاہیئے کہ ہر شخص میں استعداد مختلف کیوں رکھی ہے یہ حق تعالےٰ کے اسرار ہیں خدا نے استعداد و مقادیر مختلف بنا کر اپنے بعض بندوں کو یہ دولت عطا کی ہے کہ جہاں انھوں نے نماز شروع کی اور خدا تعالےٰ کی طرف فوراً دل کا رخ ہو گیا حضور میں غرق ہو گئے پھر اس کے ساتھ روٹی بھی بے مشقت دی ہے ان کا مرغ اور گھی اور حلوے بھی بے تکلف دے رکھے ہیں اور یہ باطنی مٹھائی بھی بے تکلف دیدی اور تم کو دنیا کی نعمتیں بھی مشقت سے ملتی ہیں اور دین کی نعمت بھی مشقت سے ملے گی چنانچہ بعضوں کی حالت یہ ہے کہ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو ان کا دل خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا بلکہ اس ادھیڑ بن میں رہتا ہے کہ کل کو کہاں سے کھاؤں گا آج تو گھر میں آٹا بھی نہیں کل کو قرض خواہ تقاضا کرنے آئے گا اسے کہاں سے دوں گا آج تو جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں یہاں تک کہ انھیں خرافات میں نماز ختم ہو جاتی ہے۔ شیخ سعدی ایسے ہی لوگوں کا حال بیان فرماتے ہیں کہ ؎

شب چو عقد نماز بر بندم چہ خورد بامداد فرزندم

(رات کو جب نماز کی نیت باندھتا ہوں تو فوراً یہ خیال ستاتا ہے کہ کل میرے بچے کیا کھائیں گے)

کہ رات کو جب یہ لوگ نماز کی نیت باندھتے ہیں تو یہ سوچتے ہیں کہ کل کو بچے کیا کھاویں گے ایک اہل زبان نے اس شعر کی عجیب تفسیر کی ؎

"شب چو عقد نماز بربندم چناں درفکر عیال مستغرق باشم کہ بجائے تکبیر تحریمہ میگویم چہ خورد بامداد فرزندم"

واقعی اہلِ زبان اپنی زبان کو خوب سمجھتے ہیں ہمارا ذہن تو اس طرف نہ جاتا مگر وہ صاحب زبان تھا خوب سمجھا اس پر ایک حکایت یاد آئی۔

دہلی سے ایک ہندوستانی ایران گیا اور وہاں برسوں رہ کر فارسی سیکھی پھر ہندوستان واپس آکر دعوے کیا کہ مجھے اہل زبان کی برابر فارسی آتی ہے۔ ایک ایرانی کو سن کر جوش آیا کہ ہندوستانی آدمی اہل فارس کی برابری کا دعوے کرتا ہے جھوٹا ہے میں اس کا امتحان کروں گا، چنانچہ امتحان کے لئے آیا اور کہا کوئی شعر بالبدیہہ فارسی کا سناؤ اس نے اسی وقت ایک شعر لطیف پڑھا ؎

سیہ چوری بدست آں نگارے نازنیں دیدم ۔۔۔ بشاخ صندلیں پیچیدہ مارے آتشیں دیدم

(سیاہ چوڑی اس معشوق کی کلائی میں ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے صندل کی کسی شاخ میں سانپ لپٹا ہوا ہو)

بظاہر شعر نہایت نفیس مگر ایرانی نے یہ سنتے ہی کہا تف تف یہ نازنیں دیدم آتشیں دیدم کیا بلا ہے بس اتنا کافی ہے ؎

سیہ چوری بدست آں نگارے ۔۔۔ بشاخ صندلیں پیچیدہ مارے

(سیاہ چوڑی اس معشوق کے ہاتھ میں اس طرح معلوم ہوئی جیسے شاخ صندلیں پر سانپ لپٹا ہوا ہو)

ارے اس تشبیہہ کا مدار تیرے دیکھنے پر تھوڑا ہی موقوف ہے جو تو نے دیدم دیدم دونوں جگہ بڑھایا ہے۔ واقعی اس اصلاح سے یہ شعر کہیں سے کہیں پہنچ گیا اور معلوم ہو گیا کہ غیر اہل زبان چاہے کتنا ہی ماہر ہو جائے اہل زبان کی برابر نہیں ہو سکتا دیوبند میں ایک ایرانی طالب علم گلستاں کے اس جملے پر وجد کرتا تھا۔

درعنفوان جوانی چنانچہ افتد دانی نظر داشتم بر روئے وگذر داشتم در کوئے اور کہتا تھا کہ یہ جملہ نہایت ہی بلیغ ہے اس میں فصاحت و بلاغت کوٹ کوٹ کر بھری ہے مگر ہم لوگوں نے بارہا اس کو پڑھا پڑھایا ہے ایک دن بھی وجد نہ ہوا تو اپنی زبان کو زبان داں ہی سمجھ سکتا ہے جیساکہ اس ایرانی نے اس شعر کا مطلب سمجھا ؎

شب چو عقد نماز بر بندم چہ خورد بامداد فرزندم

(شب کو جب نماز کی نیت باندھی تو خیال آیا کہ کل بچے کیا کھائیں گے)

یعنی تکبیر تحریمہ کے بجائے منہ سے یہ نکلتا ہے "چہ خورد بامداد فرزندم" اور پریشانی کے وقت نماز میں منہ سے ایسی بات کا نکل جانا مستبعد نہیں ہوسکتا کہ یہ لفظ ہی زبان پر جاری ہو جاتے جیسے ہمارے ایک دوست حافظ اکبر کا قصہ ہے کہ وہ ایک امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے دو مقتدی اور تھے امام کو حدث ہوا تو اس نے ان کو سمجھدار واقف مسائل خیال کر کے خلیفہ بنا دیا یہ مصلے پر جا پہنچے تو ان دو مقتدیوں میں سے ایک دوسرے سے کہتا ہے کہ ارے یہ کیا ہوا، دوسرے نے کہا چپ رہ یوں بھی ہوا کرتا ہے دونوں مقتدیوں کی نماز تو فاسد ہوئی اب حافظ اکبر صاحب مصلے پر کھڑے کھڑے فرماتے ہیں کہ میں کس کو نماز پڑھاؤں ان کی بھی گئی یہ سب سے بڑھ کر عقلمند نکلے کہ میں کسے نماز پڑھاؤں، بندۂ خدا اپنے ہی کو پڑھائی ہوتی مگر اس وقت بے ساختہ ان کی زبان سے یہ جملہ نکل ہی گیا اسی طرح بے ساختگی میں مفلس پریشان کی زبان سے بجائے اللہ اکبر کے "چہ خورد بامداد فرزندم" نکل سکتا ہے۔ الغرض اس میں بھی حکمت الٰہی ہے کہ بعضوں کو خلوص بسہولت حاصل ہو جاتا ہے اور گاؤں والوں کو دقت سے حاصل ہوتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ گاؤں والے خلوص کے مکلف ہی نہ ہوں مکلف ضرور ہیں اس پر بظاہر ایک اشکال بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر گاؤں والوں کو ایسی حالت میں تو خلوص حاصل نہیں ہوسکتا پھر ان کو اس کا مکلف کرنا تکلیف مالایطاق ہے اور بہت لوگوں کا یہی خیال ہے کہ ان کو یہ دولت حاصل نہیں ہوسکتی ہے اسی واسطے بعض لوگ ان کو

بہائم سمجھتے ہیں مگر یہ خیال غلط ہے گاؤں والوں کو مکلف بہ تحصیل خلوص ہونا تکلیف مالا یطاق کو ہرگز مستلزم نہیں کیونکہ خلوص کی تحصیل ان کی قدرت میں داخل ہے خارج از طاقت نہیں اگر وہ ارادہ اور کوشش کریں تو مقصود میں کامیاب ہوسکتے ہیں اور اس کے لئے ان کو اپنی کھیتی کے کام بھی چھوڑنا نہ پڑیں گے بلکہ اپنے کام میں مشغول ہوکر بھی مقصود حاصل کرسکتے ہیں چنانچہ کرکے دیکھ لیں ہوتا ہے یا نہیں اب شبہ یہ ہوتا ہے کہ پھر طریق بیکار ہے کیونکہ جب گاؤں والوں کو بھی مقصود حاصل ہوسکتا ہے گو اپنے کام ہی میں لگے رہیں اور باقاعدہ سلوک طے نہ کریں تو پھر طریق سلوک سے کیا نفع ہوا جواب یہ ہے کہ نفس حصول خلوص تو طریق پر موقوف نہیں لیکن سہولت حصول خلوص ضرور طریق پر موقوف ہے جس شخص نے طریق کو حاصل نہیں کیا وہ بھی خلوص میں کامیاب ہوسکتا ہے مگر دقت اور دشواری سے اور جس نے طریق کو طے کرلیا ہے وہ نہایت سہولت سے اس میں کامیاب ہوتا ہے اور ان دونوں کی ایسی مثال ہے جیسے پکا حافظ اور کچا حافظ، تراویح میں قرآن دونوں سنا سکتے ہیں مگر دونوں میں جو فرق ہے ظاہر ہے پکا حافظ تو اللہ اکبر کہتے ہی بے تکلف رواں پڑھتا چلا جائے گا اسے کہیں متشابہ نہ لگے گا اور کچا حافظ بیسیوں جگہ اٹکے گا اور متشابہ کی وجہ سے کہیں سے کہیں پہنچ جائے گا پھر لوٹ کر ادھر سے پڑھے گا اور سوچ سوچ کر متشابہ کو نکالے گا اسی طرح جو لوگ طریق کو حاصل کئے ہوئے ہیں ان کی تو یہ حالت ہے کہ جہاں انھوں نے نماز کی نیت کی اور فوراً ذکر میں غرق ہوگئے اُن کے خیالات ادھر اُدھر پریشان نہیں پھرتے کیوں انھوں نے مجاہدے کئے ہیں ریا و کبر وغیرہ کا علاج کیا ہے مشقتیں جھیلیں ہیں اب ان کے دل میں غیر خدا کا خیال بھی نہیں آتا اور اگر آیا بھی تو ذرا سی توجہ سے دفع ہوگیا اور جن لوگوں نے طریق طے نہیں کیا اور یہ مشقتیں نہیں جھیلیں نہ مجاہدات و ریاضات کئے ہیں ان کے لئے یہ مشکل ہے کہ نیت باندھتے ہی دل کا رُخ حق تعالیٰ کی طرف ہوجائے ان کو چاہیئے کہ اپنی طرف سے کوشش کرکے نفس کو پنجرے میں بند کریں اور اپنے ارادہ سے

کوئی خیال نہ لادیں اور نفس کو گھیر گھار کر مقید کریں جیسے مرغی کو گھیر گھار کر کھڈے میں بند کیا کرتے ہیں اگر اس نے اس کا اہتمام کرلیا تو دونوں کی نمازیں ایک میزان میں ہوں گی بلکہ جس نے نفس کو مشقت سے گھیر گھار کر مقید کیا ہے اور مصیبت کے ساتھ خیالات کی آمد کو روکا ہے اس کے لئے مشقت کا اجر زیادہ ہوگا۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے خواب میں دیکھا پوچھا حضرت آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا فرمایا کہ خدا تعالےٰ نے مجھے بخشدیا اور نہایت چین میں ہوں مگر ہمارا پڑوسی ہم سے بھی بڑھ گیا' حالانکہ نہ اس نے وہ مجاہدات کئے جو ہم نے کئے تھے نہ طریق سلوک طے کیا۔ وہ بیچارہ اہل وعیال والا تھا سوائے ضروریات واجبات وفرائض کے کچھ نہ کرتا تھا دن بھر اہل وعیال کے لئے کسب معاش کرتا تھا لیکن ہر وقت اس میں رہتا تھا کہ کاش میرے لئے بھی کبھی وہ دن آئے کہ ابراہیم بن ادہم کی طرح مطمئن ہو کر اللہ کا نام لوں اور یہ حال ہو ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے ... بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہای وہوی

(فراغ قلب سے ایک نظر معشوق کے چہرہ پر ڈالنا اس شاہی چھتری سے بہتر ہے کہ سلطنت کی پائے ہوے کا شور و غوغا ہو)

اور یہ حال ہو ؎

چہ خوش است با تو بزمے بنہفتہ ساز کردن ... در خانہ بند کردن سر شیشہ باز کردن

(کیا ہی اچھا ہو کہ تیرے ساتھ ایک خفیہ مجلس ہو اور گھر کا دروازہ بند کرکے جام شراب کی مہر کھولی جائے)

ساری عمر وہ اسی تمنا میں رہا مگر ایک دن بھی اسے فراغ نصیب نہ ہوا لیکن آج جو اس کو درجات ملے ہیں ابراہیم ان کو ترس رہا ہے۔ اور حق تعالیٰ نے اس کی نیت پر نظر فرمائی گو عمل قلیل تھا مگر اس کا ارادہ تو ہر وقت یہی تھا کہ ذرا فراغ نصیب ہو تو یوں ذکر کروں اس طرح نمازیں پڑھوں اور اس طرح مجاہدات کروں بس اس کی یہ نیت قبول ہوگئی اب کیا حقیر سمجھتے ہو اے صوفیو! تم ان گاؤں والوں کو۔ ممکن ہے کہ یہ تصوف میں

بھی تم سے افضل ہوں کیونکہ تصوف تام خلوص فے الاعمال کا ہے تو ممکن ہے کہ بعضے گاؤں والے خلوص میں تم سے بڑھے ہوئے ہوں پھر جس مشقت سے وہ اپنی اہل وعیال کے لئے کسب معاش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ خلوص میں جو ان کو دقت پیش آتی ہے اس کی وجہ سے ان کے درجات آخرت میں تم سے بڑھ جائیں یہ حق تعالیٰ کا راستہ ہے جو ہر شخص کے لئے مختلف ہے کسی کو کھیتی اور ہل جوتنے ہی میں مقصود تک پہنچا دیا۔ کسی کو خانقاہ میں رکھ کر پہنچا دیا کسی کو سہولت سے پہنچایا کسی کو مشقت سے کسی کو بسط کی راہ سے لے گئے کسی کو قبض کی راہ سے۔ ایک ایسے عاشق ہیں کہ ڈھول پیٹتے ناچتے کودتے مقصود تک پہنچتے ہیں جیسے چشتیہ ہیں کہ یہ اپنے کو بھی بدنام کرتے ہیں اور محبوب کا بھی پردہ کھول دیتے ہیں ؎

عشق معشوقاں نہان است دستیر　　　عشق عاشق با دو صد طبل ونفیر

(معشوقوں کا عشق پوشیدہ اور پنہاں ہوتا ہے اور عاشقوں کا عشق ہوا اور سیکڑوں ڈھول اور نفیر کی طرح شور وغوغا کرتا ہے)

ایک نقشبندیہ ہیں جو چپ چاپ راستہ طے کرتے ہیں نہ اپنے عشق کو ظاہر کریں نہ محبوب کا راز فاش کریں۔ مولانا جامی فرماتے ہیں ؎

نقشبندیہ عجب قافلہ سالارانند　　　کہ برند از رہ پنہاں بحرم قافلہ را

(نقشبندی سلسلے کے لوگ عجیب سالار قافلہ ہیں کہ مخفی راہ سے مراقبہ کئے ہوئے کعبہ شریف (حرم) تک قافلۂ طالباں کو پہنچا دیتے ہیں یعنی سلوک طے کرا دیتے ہیں)

ایک کو مسہل دے دیا ہے وہ بھڑ بھڑ کر رہا ہے، ایک کو لخلخہ سونگھا دیا ہے وہ خراٹے لے رہا ہے ایک کو ایسی نفیس دوا دی کہ آواز بھی نہیں نکلتی کسی کو کسی پر اعتراض کا حق نہیں طبیب نے جس کے مناسب جو دوا دیکھی وہی اس کو دیدی اس میں مریض پر کیا اعتراض ہے۔ ایک شخص کو تو پھول دیدیئے وہ تو اس کی خوشبو میں مست ہے اور ایک سے پھول خرچ کرا کر اس کے دل میں ایک باغ لگا دیا ؎

خود کہ باید ایں چنیں بازار را　　　کہ بیک گل میخری گلزار را

(ایسے کریم کا بازار لطف وکرم کون پا سکتا ہے کہ ایک گل کے عوض میں گلزار خرید سکتے ہو)

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد ۔۔۔ انچہ در وہمت نیاید آں دہد

(یہ وہی جان لیتے ہیں مجاہدات میں اور اس کے انعام میں سیکڑوں جانیں عطا فرماتے ہیں۔ بلکہ ایسی نعمتیں بھی عطا فرماتے ہیں جو تیرے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتی ہیں)

یہ روتا ہے کہ ہائے مجھ سے پھول چھین لئے وہ تسلی دیتے ہیں کہ بے وقوف تجھے ہم باغ دیں گے جس میں ہزاروں پھول دار درخت ہوں گے یہ پھول تو چند روز میں کمہلا جائیں گے اور درخت لگنے کے بعد ہمیشہ تازہ بتازہ نو بہ نو پھول لگیں گے یہی حال اس شخص کا جس سے کیفیات چھین لی جاتی ہیں وہ روتا ہے کہ ہائے کیفیات جاتی رہیں اور یہ نہیں جانتا کہ اس کے بعد مقامات عطا ہوں گے جو بمنزلہ باغ کے ہیں حصول مقامات کے بعد سب کیفیات تمہارے قبضہ میں ہو جائیں گی کہ جس وقت جس کیفیت کو چاہو اپنے اوپر وارد کرلو اب تو گھر میں درخت موجود ہے اب کیا غم ہے غرض یہ حق تعالےٰ کا راستہ ہے جو صوفیوں ہی کے لئے مخصوص نہیں۔ گاؤں والے بھی اس کو طے کرسکتے ہیں گو مشقت ہی سے طے کریں سو مشقت والوں کو حقیر مت سمجھو ان پر ہنسو نہیں کہ یہ کس مصیبت سے چل رہا ہے اور ہم کیسے ہلکے پھلکے چل رہے ہیں تم کو کیا خبر ہے کہ عنداللہ کون بڑھا ہوا ہے ۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب قیامت میں اہل مصیبت کو نعمتیں دی جائیں گی تو اہل نعمت کہیں گے کہ کاش دنیا میں ہماری کھال قینچی سے کتری گئی ہوتی اور آج ہم کو بھی یہ درجے ملتے تو تم کو کیا قدر ہے ان مصیبت والوں کی۔ لکھنؤ والوں کو مرچوں کی کیا قدر وہ ہم پر ہنستے ہیں کہ یہ کھانا کیا کھاتے ہیں آگ کھاتے ہیں اور ہم ان پر ہنستے ہیں کہ تم کھانا کیا کھاتے ہو خاک کھاتے ہو واقعی جس کھانے میں مرچیں نہ ہوں وہ تو مٹی ہے بعض لوگ کریلے کی تلخی دور کر کے پکاتے ہیں میں کہا کرتا ہوں کہ وہ کریلا ہی کیا جو کڑوا نہ ہو۔

(بینات محرم ۸۲ھ)

(ان شاء اللہ تعالیٰ باقی آئندہ)

ملاّ جیون کا قصّہ ہے کہ شاہ عالمگیر نے ان کی دعوت کی اور عرض کیا کہ آپ کچھ فرمائش کیجئے انھوں نے گلگلوں کی فرمائش کی۔ باورچی نے نہایت اعلیٰ درجہ کے گلگلے تیار کئے مگر ان کو پسند نہ آئے۔ بادشاہ کو محسوس ہوا حکم دیا اور اچھے پکائے جادیں، پہلے سے بھی اعلیٰ درجہ کے پکائے وہ بھی پسند نہ آئے باورچی سمجھ گیا۔ تیسرے دن اس نے گڑ اور تیل کے پکائے۔ بہت خوش ہوئے کہ ہاں آج پکے ہیں۔ تو اے صاحبو! جب دنیا کی بعض چیزیں ایسی ہیں جو تلخی کے ساتھ ہی لذیذ ہیں پھر دین کے کاموں میں کیوں تعجب ہوتا ہے اگر وہ باوجود تلخی کے کسی کو لذیذ معلوم ہوتے ہوں پھر دین کے واسطے ذراسی تلخی کیوں گوارا نہیں ہوتی مجھے اس کی دو زندہ مثالیں یاد ہیں۔ ایک مرچ ایک تمباکو کہ ان کی لذت سوزش اور تلخی ہی کے ساتھ ہے، تمباکو جتنا تیز اور کڑوا ہوا اتنا ہی تمباکو کھانے والوں کے نزدیک عزیز ہے پھر حیرت ہے کہ دین کے لئے ذراسی سوزش اور تلخی گوارا نہ ہو اسی طرح مرچ جتنی تیز اور تلخ ہو۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر آج تم کو دین کا کوئی کام گراں اور ناگوار معلوم ہوتا ہے تو تم اس پر عمل کر کے دیکھو چند دن میں اس کی تلخی لذیذ معلوم ہو گی۔ پس گاؤں والوں کو ہمت نہ ہارنا چاہیئے۔ اور گو ان کو دین کے کاموں میں مشقت معلوم ہو مگر ہمت کر کے عمل کرنا چاہیئے۔ پھر جس طرح ان کو ہل جوتنا آسان ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ دین کے کام آسان ہو جائیں گے۔ چند روزے جہد کن باقی بخند۔ اسی طرح جس شخص کو پہلے کیفیات حاصل تھیں جن سے کام آسانی سے ہو رہا تھا اور اب کیفیات حاصل نہیں جس کی وجہ سے کام میں جی نہیں لگتا وہ بھی پریشان نہ ہو ہمت کر کے تلخی کی برداشت کر کے کام میں لگا رہے۔ اس طریق میں قبض وبسط کا پیش آنا ناگزیر ہے۔ بلکہ قبض اگر نہ ہو تو عشاق کو لذت نہیں آتی۔ مزا اس میں ہے کہ آج بسط ہے کل قبض ہے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

ضروری اطلاع: خط و کتابت کرتے وقت یا پتہ بدلتے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمایا کریں۔

از دست ہجر یار شکایت نمی کنم گر نیست غیبتے نہ دہد لذتے حضور

(محبوب کی طرف سے جدائی کا غم آنے پر شکایت نہیں کرتا ہوں کیونکہ اگر غیبت نہ ہو حضوری کی لذت بھی نہ آئے یعنی لذت وصال کی قدر تکلیف فراق کے بعد ہی ہوتی ہے)

عاشق اگر واقعی عاشق ہے تو اس کو یہ خواہش ہوگی کہ محبوب کبھی عتاب بھی کرے منہ بھی چڑھا دے ہاں فاسق یہ چاہا کرتا ہے کہ معشوق ہر وقت اس کا مطیع ہی رہے عاشق ہمیشہ خود مطیع ہونا چاہتا ہے معشوق کو مطیع کرنا نہیں چاہتا حاجی صاحب کا ارشاد ہے کہ آدم علیہ السلام نے جنت میں صرف لطف کی شان دیکھی تھی اس وقت تک تفصیلی معرفت کامل نہ تھی جب ان سے لغزش کا صدور ہوا تو اس میں ان کو شانِ جلال دکھلائی گئی اس سے ان کی تفصیلی معرفت کامل ہوگئی تجلی جلال وتجلی جمال دونوں سے واقف ہوگئے واقعی یہ عجیب راستہ ہے جس میں عقل کام نہیں دیتی بس یہاں تو حیرت ہی حیرت ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

گہ چنیں بنماید و گہ ضد ایں جز کہ حیرانی نباشد کار دیں

(کبھی اس طرح دکھاتے ہیں کبھی اس کے ضد کو دکھاتے ہیں۔ دین کے کام میں حیرانی ہی حیرانی ہے)

مگر یہ حیرت جہل کی نہیں بلکہ کمال معرفت کی وجہ سے حیرانی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

نے چنیں حیراں کہ پشتش سوی دوست بل چنیں حیراں کہ رویش روی دوست

(لیکن یہ حیرانی ایسی نہیں ہے کہ دوست کی پیٹھ دوست کی طرف ہو بلکہ ایسی حیرانی ہے محبوب کا چہرہ عاشق کے چہرہ کی طرف ہے)

یعنی ایک حیرت تو اس شخص کی ہے جس کو محبوب کا پتہ نہیں ملا غلط راستہ پر چل رہا ہے یہ تو حیرت مذمومہ ہے اور ایک حیرت اس شخص کی ہے جو محبوب کا جمال دیکھ کر حیران ہو رہا ہے محبوب کی طرف رُخ کئے ہوئے ہے اور اپنے سے بے خبر اس کی حیرت حیرت محمودہ ہے تو عارف کو قبض میں بھی ترقی ہوتی ہے۔ آدم علیہ السلام کے لئے یہ حالت حالت

قبض ہی تھی جس میں ان کو پہلے سے زیادہ ترقی ہوئی ؎

سیرِ زاہد در ہے یک روزہ راہ   سیرِ عارف ہر دمے تا تختِ شاہ

(زاہد کی سیر ایک ماہ میں ایک دن کا راستہ ہے اور عارف ہر سانس میں شاہ حقیقی کے تخت تک پہنچتا ہے)

عارف کی کوئی حالت ترقی سے خالی نہیں ہوتی اس کی سیر ہر دم عرش تک ہوتی ہے پس جس طرح بسط میں ایک حیات ہے قبض میں بھی ایک حیات ہے اس لئے محقق کبھی کیفیات کی قلت سے پریشان نہیں ہوتا وہ ہر حال میں اپنا کام کئے جاتا ہے باقی غیر محقق چونکہ کیفیات ہی کو مقصود سمجھتا ہے وہ دو مفسدوں میں مبتلا ہو جاتا ہے بعضے تو کیفیت کے نہ ہونے سے عمل میں کمی کر دیتے ہیں اور بعضے کیفیت کے ہونے سے عمل میں کمی کر دیتے ہیں جیسا کہ اوپر مفصلاً بیان کیا گیا ہے یہ دونوں حالتیں اچھی نہیں اس لئے اس خیال کو دل سے نکال دینا چاہیئے اور کیفیات کو مقصود نہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ تتمہ تھا پہلے بیان کا اور اتنی لمبی تقریر کا قصد نہ تھا ارادہ مختصر تقریر کا تھا مگر بلا قصد کے اتنی لمبی ہوگئی۔ خیر حرج ہی کیا ہے، ہر چیز کا لمبا ہونا بُرا نہیں۔ قد کا لمبا ہونا تو بُرا ہے مگر زلف کا دراز ہونا محبوب ہے ایک مرتبہ ناسخ اور ایک اور شاعر کسی مجلس رقص میں جمع ہو گئے رقاصہ لمبی بے ڈول تھی تو ان میں سے ایک نے کہا ؎ طول شب فرقت سے بھی دو ہاتھ بڑی ہے۔

رقاصہ نے ہنس کر بغرض جواب دینے کے کہا کیا، دوسرے نے فوراً کہا ؎

وہ زلف مسلسل جو تیرے رُخ پہ پڑی ہے۔ اس مصرع نے اس طول کو حسین بنا دیا جو پہلے مصرع سے مذموم معلوم ہوا تھا کیونکہ اس نے اس طول کو زلف کی طرف راجع کر دیا اور زلف کا دراز ہونا عیب نہیں بلکہ مدح ہے۔ ایک تتمہ تو مضمون سابق کا یہ تھا۔ اور دوسرا تتمہ یہ ہے کہ میں نے بیان گذشتہ سے پہلے بیان کیا تھا کہ تقلیل طعام کو تو شریعت نے مجاہدہ قرار دیا ہے مگر ترک وقاع یا تقلیل وقاع کو مجاہدہ قرار نہیں دیا اس وقت میں اس مضمون کی کسی قدر تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔

اور شاید میں نے پہلے یہ بھی کہا تھا یا نہیں کہ زہد کے لئے تقلیل اللذات کافی ہے،
ترک لذات زہد میں ضروری نہیں کیونکہ سب سے بڑھ کر الذ الاشیاء وقاع ہے
اگر ترک لذات لازم ہوتا تو کم از کم حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اس سے رُکتے جیسا کہ عیسیٰ
علیہ السلام نے نکاح نہیں کیا جس کی وجہ سے آج عیسائی فخر کرتے ہیں کہ ہمارے
نبی تارک لذات تھے اور مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ تمہارے نبی تارک
لذات نہ تھے متبع شہوت تھے کہ نو نکاح کئے جس سے ناواقف مسلمان ان کے سامنے
جھینپتے ہیں سو اگر ترک لذات لازم زہد ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکاح کو ضرور
ترک کرتے تاکہ مخالفین کو مسلمانوں پر اس اعتراض کا موقع نہ ہوتا جس اعتراض
کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک بے ادب گنوار نے ایک بے ادب عیسائی کے جواب میں بک دیا
کہ پہلے تم یہ تو ثابت کر دو کہ عیسیٰ علیہ السلام میں قوت مردانگی بھی تھی اسی وقت
ان کے ترک نکاح پر فخر کرنا۔ مگر یہ بھی سخت بے ادبی ہے عیسیٰ علیہ السلام پر اس
ضعف کا شبہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حدیث بخاری میں ہرقل کا قول مذکور
ہے جس پر اجلہ صحابہ نے سکوت کیا جس سے اس کی تقریر ہو گئی کذٰلک الرسل
تبعث فی احساب تو معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام ہمیشہ اعلے حسب میں مبعوث ہوتے
ہیں کمالات ذاتیہ کو جس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام تمام کمالات سے علیٰ
وجہ الکمال موصوف ہوتے ہیں تاکہ کسی کو ان کے اتباع سے عار نہ ہو اور ظاہر ہے
کہ اگر آپ کسی شخص کی نسبت یہ سن لیں کہ وہ عنین ہے تو طبیعت کو اس سے معًا رکاوٹ
ہو جاتی ہے اور وہ شخص فوراً نگاہوں سے گر جاتا ہے حالانکہ اس وقت زیادہ
معتقد ہونا چاہیئے تھا کیونکہ معلوم ہوا کہ فرشتہ ہے مگر کچھ قاعدہ ہے کہ انسان
کے ساتھ اعتقاد جب ہی ہوتا ہے جبکہ اس میں مواد تو سب موجود ہوں پھر اس کے
روکنے میں فرشتہ ہو اور اگر خالص فرشتہ ہو تو اعتقاد کم ہوتا ہے۔ اسی واسطے
یحییٰ علیہ السلام کے بارہ میں جو حصوراً وارد ہے اس کے معنے مفسرین نے حصوراً
لکھے ہیں اور عنین کے ساتھ تفسیر کو منکر کہا ہے (کذا فی الشفاء معللا بان ہذہ نقیصۃ

وعیب ولا تلیق بالانبیا علیہم السلام) بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کو روکنے والے ہیں چنانچہ سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یحییٰ علیہ السلام نے اخیر عمر میں نکاح کیا تھا (کذا فی الشفاء) جس سے ان کے عنین ہونے کا شبہ بالکل زائل ہوگیا۔ بلکہ معلوم ہوا کہ ایسے قوی مرد تھے کہ ان کی قوت مردانگی بڑھاپے میں باقی رہی اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اخیر زمانہ میں نازل ہوکر نکاح کریں گے۔ حدیث میں آتا ہے ویولدلہ کہ ان کے اولاد بھی ہوگی جس سے ان کے ضعیف ہونے کا شبہ ہو ہی نہیں سکتا بلکہ معلوم ہوا کہ ان کی قوت اتنی زیادہ تھی کہ ہزاروں برس فرشتوں میں رہ کر بھی طاقت کم نہ ہوئی بلکہ اس سے تو بظاہر نظر ان کی یہ قوت حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے مگر نصوص سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام کمالات میں انبیاء علیہم السلام سے اکمل ہیں اس لئے یہ شبہ نہیں ہوسکتا الغرض ترک لذات لازم زہد نہیں ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکاح نہ کرتے بلکہ تقلیل لذات زہد کے لئے کافی ہے سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے نکاح کئے ہیں آپ کی اصلی قوت کے اعتبار سے وہ تقلیل لذات ہی میں داخل ہیں کیونکہ احادیث میں وارد ہے کہ صحابہ آپ کے اندر تیس مردوں اور بعض روایات میں ہے کہ چالیس مردوں کی قوت کا اندازہ کرتے تھے اور ایک مرد کی قوت چار عورتوں کے لئے کافی ہے۔ اسی لئے شریعت نے چار نکاح تک کی اجازت دی ہے۔ اس اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اتنی قوت تھی جو ایک سو بیس عورتوں کو اور دوسری روایت کے موافق ایک سو ساٹھ عورتوں کے لئے کافی تھی۔ بلکہ شرح شفاء میں ابو نعیم سے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ یہ چالیس مرد جنت کے مردوں میں سے ہیں اور ان میں ہر مرد کی قوت حسب روایت ترمذی ستر مردوں کی برابر ہوگی اور ایک روایت میں سو مردوں کی برابر آیا ہے تو ایک حساب سے آپ میں قریب تین ہزار مرد کے برابر اور ایک حساب سے چار ہزار مرد کے برابر قوت ہوئی

لمہ کما عللہ فی شرح الشفا لبعض البصر ووضع الفتنۃ ۱۲ منہ عمہ کلا الروایتین فی الشفاء ۱۲ منہ

پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نو پر صبر کرنا یہ کمال زہد تھا۔ اور آپ اس پر بھی قادر تھے کہ بالکل صبر کر لیتے چنانچہ جوانی میں آپ نے پورا صبر کیا کہ پچیس سال کی عمر میں چالیس سال کی بیوہ عورت سے نکاح کیا، بھلا کنوارا مرد ایسی عورت سے نکاح کر سکتا ہے جو اس کی ماں بن سکے ہرگز نہیں۔ پس جوانی میں آپ کا چالیس سالہ عورت سے نکاح کرنا اور ساری جوانی اسی کے ساتھ تیر کر دینا اس کی کافی دلیل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم متبع شہوات ہرگز نہ تھے بلکہ آپ اعلیٰ درجہ کے زاہد تھے مگر بوڑھاپے میں آپ نے نو نکاح کئے تو ضرور آپ کے ان نکاحوں میں کوئی حکمت تھی۔ چنانچہ ایک حکمت تو وہ تھی جو بعض عارفین نے بیان کی ہے کہ منشاء تکوین عالم محبت ہے جیسا کہ کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق سے معلوم ہوتا ہے گو یہ حدیث ان الفاظ سے محدثین کے نزدیک ثابت نہیں مگر مضمون صحیح ہے جو حدیث ان اللہ جمیل یحب الجمال سے ثابت ہے جس کی تقریر نکت دقیقہ کے مضمون ہشدہم میں اور کلید مثنوی دفتر اول قبول کردن خلیفہ ہدیہ را تحت شعر گنج مخفی بد ز پری جوش کرد میں احقر نے کی ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ اس محبت تکوین کا مظہر سب سے زیادہ وقاع ہے کہ اس میں بھی محض محبت بواسطہ وقاع کے سبب ہو جاتا ہے تکوّن ولد کا بدون کسی تدبیر خاص کے جیسے تکوین عالم میں محض محبت بواسطہ کلمہ کن کے سبب ہو گیا تکون عالم بدون کسی خاص تدبیر کے پس عارف کو عورت کے تلبس میں یعنی جماع میں محبت تکوین کی تجلّی کا مشاہدہ ہوتا ہے اس لئے وہ نکاح کرتا ہے اور اسی لئے جماع کی اس کو دوسروں سے زیادہ رغبت ہوتی ہے اور حدیث حُبّبَ الیّ من دنیاکم النسا کا بنی اسی راز کو بعض عارفین نے فرمایا ہے۔ دوسری حکمت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے نکاحوں میں یہ تھی کہ امت کو عورتوں کے ساتھ برتاؤ کرنے کا طریقہ معلوم ہوا اگر آپ نکاح نہ کرتے اور پھر عورتوں کے حقوق کی تعلیم دیتے تو اس کا زیادہ اثر نہ ہوتا۔ کسی کو شبہ ہو سکتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

خود تو نکاح کیا نہیں اس لئے بلا تامل عورتوں کے اتنے حقوق بیان فرما دیئے نکاح کرتے تو شاید ان حقوق کا ادا کرنا مشکل ہوتا اور اب کسی کو یہ کہنے کا منہ نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت سے زیادہ نکاح کرکے دکھا دیئے اور سب کے حقوق اس خوبی سے ادا فرمائے کہ اس کی نظیر کوئی پیش نہیں کرسکتا۔ حقیقت میں بیبیوں کے حقوق ادا کرنا بڑے عقلمند کا کام ہے۔ کیونکہ بی بی سے دو قسم کے تعلق ہوتے ہیں ایک علاقہ حاکمیت و محکومیت کا کہ مرد حاکم ہوتا ہے اور عورت محکوم۔ دوسرا علاقہ محبیت و محبوبیت کا کہ مرد محب اور عورت محبوب ہوتی ہے۔ علاقہ حکومت کے ساتھ علاقہ محبت کی رعایت کرنا بڑا دشوار ہے۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ اگر محبت کے حقوق ادا کرتے ہیں تو حکومت کے حقوق فوت ہوجاتے ہیں چنانچہ جو لوگ بیبیوں کے عاشق مشہور ہیں وہ اکثر ان کی غلامی ہی کرنے لگتے ہیں ان کی خاک حکومت نہیں ہوتی بیوی پر نہ کچھ رعب ہوتا ہے اور جو لوگ حکومت کے حقوق ادا کرتے ہیں ان سے محبت کے حقوق فوت ہوجاتے ہیں، دونوں کو جمع کرنا اور ہر ایک کے پورے پورے حقوق ادا کرنا کہ بی بی پر رعب بھی ہو حکومت بھی ہو اور اس کے ساتھ اس کا دل بھی شوہر سے کھلا ہوا ہو کہ بے تکلف ہنس بھی لے بول بھی لے اور مذاق بھی کرلے اور اس پر ناز بھی کرلے یہ انسان کامل کا کام ہے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کرسکتے تھے یا وہ شخص کرسکتا ہے جو آپ کا کامل متبع ہو۔ چنانچہ احادیث میں وارد ہے کہ ایک بار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضؓ کو یاد فرمایا تو حضرت عائشہ رضؓ نے عرض کیا کہ آپ اُن بڑھیا کو کیا یاد فرمایا کرتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اچھی آپ کو دے دی حدیث میں ہے فغضب حتی قلت والذی بعثك بالحق لا اذکرها بعد هذا الا بخیر۔ یعنی آپ کو غصہ آگیا جس سے حضرت عائشہ رضؓ ڈر گئیں اور بقسم عرض کیا کہ اب سے جب کبھی ان کا ذکر کروں گی بھلائی سے کروں گی۔ یہ حالت رعب کی حضرت عائشہ پر تھی جن کو سب سے زیادہ ناز تھا تو دوسرے ازواج کی تو کیا حالت ہوگی تو ناز برداری کے ساتھ رعب کا

جمع کرنا سرسری بات نہیں ۔ تیسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چند نکاح کر کے یہ بھی بتلا دیا کہ جس کے چند بیبیاں ہوں اسے سب کے ساتھ کس طرح عدل کرنا چاہیئے، خصوصاً اگر ایک کے ساتھ محبت زیادہ ہو اور دوسریوں سے کم ہو تو اس وقت اپنی طرف سے کوئی بات ایسی نہ کرے جس سے ایک کی ترجیح ظاہر ہو بلکہ امور اختیاریہ میں برابری کا پورا خیال رکھے ۔ چنانچہ آپ نے یہ بھی کر کے دکھا دیا کہ باوجودیکہ آپ کو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سب سے زیادہ محبت تھی مگر عدل میں کبھی آپ نے فرق نہیں کیا ان میں اور دوسری بیبیوں میں بلکہ ہمیشہ سب میں عدل کی پوری رعایت فرماتے تھے باقی دل کا ایک طرف زیادہ مائل ہونا یہ آپ کے اختیار سے باہر تھا اس میں برابری کیسے کرتے اس لئے آپ فرمایا کرتے تھے اللھم ھذا قسمی فی ما املك فلا تلمنی فیما تملك ولا املك ۔ اے اللہ یہ میری برابری ہے اس چیز میں جس پر مجھے قدرت ہے پس مجھ سے اس بات میں مواخذہ نہ کیا جائے جس چیز پر مجھے قدرت نہیں ۔ اس میں میلان قلب ہی کی طرف اشارہ ہے جو حضرت عائشہ رض کی طرف زیادہ تھا ۔ اور یہ بات آپ کی طرف سے نہ تھی بلکہ غیب سے ایسے سامان کئے گئے کہ خواہ مخواہ آپ کے دل کو حضرت عائشہ رض کی طرف زیادہ میلان ہو چنانچہ نکاح سے پہلے حق تعالیٰ نے خود ایک حریر کے کپڑے میں فرشتہ کے ذریعہ سے حضرت عائشہ رض کی تصویر بھیجی تھی کہ یہ آپ کی بی بی ہیں جب آپ نے اس کو کھولا تو حضرت عائشہ رض کی تصویر پر نظر پڑی اور وہاں یعنی عالم آخرت میں تصویر جائز ہے ۔ اگر تم وہاں اپنا فوٹو کھچواؤ گے تو ہم منع نہ کریں گے یہ معاملہ حق تعالیٰ نے کسی اور بی بی کے ساتھ نہیں کیا ۔ دوسرے وحی میں یہ معاملہ تھا کہ کسی بیوی کے لحاف میں آپ پر وحی نہ آتی تھی بجز حضرت عائشہ رض رضی اللہ عنہا کے کہ ان کے لحاف میں بھی آپ ہوتے تو بے تکلف وحی آتی تھی تو یہ باتیں تھیں جن کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ ہی نے حضرت عائشہ کی جانب زیادہ مائل فرما دیا، پھر اس پر ان کی قدرتی ذہانت و فقاہت اور حسن سیرت سونے پر سہاگا تھا ۔

اصل وجوہ آپ کی محبت کے وہی تھے جو پہلے مذکور ہوئے۔ حق تعالیٰ کو بھی حضرت عائشہؓ کے ساتھ سب بیبیوں سے زیادہ محبت تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پھر کیوں محبت نہ ہوتی مگر بایں ہمہ سوائے محبت قلبی کے ظاہری برتاؤ آپ کا سب کے ساتھ برابر تھا۔ پھر آپ نے جس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا ہے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی اور حضرت عائشہؓ کی نو سال کی تھی وہ بالکل بچی تھیں اور بکر۔ ان کے کوئی بی بی آپ کی کنواری نہ تھیں۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ آپ کو امت کو یہ دکھلانا تھا کہ جس شخص کی عمر زیادہ ہو

لہ اور اس واقعہ سے یہ شبہ نہ ہو جو صحاح میں وارد ہے کہ ایک مرتبہ ازواج مطہرات نے مجتمع ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت ام سلمہ کو اور ان کے بعد حضرت زینب کو بھیجا تھا فقالت ان ازواجك ينشدن نك العدل فی ابنة ابی قحافة کہ آپ کی ازواج مطہرات عائشہ کے متعلق آپ سے عدل کی درخواست کرتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس واقعہ میں ازواج مطہرات کی درخواست یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ سے فرمادیں کہ وہ اپنے ہدایا میں عائشہؓ کی باری کا انتظار نہ کیا کریں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس بیوی کے یہاں بھی ہوں وہیں ہدایا بھیجا کریں اس کی کیا وجہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ کے یہاں ہوتے ہیں اسی وقت ہدایا بھیجے جاتے ہیں اور دوسری بیبیوں کی باری میں نہیں بھیجے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم انکار فرماتے تھے کہ میں صحابہ سے ایسا نہ کہوں گا۔ بس آپ کے اس انکار کو ازواج مطہرات نے عائشہؓ کی طرفداری پر محمول فرمالیا حالانکہ یہ ان کی غلطی اجتہادی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ سے ایسی بات کہنے سے غیرت مانع تھی کیونکہ ہدیہ تو دینے والے کی خوشی پر ہے اب آپ ان سے یہ فرمائیں کہ تم مجھے ایک دن نہ دیا کرو بلکہ ہر دن دیا کرو۔ اس میں اول تو ایک قسم کا سوال ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غیور طبیعت کے بالکل خلاف تھا۔ دوسرے ہدیہ دینے والوں کی خوشی کو فوت کرنا ہے جو روح ہے ہدیہ کی ان وجوہ سے آپ انکار فرماتے تھے کہ میں صحابہ سے ہدیہ کے متعلق کچھ نہ کہوں گا، بتلایئے اس میں حضرت عائشہؓ کی کیا طرفداری ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قدرتی طور پر اس بات سے غیرت تھی کہ اس لئے کہتے سے رکتے تھے۔ مگر ازواج نے اس کو بلاوجہ طرفداری پر محمول فرمالیا پھر بعد میں وہ بھی سمجھ گئیں کہ آپ کے انکار کا منشا طبعی غیرت ہے، کسی کی طرفداری نہیں خوب سمجھ لو ۱۲ جامع

اس کو کنواری بچی کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیئے عموماً عادت یہ ہے کہ ایسی صورت میں مرد کا برتاؤ اپنی عمر کے تقاضے کے موافق ہوا کرتا ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جوان کی بچپن کی عمر کا تقاضا تھا ان کے بچپن کی آپ پوری رعایت فرماتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ مسجد کے قرب میں حبشی لڑکے عید کے دن کھیل کود رہے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ حبشیوں کا کھیل کود دیکھو گی انھوں نے خواہش ظاہر کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پردہ کر کے دیر تک ان کو کھیل[1] دکھلایا اور جب تک وہ خود ہی نہ ہٹ گئیں اس وقت تک آپ برابر کھڑے ہو کر ان کو کھیل دکھلاتے رہے۔ حضرت عائشہؓ کو بچپن کی وجہ سے گڑیوں[2] کے کھیل کا بہت شوق تھا اور محلہ کی لڑکیاں بھی ان کے پاس کھیلنے کے لئے آتی تھیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لاتے تو وہ لڑکیاں متفرق ہو جاتیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جمع کر کے پھر لاتے کہ آؤ بھاگتی کیوں ہو جس طرح کھیلتی تھیں کھیلتی رہو۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کے ساتھ مسابقت بھی کی کہ دیکھیں کون آگے نکلتا ہے۔ اس وقت حضرت عائشہؓ ہلکی پھلکی تھیں وہ آگے نکل گئیں۔ کچھ عرصہ کے بعد دوبارہ آپ نے پھر مسابقت کی۔ اس وقت حضرت عائشہ کا بدن بھاری ہو چلا تھا اس مرتبہ آپ آگے نکل گئے تو آپ نے یہ فرمایا کہ اس کا بدلہ ہے۔ بتلایئے کنواری بچی کی دلجوئی اور دل داری اور اس کے جذبات عمر کی رعایت بڑھاپے میں کوئی مرد اس طرح کر سکتا ہے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کی حاشا وکلا بوڑھوں سے یہ بہت دشوار ہے مگر ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بڑھاپے میں حضرت عائشہؓ کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جو جوان شوہر کو جوان بی بی کے ساتھ کرنا

---

[1] اور وہ محض کہنے میں تو کھیل تھا ورنہ ورزش اگر اچھی نیت سے ہو عبادت ہے اور چونکہ ان کھیلنے والوں کو دیکھنے میں کوئی فتنہ نہ تھا اس لئے یہ شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اجنبی مردوں کو کیسے دیکھا ۱۲

[2] یہ نام کی گڑیاں تھیں تصویریں نہ تھیں ۱۲ منہ

چاہیئے بلکہ کوئی جوان بھی اتنا نہیں کر سکتا جتنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کے ساتھ کیا آجکل جو لوگ وقار وقار پکارتے ہیں یہ وقار تکبر کا پوٹلہ ہے ان لوگوں نے تکبر کا نام وقار رکھ لیا ہے۔ یاد رکھو وقار کے خلاف کام وہ ہے جس میں دین پر بات آتی ہو اور جس میں دین مصلحت پر کوئی اثر نہ پہونچے محض اپنی عزتی سُبکی ہوتی ہو تو ایسا کام کرنا عین تواضع ہے آجکل جو لوگ وقار کا پوٹلہ بغل میں دبائے ہوئے ہیں وہ بیوی کے ساتھ دوڑنے کو خلاف وقار سمجھیں گے مگر وہ ذرا زبان سنبھالیں اور آنکھیں کھولکر دیکھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کے ساتھ مسابقت کی ہے تو کیا معاذ اللہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو بھی خلاف وقار سمجھتے ہیں ہرگز نہیں اور اگر کوئی ایسا کہے تو اس کے ایمان کی خیر نہیں یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل خلاف وقار نہ تھا ہاں تکبر کے خلاف ضرور تھا پس اگر آجکل کے مدعیان وقار متکبر نہیں ہیں تو ذرا وہ ہم کو بیوی کے ساتھ دوڑ کر کے دکھلائیں مگر ان سے قیامت تک ایسا نہ ہوسکے گا ہاں جو شخص متکبر نہ ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا متبع ہوگا وہ ایسا ضرور کر سکتا ہے اور بحمد اللہ ہم نے بھی اس سنت پر عمل کیا ہے۔ ایک حکمت یہ تھی کہ عورتوں کے متعلق جو خاص احکام ہیں ان میں عورت کا واسطہ ہونا زیادہ نافع اور موجب سہولت ہوسکتا ہے۔ دوسری عورتوں کے لئے پھر وہ احکام جن امور کے متعلق ہیں ان میں عادات عورتوں کی مختلف ہوتی ہیں تو یہ نہایت مصلحت کی بات ہے کہ وہ وسائط متعدد ہوں تاکہ ہر قسم کے احکام سہولت سے ظاہر ہو سکیں اور ظاہر ہے کہ منکوحہ کی برابر کوئی بے تکلف واسطہ نہیں ہوسکتا۔ غرض یہ حکمتیں تھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد نکاحوں میں اور یہ بھی نمونہ کے طور پر چند بیان کر دی گئیں ہیں ورنہ اور بہت سی حکمتیں ہیں جن کے بیان کو عمر طویل چاہیئے ان وجوہ سے آپ نے متعدد نکاح کئے ہیں ورنہ اگر آپ چاہتے تو بالکل صبر کر لیتے اور جس طرح ساری جوانی ایک چالیس سالہ بیوہ کے ساتھ آپ نے گذار دی بوڑھاپے کو بھی ایک بیوی کے ساتھ گذار سکتے تھے۔ مگر آپ نے ان حکمتوں کی وجہ سے جن کا ابھی ذکر ہوا ہے

متعدد نکاح کئے جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ترک لذات زہد کے لئے لازم نہیں بلکہ صرف تقلیل لذات کافی ہے ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ترک نکاح ضرور کرتے دوسرے یہ کہ مجاہدات وریاضات سے مقصود کسر قوت بہیمیہ ہے اور وقاع سے یہ کسر زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے۔ منْ استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر و احصن للفرج و من لم فلیصم فانہ لہ وجاء ۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح صوم سے کسر قوت بہیمیہ ہوتی ہے اسی طرح نکاح سے بھی یہ قوت منکسر ہوتی ہے بلکہ نکاح کو اس میں زیادہ دخل ہے اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مقدم فرمایا غرض ثابت ہوا کہ ترک وقاع مجاہدہ نہیں ہے۔ایک تتمہ سابق کا اور بھی ہے وہ یہ کہ میں نے پہلے بیان میں یہ بھی کہا تھا کہ تقلیل طعام کے لئے غذا کم کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ فصل بین الاکلتین مجاہدہ کے لئے کافی ہے اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس وقت رمضان کا اخیر ہے سب دیکھ لیں تو صرف اس فصل ہی کی وجہ سے مجاہدہ کے آثار سب پر نمایاں ہو رہے ہیں، چنانچہ اس وقت سب کی قوت میں کمی معلوم ہو رہی ہے۔ سب لوگ ڈھیلے ڈھیلے ہو رہے ہیں باوجودیکہ افطار وسحر میں خوب کھاتے پیتے تھے مگر پھر بھی روزہ نے اپنا اثر دکھا دیا۔ ابتدار رمضان میں شبق بھی زیادہ تھا اور اب وہ بھی بہت کم ہے پس جن فلسفی مذاق صوفیہ نے یہ لکھا ہے کہ جو شخص رمضان میں بھی اور دنوں کی طرح پیٹ بھر کر کھاتا رہے اس نے روح صوم کو باطل کر دیا یہ ان کی اجتہادی غلطی ہے جس کا منشا صرف یہ ہے کہ انھوں نے یہ سمجھا کہ مقصود صوم سے کسر قوت بہیمیہ ہے سو جب رات کو خوب پیٹ بھر کر کھایا تو یہ کسر کہاں حاصل ہوا سو اول تو خود یہ حکمت اجتہادی ہے اس کے انتفار سے روح صوم کو باطل کہہ دینا رائے محض ہے اور اس رائے سے ابہام ہوتا ہے کہ اگر رات کو شبع کے ساتھ غذا ہو تو صوم ہی کا ثواب نہ ملے گا کیونکہ بدون روح کے محض صورت

ے جو شخص قدرت رکھتا ہو تم میں سے تو وہ نکاح کر لے اس لئے کہ نکاح سے حفاظت نظر اور حفاظت فرج میں مدد ملتی ہے اور جو قدرت نہ رکھتا ہو وہ روزہ کثرت سے رکھا کرے یہ اس کے لئے حفاظت کا ذریعہ ہے۔

بیکار ہے اور یہ یقیناً غلط ہے کہ جس شخص سے کوئی معصیت سرزد نہ ہو اس کا ثواب کم ہو جاوے دوسرے بعد تسلیم کسر اس صورت میں بھی حاصل ہے اور یہ غیر مسلم ہے کہ کسر کے لئے شب کا شبع بھی مضر ہے اس لئے یقیناً کہا جاوے گا کہ پیٹ بھر کر کھانے سے روح صوم ہرگز باطل نہیں ہوتی چنانچہ مشاہدہ ہمارے سامنے ہے کہ باوجود شب کے شبع کے رب کی قوت بہیمیہ منکسر ہو رہی ہے خصوصاً جبکہ شریعت میں اس قول کی کوئی اصل نہیں ملتی۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس کی تصریح کی ہے باقی احادیث میں جو جوع کی فضیلت آئی ہے وہ ایسی ہے جیسے مرض کی فضیلت آئی ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قصداً بیمار ہوا کریں اسی طرح یہ لازم نہیں کہ قصداً بھوکے رہا کریں اسی طرح جو شبع کی مذمت وارد ہے اس سے مراد شبع مفرط ہے جس کو فقہاء نے بھی منع کیا ہے مطلق شبع مراد نہیں ورنہ اگر مطلق شبع منکسر ہوتا تو حدیث میں صائم کو شکم سیر کرنے کی فضیلت وارد نہ ہوتی کیونکہ منکر پر اعانت کرنا فضیلت کیسے ہو سکتا ہے اس پر شاید کوئی یہ شبہ کرے کہ یہ کیسا مجاہدہ ہے کہ ایک ماہ کو تو دن میں کھانا پینا بند کر دیا پھر سال بھر کے لئے چھوڑ دیا کہ اب گیارہ مہینے رات دن کھاؤ پیو۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تو میرے اس قول کی تائید ہے کہ مجاہدہ خود مقصود نہیں بلکہ مقصود عمل ہے اسی واسطے شریعت نے سال بھر میں ایک مہینہ مجاہدہ کے لئے مخصوص کیا ہے باقی ایام میں مجاہدہ مقرر نہیں کیا بلکہ وہ اس عمل کا زمانہ ہے جس کے لئے مہینہ بھر مجاہدہ کیا ہے اور میں بقسم کہتا ہوں کہ یہ ایک مہینہ کا مجاہدہ ہی اصلاح نفس کے لئے کافی ہے اس کا اثر سال بھر رہتا ہے بشرطیکہ رمضان کو اس کے حقوق کے ساتھ پورا کیا جائے تجربہ ہے کہ جن کاموں کی عادت رمضان میں کر لی جاتی ہے سال بھر کے لئے وہ کام آسان ہو جاتا ہے۔ پس جو شخص رمضان میں تقلیل کلام تقلیل منام تقلیل اختلاط کا عادی ہو جائے گا سال بھر اس کو یہ کام آسان رہیں گے

لـہ اور ایک حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے روی ابن حبان فی الضعفاء و ابو نعیم فی الحلیۃ من حدیث عائشۃ رضی اللہ عنہ اذا سلم رمضان سلمت السنۃ کذا فی تخریج العراقی ۱۲ منہ

بشرطیکہ اس کا ارادہ بھی کرتا رہے اور نفس کی نگہداشت سے غافل نہ ہو ورنہ قصداً گناہ کرنے کا تو کچھ علاج ہی نہیں غرض اگر رمضان کو اچھی طرح گذارا جائے تو واللہ سال بھر معاصی سے بچنا آسان ہو جاتا ہے بشرطیکہ گناہ سے بچنا بھی چاہے اور جو بچنا ہی نہ چاہے تو اس نے مجاہدہ کا قصد ہی نہیں کیا پس تم رمضان میں مجاہدہ کا قصد کرو اور اصلاح نفس کا اہتمام کرو پھر اگر تم گناہوں سے بچنا چاہو گے تو دیکھ لینا کتنی آسانی ہوتی ہے غرض مجاہدہ خود مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود عمل ہے اور مجاہدہ تسہیل عمل کے لئے مشروع ہوا ہے جیسے مسہل معدہ کو نرم کرنے کے لئے دیا جاتا ہے تاکہ مادہ متعفنہ نکلکر معدہ کی اصلاح ہو جائے اور ظاہر ہے کہ مسہل روز روز نہیں ہوا کرتا سال بھر میں ایک دفعہ ہوتا ہے کہ معدہ درست ہو جائے تو سال بھر غذا کھائی جائے اور اس کے ہضم سے قوت حاصل کی جائے۔ اسی طرح شریعت نے مجاہدہ کا زمانہ ایک ماہ رکھا ہے اور اس کو بھی عمل سے خالی نہیں رکھا بلکہ ہر مجاہدہ کے ساتھ ایک عمل ضرور رکھا ہے باقی مہینے خالص عمل کے لئے رکھے تاکہ معلوم ہو کہ اصل مقصود عمل ہی ہے یہ علوم جواہرات ہیں ان کی قدر کرو واللہ ان سے بہت سے مشکلات و عقبات حل ہو جاتے ہیں یہ سب اصول ہیں فن کے، یہ سب بیان اس پر چلا تھا کہ وقاع میں خود کسر قوت بہیمیہ ہے اس لئے اس کے ترک کو مجاہدہ میں شمار نہیں کیا گیا اور جب ترک وقاع مجاہدہ نہیں حالانکہ وہ الذ الاشیا رہے تو اس سے ثابت ہوا کہ ترک الذات کوئی مجاہدہ نہیں اور نہ ترک لذات کا نام زہد ہے اور جن لوگوں نے ترک لذات کو زہد کے لئے ضروری سمجھا ہے وہ محقق نہیں ہیں چنانچہ ایک بزرگ نے سنا کہ فلاں صوفی شوربے میں پانی ملا کر کھاتا ہے فرمایا وہ طفل مکتب ہے وہ اس تجلّی کو معطل کرتا ہے جو شوربے کی لذت میں ظاہر ہے ہمارے حاجی صاحب کا ارشاد ہے جو خود مجھ سے فرمایا کہ میاں اشرف علی پانی جب پیو خوب ٹھنڈا پیا ہر بن مو سے الحمد للہ نکلے گا اور گرم پانی پیو گے تو زبان تو الحمد للہ کہے گی مگر دل اس کا ساتھ نہ دے گا یہ ہیں حقائق جن کو محقق ہی سمجھتا ہے۔ اب بتلایئے اگر کوئی شخص ٹھنڈے پانی میں گرم پانی ملا کر پیئے تو

اس نے اس نعمت کو باطل کیا یا نہیں جو ٹھنڈے پانی میں رکھی ہوئی ہے یقیناً اس نے نعمت کی ناقدری کی اسی طرح لذیذ شوربا کھا کر جیسا دل خوش ہوتا ہے اور خوش ہوکر نعمت الٰہی کا شکر کرتا ہے پانی رلانے کے بعد وہ بات کہاں حاصل ہوسکتی ہے ہرگز نہیں عارف ہر چیز کے حقوق ادا کرتا ہے ٹھنڈے پانی کے بھی اور لذیذ شوربے کے بھی اور نفیس کپڑے کے بھی اور ناقص ان کے حقوق کو ضائع کرتا ہے ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ ہم تو عطر اس واسطے ملتے ہیں تاکہ خدا تعالیٰ کو اچھے لگیں عمدہ کپڑے اس واسطے پہنتے ہیں تاکہ خدا کو اچھے لگیں کیا کہنا ہے ان بزرگوں کی حالت اور نیت کا یہ ہر کام میں رضائے محبوب ہی کا قصد کرتے ہیں عام لوگ ان کی حالت کو کیا پہچانیں ؎

در نیابد حال پختہ ہیچ خام   پس سخن کوتاہ باید والسلام

(خام شخص کاملین کے حالات کو نہیں سمجھ سکتے پس کلام مختصر کرو اور ایسے نادان اور خام سے سلام کرلو (کلام نہ کرو)

مگر تم ان کی ریس مت کرنے لگنا کہ لگو آج ہی سے عمدہ عمدہ کپڑوں کا اہتمام کرنے کیونکہ اول تو وہ حضرت فنا نفس سے مشرف ہوچکے تھے دوسرے ان کاموں کیلئے اہتمام نہ کرتے تھے ہاں جب خدا نے عمدہ کھانے پہننے کو دیا تو اس کو اچھی نیت سے استعمال کرتے تھے ہر شخص کو ان کی ریس نہ کرنی چاہیے ورنہ وہی حال ہوگا جو ایک بادشاہ کا ہوا تھا ایک بادشاہ نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ روزانہ دو گولی کھایا کرتے ہیں بادشاہ نے پوچھا کہ یہ گولیاں کیسی ہیں، فرمایا قوت کے لئے ہیں۔ اس نے کہا مجھے بھی ایک عنایت کردیجئے۔ آپ نے ایک گولی اس کو بھی دیدی تھوڑی دیر کے بعد جو اس نے اپنا اثر کیا تو بادشاہ سے ضبط نہ ہوسکا محلسرا میں گیا اور اپنی بی بی اور باندیوں سے رات بھر مشغول رہا مگر کسی طرح خواہش اور قوت کم نہ ہوتی تھی۔ اب اسے خطرہ پیدا ہوا کہ ایک گولی میں تو میرا یہ حال ہوا اور یہ بزرگ مدت سے دو گولیاں روز کھاتے ہیں ان سے کیونکر ضبط ہوتا ہے ان کی

حالت کا تجسس کرنا چاہیئے کہیں یہ کسی سے خراب و خستہ نہ ہوتے ہوں گو بوجہ عقیدت قدیم کے اس خطرہ کو دفع کر دیا مگر اس خطرہ کا ان بزرگ کو کشف ہو گیا اور چاہا کہ اس کو بالکل صاف کر دیا جاوے۔ بادشاہ اگلے دن حاضر خدمت ہوا تو انھوں نے افسوس کے ساتھ فرمایا کہ مجھ کو معلوم ہوا کہ تمہاری زندگی کے تھوڑے روز باقی رہ گئے ہیں۔ چالیس دن کے بعد تم مر جاؤ گے مگر چونکہ عبادت کے لئے قوت کی ضرورت ہے اس لئے یہ گولیاں پاس رکھو روزانہ کھالیا کرو تاکہ عبادت آسانی سے ہو سکے چونکہ بادشاہ کو ان سے اعتقاد تھا اس لئے یقین آگیا کہ بس میری زندگی کے چالیس دن باقی ہیں، پھر تو حالت یہ ہوئی کہ دو گولیاں روزانہ کھا کر بھی نفس کو مطلق ہیجان نہیں ہوتا۔ موت کے خیال نے نفس کو پژمردہ کر دیا اب نہ بیوی کی طرف التفات ہے نہ باندیوں کا خیال ہے۔ ہر وقت موت کا فکر ہے۔ سب کام چھوڑ چھاڑ کر گوشہ نشین ہو کر خدا کی یاد میں لگ رہا ہے۔ جب چالیس دن پورے ہو گئے اور موت نہ آئی تو بزرگ کی خدمت میں پھر حاضر ہوا اور کہا حضور چالیس دن تو گذر گئے مگر آپ کا کشف پورا نہ ہوا، فرمایا وہ گولیاں بھی کھائی تھیں کہا ہاں۔ فرمایا کیا ویسا ہی اثر ہوا کہا حضور خاک بھی اثر نہیں ہوا مجھے تو ہر وقت موت کا فکر لگا ہوا تھا۔ فرمایا میرا مقصود تمہارے خطرہ کا جواب دینا تھا دیکھو کہ تم کو تو چالیس دن کی مہلت کا بھی یقین تھا مگر پھر بھی موت کے فکر نے تمہارا یہ حال کر دیا اور جس کو چالیس منٹ کی مہلت کا بھی یقین نہ ہو اور ہر وقت موت ہی کا دھیان لگا رہتا ہو کہ دیکھئے کب بلا وا آجاوے تو اس کا کیا حال ہوگا۔ اب بادشاہ سمجھا کہ واقعی میرے خطرہ کا جواب ہو گیا۔ واقعی جس کو موت کا ہر دم فکر لگا ہوا سے ان گولیوں سے کیا ہیجان ہوتا۔

صاحبو! تم تو یہ دیکھتے ہو کہ بزرگ عمدہ کھاتے عمدہ پہنتے ہیں مگر ان کے دل پر جو آرے چلتے ہیں ان کی تمہیں کیا خبر، تم ان کو ظاہر میں خوش حال دیکھ کر اپنے اوپر قیاس کرتے ہو کہ بس یہ بھی ہر وقت تنعم میں رہتے ہیں مگر ان کے دل کی کیا خبر کہ

اس پر کیا گذر رہی ہے اس لئے تم ان کی ریس نہ کرو تمہاری سلامتی اس میں ہے کہ عبادات میں تو ان کی تقلید کرو احوال میں تقلید نہ کرو کیونکہ تم ان احوال کے حقوق ادا نہیں کر سکتے اور جب اس قابل ہو جاؤ گے پھر تقلید احوال کا بھی مضائقہ نہیں میں یہ کہہ رہا تھا کہ ترک وقاع مجاہدہ نہیں ہے نہ ترک لذات کا نام زہد ہے اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ اگر ترک وقاع مجاہدہ نہیں تو پھر روزے میں ترک اکل و شرب کے ساتھ ترک وقاع کیوں مشروع ہوا خوب سمجھ لو کہ روزہ میں ترک وقاع کے ضروری ہونے سے اس کا مجاہدہ ہونا لازم نہیں آتا بلکہ روزہ میں ترک وقاع کے مشروع ہونے کا دوسرا سبب ہے میرے یہ علوم نقلی نہیں ہیں کیونکہ میری نظر کتابوں پر بہت کم ہے۔ اسی لئے بعض لوگ مجھے کم ہمت بھی کہتے ہیں بلکہ یہ علوم میرے قلب پر خود بخود چلے آتے ہیں جیسے ایک ڈوم کی آنکھوں میں چاند گھسا آتا تھا اس نے کہیں سن لیا تھا کہ چاند دیکھنے سے روزہ فرض ہوتا ہے اس نے کہا کہ ہم چاند ہی نہ دیکھیں گے جو روزہ فرض ہو۔ ایک دفعہ وہ تالاب کے کنارہ پر آب دست لے رہا تھا کہ پانی میں چاند کا عکس نظر آیا تو کہنے لگا گھس جا آنکھوں میں کر دے روزہ فرض تو جیسے اس کی آنکھوں میں چاند خود بخود گھسا آتا تھا ایسے ہی میرے دل پر یہ علوم خود بخود چلے آتے ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ وہ آنکھیں بند کر لیتا تھا میں کھلی رکھتا ہوں تو بات یہ ہے کہ گو وقاع بھی مانع مشاہدہ نہیں ہے کہ اس کے ترک کو مجاہدہ کہا جاوے بلکہ مشاہدہ پر معین ہے جیسا میں اوپر بتا چکا ہوں کہ عارفین کو اس میں بھی ایک تجلّی ظاہر ہوتی ہے اور اس کا مقتضا واقع میں یہی تھا کہ ترک وقاع صوم کے لئے ضروری نہ ہوتا مگر یہ مشاہدہ بواسطہ ہے اور ترک وقاع میں مشاہدہ بلاواسطہ دوسرے وقاع میں مشاہدہ ہونا یہ حالت عارفین کے ساتھ مخصوص ہے غیر عارف کو تو اس وقت حضور بھی مشکل ہے کیونکہ اکثر لوگ تو اس وقت نفسانی لذت میں ایسے مشغول ہوتے ہیں کہ ان کو حضور حق کی طرف التفات بھی نہیں ہو سکتا اور عارف کو گو اس وقت حضور ہو سکتا ہے مگر اس میں

شک نہیں کہ اس کے لئے بھی یہ حضور بواسطہ ہے باقی حضور بلا واسطہ وہ ترک وقاع ہی میں ہے جیسا کہ عارف کو خلوت میں حضور بلا واسطہ ہوتا ہے اور اختلاط مع الخلق میں بواسطہ اور یہی تفسیر ہے حدیث (انہ لیغان علی قلبی کی (کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرے دل پر بھی بعض دفعہ ابر سا چھا جاتا ہے ۱۲) کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو تو خلوت میں توجہ الی الحق بلا واسطہ حاصل تھی پھر ان کو تبلیغ کے لئے مخلوق سے ملنے ملانے کا حکم ہوا تو اس میں بھی توجہ الی الحق محفوظ ہے مگر یہ توجہ بواسطہ ہے اور توجہ بلا واسطہ یقیناً الذ ہے توجہ بواسطہ سے جیسے ایک تو معشوق کو بلا واسطہ آئینہ کے دیکھا جائے اس طرح کہ وہ بالکل تمہارے سامنے ہو اور ایک یہ کہ محبوب کے سامنے آئینہ رکھا ہوا ہو اس میں سے محبوب کی صورت دیکھی جائے گو دونوں صورتوں میں آپ محبوب ہی کو دیکھ رہے ہیں مگر یقیناً دونوں میں فرق ہے۔ اسی طرح گو انبیاء کے حق میں تمام مخلوق مرآۃ جمال حق ہے اور وہ مخلوق سے ملنے ملانے میں بھی توجہ الی الحق ہی رکھتے ہیں مگر یہ توجہ بواسطہ ہے جس میں وہ لذت نہیں جو خلوت میں بلا واسطہ توجہ الی الحق میں ہوتی ہے اسی تفاوت کو حضور عین سے تعبیر فرماتے ہیں غرض حالت وقاع میں اول تو مشاہدہ بلا واسطہ نہیں صرف بواسطہ ہے پھر وہ بھی ہر ایک کو نہیں صرف عارف کو ہوتا ہے اس لئے روزہ میں ترک وقاع مشروع ہوا تاکہ روزہ میں حق تعالیٰ کی طرف توجہ اعلیٰ درجہ کی علی وجہ الکمال پائی جاوے یہ راز ہے ترک وقاع کے ضروری ہونے کا صوم میں نہ یہ کہ ترک وقاع مجاہدہ ہے دوسری بات یہ ہے کہ بزرگوں کے کلام میں تصریح ہے کہ روزہ میں شان تنزیہ کا ظہور ہے یعنی روزہ فی الجملہ تخلق باخلاق اللہ ہوتا ہے اس لئے کھانے پینے کے ساتھ جماع سے بھی روک دیا گیا کیونکہ حق تعالیٰ ان افعال سے منزہ ہیں اور اس کا مقتضا یہ بھی تھا کہ پیشاب و پائخانہ سے بھی منع کر دیا جاتا مگر اس کی ممانعت اس لئے نہیں کی گئی کہ یہ تکلیف مالایطاق تھی انسان پیشاب پائخانہ کے تقاضے کو نہیں روک سکتا اگر اس سے بھی ممانعت ہو جاتی تو انبیٹھ کے ایک پورانے مولوی صاحب کی مریدینوں

کا سارو زہ ہو جاتا اور ان کا خدا جانے کہاں سے یہ اعتقاد تھا کہ روزہ پائخانہ پیشاب کرنے سے بھی ٹوٹ جاتا ہے تو یہ مریدنیاں دن بھر ان کاموں سے رُکی رہتی تھیں مگر بُرا حال ہوتا تھا، پھر افطار کے وقت دوسرے تو کھانے پینے پر گرتے تھے اور وہ مریدنیاں لوٹا لیکر پائخانہ کو بھاگتی تھیں ان کا روزہ پیشاب کرنے سے افطار ہوتا تھا اس وجہ سے استنجے کی ممانعت نہ ہوئی اکل وشرب و وقاع سے ممانعت ہوگئی نیز روزہ میں ایک اور نکتہ بھی ہے وہ یہ کہ دن بھر تو شان تنزیہ واستغنار کا ظہور ہوتا ہے اور افطار کے وقت شان عبدیت وافتقار کا کامل ظہور ہوتا ہے اذان ہوتے ہی کیسے کھانے پینے پر گرتے ہیں اس سے بندہ کو اپنا محتاج ہونا معلوم ہوجاتا ہے پھر احتیاج کے ساتھ بندہ کے ایک نقص کا ظہور ہوتا ہے اس طرح کہ اکل وشرب کے لئے عادۃً لازم بول و براز پس ملزوم سے لازم کی طرف ذہن منتقل ہوکر عبدیت کے اس نقص کا استحضار ہوجاتا ہے جیسے بعض مفسرین نے اسی استلزام وانتقال ذہن کی بنار پر کانا یاکلان الطعام کی تفسیر میں کہا ہے اے وکانا یبولان ویبرزان ایضاً یعنی نصاریٰ نے جو عیسیٰ علیہ السلام و مریم علیہا السلام کو خدا کا بیٹا وخدا کی بیوی بنا رکھا ہے حق تعالےٰ اس کا رد فرماتے ہیں کہ وہ دونوں تو خدا کے مقبول بندے تھے خدا ہرگز نہ تھے چنانچہ دونوں کھایا پیا کرتے تھے۔ یہ مفسرین کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ ہگتے موتتے بھی تھے اور جو شخص ہگتا موتتا ہو اس سے زیادہ محتاج کون ہوگا لیکن حق تعالےٰ نے تہذیب کی پوری رعایت فرمائی ہے کہ ملزوم پر اکتفا کرکے لازم کی طرف اشارہ فرمادیا کیونکہ اس کو تو عقلاً خود ہی سمجھ جاویں گے کیونکہ جو کھائے پئے گا وہ ہگے موتے گا بھی ضرور اس لئے کان یبولان ویبرزان صراحۃً نہیں فرمایا تاکہ کلام میں تہذیب کی رعایت رہے اور بعض لوگوں نے کانا یاکلان الطعام کی دوسری تفسیر کی ہے وہ بے تکلف ہے اس کا حاصل وہی ہے جو اس قطعہ کا ہے ؎

ابروباد ومہ وخورشید فلک درکارند   تا تو نانے بکف آری وبغفلت نخوری

(بادل اور ہوا اور آفتاب و آسمان سب اپنے کام میں لگے ہیں تاکہ تو جب روٹی ہاتھ میں لیوے تو غفلت سے نہ کھالیوے بلکہ سوچے کہ اس روٹی کے انتظام میں بادل اور ہوا اور سورج اور آسمان کے خدمات بھی شامل ہیں)

یعنی جو شخص کھانے کا محتاج ہے وہ سیکڑوں ہزاروں چیزوں کا محتاج ہے کیونکہ طعام کے لئے زمین کی ضرورت، بیلوں کی ضرورت، بیج کی ضرورت، کیہ دل بالدیوں کی ضرورت، پھر آفتاب اور چاند کی ضرورت کیونکہ پیدا وار بدون تمازت آفتاب و نور قمر کے نہیں ہوسکتی۔ پھر بارش کی ضرورت پھر کھیتی پکنے کے لئے دھوپ کی ضرورت، پھر کھیتی کٹنے کے بعد جب غلہ گاہتے ہیں تو بھوسہ اور غلّہ کو الگ کرنے کے لئے ہوا کی ضرورت، پھر جب غلّہ گھر میں آگیا تو پیسنے والے اور پکانے والے کی ضرورت، پھر ہل وغیرہ بنانے کے لئے لوہار اور بڑھئی کی ضرورت۔ غرض ایک روٹی کے لئے سیکڑوں ہی سامان کی احتیاج ہے تو جو شخص کھانے کا محتاج ہے حقیقت میں اس سے زیادہ محتاج کوئی نہیں اور عیسیٰ اور مریم علیہما السلام دونوں کھانے کے محتاج تھے تو پھر ایسے سراپا احتیاج خدا یا خدا کے بیٹے اور بیوی کیونکر ہوسکتے ہیں خدا میں اور ان میں مناسبت ہی کیا وہ سراپا غنا یہ سراپا احتیاج اور اولاد کو باپ سے اور بیوی کو شوہر سے مناسبت ہونا ضرور یہاں کچھ بھی مناسبت نہیں۔ پھر نصاریٰ کی حماقت ہی نہیں جو ان کو عبدیت سے بڑھا کر الوہیت تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ حاصل ہے دوسری تفسیر کا واللہ اعلم۔

غرض روزہ میں شان تنزیہ کا کامل ظہور ہے اس لئے جن چیزوں کے ترک کو تنزیہ میں دخل تھا ان سے روزہ میں روک دیا گیا جس سے روکنا ہو اسی واسطے جماع سے بھی روک دیا گیا کہ ترک جماع کو بھی تنزیہ میں دخل ہے۔ اب یہاں ایک سوال ہوسکتا ہے وہ یہ کہ معاصی کا ارتکاب بھی تو تنزیہ کے خلاف ہے تو چاہیئے کہ ان سے بھی روزہ فاسد ہو جاوے کیونکہ ان سے شان تنزیہ فوت ہوگئی حالانکہ

بجز اکل و شرب و وقاع کے اور کسی فعل کو مفسد صوم نہیں کہا جاتا اس کا جواب یہ ہے کہ تنزیہ کا حال استغنا ہے اس کے خلاف وہ افعال ہوں گے جن میں احتیاج کی شان ظاہر ہے اور وہ انہی افعال ثلٰثہ میں ہے۔ اور دوسری معاصی گو قبح میں اشد ہوں مگر ان میں احتیاج کی شان اتنی زیادہ نہیں بلکہ اگر ہے تو کبر کی شان ہے چنانچہ احکام خداوندی کی سرکشی سے بڑھ کر کیا کبر ہوگا اس لئے جن گناہوں میں اکل و شرب و جماع نہ پایا جائے ان سے بچنا روزہ کا جزو اور رکن نہیں یعنی ان سے روزہ باطل بھی نہیں ہوتا گو عذاب سخت ہو کیونکہ ان سے بچنے کو تنزیہ میں (جو کہ تخلق باخلاق اللہ ہے) کوئی دخل نہیں اور روزہ نام ہے تخلق باخلاق اللہ کا اور یہی معنے ہیں حدیث الصوم لی وانا اجزی بہ کے کہ روزہ میرے لئے ہے اور اس کی جزا میں خود دوں گا اہل ظاہر تے اس کی شرح میں یہ کہا ہے کہ روزے میں خلوص زیادہ ہے داس میں ریا نہیں ہوسکتی کیونکہ اس کی حقیقت ترک ہے جو کہ عدمی ہے اور ریا وجودی میں ہوا کرتی ہے اس لئے اس کو لی فرمایا ہے یعنی اس کو میرے ساتھ خاص خصوصیت ہے بوجہ اس کے کہ اس میں غیر اللہ کے دکھلانے کی گنجائش نہیں مگر عارفین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ روزہ میں شان تنزیہ ہے اس میں تشبہ بحق د تخلق باخلاق اللہ ہوتا ہے اس سے خدا تعالیٰ کے ساتھ مناسبت ہوجاتی ہے لی کی یہ تفسیر کی ہے اور یہاں سے تفسیر ہوگئی میرے ایک خواب کی بچپن کا خواب ہے۔ میں نے خواب دیکھا کہ کسی نے مجھ سے سوال کیا کہ اس کے کیا معنے ہیں کہ روزہ اللہ کا اور نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ میں نے جواب دیا کہ روزہ میں تنزیہ کے سبب حق تعالیٰ کے ساتھ زیادہ تشبہ ہے اس لئے اس کو اللہ کا کہا جاتا ہے۔ اور نماز میں شان عبدیت کا ظہور ہے اور عبدیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ہے اس لئے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تشبہ ہے اس جواب کی تصدیق کی گئی غرض یہ اشکال بھی رفع ہوگیا کہ روزہ میں ترک وقاع کے مشروع ہونے سے اس کا مجاہدہ ہونا معلوم ہوتا ہے میں نے بتلا دیا

کہ اس کا سبب مجاہدہ ہوتا نہیں ہے بلکہ روزہ میں ترک وقاع کے مشروع ہونے کا سبب اور ہے یہ سب تتمہ تھا سابق کا جو مقصود سے بھی غالباً لمبا ہے جیسے مور کی دم مور سے لمبی ہوتی ہے مگر بدنما نہیں ہوتی اس کی یہاں تک قدر ہوتی ہے کہ اس کے پر قرآن میں رکھے جاتے ہیں، اسی طرح یہ تتمہ بھی گو لمبا ہے مگر بدنما نہیں بلکہ خوشنما ہے اب میں مقصود کی طرف رجوع کرتا ہوں، وہ یہ کہ تیسرا رکن مجاہدہ کا تقلیل کلام ہے اور یہ تقلیل طعام و تقلیل منام سے بھی زیادہ دشوار ہے کیونکہ کھانے میں کچھ اہتمام تو کرنا پڑتا ہے۔ طعام کو تیار کرنا پڑتا ہے پھر منہ چلانا پڑتا ہے پھر ہضم کی فکر ہوتی ہے کبھی کچھ چورن وغیرہ کھانا بھی پڑتا ہے تقلیل میں ان سب امور کی تخفیف ہے پھر کیا دشوار ہے ایک دو دفعہ زیادہ کھالیگا پھر کہاں تک کھائے گا جب ہضم نہ ہوگا تو خود ہی تقلیل طعام ہو جائے گا بخلاف بولنے کے کہ اس میں کچھ اہتمام ہی کرنا نہیں پڑتا نہ زیادہ بولنے سے بدہضمی ہوتی ہے اس لئے اس کی تقلیل کا کوئی قوی داعی نہیں اسی طرح سونا ہے تو اس میں کبھی تقلیل ہو گی آخر کہاں تک سوئے گا کبھی تو جاگے گا بخلاف اس زبان کے چرخہ کے کہ اس کی کہیں انتہا ہی نہیں یہ چرخہ چلنے سے تھکتا ہی نہیں کیونکہ اس کے لئے کچھ اہتمام کرنا ہی نہیں پڑتا نہ زبان چلانے سے کچھ تعب ہوتا ہے دوسرا راز یہ ہے کہ انسان جس قدر حظوظ اختیار کرتا ہے لذت کے لئے اختیار کرتا ہے سو کلام کے سوا دوسرے جس قدر حظوظ ہیں ان میں کرنے سے لذت کم ہو جاتی ہے۔ پیٹ بھرنے کے بعد پھر کھانے میں مزا نہیں آتا نیند بھر جانے کے بعد پھر سونے میں لذت نہیں آتی بلکہ سونے سے جی گھبرا جاتا ہے مگر بولنے کی لذت ختم نہیں ہوتی بلکہ جتنا بولتے جاؤ اتنی ہی لذت بڑھتی جاتی ہے اس لئے تقلیل کلام سب سے زیادہ دشوار ہے مگر باوجود دشواری کے اس میں آزادی اس لئے نہیں دی گئی کہ زیادہ بولنے میں آفات بہت ہیں اور اس سے گناہوں میں ابتلا بکثرت ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس کی تقلیل کو مجاہدہ کا ایک رکن قرار دیا گیا لیکن تقلیل کلام کا یہ مطلب نہیں کہ ضروری باتوں کو بھی کم کر دے بلکہ مطلب

یہ ہے کہ فضول کلام چھوڑ دے گو مباح ہی ہو باقی جو باتیں حرام ہیں جیسے جھوٹ اور غیبت و بہتان وغیرہ وہ تو اس سے خود ہی چھوٹ جائیں گے کیونکہ وہ تو مجاہدہ حقیقیہ ہے جو شخص مجاہدہ حکمیہ کرے گا وہ مجاہدہ حقیقیہ کو کیسے ترک کر سکتا ہے رہا ضروری کلام سو اس کا ترک کرنا جائز نہیں کیونکہ اس سے یا ضروریات میں حرج یا مخاطب کو تکلیف ہو گی بعض لوگ غلو کے سبب ضروری کلام میں بھی تقلیل کرتے ہیں کوئی بات پوچھے تو پورا جواب ہی نہیں دیتے بس آدھی بات منہ میں ہوتی ہے اور آدھی پیٹ میں اور وظیفے کے اندر تو بولنا حرام ہی سمجھتے ہیں خواہ کوئی کیسی ہی ضروری بات ہو مگر یہ ایسی چپ سادھ کر بیٹھتے ہیں کہ جواب ہی نہیں دیتے بس ہوں ہوں کئے جاتے ہیں نہ معلوم اس سے کیا مراد ہے ہمارے علم میں تو چھوٹے بچے ہگنے موتنے کو بتلانے کے واسطے ہوں ہوں کیا کرتے ہیں جب ان کو پیشاب یا پاخانہ کا تقاضا ہوتا ہے اس وقت ایسے اشارے کیا کرتے ہیں شریعت مقدسہ نے ضروری کلام کے واسطے نماز تک قطع کرنے کا حکم دیا ہے مثلاً کوئی اندھا جارہا ہو اور اس کے سامنے گڑھا ہو جس میں اس کے گرنے کا اندیشہ ہے تو اگر تم نماز بھی پڑھ رہے ہو تب بھی واجب ہے کہ اندھے کو گرنے سے بچاؤ نماز کو توڑ دو اور اس سے کہو کہ ذرا بچ کر چلے آگے گڑھا ہے ؎

اگر بینم کہ نابینا و چاہ ست　　　اگر خاموش بنشینم گناہ است

(اگر دیکھوں کہ نابینا کے سامنے کنواں ہے پھر بھی خاموش رہوں اور نہ بتاؤں تو گناہ ہے)

ایسے وقت میں خاموشی گناہ ہے بلکہ نماز توڑ کر نابینا کو گڑھے میں گرنے سے بچانا واجب ہے مگر آج کل کے وظیفچی نماز کو تو چاہے توڑ دیں مگر وظیفے کو نہیں توڑ سکتے اس میں بات کرنے کی مجال نہیں چاہے کسی پر کچھ ہی آبنے اللہ بچائے ایسے وظیفوں سے آجکل وظیفوں کے ساتھ قرآن سے بھی زیادہ ادب کا معاملہ کیا جاتا ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے تو دنیا کی ہزار باتیں کریں اور وظیفہ پڑھتے ہوئے دین کی بھی ضروری

بات نہ کریں۔ شریعت نے ضرورت کی یہاں تک رعایت کی ہے کہ اگر بلی کتے سے تمہارا نقصان چار آنے سے زیادہ کا ہوتا ہے تو نماز کو توڑ کر اپنے مال کی حفاظت کرلو شریعت پر چلنے والا کہیں نہیں اٹک سکتا اس کو قدم قدم پر شریعت کی وسعت کا اندازہ ہوتا رہتا ہے اور کیوں نہ ہو شریعت کا دعوے ہے ماجعل علیکم فی الدین من حرج کہ خدا نے تمہارے اوپر دین میں کچھ بھی تنگی نہیں کی نفی الحرج میرا ایک وعظ ہے جو الہ آباد میں ہوا تھا اور پہلے اس کے تمام ہونے کے لئے دعا بھی کرائی تھی اب وہ پورا ہو چلا ہے اور مطبع والے کہتے ہیں کہ جلدی طبع ہو جائے گا وہ اس مضمون میں بہت ہی کافی ہے امید ہے کہ اب وہ جلدی طبع ہو جائے گا یہ وعظ مولوی سعید احمد مرحوم کا ضبط کیا ہوا ہے مگر تسوید تفصیلی کا ان کو موقع نہیں ملا دوسرے لوگوں نے صاف کیا ہے مرحوم کے اشارے بھی بہت کافی ہوتے ہیں اس لئے کام چل گیا ورنہ صاف کرنے والے نے تو محض پنسل پر سیاہی پھیر دی ہے تفصیل کچھ نہیں کی غرض شریعت میں تنگی بالکل نہیں ہے اسی لئے ضروری کلام کا ترک کرنا ممنوع ہے کیونکہ اس سے دوسرے لوگوں کو ایذا اور پریشانی ہوتی ہے اور شریعت مخلوق کو تکلیف سے بچانا چاہتی ہے اسی لئے حکم ہے کہ اگر بیٹا نفل نماز پڑھ رہا ہو اور والدین میں سے کوئی پکارے تو دیکھے کہ ان کو اس کا نماز میں ہونا معلوم ہے یا نہیں اگر انھیں معلوم ہے کہ بیٹا نماز پڑھ رہا ہے اور پھر بھی پکار رہے ہیں تو نہ بولے کیونکہ جان کر پکارنا ان کی شرارت ہے اور اگر ان کو معلوم نہیں کہ بیٹا نماز پڑھ رہا ہے تو بول پڑے اور نماز کا بعد میں اعادہ کرلے یہ مسئلہ فقہاء نے حدیث سے سمجھا ہے۔ واقعی دو فرقے امت کے لئے رحمت ہیں ایک فقہا دوسرے صوفیہ فقہاء نے اس مسئلہ کو حدیث جریج سے مستنبط کیا ہے۔ جریج بنی اسرائیل کا ایک عابد تھا۔ ایک دفعہ یہ اپنے صومعہ میں نماز پڑھ رہا تھا کہ اس کی ماں کسی ضرورت سے آئی اور اس نے صومعہ کے نیچے کھڑے ہو کر آواز دی جریج جریج۔ یہ نماز پڑھ رہا تھا اس نے دل میں حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے اللہ میں نماز میں ہوں اور میری ماں پکار رہی ہے یعنی

میں جواب دینے سے معذور ہوں غرض نماز میں مشغول رہا۔ اُس نے پھر آواز دی جریج نے پھر وہی کہا اللھم امی وصلاتی اور بدستور نماز میں مشغول رہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس واقعہ کو بیان فرماکر ارشاد فرماتے ہیں لوکان فقیھا لاجاب امہ اگر جریح فقیہہ ہوتا تو اپنی ماں کے پکارنے کا جواب دے دیتا اس سے فقہائے سمجھا ہے کہ والدین کے پکارنے پر نماز میں بول پڑنا جائز ہے بشرطیکہ ان کو اس کا نماز میں ہونا معلوم نہ ہو یہ قید دوسرے دلائل کی وجہ سے بڑھائی گئی جریج کی ماں نے اس موقعہ پر اپنے بیٹے کو کوسا بھی تھا جب اس نے کئی آوازیں دیں اور یہ نہ بولا تو اس نے بددعا دی اللھم لا تمتہ حتی تریہ وجوہ المومسات یعنی خداوندا اسے اس وقت تک موت نہ دیجو جب تک یہ کسی فاحشہ کا منہ نہ دیکھ لے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں دینداری بہت ہی زیادہ تھی کہ رنڈی کا منہ دیکھنا اس زمانہ میں بددعا اور کوسنے میں بیان کیا جاتا تھا گویا غیر عورت کا منہ دیکھنا مردوں کے لئے بہت ہی بڑا عیب سمجھا جاتا تھا جبھی تو اس کو کوسنے میں بیان کیا اور آجکل منہ دیکھنا تو کیا اس سے منہ کالا کرنا بھی عیب نہیں سمجھا جاتا اسی لئے عورتوں میں مشہور ہے کہ مرد تانبہ ہے اور عورت موتی ہے۔ تانبہ تو دس مرتبہ سیاہ ہو جائے تو قلعی سے پھر ویسا کا ویسا ہی ہو جاتا ہے اور موتی کی ایک دفعہ آب جاتی رہے تو پھر کسی طرح اس میں آب پیدا نہیں ہو سکتی مطلب یہ ہے کہ مرد تو غیر عورت سے چاہے کتنی دفعہ منہ کالا کرلے چند دن کے بعد جب بات رفع دفع ہو جاتی ہے پھر ویسا کا ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ اور عورت اگر غیر مرد کے سامنے ایک دفعہ آجائے تو پھر ساری عمر کو اس کی آبرو برباد ہو جاتی ہے عمر بھر منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتی مگر حقیقت کے اعتبار سے یہ کلام غلط ہے۔ آج کل بے حیائی بڑھ گئی ہے اس لئے مردوں میں غیر عورت کے پاس جانا کوئی عیب نہیں رہا اگر حیا ہوتی تو مرد بھی عورت کے طرح ایک دفعہ بے حیائی کا کام کرکے عمر بھر کو منہ دکھلانے کے قابل نہ رہتا پس حقیقت میں مرد و عورت دونوں کی آبرو موتی ہی جیسی ہے مگر

بے حیائی کے غلبہ نے مردوں کو تانبہ بنا دیا ہے اور اگر یہی حال بے حیائی کا رہا تو چند دنوں میں عورتیں بھی موتی نہ رہیں گی وہ بھی مردوں کی طرح تانبہ ہوجائیگی چنانچہ ایسے قصے ہونے لگے ہیں کہ مرد نے بیوی کو تین طلاق کے بعد پھر گھر میں ڈال لیا اور وہ خوشی خوشی اس کے گھر میں رہتی ہے اور بے حیائی کو گوارا کرتی ہے اور پھر خاصہ منہ لے کر برادری کے سامنے آتی ہے اور برادری کی عورتیں اس سے اسی طرح ملتی ہیں جس طرح تین طلاق سے پہلے ملتی تھیں کچھ ٹھکانا ہے اس بے حیائی کا داگر یہی حال رہا تو کچھ دنوں میں کھلّم کھلّا بدکاری کرنے کے بعد بھی عورت مرد کے گھر میں خاصی طرح رہا کرے گی اور کوئی بھی اس کی بدکاری پر التفات نہ کرے گا کیونکہ تین طلاق کے بعد شوہر کے پاس رہنے میں اور بدکاری میں فرق ہی کیا ہے اللہ بچائے اس فتنہ سے ۱۲ جامع) غرض جریح کی ماں نے اس کو یہ کوستا دیا کہ خدا اسے موت سے پہلے فاحشہ عورت سے پالا ڈالے بددعا قبول ہوگئی اور ایک فاحشہ عورت جریح کے پیچھے پڑی اور اس کے صومعہ میں آکر بدکاری پر اسے برانگیختہ کرنا چاہا یہ شخص متقی تھا اس نے دھمکا کر اسے نکال دیا اس نے کہا کہ میں تجھ کو بدنام کرکے رہوں گی بڑا متقی بنا ہے۔ چنانچہ جنگل کے کسی چرواہے سے اس نے منہ کالا کیا جس سے حمل رہ گیا۔ جب بچہ پیدا ہوا تو لوگوں نے پوچھا یہ بچہ کس کے زنا سے ہوا۔ اسنے جریح کا نام لے دیا۔ بس اب لوگ کہاں تھے بلا تحقیق گمان پکا لیا اور جریح کے صومعہ پر جا چڑھے اور لگے اس کو ڈھانے جریح اندر سے نکلا اور لوگوں سے کہا کہ میرے صومعہ کو کیوں گراتے ہو کہا کمبخت تو اس قابل نہیں کہ صومعہ میں رہے تو زناکار بدکار ہے اور ظاہر میں متقی بنا ہوا ہے اس نے پوچھا کہ آخر تم سے کس نے کہا کہ میں زانی ہوں لوگوں نے اس عورت کو مع بچہ کے پیش کیا کہ دیکھ یہ عورت کیا کہتی ہے کہ تو نے اس سے زنا کیا اور یہ بچہ تیرے زنا کا ہے جریح نے کہا ذرا ٹھہرو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے اس کے بعد اس نے وضو کیا اور دو رکعت نماز پڑھی پھر اس بچہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا اے بچہ خدا کے حکم سے

بول اور بتلا کہ تیرا باپ کون ہے خدا تعالیٰ نے بچہ کو گویائی عطا فرمائی اس نے کہا کہ میرا باپ فلاں چرواہا ہے۔ اب تو سب کو یقین ہو گیا کہ یہ عورت جھوٹی ہے اور اس نے چرواہے سے منہ کالا کر کے جھوٹ موٹ جریج کا نام لیا ہے۔ اتنی بڑی کرامت کے بعد کیا شبہ ہو سکتا تھا بس سب کے سب جریج کے قدموں پر گر پڑے کہ ہماری خطا معاف کرو ہم نے بلا تحقیق تم کو متہم کیا اور اب ہم تمہارا صومعہ سونے کی اینٹوں سے بنا دیں گے۔ اس نے کہا نہیں جیسا پہلے تھا تم ویسا ہی بنا دو غنیمت ہوا کہ جریج کی ماں نے اتنی ہی بد دعا کی تھی کہ خدا اسے رنڈی کا منہ دکھا دے آگے اور کچھ نہ کہا تھا تو جریج نے رنڈی کا منہ ہی دیکھا اور کچھ نہ ہوا اس لئے والدین کی بد دعا سے ڈرنا چاہیئے مگر ناحق کی بد دعا نہیں لگتی اور یہاں جو ام جریج کی بد دعا لگ گئی تو وہ ناحق بد دعا نہ تھی بلکہ جریج کے نہ بولنے سے اس کو ایذا ہوئی اور اس ایذار میں جریج کے فعل کو بھی دخل تھا کہ اس نے بے موقع سکوت کیا گو وہ بوجہ جہل کے اس سکوت میں معذور ہو مگر نفس جہل خود ایک جرم ہے اس لئے بد دعا لگ گئی اور اس کی معذوری کا یہ اثر ظاہر ہوا کہ جلدی ہی براءت ہو گئی اور جن کو سوء عقیدت ہوئی تھی ان کو پھر حُسنِ عقیدت ہو گئی اور یہاں سے ایک بات بھی ثابت ہو گئی جس کو ہمارے اُستاد مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ عوام کے اعتقاد کا بھی کچھ اعتبار نہیں بیوقوف آدمی خواہ مخواہ لوگوں کے اعتقاد سے خوش ہوتا ہے کہ میرے اتنے معتقد ہیں ان عوام کے اعتقاد کی ایسی مثال ہے جیسے گدھے کا خاص عضو کہ کبھی تو اتنا بڑھتا ہے جس کی حد نہیں اور کبھی ایسا غائب ہوتا ہے کہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ گدھا ہے یا گدھی، چنانچہ عوام نے محض ایک فاحشہ کے قول پر بلا دلیل جریج کے صومعہ کو ڈھانا شروع کر دیا۔ مدت دراز کا اعتقاد ذرا سی بات میں بالکل غائب ہو گیا اور جب اس کی کرامت سے بچہ بول پڑا تو پھر ایسے معتقد ہوئے کہ اس کا صومعہ سونے کی اینٹوں سے بنانے پر تیار ہو گئے اس لئے عوام کے اعتقاد کا کبھی اعتبار نہ کرنا چاہیئے بلکہ معیار کسی کی حقیقت کمال کا

یہ ہے کہ اہل نظر اس کے کمال کے معتقد ہوں صائب نے خوب کہا ہے ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خودرا عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

(اے شخص اپنے موتی کو کسی اہل نظر کو دکھا چند گدھوں کی تصدیق سے کوئی عیسیٰ نہیں ہوسکتا)

غرض شریعت نے ضرورت کی اتنی رعایت کی ہے کہ ضرورت کے وقت نفل نماز توڑنے کی توسع کی ساتھ اجازت ہے اور بعض شرائط کے ساتھ فرض نماز توڑنے کی بھی اجازت ہے جیسے اندھے کے گرنے کا اندیشہ ہو اس لئے تقلیل کلام کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی ضروری باتیں بھی نہ کیا کرے لیکن ضرورت کی تفسیر سمجھ لینی چاہئے کہیں آپ سب باتوں کو ضرورت ہی میں نہ داخل کرلیں بعضے ایسے وہمی بھی ہیں جن کو یہ سن کر کہ یہ ضروری باتوں کو ترک نہ کرنا چاہیئے بات بات میں ضرورت کا وہم پیدا ہوگا کہ یہ بات بھی ضروری معلوم ہوتی ہے پھر ان کے نزدیک غیر ضروری بات کوئی بھی نہ رہے گی تو ضرورت کی تفسیر سنئے (اور یہ جواہرات کا ٹکڑا ہے، اس کی قدر کرو کتابوں میں سر مارنے سے یہ جواہرات نہ ملیں گے) ضرورت کی تفسیر یہ ہے لولاہ لتضرر (یعنی جس کے نہ ہونے سے ضرر ہو پس جس بات کے ترک سے دنیا کا یا دین کا ضرر ہو وہ بات ضروری ہے مثلاً ایک شخص تاجر ہے اس کے پاس کوئی خریدار آئے اور گھنٹہ بھر تک چیزوں کی قیمت دریافت کرتا رہے اور تاجر کو امید ہے کہ یہ ضرور کچھ خریدے گا تو جب تک یہ امید ہو اس وقت تک خریدار سے باتیں کرنا ضرورت میں داخل ہے کیونکہ اس صورت میں خریدار سے باتیں نہ کرنے میں دنیا کا ضرر ہے تجارت کو نقصان پہونچے گا اس لئے شریعت اجازت دیتی ہے کہ وہ دو گھنٹے بھی تجارت کی باتیں کرے تو تم اس سے باتیں کرتے رہو ہاں سچی باتیں کرو جھوٹ اور مبالغہ سے کام نہ لو کہ خواہ مخواہ اپنے مال کی حد سے زیادہ تعریف کرو تو یہ سب باتیں ضرورت میں داخل ہیں اس سے قلب میں ذرہ برابر ظلمت نہیں ہوتی یا کوئی شخص آپ سے ملنے آیا اس سے باتیں کرنا

مزاج پوچھنا اور یہ دریافت کرنا کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں مکان سے کب چلے تھے یہاں کب تک قیام رہے گا یہ بھی ضرورت میں داخل ہے۔ بعض خشک زاہدان باتوں کو فضول سمجھتے ہیں مگر یہ لوگ فقیہ نہیں یہاں سے معلوم ہوا کہ اس بات کا سمجھنا کہ کس بات کے ترک سے ضرر ہوتا ہے اور کس کے ترک سے ضرر نہیں ہوتا یہ بھی فقہا ہی کا کام ہے فقیہ کہتا ہے کہ اس صورت میں مہمان سے اس قسم کی باتیں کرنا ضروری ہے کیونکہ یہ سوال نہ کرنے سے اس کی دل شکنی ہوگی دل ٹوٹے گا کہ میری بات بھی نہ پوچھی اور مسلمان کا دل سنبھالنا بھی شرع میں مقصود ہے غرض ضرر کے مواقع فقہا کے طرز پر میں کہاں تک بیان کروں اس کے لئے تو بڑے وسیع وقت کی ضرورت ہے اور پھر بھی جزئیات کا احاطہ نہ ہو سکے گا کلیات میں نے بیان کر دیئے ہیں جزئیات کو تم خود نکال لو اور جن میں اس کا مادہ بالکل نہیں وہ علماء سے مل کر پوچھتے رہیں، اور بھی کچھ نہ کر سکیں تو کم از کم ان گناہوں سے تو بچتے رہیں جو زبان کے متعلق ہیں چاہے دقائق کی رعایت نہ کریں اور دقائق کی رعایت عوام تو کیا کریں گے علماء بھی خاص خاص ہی ان باتوں کو سمجھتے ہیں کہ کہاں ترک کلام سے ضرر ہوتا ہے کہاں ضرر نہیں ہوتا مگر جو باتیں گناہ کی ہیں وہ تو سب کو معلوم ہو سکتی ہیں ان کا ترک تو سب پر ضروری ہے اس ذراسی جبیا میں (جیب یعنی زبان کی تصغیر ۱۲) بیس آفات ہیں جن کو امام غزالی نے احیاء میں بیان کیا ہے اور آجکل احیاء کا ترجمہ بھی ہو گیا ہے، اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے اگر اس کو طویل سمجھا جاوے تو کیمیائے سعادت کا ترجمہ اکسیر ہدایت بہت اچھی کتاب ہے اسی کا مطالعہ کر لو تو زبان کی آفات معلوم ہوں گی بس عوام کے لئے تو تقلیل کلام میں یہ درجہ کافی ہے کہ وہ زبان کے گناہوں سے بچتے رہیں۔ اور جو خواص ہیں ان کو ضرورت و بے ضرورت کا لحاظ بھی کرنا چاہیئے کیونکہ مجاہدہ بدون اس کے کامل نہیں ہو سکتا یہ تو تقلیل کلام کی حقیقت پر گفتگو تھی اب میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ روزہ میں تقلیل کلام کی کس طرح رعایت کی گئی ہے

تقلیل کلام کی ایک صورت تو یہ ہے کہ زبان کو بند کرلیا جائے روزہ میں کسی سے بات ہی نہ کی جائے یہ طریقہ ہماری شریعت میں نہیں ہے۔ پہلی شریعتوں میں صوم سکوت مشروع تھا جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے فاما ترین من البشر احداً فقولی انی نذرت للرحمٰن صوما فلن اکلم الیوم انسیا مگر شریعت محمدیہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو منسوخ کردیا اب روزے میں بالکل بات نہ کرنا مکروہ ہے بلکہ ضرورت کے موقع پر بات کرنی چاہیئے کیونکہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں کہ ضرورت کے وقت بات نہ کرنے سے حرج یا لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے اس لئے شریعت اسلامیہ نے صوم سکوت کو مشروع نہیں کیا کیونکہ روزے کا وقت ممتد ہے اتنے طویل سکوت سے دنیوی کاروبار بھی بند ہوجاویں گے اور بہت سے ضروری کاموں میں خلل پڑے گا دین کے کام بھی مثل وعظ و تبلیغ وغیرہ کے بند ہوجائیں گے۔ ہاں نماز میں سکوت مشروع ہے مگر نماز تھوڑی دیر کی عبادت ہے فرض نمازیں تو پانچ منٹ میں ختم ہوجاتی ہیں اور نوافل میں بھی کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی پھر نوافل ہمارے اختیار میں ہیں جس کو ضرر کا اندیشہ ہو وہ نوافل میں مشغول نہ ہو۔ غرض نمازیں تھوڑی دیر کا سکوت ہے اس سے ضرر نہیں ہوسکتا اتنی دیر تو آدمی ویسے بھی خاموش رہا کرتا ہے البتہ روزے میں سکوت مشروع ہوتا تو اس سے دنیوی کاروبار میں بہت حرج واقع ہوتا اس لئے شریعت نے ہمارے حال پر رحم کرکے صوم سکوت کو منسوخ کردیا۔ مگر ایک دوسرے طریقے سے روزے میں تقلیل کلام کی رعایت کی گئی ہے اس لئے پہلے ایک مقدمہ سمجھ لینا چاہیئے وہ یہ کہ قاعدہ ہے کہ نفس ایک آن میں دو طرف متوجہ نہیں ہوسکتا' اسی طرح زبان بھی ایک وقت میں دو قسم کی باتیں نہیں کرسکتی۔ مثلاً جو شخص کتاب پڑھ رہا ہو وہ کتاب پڑھتے ہوئے بات نہیں کرسکتا اگر بات کرے گا تو اس وقت کتاب نہ پڑھے گا تو شریعت نے روزے میں کلام کو تو ممنوع نہیں کیا لیکن نفس اور زبان کو دوسرے کام کی طرف متوجہ کردیا اس طرح کہ روزے میں تلاوت قرآن کا اور ایام سے زیادہ اہتمام کیا گیا ہے

چنانچہ تراویح میں ایک قرآن ختم کرنا جبکہ کوئی عذر نہ ہو حسب قول مشہور سنت موکدہ کردیا گیا جس کی وجہ سے حفاظ کو خواہ مخواہ دن میں کئی مرتبہ سپارہ پڑھنا پڑتا ہے اور دور بھی کرنا پڑتا ہے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں خود تلاوت قرآن کا اور دنوں سے زیادہ اہتمام فرمایا کہ چنانچہ حدیثوں میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ بالالتزام دور فرمانا مصرح ہے سب مسلمانوں کو عملاً اس کی ترغیب دی ہے کہ رمضان میں تلاوت قرآن زیادہ کریں خواہ وہ حافظ ہوں یا نہ ہوں تراویح میں قرآن سنا دیں یا نہ سنا دیں پھر آپ کا ارشاد ہے کہ قرآن کے ایک حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور یہ بھی ارشاد ہے کہ رمضان میں نفل طاعت کا ثواب فرض کے برابر ملتا ہے ثواب رمضان میں تلاوت قرآن کرنے سے ایک ایک حرف پر جو دس نیکیاں ملیں گی ان میں ہر نیکی پر فرض کام کے برابر ثواب ملے گا۔ اللہ اکبر کچھ ٹھکانا ہے اس ثواب کا اس سے بھی لوگوں کو خواہ مخواہ تلاوت کی رغبت زیادہ ہوگی۔ غرض رمضان میں تلاوت قرآن کا شریعت نے بہت ہی اہتمام کیا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ نزول قرآن آسمان اول پر رمضان ہی کے مہینے میں ہوا ہے پھر وہاں سے تدریجاً تئیس سال میں نازل ہوا تو اس ماہ کو قرآن کے ساتھ خاص تعلق ہے جو دوسرے ایام کو نہیں یہی وجہ ہے کہ رمضان میں تلاوت قرآن بالمشاہدہ اور دنوں سے زیادہ آسان بھی ہے اور ظاہر ہے کہ جب انسان تلاوت قرآن میں مشغول ہوگا تو لامحالہ دنیوی باتوں میں تقلیل ہوگی کیونکہ نفس ایک آن میں دو طرف متوجہ نہیں ہوسکتا تو تلاوت قرآن کے وقت اگر توجہ کے ساتھ تلاوت ہو دوسری باتوں کا خیال بھی نہ آئے گا ورنہ زبان تو جب تک اس میں مشغول رہے گی اس وقت تک دنیوی باتوں سے رُکی رہے گی اس طرح سے تلاوت قرآن کے ضمن میں تقلیل کلام ہو جائے گی۔ پھر محض یہی نہیں کہ تقلیل کلام کا مجاہدہ حاصل ہوگیا اور کوئی نفع حاصل نہ ہو بلکہ اس میں ثواب بھی اتنا ہوتا ہے کہ کسی طاعت میں اتنا ثواب نہیں کہ ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور رمضان میں وہ دس نیکیاں دس فرض کے برابر ہوتی ہیں یہ تو عام ثواب ہے اور جو کوئی زیادہ

مخلص ہو تو اس کو ایک حرف پر سات سو نیکیاں تک ملتی ہیں بلکہ واللہ یضاعف لمن یشاء یعنی سات سو پر بھی انتہا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اس سے بھی زیادہ دیتے ہیں۔ اب بتلایئے اگر شریعت بھی تقلیل کلام کی وہی صورت تجویز کرتی جو اہل ریاضت میں مستعمل ہے کہ بس زبان کو گوند لگا دیا جائے اور بالکل خاموش بیٹھے رہا کریں تو یہ دولت بے شمار کیونکر حاصل ہو سکتی ہے۔ شریعت کے قربان جایئے کہ اس نے مجاہدہ تقلیل کلام کی وہ صورت تجویز کی جس سے اس مجاہدہ کا فائدہ بھی حاصل ہو جائے کہ زبان گناہوں سے بچی رہے فضول باتیں کرنے کی عادت کم ہو جائے اور اس کے ساتھ ثواب بھی بے شمار ملتا رہے اور ثواب ہی پر بس نہیں بلکہ تلاوت قرآن میں بندے کو حق تعالیٰ کا ایک خاص قرب بھی حاصل ہوتا ہے جو خاموش رہنے میں کبھی حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ قرآن میں ایک خاص تجلی ہے جب اس کا ظہور قلب پر ہوتا ہے تو دل میں حق سبحانہ کے سوا کسی کی گنجائش نہیں رہتی قلب عظمت حق سے پُر ہو جاتا ہے بس وہ حال ہوتا ہے ؎

چو سلطان عزت علم برکشد   جہاں سر بجیب عدم درکشد

(جب وہ سلطان عزت جھنڈا بلند کرتا ہے تو یہ کائنات تمام عدم کے جیب میں سر ڈال دیتی ہے)

پھر ان باطنی دولتوں کے ساتھ قرآن میں ایک ظاہری لذت بھی ہے جس کی وجہ سے کثرت تلاوت قرآن آسان ہو گئی اگر ذرا سا بھی ذوق ہو تو قرآن سے زیادہ کوئی کلام لذیذ نہیں اس میں وہ لذت ہے کہ جتنا پڑھتے جاؤ لذت بڑھتی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ کثرت تلاوت سے جی نہیں گھبراتا۔ بعض خدا کے بندے روزانہ ایک ختم کرتے ہیں اگر قرآن میں یہ لذت نہ ہوتی تو بھلا روزانہ ایک ختم ہو سکتا تھا ہرگز نہیں بعضے دو دن میں ایک ختم کرتے ہیں بعضے دس پارے روزانہ پڑھ کر تین دن میں ختم کر لیتے ہیں۔ اور ایسے تو اللہ کے بندے بہت ہیں جو رمضان میں تین چار دفعہ قرآن شریف ختم کر لیتے ہیں۔

آخر قرآن میں کوئی تو لذت ہے جو اس کی بار بار تلاوت کرنا آسان ہے بعض کلاموں میں یہ کمال ہوتا ہے کہ ان میں بدون سمجھے بھی لطف آتا ہے قرآن میں یہ صفت سب سے زیادہ ہے اور اگر خدا نے فہم معانی کی بھی توفیق دی ہے۔ پھر تو اس لذت کا پوچھنا ہی کیا بعض لوگ جن کو معانی قرآن کا ذوق ہے ایک ایک آیت پر گھنٹوں وجد کرتے ہیں بعض اللہ کے بندوں نے ایک ہی آیت کے تکرار میں رات سے صبح کر دی ہے روتے جاتے ہیں اور ایک ہی آیت کو بار بار پڑھتے جاتے ہیں پھر بھی لذت ختم نہیں ہوتی اگر کوئی صحیح قرآن پڑھنے والا ہو اور اس کے ساتھ خوش آواز بھی ہو اس کا قرآن سنئے واللہ بدون سمجھے بھی وہ لطف آئیگا جو کسی کلام میں نہ آئے گا قرآن کو صحت کے ساتھ پڑھا جائے تو ہر لہجہ میں مزہ آتا ہے ہاں موسیقی کے قواعد پر نہ پڑھنا چاہیئے اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ قرآن کے بعد مثنوی میں بھی یہ صفت ہے کہ اس کے اشعار سننے میں ہر شخص کو مزا آتا ہے چاہے مطلب کچھ بھی نہ سمجھتا ہو اسی لئے مولانا جامی نے کہا ہے ؎

مثنوی مولوی معنوی　　　　ہست قرآن در زبان پہلوی ؒ

بظاہر اس میں شبہ ہوتا ہے کہ پوری مثنوی میں تو قرآن کے مضامین نہیں ہیں پھر اس کو قرآن در زبان پہلوی کیسے کہدیا۔ حضرت حاجی صاحب نے اس کا مطلب اور بیان فرمایا ہے کہ اس جگہ قرآن کے معنے مطلق کلام الہامی ہے مطلب یہ ہوا کہ مثنوی فارسی میں الہامی کتاب ہے کیونکہ روایات سیر سے معلوم ہوا ہے کہ مولانا رومی پر غیبی واردات کا غلبہ ہوتا تھا اس وقت مثنوی کے اشعار آپ کی زبان پر جاری ہوتے تھے اور مولانا حسام الدین ان کو لکھ لیتے تھے جب حالت فرو ہو جاتی تو اشعار کی آمد بند بھی ہو جاتی تھی اسی طرح اس کی تصنیف تمام ہوئی ہے تو یہ ساری کتاب غلبۂ حال میں لکھی گئی ہے اس وقت بطور الہام کے یہ کلام مولانا کی زبان سے نکلتا تھا اسی لئے مثنوی میں ایک شوکت اور حلاوت ایسی ہے جو دوسروں کے کلام میں نہیں پائی جاتی یہ تو جملہ معترضہ تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ قرآن میں ایک لذت ہے جو بے سمجھے پڑھنے میں بھی ہر شخص کو حاصل

ؒ یہ مثنوی مولانا رومی فارسی زبان میں الہامی کتاب ہے۔

ہوتی ہے قرآن میں ایک بات یہ ہے لا یخلق من کثرۃ الرد کہ یہ کلام بار بار پڑھنے سے پُرانا نہیں ہوتا ہر دفعہ تازہ کلام معلوم ہوتا ہے۔ کوئی غزل کیسی ہی عمدہ ہو دس مرتبہ سن لو تو پھر اس کے سننے میں مزا نہیں آتا بلکہ جی گھبرانے لگتا ہے اور قرآن کو نہ معلوم کتنی مرتبہ سنا ہوگا اور کتنی مرتبہ پڑھا ہوگا یہ پُرانا نہیں ہوتا ہر دفعہ نیا لطف آتا ہے بلکہ بار بار ختم کر کے پھر شروع کرنے کو جی چاہتا ہے چنانچہ جو لوگ تلاوت قرآن کے عادی ہیں ان سے پوچھ لیجئے اور تم عادت کر کے دیکھ لو پھر خود ہی تجربہ ہو جائیگا جو لوگ تلاوت قرآن کے عادی ہیں اگر کسی دن ان کا معمول پورا نہ ہوا اور تلاوت کا موقع نہ ملے تو دن بھر ان کا دل بُرا رہتا ہے جیسے بھوکے پیاسے کو روٹی اور پانی کی طلب ہوتی ہے اس طرح ان کا دل تلاوت کو ترستا رہتا ہے جب قرآن پڑھ لیتے ہیں اس وقت تسلی ہوتی ہے جیسے بھوکے کو غذا مل گئی پیاسے کو پانی مل گیا ورنہ ماہی بے آب کی طرح تڑپتے رہتے ہیں اگر کثرت تلاوت سے قرآن پُرانا ہو جایا کرتا تو یہ طلب اور یہ بے چینی کبھی نہ ہوتی خصوصاً ان لوگوں کو جو مہینہ میں کئی بار ختم کرتے ہیں مگر یہاں یہ حالت ہے کہ جو جتنا زیادہ تلاوت کا عادی ہے وہ اتنا ہی اس کے لئے بیچین ہے تو شریعت نے عجیب مجاہدہ تجویز کیا ہے جس میں تقلیل کلام کے ساتھ ظاہری لذت بھی ہے جس کی کثرت قلب پر گراں بھی نہیں ہوتی پھر اس میں قرب بھی بے انتہا ہے ثواب بھی بے شمار ہے بھلا تقلیل کلام کی ایسی صورت کوئی بتلا سکتا ہے (پھر جو صورت مجاہدہ تقلیل کلام کی اہل ریاضت نے تجویز کی ہے کہ زبان کو بند کر لیا جائے اس میں ایک نقص یہ بھی ہے کہ اس طرح قوت گویائی کم ہو جاتی ہے اگر ایسا شخص کسی وقت تقریر کرنا چاہے تو اس کے کلام میں شوکت و قوت نہ ہوگی اور قوت نطق انسان میں بڑا جوہر ہے زبان سے بعض دفعہ وہ کام لئے گئے ہیں جو تلوار سے نہ ہو سکتے تھے تو اس قوت کا معطل و بیکار ہو جانا بہت بڑا نقص ہے مگر شریعت نے تقلیل کلام کی جو صورت تجویز کی ہے اس سے قوت کلام بڑھتی ہے تجربہ ہے کہ کثرت تلاوت قرآن سے کلام میں بلاغت و فصاحت پیدا ہوتی ہے اور گویائی میں قوت پیدا ہوتی ہے تو سبحان اللہ کیا عجیب مجاہدہ ہے کہ تقلیل کلام کے ساتھ تقویت کلام مجتمع کر دی بھلا

ضدین کو کوئی اس طرح جمع کرسکتا ہے ہرگز نہیں یہ بات تلاوت قرآن ہی میں ہے کہ اس کی مشغولی میں تقلیل کلام بھی ہے اور ساتھ ساتھ گویائی کی قوت بھی حاصل ہوتی۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جو شخص اپنے کلام میں بلاغت پیدا کرنا چاہے وہ تلاوت قرآن کثرت سے کیا کرے ۱۲ جامع) اب میں ایک مسئلہ تصوف کا مقام کے متعلق بیان کر کے شاید بیان کو ختم کر دوں خدا نے آج وعظ کی لاج رکھ لی کہ پہلے بیانات کے تمموں سے وعظ طویل ہو گیا ورنہ تقلیل کلام کے متعلق زیادہ مضمون ذہن میں نہیں ہے یا یوں کہئے کہ تنگی وقت کی وجہ سے مضمون آتا نہیں کیونکہ اب دیر بہت ہو گئی ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ سلوک طریق کے دو جزو ہیں ایک تحلیہ (بالحاء المہملۃ) دوسرے تخلیہ (بالخاء المعجمہ) تحلیہ کے معنے لغت میں آراستہ کرنا اور اصطلاح صوفیہ میں تحلیہ یہ ہے کہ سالک اپنے کو اخلاق حمیدہ و تعلق مع اللہ سے آراستہ کرے جس کا طریقہ طاعات و ذکر میں مشغول ہونا ہے اور تخلیہ کے معنے لغت میں خالی کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں سالک کا اپنے کو اخلاق رذیلہ سے پاک کرنا اور غیر سے تعلق منقطع کرنا ہے اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ سلوک کیلئے تحلیہ اور تخلیہ دونوں کی ضرورت ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ تحلیہ کو مقدم کیا جاوے یا تخلیہ کو مشائخ میں دونوں طریقے مستعمل ہیں۔ بعض تخلیہ کو مقدم کرتے ہیں اس کے بعد تحلیہ کرتے ہیں بعض تحلیہ کو مقدم کرتے ہیں اس کے بعد تخلیہ کرتے ہیں اور ہر دونوں طریق سے کامیابی ہوتی ہے جیسے معالجات امراض جسمانیہ میں بھی یہ دونوں طریقے مستعمل ہیں حکماء یونان تخلیہ کو مقدم کرتے ہیں یعنی پہلے مادہ فاسدہ کو نکالتے ہیں بعد میں تقویت طبع کا اہتمام کرتے ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ جب تک مادۂ فاسدہ کا اخراج نہ ہو اور مرض زائل نہ ہو اس وقت تک تقویت کی تمام تدبیریں بیکار رہیں۔ اس صورت میں اگر تم طبیعت کو قوت پہنچاؤ گے تو اس سے ممکن ہے کہ مرض کو قوت پہونچے۔ اس لئے طب یونانی میں بحالت مرض تقویت کی تدبیریں نہیں کی جاتیں۔ ہاں صحت کے بعد کوئی خمیرہ یا معجون وغیرہ قوت کے لئے کھلاتے ہیں یعنی تخلیہ کے بعد تحلیہ کرتے ہیں۔

اور حکماء یورپ کی رائے یہ ہے کہ مرض کی حالت میں سب سے پہلے

تقویت طبع کا اہتمام کرنا چاہیئے اگر اس میں دیر کی گئی اور ازالہ سبب مرض ہی پر صرف توجہ کی گئی اور تقویت طبع کا خیال نہ کیا گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ازالہ سبب مرض تک طبیعت نہایت کمزور ہو جائے گی اور جب تک تم سبب کا ازالہ کروگے اس وقت تک مریض ضعف طبع سے کہیں سے کہیں پہنچ جائیگا پھر غایت ضعف کی حالت میں سنبھال دشوار ہو جائے گی اس لئے حکماء یورپ اول تقویت طبیع کا اہتمام کرتے ہیں یعنی تحلیہ کو مقدم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تحلیہ سے تخلیہ خود ہو جاتا ہے یعنی جب طبیعت قوی ہو جاتی ہے تو وہ مرض کو خود زائل کر دیتی ہے۔ حکماء یونان اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ضعف طبع کا سبب تو مرض ہی ہوا ہے اور اگر مرض اور سبب مرض کا ازالہ ہو گیا تو طبیعت خود قوی ہو جائے گی اور جب تک سبب ضعف موجود ہے اس وقت تک طبیعت کو قوت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور اگر کسی تیز دوا سے قوت پہنچا بھی دیگئی تو وہ عارضی قوت ہو گی دیرپا نہ ہو گی قابل اعتبار وہی قوت ہے جو مانع کے ارتفاع کے بعد پیدا ہو۔ غرض طرفین سے دلائل بیان کئے جاتے ہیں اور دونوں طریقوں سے کامیابی ہوتی ہے۔ اجسام طبعیہ کے خواص میں نظر کرنے سے بھی دونوں کی تائید ہوتی ہے بعض خواص سے حکماء یونان کے قول کی تائید ہوتی ہے اور بعض خواص سے حکماء یورپ کے قول کی۔

مثلاً جس بوتل میں پانی بھرا ہوا ہے اس میں اگر آپ ہوا بھرنا چاہیں تو جب تک پانی بھرا ہوا ہے اس وقت تک ہوا اس کے اندر نہیں پہونچ سکتی۔ پانی گرا دو تو ہوا خود بخود بھر جائے گی۔ اس میں حکماء یونان کے قول کی تائید ہوتی ہے کہ تخلیہ کے بعد تحلیہ آسان ہو جاتا ہے جہاں ظرف کو غیر سے خالی کیا پھر اصلی حالت خود بخود عود کر آتی ہے۔ اور اگر کسی بوتل میں ہوا بھری ہو اور آپ اس کو نکال کر پانی بھرنا چاہیں تو ہوا کو پہلے نکالنے کی ضرورت نہیں بلکہ بوتل میں پانی بھرنا شروع کردو بس ہوا ساتھ کے ساتھ خود نکلتی رہے گی چنانچہ جس وقت بوتل منہ تک پانی سے بھر جائے گی

اس وقت ہوا بالکل نہ رہے گی اس خاصیت سے حکماء حال کی تائید ہوتی ہے کہ تحلیہ سے تخلیہ خود بخود ہو جاتا ہے تخلیہ کو مقدم کرنے کی ضرورت نہیں تم تحلیہ شروع کر دو طبیعت عوارض سے خود ہی خالی ہوتی چلی جائے گی۔ اسی طرح صوفیہ کی بھی رائے مختلف ہوگئی بعض کے یہاں صفات حمیدہ اور تعلق مع اللہ پہلے پیدا کیا جاتا ہے پھر ذمائم کی اصلاح کی جاتی ہے اور بعض کے یہاں صفات رذیلہ اور تعلق غیر کو اول قطع کیا جاتا ہے پھر صفات حمیدہ اور تعلق مع اللہ پیدا کیا جاتا ہے اور ہر فریق نے اپنی تائید کے لئے قرآن سے بھی استنباط کیا ہے۔ فریق اول اس آیت کو اپنی تائید میں پیش کرتا ہے واذکر اسم ربک و تبتل الیہ تبتیلاہ دیکھئے اس آیت میں ذکر اللہ کا حکم مقدم کیا گیا ہے جو کہ تحلیہ ہے اور تبتل یعنی قطع تعلقات غیر کو موخر کیا گیا ہے اور یہی تخلیہ ہے تو اس آیت میں تحلیہ کو تخلیہ پر مقدم کیا گیا ہے۔ دوسرا فریق یہ آیت پیش کرتا ہے واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ کہ اس آیت میں استعانت بالصبر کو مقدم کیا گیا ہے اور صبر کے معنے ہیں کف النفس عن المعاصی یعنی نفس کو معاصی سے روکنا اور یہی حاصل ہے تخلیہ کا اور استعانت بالصلوٰۃ کو مؤخر کیا گیا ہے جو کہ تحلیہ کی قسم میں سے ہے تو اس آیت کو تخلیہ کو تحلیہ پر مقدم کیا گیا ہے مگر اس میں قول فیصل یہ ہے کہ نہ تحلیہ کو مطلقاً مقدم کیا جائے نہ تخلیہ کو بلکہ دونوں کو دوش بدوش لے چلنا چاہئے کہ ساتھ ساتھ تحلیہ و تخلیہ دونوں ہوتے رہیں اگر تحلیہ کو مطلقاً مقدم کیا گیا تو بعض دفعہ رذائل ایسے قوی ہوتے ہیں کہ سارا تحلیہ بیکار ہو جاتا ہے مثلاً کوئی شخص سر سے پیر تک پائخانہ میں بھرا ہوا ہو تو اس کے بدن پر عطر ملنا بیکار ہے وہ عطر کو بھی لے ڈوبے گا اسی طرح اگر تخلیہ کو مقدم کیا گیا تو اتنا زمانہ تحلیہ کی برکات سے خالی جائے گا پھر ممکن ہے کہ تخلیہ میں دیر لگ جائے اور کوتاہی عمر کی وجہ سے تحلیہ کی نوبت ہی نہ آئے تو یہ شخص تعلق مع اللہ سے بالکل ہی کورا جائے گا اس لئے محققین کی رائے اب یہ ہے کہ تحلیہ اور تخلیہ ساتھ ساتھ ہونا چاہیئے۔ چشتیہ کے یہاں پہلے تخلیہ مقدم تھا اور اب بھی ان کو تحلیہ کے ساتھ تخلیہ کا اہتمام زیادہ ہوتا ہے مگر پہلے یہ حالت تھی کہ برسوں مجاہدات کراتے تھے پھر مدت کے بعد بارہ تسبیح وغیرہ تعلیم کرتے اور نقشبندیہ پہلے ہی

ہی دن ذکر تعلیم کر دیتے تھے ان کے یہاں تحلیہ مقدم تھا بعد میں تخلیہ کراتے تھے اور اب گو دونوں سلسلے کے محققین کی رائے بدل گئی مگر مذاق پر چشتیہ کے تخلیہ غالب ہے اور نقشبندیہ کے مذاق پر تحلیہ غالب ہے مگر باوجود اس کے اہل تربیت جو محقق ہیں اس میں طالب کے مذاق پر زیادہ مدار رکھتے ہیں جس کو وہ اپنے خداداد بصیرت سے تشخیص کر لیتے ہیں چنانچہ مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت کے متعلق مشورہ لیا کہ میں چشتیہ سلسلہ میں داخل ہوں یا نقشبندیہ میں حضرت حاجی صاحب نے ان سے فرمایا اچھا یہ بتلاؤ کہ اگر ایک زمین میں جھاڑ جھنکار بکثرت کھڑے ہوں اور کوئی شخص اس میں تخم پاشی کرنا چاہے تو اس کی بہتر صورت کیا ہے آیا اس کو اول جھاڑ جھنکاڑ صاف کرنا چاہیے اور بعد میں تخم پاشی کرے یا پہلے تخم پاشی کرے اور بعد میں جھاڑ جھنکار کو صاف کرتا رہے۔ مولانا محمد منیر صاحب نے کہا حضرت میری رائے میں تو تخم پاشی پہلے کر دینا چاہیے کچھ تو پیدا ہو جائے گا پھر جھاڑ جھنکاڑ کو بھی صاف کرتا رہے اگر اول جھاڑ جھنکاڑ وغیرہ کی صفائی میں لگ گیا تو ایسا نہ ہو کہ عمر اسی میں تمام ہو جائے اور تخم پاشی کی نوبت ہی نہ آئے۔ حاجی صاحب نے ہنس کر فرمایا کہ بس نقشبندیوں میں جاؤ تمہاری طبیعت کو اسی طریق ہی سے مناسبت ہے یہ مذاق نقشبندیہ ہی کا ہے کہ جھاڑ جھنکاڑ کو بعد میں صاف کرے تخم پاشی پہلے کر دے چشتیہ کا مذاق یہ ہے کہ وہ پہلے جھاڑوں کو صاف کرتے ہیں بعد میں تخم پاشی کرتے ہیں تو چشتیہ کا اصلی مذاق تو یہی ہے۔ مگر اب زمانہ کی حالت اور عمر کی کوتاہی اور فراغ کی قلت پر نظر کر کے دونوں طریق کے محقق نے فیصلہ کر دیا ہے کہ دونوں کو دوش بدوش لے چلو یعنی زمین کو بھی تھوڑا تھوڑا صاف کرتے جاؤ اور جتنی زمین صاف ہوتی جائے اس میں تخم پاشی بھی کرتے جاؤ۔ ساری زمین کی صفائی کا انتظار نہ کرو تو اب الحمد للہ جو محقق ہیں وہ تخلیہ اور تحلیہ ساتھ ساتھ کرتے ہیں چشتی اور نقشبندی دونوں طریقوں کو ملا دیا بس وہ حال ہو گیا مرج البحرین یلتقیان دونوں دریاؤں کو ساتھ ساتھ لیجا رہے ہیں اب جس دن یہ شخص فارغ ہوگا نقشبندی ہوگا اور چشتی بھی دونوں طریق کا فاضل ہوگا اور یہ فیصلہ ایسا ہے جیسا مدرسین کے طرز میں پہلا اختلاف تھا کہ

منقولات کو تعلیم میں مقدم کرنا چاہیے یا معقولات کو بعض کی رائے یہ تھی کہ منقولات کو مقدم کرنا چاہیے کیونکہ وہ مقاصد ہیں اگر معقولات کو مقدم کیا گیا تو ایسا نہ ہو کہ پھر یہ شخص قلت فراغ یا قصر عمر کی وجہ سے منقولات سے محروم ہی رہ جائے تو یہ سارا زمانہ تعلیم کا بیکار ہی گیا کیونکہ یہ تو غیر مقصود کی تحصیل میں گذرا بعض کی رائے یہ تھی کہ معقولات کو مقدم کرنا چاہیے کیونکہ وہ مقدمات میں سے ہے اور اس سے عقل میں تیزی پیدا ہوتی ہے اور اس کی ضرورت مقاصد سے پہلے ہے جب اول عقل روشن ہو جائے گی تب مقاصد کا فہم آسان ہوگا دوسرے اگر معقولات کو مؤخر کیا گیا تو اس میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ اس شخص پر رنگ معقول ہی کا غالب ہوگا کیونکہ جو رنگ اخیر میں چڑھتا ہے وہی غالب رہتا ہے اور اسی کا اثر طبیعت پر رہ جاتا ہے اور اگر منقول کو مؤخر کیا گیا تو اخیر میں اسی کا رنگ طبیعت پر غالب رہے گا۔ یہ تو ہر فریق کے دلائل تھے مگر علماء محققین نے اب فیصلہ کر دیا ہے کہ نہ معقول کو علی الاطلاق مقدم کرو نہ منقول کو بلکہ دونوں کو دوش بدوش لے چلو اور معقول بقدر ضرورت پڑھاؤ منقول زیادہ پڑھاؤ تو اخیر میں اس شخص پر منقول ہی کا اثر غالب رہے گا اور ساتھ ساتھ معقولات پڑھنے سے فہم منقول میں مدد بھی ملے گی۔ چنانچہ اب مدارس میں اسی طریق پر عمل ہے یہ تو مسئلہ تھا۔ اب میں بتلانا چاہتا ہوں کہ جو بات محققین نے عرصۂ دراز کے بعد طے کی ہے شریعت مقدسہ نے اس کو پہلے ہی طے کر دیا ہے مگر اس پر کسی کی نظر نہیں پہنچی وہ یہ کہ شریعت نے تمام مجاہدات میں اس کی رعایت کی ہے کہ محض تخلیہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مجاہدہ کی صورت وہ تجویز کی جس میں تخلیہ اور تحلیہ ساتھ ساتھ ہوتا رہے مثلاً تقلیل منام کی یہ صورت تجویز نہیں کی کہ رات کو خالی بیٹھے جاگا کرو بلکہ اس کو تراویح اور تہجد کی صورت میں تجویز کیا جس میں جاگنا بھی ہو گیا جو ترک راحت ہونے کی وجہ سے تخلیہ ہے اور ساتھ ساتھ عمل بھی ہوتا رہا جو تحلیہ ہے۔ اسی طرح تقلیل کلام کی یہ صورت تجویز نہیں کی کہ زبان کو بند کر کے بیٹھ جاؤ بلکہ اس کی یہ صورت تجویز کی کہ تلاوت قرآن میں مشغول رہو اس میں زبان رذائل و ذمائم سے بھی محفوظ ہو گئی۔ یہ تو تخلیہ تھا اور ساتھ ساتھ ذکر بھی ہو رہا ہے یہ تحلیہ ہے اور اس میں ایک بڑا راز ہے جس کے معلوم ہو جانے کے بعد ایک بہت بڑا خطرہ رفع ہو جائے گا جو سالکین کو پیش آتا ہے وہ خطرہ یہ ہے کہ بعض

سالکین کو ترک تعلقات کا بے حد اہتمام ہوتا ہے اور اسی کے وقائق میں غور وفکر
اور عمل کو لگائے رکھتا ہے مثلاً کسی نے اپنے ذمے بہت سے فضول کام لے
رکھے تھے انھیں کم کردیا یا زار کے کام کم کردیئے۔ معاملات د تعلقات میل
جول وغیرہ کو اس مصلحت سے گھٹا دیا کہ ان تعلقات کے کم ہونے سے
تعلق مع اللہ پیدا ہو پھر قلب کو خالی کر کے متوجہ بحق ہو یہ نیت اچھی
ہے اور مذاق چشتیہ کے موافق ہے مگر اس کے استعمال میں بعض
دفعہ غلطی ہوجاتی ہے وہ یہ کہ تخلیہ اور تحلیہ دونوں ساتھ ساتھ تو تھے نہیں یعنی جس
زمانہ میں یہ شخص تقلیل تعلقات غیر میں مشغول ہوتا ہے اس وقت
تکثیر تعلق مع اللہ میں مشغول نہیں ہوتا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک وقت
اس پر ایسا گذرتا ہے کہ اس کا دل بالکل خالی ہوجاتا ہے کہ نہ اس میں
تعلق مع الخلق ہے نہ تعلق مع اللہ کیونکہ تعلق مع اللہ سے تو قلب
کو بھرنے کا اس نے قصد ہی نہیں کیا یا قصد کیا ہو مگر اس کے لئے عمل
تھوڑا کیا جو کافی نہیں ہوا اور تعلق مع اللہ چونکہ تعلق مع الغائب ہے
اس لئے وہ ابھی ایسا قوی نہیں ہوا کہ دوسرے تعلقات کو دل سے نکال کر
خود اس میں بھر جائے تو اس نے اپنے نزدیک مخلوق سے اپنے دل کو خالی
کیا لیکن وہ اس وقت تعلق مع الحق سے بھی خالی ہے تو شیطان نے
میدان خالی پاکر اپنا قبضہ جمالیا کیونکہ خالی میدان پر دشمن کا قبضہ آسانی سے
ہوجاتا ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ تم نے سپاہیوں کے واسطے ایک گاڑی خالی
کرائی جس میں چمار بیٹھے تھے لیکن غلطی یہ کی کہ چماروں کے اترنے کے ساتھ
سپاہیوں کو بھرنا شروع نہ کیا بلکہ گاڑی کے خالی ہونے کا انتظار کیا اب
جس وقت گاڑی چماروں سے خالی ہوگئی اور سپاہیوں سے بھی خالی تھی
دشمن نے خالی دیکھ کر وہاں بستر جمالیا تم کو چاہیئے تھا کہ جو چمار اترتا جاتا
اس کی جگہ ایک سپاہی کو بٹھاتے جاتے تاکہ گاڑی خالی نہ ہوتی اور دشمن کو

سہولت سے قبضہ کرنے کا موقع نہ ملتا اسی لئے بزرگوں نے لکھا ہے کہ بعض دفعہ تعلقات مباحہ بھی دل کے واسطے شیطان سے پہرہ دار ہوتے ہیں، کیونکہ دل بھرا ہوا تو ہے گو تعلق مع اللہ سے نہ سہی تعلقات مباحہ ہی سے بھرا ہوا سہی مگر میدان خالی تو نہیں تو دشمن وہاں نہیں آسکتا اسی لئے وہ طالب کو نوکری چھوڑنے کی جلدی اجازت نہیں دیتے۔ کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ تعلق مع اللہ ابھی ایسا قوی نہیں ہوا جو دل کو پُر کر دے اگر نوکری کا جائز تعلق بھی قلب سے نکل گیا تو دل بالکل خالی رہ جائے گا اور اس میں تشویشات پیدا ہوں گی جن کو ضعیف تعلق مع اللہ جو اس حالت میں ہے رفع نہیں کر سکتا۔ اِسی لئے قلب کا بالکل خالی رہنا اچھا نہیں اس میں کچھ نہ کچھ ہونا چاہیئے۔ جبھی شیطان سے حفاظت ہو سکتی ہے جب تک تعلق مع اللہ سے قلب پُر نہیں ہوا ہو تو تعلق مع الخلق ہی سے پُر رہے بشرطیکہ وہ تعلق مباح ہو۔

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہی تحقیق ہے کہ جب تک تعلق مع اللہ قوی نہ ہو اس وقت تک تعلقات مباح کو ترک نہ کرو ایسا نہ ہو کہ زمین کو موروثی سے چھڑالو اور خود بھی کھیتی نہ کر سکو تو زمین خالی دیکھ کر کوئی دشمن قبضہ کر کے دعوے دار ہو جائے پہلے کسی کو کاشت کے واسطے مقرر کر لو پھر موروثی کو الگ کرنا۔ خلاصہ یہ کہ قلب کا بالکل خالی ہونا اچھا نہیں اب سمجھو کہ شریعت نے جو مجاہدات میں محض ترک پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ساتھ ساتھ عمل بھی مشروع کیا اس میں راز یہی ہے کہ اگر مجاہدہ میں صرف ترک پر اکتفا کیا جائے اور اس کے ساتھ کوئی عمل تعلق مع اللہ کے بڑھانے والا نہ کیا جائے تو نتیجہ مجاہدہ کا یہ ہوگا کہ قلب تعلقات غیر سے خالی ہونے کے ساتھ تعلق مع اللہ سے بھی خالی ہوگا اور اس صورت میں شیطان کا قلب پر قبضہ جما لینا آسان ہو جائے گا۔ اسی واسطے شریعت نے ہر مجاہدہ میں اس کی رعایت کی ہے کہ تعلقات مباحہ کو

ترک کر کے اعمال میں مشغول کر دیا ہے تاکہ قلب خالی نہ ہو یہ مسئلہ شیخ ابن قیم کی تقریر سے اول حل ہوا تھا حق تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے (انھوں نے اپنی کتاب الدوا الکافی میں یہ مضمون لکھا ہے) اس سے معلوم ہوا کہ ابن القیم صوفی محقق تھے خشک زاہد نہ تھے حق تعالےٰ ان کو جزائے خیر دے عجیب بات لکھی اسی اصل پر میں کہتا ہوں کہ شریعت نے تقلیل کلام کی جو صورت تجویز کی ہے اس میں بھی اسی راز کی رعایت ہے یعنی شریعت نے یہ نہیں کہا کہ روزے میں زبان بند کر لیا کرو کیونکہ اس سے صرف تعلق مع الخلق میں کمی ہوگی تعلق مع الحق میں کیا زیادتی ہوئی تو نتیجہ وہی ہوگا کہ دل دونوں سے خالی ہوجائے گا، بلکہ یہ صورت تجویز کی کہ قرآن کی تلاوت میں مشغول رہو اس سے تعلق مع الخلق کی کمی کے ساتھ تعلق مع الحق بڑھتا رہیگا اب دل خالی نہ ہوگا ایک چیز نکلے گی اور اس کی جگہ تعلق مع اللہ بھرے گا تو دل شیطان سے بالکل محفوظ رہے گا۔ بحمد اللہ ہر پہلو سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ شریعت نے مجاہدہ تقلیل کلام کی جو صورت تجویز کی ہے وہ سب سے بہتر صورت ہے اور اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہوسکتی اس میں کوئی خطرہ کچھ بھی نہیں اور منافع بے شمار ہیں اور مجاہدہ عرفیہ جو تقلیل کلام کے لئے اہلِ ریاضت میں مستعمل ہے خطرہ سے خالی نہیں اور اس میں اتنے منافع بھی نہیں۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور اس بیان کا نام "تقلیل الکلام بصورۃ تلاوۃ کلام الملک العلام" تجویز کرتا ہوں۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالےٰ ہم کو رمضان میں تلاوۃ قرآن کی توفیق دیں اور تقلیل کلام کے ثمرات سے کامیاب فرما دیں اور فہم سلیم عطا ہو۔

آمین وصلی اللہ تعالےٰ علےٰ خیر خلقہ سیدنا

محمد وعلےٰ آلہ واصحابہ اجمعین

وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین۝

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ مسمّٰی بہ

تقلیل الاختلاط مع الانام

فی

صورۃ الاعتکاف فی خیر مقام

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ

ناشر:۔ محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبۂ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافرخانہ بندر روڈ کراچی ملا

ایم۔ اے جناح روڈ

سلسلہ التبلیغ کا وعظ مسمےٰ بہ

تقلیل الاختلاط مع الانام

فی

صورۃ الاعتکاف فی غیر مقام

این	متیٰ	کم	کیف	لم	ماذا	من ضبط	من زائد	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا دیر ہوا	کس طرح ہوا	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	[illegible]	سامعین کی تعداد	متفرقات
مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون	۲۹ رمضان ۱۳۳۴ھ بروز جمعہ	۱۲ گھنٹہ ۵ منٹ	کھڑے ہو کر	ان مواعظ اعتکاف کا سبب واصلاح ہے	اعتکاف جامع مع خلوت و جلوت کے متعلق تھا تقلیل الاختلاط کی اس کے ضمن میں بحث بھی تھی۔	احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ وکان اللہ لہ	[illegible]	۲۵۰ تقریباً	....

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(دعاء) الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم۔

امابعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰ وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ۵

آج چوتھا جمعہ ہے کہ اسی آیت کے متعلق سلسلہ وار بیان ہو رہا ہے۔ بس آج اس کا بیان ختم[1] کئے دیتا ہوں۔ یہ بات تو پہلے معلوم ہو چکی ہے کہ اس آیت میں مجاہدہ کا بیان ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ مجاہدہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مجاہدہ حقیقیہ یعنی ارتکاب اعمال واجتناب عن المعاصی دوسرے مجاہدہ حکمیہ یعنی ان مباحات کو ترک کرنا جو معاصی کی طرف مفضی ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ مجاہدہ حکمیہ کے چار ارکان ہیں جن میں سے تین ارکان کا ذکر تو ہو چکا ہے آج چوتھے رکن کا بیان ہوگا۔ یعنی تقلیل اختلاط مع الانام کا۔ مجاہدہ حکمیہ کی حقیقت یہ ہے کہ بعض ایسے جائز کاموں سے بچنا جو مقضی ہو جاتے ہیں گناہوں کی طرف اس پر بعض لوگوں کو اشکال ہوتا ہے کہ یہ صوفی جائز کاموں سے بھی منع کرتے ہیں مگر ان کو حقیقت کی خبر نہیں بعض دفعہ طبیب امور مفضیہ سے بھی منع کر دیتا ہے گو فی نفسہ اس مقضی میں ضرر نہ ہو مگر یہ کیا ضرر تھوڑا ہے کہ وہ مضر کی طرف مفضی ہے مثلاً کوئی چیز جیسے مصری تین تولہ کی مقدار میں تو مضر ہے اور ایک تولہ کی مقدار میں مضر نہیں۔ لیکن طبیب کو حق ہے کہ ایک تولہ سے بھی منع کر دے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ایک تولہ کھا کر اس سے صبر نہ ہوگا پھر یہ ڈیڑھ تولہ کھائے گا پھر دو تولہ کھائے گا یہاں تک کہ ایک دن تین تولہ تک نوبت پہونچ جائے گی اور اس وقت ضرر پہونچ جائے گا۔ اس لئے وہ پہلے ہی دن اس سے بالکل منع کر دیتا ہے۔ یا ایک مریض کے متعلق طبیب جانتا ہے کہ اس کو تھوڑی سی مقدار میں گوشت کھانا مضر نہیں اور زیادہ مضر ہے مگر پھر بھی وہ اس سے یہ نہیں کہے گا کہ تم زیادہ گوشت سے پرہیز کیا کرو اور تھوڑا سا کھا لیا کرو۔ بلکہ وہ یہ کہے گا کہ تم گوشت بالکل نہ کھانا۔ بس مونگ کی دال یا ہری ترکاری کھانا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ گوشت سامنے آنے کے بعد تھوڑے اور زیادہ مقدار کا لحاظ کرنا مریض سے

[1] اس وقت یہی خیال تھا۔

دشوار ہے اس لئے وہ قطعاً منع کر دیتا ہے حالانکہ قلیل مقدار مباح تھی مگر خوف افضا کی وجہ سے اس کو بھی منع کر دیا اسی طرح کلام مباح و نوم مباح و اختلاط مباح گو گناہ نہیں مگر چونکہ یہ مباحات اکثر مفضی الی الذنب ہو جاتے ہیں (جس کی تفصیل پہلے وعظ میں گذر چکی ۱۲) اس لئے صوفیہ ان سے بھی منع کرتے ہیں۔ اور مجاہدہ کے ذریعہ سے ان کی تقلیل کراتے ہیں جیسے بعض مسکرات میں (جیسے افیون) قدر قلیل غیر مسکر گو حرام نہیں مگر چونکہ مقدار قلیل مفضی الی القدر المسکر ہو جاتی ہے اس لئے قلیل سے بھی منع کیا جاتا ہے۔ فقہاء وصوفیہ نے اس قاعدہ کا بہت لحاظ کیا ہے کہ جو مباح و مستحب مفضی الی المعصیت ہو جائے۔ وہ بھی ممنوع ہے بعض لوگ فقہاء پر اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے بعض مباحات کو بھی حرام کر دیا۔ مگر وہ اس راز سے بے خبر ہیں۔ حقیقت میں فقہاء نے مباح کو حرام نہیں کیا بلکہ مقدمۂ حرام کو حرام کہا ہے۔ اور عقلاً یہ قاعدہ مسلم ہے کہ مقدمہ واجب کا واجب اور مقدمہ حرام کا حرام ہے تو وہ مباح جس سے فقہاء منع کرتے ہیں مقدمہ حرام ہونے کی حیثیت سے مباح کی فرد ہی نہیں رہا بلکہ اس حیثیت کے لحاظ سے وہ حرام کی فرد بن گیا اور اختلاف حیثیات سے احکام کا اختلاف ہمیشہ ہوا کرتا ہے۔

بہت چیزیں ایسی ہیں کہ ایک حیثیت سے حسن اور دوسری حیثیت سے قبیح ہیں۔ نماز کے حُسن میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ مگر پاخانہ کا تقاضا ہو تو اس وقت نماز مکروہ ہے۔ اب اگر کوئی اعتراض کرنے لگے کہ صاحب نماز کو قبیح کہدیا۔ تو یہ اس کی حماقت ہے نماز تو فی نفسہا حسن ہی ہے مگر اس وقت ایک عارض کی وجہ سے اس میں قبح آگیا ہے۔ وہ یہ کہ تقاضائے حاجت کے وقت نماز میں اطمینان نہ ہوگا اس طرح ممکن ہے کہ ایک فعل فی نفسہٖ مباح ہو مگر دوسری حیثیت سے اس میں قبح آجائے اور وہ حیثیت افضاء الی المعصیت کی ہے۔ پس اب نہ فقہاء پر اعتراض رہا نہ صوفیہ پر۔ لیکن اس جگہ میں اس پر متنبہ کئے دیتا ہوں کہ کسی مباح کو کسی مصلحت یا مفسدہ کی وجہ سے ناجائز و حرام کہنے میں ہر کس و ناکس کا اجتہاد معتبر نہیں

بلکہ اس کو محقق حکیم ہی سمجھ سکتا ہے کہ کون سا مفسدہ قابل اعتبار ہے جس کی وجہ سے فعل مستحب کو ترک کر دینا چاہیئے اور کون سا مفسدہ قابل اعتبار نہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ گویہ قاعدہ شرعی ہے کہ جس مباح و مستحب میں احتمال مفسدہ ہو اس مباح و مستحب کو ترک کر دینا چاہیئے مگر اس کا فیصلہ کرنا کہ کون سا مفسدہ قابل اعتبار ہے اور کون سا قابل التفات نہیں۔ یہ ہر شخص کا کام نہیں۔ بلکہ اس کا فیصلہ بھی شارع ہی کر سکتا ہے یا وہ شخص جو کلام شارع کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہو۔ چنانچہ شریعت میں اس کی دو نظیریں موجود ہیں کہ دونوں جگہ بعض خاص افعال میں مفسدہ کا احتمال تھا مگر حق تعالیٰ نے ایک جگہ تو مفسدہ کا اعتبار کیا۔ اور دوسری جگہ اعتبار نہیں کیا اُن میں سے ایک تو واقعہ حطیم ہے کہ قریش نے تنگئ خرچ کی وجہ سے حطیم کو بیت اللہ سے خارج کر دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بیت اللہ میں داخل کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر اس خیال سے ملتوی کر دیا کہ اہل مکہ نے ابھی ابھی اسلام لائے ہیں اگر میں نے کعبہ کو منہدم کیا تو ان کو یہ خیال پیدا ہوگا کہ یہ کیسے نبی ہیں جو کعبہ کو منہدم کر کے اس کی بے حرمتی کرتے ہیں تو ان کے اسلام میں ضعف پیدا ہوگا۔ حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خیال کی تقریر فرمائی اور مفسدہ کی وجہ سے ترک مستحب کو گوارا فرمایا۔

دوسرا واقعہ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نکاح کا ہے جب حضرت زید بن حارثہ نے ان کو طلاق دے دی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال ہوا کہ زینب اور اُن کے اولیاء کی دلجوئی کی اب صرف ایک صورت ہے کہ میں ان سے نکاح کر لوں۔ مگر آپ اس خیال سے رُکتے تھے۔ کہ زید بن حارثہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنیٰ تھے اور اس وقت متبنیٰ کو مثل اپنی اولاد کے سمجھا جاتا تھا۔ اگر میں نے زینب[1] سے نکاح کیا تو جہلاء مشرکین و منافقین طعن کریں گے

---

[1] قلت وفی قصۃ زینب ھذہ اشکال قد یختلج فی بعض الاذھان ارید ازاحتہ بما افاض اللہ

(بقیہ صفحہ آئندہ)

کہ بیٹے کی بہو سے نکاح کرلیا، اور اس طعن کی وجہ سے بہت لوگ اسلام سے رُک جائیں گے۔ اور ممکن ہے بعض ضعفا ر اسلام ہی سے مرتد ہو جائیں تو دیکھئے نکاح زینب میں بھی اُسی مفسدہ کا احتمال تھا جس کا قصہ حطیم میں احتمال تھا مگر حق تعالیٰ نے یہاں مفسدہ کی پرواہ نہیں کی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ زینب سے نکاح کرلیں اور طعن منافقین کی پروا نہ کریں۔ بلکہ خود ہی نکاح بھی کردیا اور آیت میں زوجنکھا نازل ہوا کہ ہم نے آپ کا نکاح زینب سے کردیا۔ ان دونوں واقعوں سے معلوم ہوگیا کہ ہر مفسدہ قابل اعتبار نہیں اور ہر مصلحت قابل تحصیل نہیں پس کسی مصلحت کے فوت ہونے یا کسی مفسدہ کے پیدا ہونے کے احتمال سے مباح و مستحب کو ناجائز کہنے کا ہر کسی کو حق نہیں بلکہ یہ منصب خاص حضرات مجتہدین کا ہے۔ اس میں ہر شخص کا اجتہاد معتبر نہیں کیونکہ اجتہاد کے بعض اسباب مکتسب ہیں۔ اور بعض اسباب

(بقیہ صفحہ گذشتہ) علینا من برکات الشیخ ادام اللہ مجدہٗ تقریر الاشکال ان اللہ تعالیٰ قال فی حقہ علیہ الصلوٰۃ والسلام وتخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ وتخشی الناس واللہ احق ان تخشاہ اثبت فیہ خشیۃ الناس فی حقہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم قال فی حق غیرہ من الانبیاء والرسل الذین یبلغون رسٰلٰت اللہ ویخشونہ ولا یخشون احداً الا اللہ ط اظہر فیہ ان رسل اللہ کانوا لا یخشون احداً غیر اللہ وھذہ الیقتضی بظاہرہ فضیلۃ سائر الانبیاء علیہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ھذا الوصف بعینہ واجاب عنہ الشیخ بما نصہ ان معنی الآیۃ انک یا محمد انما تخشی الناس فی ھذا الامر لعدم علمک بان ھذا النکاح من قبیل تبلیغ الرسالۃ عملاً ولو علمت ذلک لم تخش احداً فان اللہ احق ان تخشاہ فی ترک التبلیغ ولو علمت کونہ من التبلیغ لفعلت کما کان الرسل تفعلہ من انہم کانوا یبلغون رسٰلٰت اللہ یخشونہ ولا یخشون احداً الا اللہ فاندفع الاشکال راساً واساساً وکان صلی اللہ علیہ وسلم کسائر الانبیاء بعد علمہ بکون ھذا النکاح من تبلیغ رسالات اللہ عملاً فبادر الی النکاح ولم یخش احداً الا اللہ وانما خشی عن الناس وطعنہم فی الدین مالم یعلم کونہ من تبلیغ الرسالات واما بعد ذالک فلا فلم یثبت من الآیۃ خشیۃ صلی اللہ علیہ وسلم عن الناس فی تبلیغ الاحکام حتی یلزم فضیلۃ سائر الانبیاء علیہ بل غایۃ ما ثبت انہ کان یخشی الناس قبل علمہ بکون ذلک من جملۃ التبلیغ وبعد علمہ بہ کان کسائر الرسل ۱۲ جامع

موہوب ہیں ذوق صحیح اور فہم سلیم کسی کی سعی سے حاصل نہیں ہو سکتی بس جن کو خدا نے یہ دولت عطا کر دی ہے وہی دین میں اجتہاد کا حق رکھتے ہیں ہر شخص دین میں مجتہد نہیں ہو سکتا۔ جیسے قوانین سلطنت میں ہر کسی کی رائے نہیں لی جاتی نہ ہر شخص کو رائے دینے کا حق ہے۔ اور جیسے طبیب کے سوا دوسرے کی رائے علاج و پرہیز میں معتبر نہیں نظام عالم اسی طرح قائم رہ سکتا ہے کہ ہر شخص کی رائے کا اعتبار نہ کیا جائے۔ اگر ہر اک کی رائے معتبر ہو تو تابعیت و متبوعیت زائل ہو جائے گی سب مساوات کا دعوٰے کریں گے۔ حالانکہ نظام عالم اس پر قائم ہے کہ بعض تابع ہوں اور بعض متبوع ہوں آپ اپنے گھر میں افسر ہیں یہ افسریت اسی وقت تک باقی ہے۔ جب تک بیوی اور نوکر چاکر حشم خدم آپ کی رائے اور حکم کا اتباع کریں اور اگر آپ کی اولاد اور حشم خدم یا بیوی جو بعض وجوہ سے ہمسر بھی ہے آپ کی رائے میں مزاحمت کرنے لگے تو آپ کو ہرگز گوارا نہ ہوگا۔ اور اگر آپ اس کو گوارا کر لیں تو پھر نہ وہ تابع رہیں گے نہ آپ متبوع۔ پھر گھر میں روز جوتی بیزار ہوا کرے گی۔ آپ کی کچھ رائے ہوگی۔ اور اولاد کی کچھ رائے ہوگی۔ نوکر کچھ چاہے گا بیوی کچھ چاہے گی۔ اور سب کی رائے معتبر ہے تو بتلایئے گھر کا انتظام کیونکر ہوگا۔ آخر کس کی رائے کے موافق عمل ہوگا اگر سب کی رائے پر عمل ہوا تو ذرا کر کے دیکھ لیجئے کہ اس طرح کتنے دن نباہ ہو سکتا ہے۔ اور یہ تو احتمال عقلی پر گفتگو ہو رہی ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ جس دن نوکر یا اولاد وغیرہ آپ کی رائے میں مزاحمت کریں گے اسی دن آپ کان پکڑ کر گھر سے نکال دیں گے آخر یہ کیوں محض اس لئے کہ نظام عالم تابعیت و متبوعیت کو چاہتا ہے اسی لئے متبوع کو تابع کی مساوات گوارا نہیں۔ اسی وجہ سے سلطنت کی ضرورت ہے تاکہ ایک تابع ہو ایک متبوع ہو سب کے سب آزاد نہ ہوں۔ بلکہ متبوع کے سامنے تابع کی آزادی سلب ہو جائے یہ حقیقت ہے سلطنت کی۔ اگر سلطنت نہ ہو تو ہر شخص آزاد ہوگا۔ اور آزادی مطلق انتظام کے لئے ہرگز کافی نہیں اور نہ کسی نے آج تک اس کو گوارا کیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سلطنت کوئی چیز نہیں چنانچہ

آج کل ایک فرقہ نکلا ہے جو سلطنت کا مخالف ہے۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ بدون سلطنت کے انتظام اور نزاعات کا فیصلہ کیونکر ہوگا۔ اگر کہو کہ کثرت رائے سے فیصلہ ہوگا تو میں کہتا ہوں کہ جن کثیرین کی رائے پر فیصلہ ہوگا وہی سلطنت کے مصداق ہو گئے کیونکہ ان کے سامنے دوسروں کی آزادی سلب ہو گئی اور یہی حقیقت ہے سلطنت کی کہ بعض کی آزادی بعض کی رائے کے سامنے سلب ہو جائے کثرت رائے پر فیصلہ ہونے کے بعد بھی آزادی مطلق کہاں رہی اس فیصلہ کی پابندی سے بھی تو آزادی سلب ہو گی تو یہ لوگ جس چیز کو مٹاتے ہیں اخیر میں اس کو ثابت کرتے ہیں۔ خدا تعالے نے بھی آزادی مطلق کو گوارا نہیں کیا۔ بلکہ ایک کو تابع ایک کو متبوع بنایا ہے چنانچہ حق تعالے نے اپنے احکام نبی کے واسطہ سے بھیجے ہیں اور تمام مخلوق پر نبی کا اتباع فرض کیا ہے تاکہ مخلوق کو کسی ایک کا تابع کیا جائے، ورنہ بہت سہل تھا کہ انبیاء کو نہ بھیجتے بلکہ آسمان سے چھپے ہوئے کاغذ ہر ایک کے پاس آ گرا کرتے اور ہر شخص اس کو پڑھ کر کام کرتا۔ نہ نبی کا اتباع ضروری ہوتا نہ خلیفہ کا نہ علماء و مجتہدین کا۔ شاید کوئی کہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں پریس کہاں۔ میں کہتا ہوں کہ جب تم نے پریس ایجاد کر لئے ہیں تو خدا تعالیٰ کو پریس بنا لینا کیا مشکل ہے۔ بلکہ تم جو کچھ ایجاد کرتے ہو یہ عقل سے ایجاد کرتے ہو اور عقل خدا کی دی ہوئی ہے تو یہ ایجاد بھی حقیقت میں خدا تعالیٰ کی ایجاد ہے۔ تمہارا تو محض نام ہی نام ہے۔ اس لئے یہ شبہ محض لغو ہے۔ دوسرے میں دعویٰ کرتا ہوں کہ حق تعالے کے یہاں اس وقت بھی پریس موجود ہیں کیونکہ کاتبین اعمال کا لکھا ہوا قیامت تک نہ مٹے گا۔ ایسی سیاہی اور ایسا کاغذ تو کسی پریس کو بھی نصیب نہیں جو قیامت تک باقی رہے۔ تو پھر جو کاتبین اعمال آپ کے کاموں کو ایسی سیاہی سے روزانہ لکھتے ہیں وہی اگر احکام کو لکھ کر ہر شخص کے پاس ڈال دیا کریں تو کیا مشکل ہے۔ مگر حق تعالے نے ایسا نہیں کیا بلکہ احکام کو نبی پر نازل کیا اور مخلوق کو نبی کا تابع کیا تاکہ آزادی سلب ہو جائے۔ جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں اور حریت و مساوات کے مدعی ہیں وہ بھی آزادی کا عام ہونا گوارا نہیں

کرتے کیونکہ جمہوری سلطنت کے بعد بھی وہ کوئی قانون ہوگا جس کی پابندی عام رعایا پر لازم ہوگی۔ تو اس قانون کے سامنے سب کی آزادی سلب ہوجائے گی۔ہم تو آزادی کا دعوےٰ جب جانیں کہ کسی شخص کو بھی قانون کا پابند نہ کیا جائے بلکہ جس کے جو جی میں آئے کرنے دیا جائے۔ کسی سے کچھ مزاحمت نہ کی جائے کیونکہ تم آزادی کے حامی ہو تو آزادی تو اسی کا نام ہے کہ کوئی کسی بات کا پابند نہ ہو۔ پھر تم لوگوں کو قانون کا پابند کیوں بناتے ہو اور ان کی آزادی کو قانون کا تابع کیوں بناتے ہو۔ یا کم از کم یہی کرو کہ قانون بنانے میں ساری رعایا کی رائے لے لیا کرو۔ قانون سازی کے لئے پارلیمنٹ کی مختصر جماعت کو کیوں خاص کر رکھا ہے اور تمام رعایا کو چند آدمیوں کی رائے کا تابع کیوں بنا رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں وہ بھی شخصیت ہی کے حامی ہیں۔ مگر ہر شخص کبھی حقیقی ہوتا ہے۔ کبھی حکمی فلسفہ کا مسئلہ ہے کہ مجموعہ بھی شخص واحد ہے۔ مگر وہ واحد حکمی ہے حقیقی نہیں تو یہ لوگ جس پارلیمنٹ کے فیصلوں کا اتباع کرتے ہیں اس میں گو بظاہر بہت سے آدمی ہوتے ہیں مگر مجموعہ ملکر پھر شخص واحد ہے کیونکہ جو قانون پاس ہوتا ہے وہ سب کی رائے سے مل کر پاس ہوتا ہے پارلیمنٹ میں بھی ہر شخص آزاد نہیں کہ جو شخص جو رائے دیدے وہی قانون ہوجایا کرے اگر ایسا بھی ہوتا جب بھی کسی قدر آزادی کا دعویٰ صحیح ہوتا۔ مگر وہاں تو پارلیمنٹ کے بھی ہر شخص کی انفرادی رائے معتبر نہیں بلکہ اجتماعی رائے معتبر ہے اور اجتماعی رائے پھر شخصی رائے ہے۔ کیونکہ مجموعہ مل کر واحد حکمی ہوجاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ہم شخص واحد حقیقی کے حامی ہیں اور تم شخص واحد حکمی کے حامی ہو جمہوریت کے حامی ہو تو تم بھی نہ رہے۔ جمہوریت اور آزادی کا رہل تو جب ہوتی جب ہر شخص اپنے فعل میں آزاد ہوتا کوئی کسی کا تابع نہ ہوتا نہ ایک بادشاہ کا نہ پالیمنٹ کے دس ممبروں کا۔ اور یہ کیا آزادی ہے کہ تم نے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو پارلیمنٹ کے دس ممبروں کی رائے کا تابع بنا دیا۔ ہم تو ایک ہی کا غلام بناتے تھے تم نے دس کا غلام بنا دیا۔ اب تم ہی فیصلہ کرلو کہ ایک کا غلام بنانا اچھا ہے یا دس بیس کا غلام ہونا

ظاہر ہے کہ جس شخص پر ایک کی حکومت ہو وہ اس سے بہتر ہے جس پر دس بیس کی حکومت ہو یہ حاصل ہے جمہوری سلطنت کا کہ رعایا کی غلامی سے تو اس کو بھی انکار نہیں۔ مگر وہ یہ کہتی ہے کہ تم دس بیس کی غلامی کرو۔ اور ہم یہ کہتے ہیں کہ صرف ایک کی غلامی کرو۔ شریعت میں یہ خاص بات ہے کہ اس کے دعاوے کہیں نہیں ٹوٹتے۔ شریعت نے آزادی کا ایسے زور سے دعوے ہی نہیں کیا جو اُس پر نقض وارد ہو۔ اور جو لوگ آزادی کا دم بھرتے ہیں کسی وقت ان کو اپنے دعوے سے ہٹنا پڑتا ہے۔ آخر کیوں ہٹتے ہو اگر کوئی شخص پارلیمنٹ کے فیصلے کو نہ مانے تو اس کو مجبور کیوں کرتے ہو اس کو پارلیمنٹ کا غلام کیوں بناتے ہو آزاد کیوں نہیں رہنے دیتے۔ مگر کیونکر آزاد رہنے دیں نظام عالم بدون اس کے قائم نہیں ہو سکتا۔ کہ مخلوق میں بعض تابع ہوں بعض متبوع ہوں۔ آزادی مطلق سے فساد برپا ہوتے ہیں اس لئے یہاں آکر ان کو اپنے دعوٰے آزادی سے ہٹنا پڑتا ہے اور شریعت کو کبھی اپنے دعوے سے ہٹنا نہیں پڑتا کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے تابعیت و متبوعیت کی حامی ہے وہ تو آزادی کا سبق سکھاتی ہی نہیں اول ہی دن سے نبی کے اتباع کا حکم دیتی ہے جس سے تمام مخلوق کو ایک کا تابع کر دیا بلکہ اگر کسی وقت خدا تعالیٰ نے ایک زمانہ میں دو نبی بھی ایک قوم کی طرف ارسال کئے ہیں تو ان میں بھی ایک تابع تھے دوسرے متبوع تھے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام ایک زمانہ میں دو نبی تھے۔ جو بنی اسرائیل و قوم قبط کی طرف مبعوث ہوئے تھے، مگر ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام متبوع تھے حضرت ہارون علیہ السلام تابع تھے۔ دونوں برابر درجہ میں نہ تھے اور یہ تابعیت محض ضابطہ کی تابعیت نہ تھی بلکہ واقعی تابعیت تھی۔ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہارون علیہ السلام پر پوری حکومت رکھتے تھے۔ وہ ان کی مخالفت نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ایک واقعہ ایسا پیدا کر دیا جس سے اس حقیقت کا ظہور ہو گیا۔ جب موسیٰ علیہ السلام تورات لینے کے لئے کوہ طور پر تشریف لے گئے تو ہارون علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بنا کر چھوڑ گئے تھے کہ میرے پیچھے بنی اسرائیل کا خیال رکھنا اور ان کی اصلاح کرتے رہنا یہاں پیچھے یہ قصہ ہوا کہ

سامری نے ایک سونے کا بچھڑا بنایا اور اس میں قدم جبریل کی مٹی ڈالدی جس سے اس میں حیات پیدا ہوگئی فَقَالُوۡا هٰذَاۤ اِلٰهُكُمۡ وَاِلٰهُ مُوۡسٰى فَنَسِیَ ؕ جاہل لوگ کہنے لگے کہ ہمارا اور موسیٰ علیہ السلام کا خدا تو یہ ہے۔ وہ بھول کر نہ معلوم کہاں چلے گئے بس بیوقوف لگے اس کی عبادت کرنے۔ موسیٰ علیہ السّلام کو حق تعالیٰ نے اس واقعہ کی اطلاع دی، وہ غصہ میں بھرے ہوئے تشریف لائے اور قوم کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا۔ اس وقت انھوں نے ہارون علیہ السلام سے فرمایا کہ جب یہ کمبخت گمراہ ہوگئے تھے تو تم یہاں کیوں رہے میرے پاس باقی ماندہ جماعت کو لے کر کیوں نہ چلے آئے اور غصہ میں اُن کا سر اور داڑھی پکڑ کر کھینچنے لگے قال یاابن ام لا تاخذ بلحیتی ولابراسی۔ ہارون علیہ السلام نے کہا کہ اے بھائی میری داڑھی اور سر کو نہ پکڑو۔ میری بات سنو۔ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ اگر میں ان کو چھوڑ کر چلدوں گا تو آپ یہ نہ کہیں کہ تو نے وہاں رہ کر ان کو سمجھایا کیوں نہیں ان کی اصلاح کیوں نہ کی اس لئے میں یہیں رہ کر ان کو سمجھاتا رہا۔ حالانکہ ہارون علیہ السلام عمر میں موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے مگر نبوت میں اُن کے تابع تھے۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے بے تکلف اپنی متبوعیت اور ان کی تابعیت کی مقتضا پر عمل کیا۔ اور وہ برتاؤ کیا جو حاکم محکوم کے ساتھ کیا کرتا ہے۔

آج ایک سب انسپکٹر باوجودیکہ انسپکٹر کا تابع اور ماتحت ہوتا ہے۔ مگر انسپکٹر اپنے ماتحت کے ساتھ ایسا کر کے تو دیکھیں۔ معلوم ہوا کہ ہارون علیہ السلام کی تابعیت محض ضابطہ کی نہ تھی۔ بلکہ واقعی تابعیت تھی جس کا اس واقعہ سے ظہور ہوگیا اور لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ ان دونوں رسولوں میں ایک تابع ہیں ایک متبوع ہیں۔ دونوں یکساں مرتبہ میں نہیں ہیں۔ اس واقعہ سے بعض لوگوں کو تعجب ہوتا ہوگا کہ موسیٰ علیہ السلام کے اس فعل میں کیا حکمت تھی۔ لیجئے ایک حکمت تو میرے قلب پر اسی وقت آگئی کہ حق تعالیٰ کو ان کی متبوعیت وتابعیت کا ظاہر کرنا تھا اس لئے موسیٰ علیہ السلام کو غصہ سے ایسا بیتاب کردیا جس سے انھوں نے اپنی حکومت و

متبوعیت کے مقتضا پر بے تکلف عمل کیا اور نہ معلوم کتنی حکمتیں ہوں گی۔ غرض اسلام میں جمہوری سلطنت کوئی چیز نہیں اسلام میں محض شخصی حکومت کی تعلیم ہے اور جن مفاسد کی وجہ سے جمہوری سلطنت قائم کی گئی ہے وہ سلطنت شخصی میں تو محتمل ہی ہیں اور نہ جمہوری میں متیقن ہیں۔ شخصی سلطنت میں یہ خرابیاں بیان کی جاتی ہے کہ اس میں ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے حالانکہ ممکن ہے کسی وقت اس کی رائے غلط ہو۔ اس لئے ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام نہ چھوڑنا چاہیے۔ بلکہ ایک جماعت کی رائے سے کام ہونا چاہیئے۔ میں کہتا ہوں کہ جس طرح شخصی سلطنت کے بادشاہ کی رائے میں کبھی غلطی کا احتمال ہے اسی طرح جماعت کی رائے میں بھی غلطی کا احتمال ہے۔ کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ ایک شخص کی رائے ہمیشہ غلط ہوا کرے اور دس کی رائے ہمیشہ صحیح ہوا کرے۔ بلکہ ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کا ذہن وہاں پہونچتا ہے جہاں ہزاروں آدمیوں کا ذہن نہیں پہونچتا ایجادات عالم میں رات دن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کیونکہ جتنی ایجادات ہیں وہ اکثر ایک ایک شخص کی عقل کا نتیجہ ہیں۔ کسی نے کچھ سمجھا کسی نے کچھ سمجھا۔ ایک نے تار برقی کو ایجاد کیا۔ ایک نے ریل کو ایجاد کیا۔ تو موجد اکثر ایک شخص ہوتا ہے اور اس کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں صدہا ہزارہا مخلوق کا ذہن نہیں پہنچتا علوم میں بھی یہ امر مشاہد ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کسی مضمون کو اس طرح صحیح حل کرتا ہے کہ تمام شراح و محشین کی تقریریں اس کے سامنے غلط ہو جاتی ہیں تو جماعت کی رائے کا غلط ہونا بھی محتمل ہے۔ اب بتلایئے اگر کسی وقت بادشاہ کی رائے صحیح ہوئی اور پارلیمنٹ کی رائے غلط ہوئی تو عمل کس پر ہوگا۔ جمہوری سلطنت میں کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے۔ تو بادشاہ اپنی رائے پر عمل نہیں کرسکتا۔ بلکہ کثرت رائے سے مغلوب ہوکر غلط رائے کی موافقت پر مجبور ہوتا ہے۔ اور شخصی سلطنت میں بادشاہ اپنی رائے پر ہر وقت عمل کرسکتا ہے۔ وہ کسی سے مغلوب نہیں ہوتا۔ اگر وزراء کی رائے صحیح معلوم ہوئی اس پر عمل کر لیتا ہے اگر وزراء کی رائے غلط معلوم ہوئی تو وہ اپنی رائے پر عمل کرسکتا ہے اور جمہوری میں اگر کثرت رائے غلطی پر ہوئی تو صحیح رائے پر عمل کرنے کی کوئی بھی صورت نہیں

سب مجبور رہیں غلط رائے کی موافقت پر اور یہ کتنا بڑا ظلم ہے۔ اس لئے یہ قاعدہ ہی غلط ہے کہ کثرت رائے پر فیصلہ کیا جائے بلکہ قاعدہ یہ ہونا چاہیئے کہ صحیح رائے پر عمل کیا جائے۔ خواہ وہ ایک ہی شخص کی رائے ہو۔

مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی نے سید احمد خاں سے کہا تھا کہ آپ لوگ جو کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ حماقت کی رائے پر فیصلہ کرتے ہیں کیونکہ قانون فطرت یہ ہے کہ دنیا میں عقلاء کم ہیں اور بے وقوف زیادہ تو اس قاعدہ کی بناء پر کثرت رائے کا فیصلہ بیوقوفی کا فیصلہ ہوگا۔ سید احمد خاں نے جواب دیا کہ دنیا میں جو عقلاء کی قلت اور بیوقوفوں کی کثرت ہے یہ اُس صورت میں ہے جبکہ بہت سے آدمیوں کو کیفما اتفق جمع کرلیا جائے تو ان میں واقعی بیوقوف زیادہ ہوں گے۔ لیکن ہم جن لوگوں کی کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں وہ کیفما اتفق جمع نہیں کئے جاتے بلکہ انتخاب کرکے خاص خاص آدمیوں کی کمیٹی بنائی جاتی ہے جس میں سب عقلاء ہی ہوتے ہیں۔ تو ان میں جس طرف کثرت ہوگی وہ بیوقوفوں کی کثرت نہ ہوگی بلکہ عقلاء کی کثرت ہوگی۔ مولانا نے جواب دیا کہ بہت اچھا لیکن عقلاء میں بھی قانون فطرت یہ ہے کہ کامل العقل تھوڑے ہیں اور ناقص العقل زیادہ۔ چنانچہ تجربہ کرلیا جائے کہ ہزار عاقلوں میں کامل العقل ایک ہی دو ہوتے ہیں۔ تو عقلاء میں بھی کثرت ان ہی لوگوں کی ہے جو ناقص العقل ہیں بس کثرت رائے پر فیصلہ اگر حماقت کا فیصلہ نہیں تو کم عقلی کا فیصلہ تو ضرور ہی ہوگا۔ سید احمد خاں کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا بالکل خاموش ہوگئے۔ غرض صحیح رائے پر عمل کرنا بدون شخصی حکومت کے ممکن نہیں جمہوری میں تو کثرت رائے کا اتباع لازم ہے۔ خواہ وہ غلط ہو یا صحیح بلکہ مولانا محمد حسین صاحب کے قول کے موافق کثرت رائے اکثر غلط ہی ہوگی۔ تو گویا جمہوری میں اکثر غلط رائے پر عمل ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب تک صحیح رائے پر عمل نہ ہوگا اس وقت تک انتظام درست نہیں ہوسکتا۔ پس ثابت ہوگیا کہ انتظام بدون شخصی حکومت کے نہیں ہوسکتا۔ دوسرے جو لوگ کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھتے ہیں اور بادشاہ کو تنہا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں دیتے وہ پہلے ہی سے اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا

بادشاہ ایسا ضعیف الرائے ہے کہ اس کی تنہا رائے قابل اعتبار نہیں اور وہ نااہل ہے تو واقعی جو لوگ اپنے بادشاہ کو ایسا سمجھتے ہوں ہم ان سے گفتگو نہیں کرتے۔ اُن کو جمہوریت مبارک ہو۔ ایسا نااہل بادشاہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کو شخصی سلطنت کا بادشاہ بنایا جائے۔ اسلام میں جو شخصی سلطنت کی تعلیم ہے تو اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ اے اہل حل وعقد اور اے جماعت عقلاء بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو اتنا صائب الرائے ہو کہ اگر کبھی اس کی رائے سارے عالم کے بھی خلاف ہو تو یہ احتمال ہو سکے کہ شاید اسی کی رائے صحیح ہو۔ اور جس کی رائے میں اتنی رزانت نہ ہو اس کو ہر گز بادشاہ نہ بناؤ۔ اب بتلاؤ کہ جس کی رائے اتنی زریں ہو کہ سارے عالم کے مقابلہ میں بھی اس کی رائے کے صائب ہونے کا احتمال ہو وہ حکومت شخصی کے قابل ہے یا نہیں یقیناً قابل ہے بشرطیکہ اہل حل وعقد انتخاب میں خیانت نہ کریں۔ پس ہم شخصی سلطنت کے اس لئے حامی ہیں کہ ہم بادشاہ کو رزین العقل صائب الرائے سمجھتے ہیں۔ اور تم کثرت رائے کے اس لئے حامی ہو کہ تم اپنے بادشاہ کو ضعیف الرائے اور نااہل سمجھتے ہو تو ایسے شخص کو بادشاہ بنانے ہی کی کیا ضرورت ہے جس کے لئے ضم ضمیمہ کی ضرورت ہو۔ بلکہ پہلے ہی سے بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو ضم ضمیمہ کا محتاج نہ ہو مستقل الرائے ہو۔ اور اگر تم بھی اپنے بادشاہ کو مستقل الرائے صائب العقل رزین سمجھتے ہو تو پھر کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھنا اور کامل العقل کو ناقصین کی رائے کا تابع بنانا ظلم ہے جس کا حماقت ہونا بدیہی ہے۔ بعض لوگوں کو یہ حماقت سوجھی ہے کہ وہ جمہوری سلطنت کو اسلام میں ٹھونسنا چاہتے ہیں اور دعوےٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہی کی تعلیم ہے۔ اور استدلال میں یہ آیت پیش کرتے ہیں وشاورھم فی الامر مگر یہ بالکل غلط ہے ان لوگوں نے مشورہ کے دفعات ہی کو دفع کر دیا اور اسلام میں مشورہ کا جو درجہ ہے اس کو بالکل نہیں سمجھا اسلام میں مشورہ کا درجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ اے بریرہ تم اپنے شوہر سے رجوع کر لو قصہ یہ ہوا تھا کہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا

پہلے باندی تھیں اور اسی حالت میں ان کا نکاح ایک شخص سے جن کا نام مغیث تھا اُن کے آقا نے کردیا تھا۔ جب وہ آزاد ہوئیں تو قانون اسلام کے مطابق ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ جو نکاح حالتِ غلامی میں ہوا تھا اگر چاہیں اس کو باقی رکھیں۔ اگر چاہیں فسخ کردیں اصطلاح شریعت میں اس کو اختیار عتق کہتے ہیں۔ اس اختیار کی بنا پر حضرت بریرہ نے نکاح سابق کو فسخ کردیا۔ لیکن ان کے شوہر کو ان سے بہت محبت تھی وہ صدمہ فراق میں مدینہ منورہ کی گلی کوچوں میں روتے پھرا کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر رحم آیا اور حضرت بریرہ سے آپؐ نے فرمایا کہ اے بریرہ کیا اچھا ہو۔ اگر تم اپنے شوہر سے رجوع کرلو۔ تو وہ دریافت فرماتی ہیں کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ کی ایک فرد ہے۔ اگر حکم ہے تو بسر وچشم منظور ہے گو مجھ کو تکلیف ہی ہو۔ آپ نے فرمایا حکم نہیں صرف مشورہ ہے۔ تو حضرت بریرہؓ نے صاف عرض کردیا کہ اگر مشورہ ہے تو میں اس مشورہ کو قبول نہیں کرتی۔ لیجئے اسلام میں یہ درجہ ہے مشورہ کا کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلیفہ تو بدرجہ اولیٰ رعایا کے کسی آدمی کو کوئی مشورہ دیں تو اس کو حق ہے کہ مشورہ پر عمل نہ کرے اور یہ محض ضابطہ کا حق نہیں بلکہ واقعی حق ہے۔ چنانچہ جب حضرت بریرہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ پر عمل نہ کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے ذرا بھی ناراض نہیں ہوئے۔ نہ حضرت بریرہ کو کچھ گناہ ہوا نہ اُن پر کچھ عتاب ہوا تو جب امت اور رعایا اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا بادشاہ کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے اسلام میں مجبور نہیں تو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) یا خلیفہ رعایا کے مشورہ سے کیونکر مجبور ہوجائے گا کہ رعایا جو مشورہ دے اسی کے موافق عمل کرے اس کے خلاف کبھی نہ کرے پس وشاورھم فی الامر سے صرف یہ ثابت ہوا کہ حکام رعا سے مشورہ کرلیا کریں یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان کے مشورہ پر عمل بھی ضرور کیا کریں۔ اور اگر کثرت رائے بادشاہ کے خلاف ہوجائے تو وہ کثیرین کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہے اور جب تک یہ ثابت نہ ہوا اس وقت تک وشاورھم فی الامر سے جمہوریت ہرگز ثابت نہیں ہوسکتی۔ جب اسلام میں ایک معمولی آدمی بھی بادشاہ کے

مشورہ پر مجبور نہیں ہوتا تو تم بادشاہ کو رعایا کے مشورہ پر کیونکر مجبور کرتے ہو۔ آخر اس کی کوئی دلیل بھی ہے یا محض دعوے ہی دعوے ہے۔ اور ہمارے پاس حدیث بریرہ سے دلیل موجود ہے کہ کسی کے مشورہ پر عمل کرنا ضروری نہیں خواہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کا مشورہ کیوں نہ ہو۔ اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اگر حکام رعایا سے مشورہ لیں تو وہ ان کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہرگز نہیں ہیں بلکہ عمل خود اپنی رائے پر کریں خواہ وہ دنیا بھر کے مشورہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس آیت میں آگے ارشاد ہے فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ کہ مشورہ کے بعد جب آپ ارادہ کسی بات کا کریں تو خدا پر بھروسہ کرکے اس پر عمل کریں یہاں اذا عزمت صیغہ واحد ہے معلوم ہوا کہ عزم میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) مستقل تھے۔ اسی طرح آپ کا نائب یعنی سلطان بھی عزم میں مستقل ہے۔ اگر عزم کا مدار کثرت رائے پر ہوتا تو اذا عزمت نہ فرماتے بلکہ اس کے بجائے اذا عزم اکثرکم فتوکلوا علی اللہ فرماتے۔ پس جس آیت سے یہ لوگ جمہوریت پر استدلال کرتے ہیں اس کا اخیر جزو خود ان کے دعوے کی تردید کر رہا ہے۔ مگر ان کی حالت یہ ہے حفظت شیئًا وغابت عنك اشیاء کہ ایک جزو کو دیکھتے ہیں اور دوسرے جزو سے آنکھیں بند کرلیتے ہیں۔ دوسرے اس آیت میں صرف حکام کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ رعایا سے مشورہ کرلیا کریں۔ رعایا کو تو یہ حق نہیں دیا گیا کہ تم از خود استحقاقاً حکام کو مشورہ دیا کرو۔ چاہے وہ مشورہ لیں یا نہ لیں۔ اہل مشورہ ان کو مشورہ سننے پر مجبور کرسکیں۔ چنانچہ شریعت میں اشیروا الحکام وھو حقکم علیھم کہیں نہیں کہا گیا جب رعایا کو از خود مشورہ دینے کا کوئی حق بدرجۂ لزوم نہیں تو پھر اسلام میں جمہوریت کہاں ہوئی۔ کیونکہ جمہوریت میں تو پارلیمنٹ کو از خود رائے دینے کا حق ہوتا ہے چاہے بادشاہ اس سے رائے لے یا نہ لے۔ یہاں تک کہ اگر بادشاہ پارلیمنٹ سے بغیر رائے لئے کوئی حکم نافذ کردے تو اس پر چاروں طرف سے لے دے ہوتی ہے کہ ہم سے بدون مشورہ لئے یہ حکم کیوں جاری کیا گیا بھلا رعایا کو یہ حکم اسلام میں کہاں دیا گیا ہے۔ ذرا کوئی صاحب ثابت تو کریں۔ پس یہ دعوے بالکل غلط ہے کہ اسلام میں جمہوریت کی تعلیم ہے اور جس

آیت سے یہ لوگ استدلال کرتے ہیں میں نے بتلا دیا کہ اُس سے استدلال نہیں ہوسکتا بلکہ اگر غور کریں تو اُسی آیت سے شخصی حکومت کا ثبوت ہورہا ہے اور اس آیت میں فتوکل علی اللہ جو حق تعالےٰ نے فرمایا ہے اس میں ایک عجیب حکمت ہے یہ بات اسی وقت ذہن میں آئی ہے وہ حکمت یہ ہے کہ بعض لوگوں کا جو خیال ہے کہ ایک شخص کی تنہا رائے کبھی صحیح نہیں ہوسکتی ضرور اس میں غلطی ہوگی۔ اس کا جواب فتوکل علی اللہ میں دیا گیا ہے سبحان اللہ حق تعالیٰ کو معلوم تھا کہ ایک زمانہ ایسا بھی آوے گا جس میں مادہ پرستی غالب ہوگی۔ اور بعض لوگوں کا یہ اعتقاد ہوگا کہ شخص واحد کی رائے ضرور غلطی کرے گی۔ اس لئے پہلے ہی سے اس کا بھی جواب دیدیا اور ایسا جواب دیا جس میں گفتگو کی مجال نہیں۔ اس خیال کا ایک جواب تو یہ تھا کہ یہ مشاہدہ کے خلاف ہے تم تجربہ کرکے دیکھ لو معلوم ہوجائے گا کہ بعض دفعہ ایک شخص کی رائے تمام دنیا کے خلاف صحیح ہوتی ہے۔ مگر اس سے گفتگو قطع نہیں ہوتی اور تو تو میں میں شروع ہوجاتی ہے چنانچہ آجکل یہ جواب دیکر دیکھ لو جو کبھی گفتگو قطع ہو۔ مخاطب کبھی اس کو اتفاق پر محمول کرے گا کبھی یہ کہے گا کہ واقع میں تو اکثر ہی کی رائے صحیح تھی۔ مگر بعض موانع کی وجہ سے ان کو کامیابی نہیں ہوئی اور شخص واحد کی رائے واقع میں غلط تھی۔ مگر اسباب خارجہ ایسے پیش آگئے جن کی وجہ سے اس کی رائے کامیاب ہوگئی۔ وعلیٰ ہذا۔ کچھ نہ کچھ توجیہیں نکال لی جائیں گی مگر حق تعالیٰ نے یہ جواب نہیں دیا۔ حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ جواب ایسا دیا کرتے ہیں جس سے مخاطب کی تسلی ہوجائے۔ قرآن میں مقدمات اور صغریٰ کبریٰ اور قیاسی اشکال سے جواب نہیں دیا گیا کیونکہ اس سے گفتگو قطع نہیں ہوتی۔ مخاطب مقدمات میں گفتگو کرنے لگتا ہے بلکہ قرآن میں جواب ایسی مختصر بات سے دیا جاتا ہے جو دل میں گھس جائے اور مخاطب کو گفتگو کی جگہ نہ ملے چنانچہ اس کا خیال کا دوسرا جواب وہ ہے جو فتوکل علے اللہ میں دیا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حاکم کا قلب مشورہ کے بعد جب ایک شق کی طرف مائل ہوجائے تو خدا پر بھروسہ کرکے عمل شروع کردے تمہارے ہاتھوں میں خزائن کامیابی نہیں ہیں بلکہ سب خزائن ہمارے ہاتھ میں ہیں

تم خدا پر بھروسہ کر کے عمل کرو حق تعالیٰ شخص واحد کی رائے کو بھی کامیاب کر سکتے ہیں بلکہ اگر وہ رائے غلط بھی ہوگی تب بھی توکل کی برکت سے صحیح ہو جائے گی۔ اور اگر عقل اس کو تسلیم نہ کرے تو تم عقل کے فتوے پر عمل نہ کرو۔ بلکہ ہمارے قانون پر عمل کرو ہمارا قانون یہ ہے کہ مشورہ کے بعد حاکم کی رائے جس طرف قائم ہو جائے اس کو اپنی رائے کے موافق عمل کرنا چاہیئے اور خدا پر نظر رکھنی چاہیئے۔ وہ ایک آدمی کی رائے کو بھی تمام عالم کی رائے پر غالب کر سکتے ہیں۔ عقل اگر یہ کہے کہ ایک کی رائے صحیح نہیں ہو سکتی تو اس کی بات پر التفات نہ کرو عقل بے چاری ہے کیا چیز۔ جو قانون خداوندی میں اس کے فتوے سے مزاحمت کی جاوے۔ عقل کی بس اتنی حقیقت ہے کہ اُسے خود اپنی حقیقت بھی معلوم نہیں۔ عقلاء میں اب تک اختلاف ہے کہ عقل جوہر مجرد ہے یا جوہر مادی ہے۔ اور یہ نفس ناطقہ کے علاوہ کوئی چیز ہے یا خود نفس ہی کا نام عقل ہے یہ عقل کا علم ہے پھر اس کو احکام خداوندی میں مزاحمت کا کیا حق ہے جو لوگ عقل کے بہت متبع ہیں وہ ہر وقت پریشان ہیں۔ ہر چیز کی لم دریافت کرنا چاہتے ہیں مگر بعض جگہ گاڑی اٹک جاتی ہے اور کوئی بات نہیں بنتی۔ اور جہاں کچھ اسباب و علل معلوم بھی ہو جاتے ہیں وہ بھی اٹکل اور تخمین سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ پرسوں آندھی آئی تھی میں کہہ رہا تھا کہ عقلاء کے نزدیک اس کے بھی کچھ اسباب ہیں تو یہ لوگ اُن اسباب میں تصرف کر کے ذرا اس کو روک تو دیں۔ آخر اور بہت سے اسباب میں یہ تصرف کے مدعی ہیں۔ آندھی کے اسباب میں بھی تو ذرا تصرف کر کے دکھلائیں دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو وہ اسباب اختیاری ہیں یا غیر اختیاری ہیں اور قابل تصرف نہیں ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ آندھی کا آنا اور اس کا رد کرنا کسی کے اختیار میں نہیں تو پھر خواہ مخواہ اسباب کا نام کیوں کرتے ہیں۔ موحد کی طرح صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ حق تعالیٰ کے حکم سے آندھی آتی ہے، اسی طرح زلزلہ آتا ہے۔ اس کے لئے بھی ان کے نزدیک کچھ اسباب ہیں۔ تو ذرا اُن اسباب میں تصرف کر کے زلزلہ کو روک تو دیں۔ زلزلہ کو تو کیا رد کرتے جن چیزوں کا ان کو تجربہ سے علم بھی ہو چکا ہے ان کی بھی

لِم معلوم نہیں۔ مثلاً زلزلہ سے کچھ پہلے مقناطیس کی خاصیت جذب زائل ہوجاتی ہے ذرا اس کی لِم مجھے کوئی بتلا دے کہ آخر زلزلہ میں اور مقناطیس کی قوت میں تعلق کیا ہے۔ زلزلہ سے اس کی قوت جذب کیوں زائل ہوجاتی ہے کوئی شخص اس کی لِم بیان نہیں کر سکتا۔ باقی اٹکل پچو بات گھڑ دینا تو ہر ایک کو آسان ہے لِم تو وہ ہے جس کو دل بھی قبول کرلے ورنہ گھڑ گھڑ کے بیان کردینا کیا مشکل ہے۔ مگر وہ ایسی لِم ہوگی جیسے بعض لوگوں نے چیتے کے بدن پر نشانات کی وجہ بتلائی ہے کہ وہ دھوپ میں سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھتا تھا۔ اس لئے جہاں دھوپ پڑی وہاں سے سفید ہوگیا جہاں سایہ پڑا وہاں سے سیاہ ہوگیا۔ واہیات بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ اس چیتے کے پاس کوئی پرکار تھی کہ ہر روز ایک ہی جگہ میں ٹھیک بیٹھتا تھا اور آہستہ آہستہ دھوپ سے سایہ میں اور سایہ سے دھوپ میں اس طرح ہٹتا تھا کہ بدن پر گول ہی نشانات پڑیں کوئی نشان مربع یا مستطیل یا مثلث و مکعب نہ ہو۔ کیا کسی کے دل کو یہ بات لگ سکتی ہے۔ چیتا کیا ہوا بڑا ماہر انجنیر ہوا مگر ان احمقانہ وجوہ پر یہ لوگ خوش ہیں۔ کہ ہم نے وجہ تو بیان کردی ہے چاہے وہ ایسی ہی وجہ ہو جیسے ایک شیخ نے جاٹ سے کہا تھا کہ جاٹ اے جاٹ تیرے سر پر کھاٹ۔ اس نے کہا شیخ رے شیخ تیرے سر پر کولھو۔ شیخ نے کہا واہ قافیہ تو ملا ہی نہیں۔ کہنے لگا قافیہ نہ سہی بوجھ میں تو مرے گا۔ ایسے ہی ان کی وجہ ہوتی ہے کہ چاہے جوڑ نہ ہو مگر وجہ ہونی چاہیئے۔ یہ ساری خرابی ہے طبیعت بے شعور کو فاعل ماننے کی کیونکہ یہ لوگ یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ نشانات طبیعت نے بلا واسطہ بنا دیئے ہیں کیونکہ طبیعت میں ارادہ اور شعور ہی نہیں وہ کس طرح افعال مختلفہ بناتی اس لئے اسباب کا واسطہ مانتے ہیں پھر اٹکل پچو اسباب گھڑ کر نکالتے ہیں اور موحد کو کسی جگہ اٹکاؤ نہیں۔ وہ بڑا بے فکر ہے جس بات کی اس سے وجہ پوچھو وہ کہتا ہے کہ خدا نے یوں ہی بنانا چاہا تھا بنا دیا۔ اور گو وہ واحد حقیقی ہے مگر ارادہ کے تعلق کی وجہ سے افعال میں اختلاف واقع ہوگیا اس لئے الواحد لا

یصدر عنہ الا الواحد کے بھی خلاف نہیں کیونکہ یہ حکم علت موجبہ میں ہے اور حق تعالےٰ ایجاب سے منزہ ہیں۔ اور طبیعت میں ارادہ اور شعور ہی نہیں وہ علت موجبہ ہی ہوگی اس لئے اس کی طرف ان افعال کی نسبت نہیں کر سکتے۔ ہائے کیسے غیر ذی شعور کو فاعل مانا۔ اور جس جگہ ان سے کوئی تاویل نہیں بنتی نہ الٹی نہ سیدھی نہ کوئی سبب ظاہری سمجھ میں آتا ہے تو وہاں بھی ظالم خدا کو فاعل نہیں مانتے بلکہ ان مواقع کے لئے بخت واتفاق کو گھڑ لیا ہے۔ مگر یہ محض نام ہی نام ہے۔ اِنْ هِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَا اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ۔ کوئی ان سے پوچھے بخت واتفاق ہے کیا بلا اس میں فاعلیت کی قوت کہاں سے آگئی اور یہ کیونکر سبب بن گیا۔ بس اس کا کچھ جواب نہیں یہ ہے عقل محض کے اتباع کا نتیجہ جس سے ایسی بے عقلی کی باتیں ماننا پڑتی ہیں۔ موحد کیسی چین میں ہے کہ اس کو ایسی دور از کار باتیں سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ سب کا فاعل خدا ہے۔ اس نے جس طرح پیدا کرنا چاہا پیدا کر دیا نہ اس کو طبیعت کی ضرورت ہے نہ بخت واتفاق کی اور جہاں ظاہر میں کچھ اسباب کا دخل معلوم بھی ہوتا ہے۔ وہاں وہ کہتا ہے۔

کہ اسباب موثر بالذات نہیں ہیں۔ بلکہ یا تو موثر باذن الخالق ہیں جیساکہ ایک قول ہے اور یا موثر ہی نہیں بلکہ محض علامات ہیں، جیسا ایک قول ہے۔ جیسے جھنڈی کا ہلنا ریل کے چلنے کی محض علامت ہے موثر بالذات حق تعالیٰ ہیں اگر وہ ارادہ نہ کریں تو سارے اسباب بے کار پڑے رہیں۔ جیسے ڈرایور گاڑی کو روکنا نہ چاہے تو ہزاروں سرخ جھنڈیاں بیکار ہو جاتی ہیں۔ بتلایئے یہ شخص چین میں ہے یا وہ شخص جو کبھی اسباب کو فاعل مانتا ہے۔ کبھی طبیعت کو۔ کبھی بخت واتفاق کو۔ موحد ان اسباب پرستوں کی پریشانی دیکھ کر یوں کہتا ہے ؎

اربا[1] واحدا ام الف رب	ادین اذا تقسمت الامور
ترکت[2] اللات والعزیٰ جمیعًا	کذلك یفعل الرجل البصیر

[1] و [2] کیا میں ایک رب کی عبادت کروں یا ہزاروں رب کی اس صورت میں تو

امورا نتظامیہ کی تقسیم بہت سے خداؤں میں ہو گی۔ میں نے ترک کیا
لات اور عزّیٰ (جو بتوں کے نام ہیں) سب کو اور عقل والے انسان
اسی طرح کرتے ہیں)

وہ ان سب لات و عزی پر لات مارتا ہے اور ایک خدا کو فاعل مانتا ہے اور اسباب پرستوں سے کہتا ہے کہ تم ایک خدا کو چھوڑ کر کہاں مارے مارے پھرتے ہو چھوڑو ان خرافات کو اور یہ مذہب اختیار کرو ؎

مصلحت دید من آں ست کہ یاراں ہمہ کار   بگذارند وخم طرۂ یارے گیرند

(میری تحقیق تو یہ ہے کہ ہمارے احباب سب کام چھوڑیں اور محبوب کے زلف کے خم کو پکڑلیں یعنی حق تعالےٰ سے رابطہ قائم کریں)

اور مولانا جامی فرماتے ہیں ؎

خلیل آسا در ملک یقین زن   نوائے لا احب الآفلین زن

(مثل حضرت ابراہیم علیہ السلام ملک یقین کا دروازہ کھٹکھٹاؤ اور میں کسی فانی سے محبت نہیں کرتا کا نعرہ لگاؤ)

کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ اسباب سب اس کے قبضہ میں ہیں ؎

خاک وباد وآب و آتش بندہ اند   بامن وتو مردہ با حق زندہ اند

(خاک وہوا پانی اور آگ سب اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں ہمارے سامنے تو مردہ ہیں مگر حق تعالےٰ کے ساتھ یہ زندہ ہیں)

واللہ مواحد سے بڑھ کر کوئی چین میں نہیں پھر مشرکین کے بعضے معبود ایسے ہیں کہ ان میں باہم رقابت ہے۔ وہ ایک کی عبادت دوسرے سے چھپا کر کرتے ہیں۔ کہیں وہ یہ معلوم کر کے کہ یہ دوسرے کے پاس بھی جاتا ہے ناخوش نہ ہو جائے۔ جیسے کوئی رنڈی دو آشنا کرے تو وہ ایک کے پاس دوسرے سے چھپ کر جاتی ہے اور موحد کو ایسا اطمینان ہوتا ہے جیسا بچہ کو ماں کی گود میں اطمینان ہوتا ہے۔ بچہ ماں کی گود میں جاکر بالکل بے فکر ہو جاتا ہے۔ کہ بس اب کسی کا خوف نہیں اور اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ

دوسرا پیار سے بھی بلائے تو اس سے بھاگتا ہے اور ماں اگر مارتی بھی ہے تو اس سے بھاگتا نہیں۔ بلکہ رو کر اسی کو چمٹ جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

مادرش گر سیلے بر روئے زند　　　ہم بما در آید ابر وئے تند

(اس کی ماں اگر طمانچہ لگائے تو وہ بچہ ماں ہی کے اوپر لپٹ جاتا ہے)

از کسے یاری نخواہد غیر او　　　اوست جملہ شراو و خیر او

(ماں کے علاوہ کسی سے یاری اور مدد نہیں چاہتا صرف ماں کو شر و خیر کا مالک سمجھتا ہے)

(دفتر چہارم ثلثۃ اربا ع)

افلاطون نے موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا تھا کہ اگر آسمان کمان ہو اور حوادث تیر ہوں اور خدا تعالیٰ تیر انداز ہوں تو اس سے بھاگ کر کہاں جائے۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیر انداز کے پاس جا کھڑا ہو کیونکہ تیر دور والے کے لگتا ہے پاس والے کے نہیں لگتا۔

افلاطون نے کہا کہ یہ جواب بجز نبی کے کوئی نہیں دے سکتا واقعی آپ نبی ہیں۔ مگر بایں ہمہ یہ حکما اتباع نہیں کرتے تھے۔ یہ کہتے تھے کہ نبی کی ضرورت ان لوگوں کو ہے جنھوں نے اپنے نفوس کی اصلاح نہیں کی۔ ونحن قوم ھذبنا انفسنا فلا حاجۃ لنا الی من یھذبنا۔ اور ہم اپنے نفسوں کو مہذب بنا چکے ہیں، ہمیں کسی مذہب بنانے والے کی ضرورت نہیں۔

مگر بخدا ان کا یہ خیال غلط تھا۔ بھلا عقلی تہذیب بھی کہیں نبی سے مستغنی کر سکتی ہے۔ ان لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کی تہذیب کو دیکھا ہی نہیں۔ ورنہ اقرار کر لیتے کہ اس کے سامنے ہماری تہذیب سراسر بد تہذیبی ہے۔ چنانچہ مجاہدات و ریاضات میں حکماء یونان کو کمال حاصل تھا اور اسی تہذیب کے وہ مدعی تھے مگر میں نے بیانات سابقہ میں ثابت کر دیا ہے۔ کہ مجاہدات کی جو صورت شریعت نے تجویز کی ہے اس کی حکماء یونان کو ہوا بھی نہیں لگی۔ جو طریقے اُن لوگوں نے ریاضت و مجاہدہ کے لئے تجویز کئے ان میں بیشمار غوائل و فتن ہیں اور منافع بہت کم۔

اور شریعت نے جو طریقے مجاہدات کے تجویز کئے ہیں وہ عوامل سے محفوظ اور منافع سے پر ہیں۔ ذرا کوئی ان کی نظیر تو دکھلائے۔ یہ کلام تو ان حکمار کی تہذیب میں تھا باقی آج کل جس چیز کا نام تہذیب رکھا جاتا ہے میں تو اس کو تعذیب کہا کرتا ہوں۔ یہ تو ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کو تہذیب کہا جائے اس سے تو حکمار یونان کی ہی تہذیب اچھی تھی۔ کیونکہ ان میں کسیقدر روحانیت بھی تھی، وہ لوگ خدا کے قائل تھے۔ توحید کے قائل تھے۔ گو توحید میں اتنا غلو کیا کہ خدا کو معطل کرکے عقول عشرہ کو فاعل اور قدیم مان لیا مگر پھر وہ لوگ آجکل کے حکماء سے اچھے تھے خدا کے وجود کے تو قائل تھے اور جہاں تک ان کی عقل نے کام دیا وہاں تک صفات کمال کو بھی حق تعالیٰ کے لئے ثابت کرتے تھے اور آجکل کے حکمار تو ایسے بدتہذیب ہیں کہ خدا کے بھی منکر ہیں۔ ان کی ایسی مثال ہے جیسے ایک چپراسی اپنے افسر سے تنخواہ لیتا ہو۔ مگر تنخواہ لینے کے بعد کہتا ہے کہ میرا کوئی افسر نہیں نہ مجھے کوئی تنخواہ دیتا ہے بلکہ زمین سے خود بخود روپیہ پیدا ہو جاتے ہیں اور ہوا سے اڑ کر میرے ہاتھ میں آجاتے ہیں۔ رسالہ حمیدیہ میں موحد اور دہری کی مثال ایک گفتگو کے پیرایہ میں خوب لکھی ہے کہ ایک موحد اور ایک دہری کسی جزیرہ میں گئے۔ وہاں ایک مکان نہایت خوبصورت مستحکم بنا ہوا دیکھا جس میں ایک طرف کھانے کا کمرہ ہے جو فرش فروش اور آئینوں سے سجا ہوا ہے۔ ایک طرف سونے کا کمرہ ہے جس میں عمدہ عمدہ مسہریاں بچھی ہوئی اور فرشی پنکھے لگے ہوئے ہیں ہر کمرہ میں ہوا کے لئے روشندان بنے ہوئے ہیں، ایک طرف باغ لگا ہوا ہے جس کے درخت نہایت قرینے سے لگائے گئے ہیں، ایک طرف حوض بنا ہوا ہے جس میں فوارہ سے ہر وقت پانی آتا ہے۔ موحد نے اس مکان کو دیکھ کر کہا کہ اس کا بنانے والا بڑا ہی صناع اور بہت ہی ماہر تھا جس نے نہایت عمدگی اور مضبوطی اور خوبصورتی کے ساتھ اس مکان کو تیار کیا۔ دہری نے کہا کہ اس کا بنانے والا کوئی نہیں بلکہ عرصہ دراز تک بارش ہونے سے زمین کی مٹی جم گئی پھر دھوپ سے پختہ اینٹیں بن گئیں۔

پھر ہوا سے اڑ اڑ کر وہ اینٹیں اس جگہ آکر جمع ہو گئیں۔ پھر ہوا چلی اور ان کو اوپر نیچے کر دیا اس طرح دیواریں بن گئیں، پھر پہاڑوں سے پتھر گرے اور ہوا نے ان کو اڑا کر یہاں کھڑا کر دیا اس کے ستون بن گئے، پھر درختوں کی لکڑیاں ہوا سے ٹوٹ گئیں وہ اڑ کر یہاں چھت کی صورت میں قائم ہو گئیں اسی طرح اس نے سارے مکان کو ہوا اور دھوپ سے تیار کر دیا۔ میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ بتلایئے ان میں گدھا کون ہے اور آدمی کون ہے۔ یقیناً وہ شخص بالکل گدھا ہے جو ایسے مکان کی نسبت یوں کہتا ہے کہ وہ خود بخود تیار ہو گیا۔ اسی طرح سمجھ لیجئے کہ جو لوگ آسمان و زمین کی اتنی بڑی عجیب و غریب اور عظیم الشان عمارت کو کسی صانع کی بنائی ہوئی نہیں مانتے بلکہ از خود تیار مانتے ہیں وہ بے وقوف ہیں یا نہیں۔ تو یونان کی حکمت اس حکمت سے پھر اچھی تھی۔ وہ لوگ خدا کے تو قائل تھے۔ اور اہلِ سائنس تو غضب کرتے ہیں کہ خدا کے بھی منکر ہیں اور سائنس والوں میں سے جو مسلمان خدا کے قائل بھی ہیں یہ ان کی محض وضعداری ہے۔ ورنہ ان کا خدا کو ماننا ایسا ہے۔ جیسے کوئی شخص کسی سے پوچھے کہ تو نے بادشاہ کو دیکھا ہے وہ کہے ہاں دیکھا ہے۔ اُس کے ایک سونڈ تھی اور ذرا سا سر تھا۔ اور آنکھیں نہیں تھیں۔ تو پہلا شخص یہ اوصاف سُن کر کہے گا کہ کمبخت تو نے بادشاہ کو نہیں دیکھا۔ نہ معلوم کس بلا کو دیکھ لیا ہے بادشاہ تو ایسا بدصورت نہیں ہے یہی حال ان سائنس داں مسلمانوں کا ہے جو خدا کے قائل ہیں مگر اس کے کمالات کے منکر ہیں جن میں سے ایک بڑا کمال یہ ہے یفعل مایشاء ویحکم مایرید مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ بس خدا نے عالم کو پیدا کر کے طبیعت اور مادہ کے سپرد سارا کام کر دیا ہے۔ اب جو ہوتا ہے وہ اسباب طبعیہ سے ہوتا ہے خدا تعالیٰ کے ارادہ کو کچھ دخل نہیں گویا خدا نے گھڑی میں کوک بھر دی ہے اب اس کے چلنے میں فنر اور بال کمانی کی طاقت کو دخل ہے خدا کو کچھ دخل نہیں۔ اسی لئے یہ لوگ ابراہیم علیہ السلام پر نار کے گلزار ہونے کا انکار کرتے ہیں کہ آگ بھلا کیونکر ٹھنڈی ہو گئی یہ قانون طبیعت کے خلاف ہے بھلا بنی اسرائیل پر پہاڑ کیونکر معلق ہو گیا۔ اور ایک ذرا سے پتھر میں سے

بارہ چشمے کیونکر بہنے لگے ۔ یہ تو قانون فطرت کے خلاف ہے ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کو قانون فطرت کے تابع بنا دیا۔ موحد کہتا ہے کہ نہ معلوم تم کس عاجز کو خدا سمجھتے ہو۔ خدا تو ایسا عاجز نہیں۔ اس کی تو شان یہ ہے کہ ایک پتہ بھی اس کے حکم وارادہ کے خلاف نہیں ہل سکتا اور اگر وہ چاہے تو تمام عناصر کی خاصیت کو دم بھر میں بدلدے ۔ پس ان اوصاف کے ساتھ یہ ان کا کہنا کہ ہم خدا کے قائل ہیں ویسا ہی ہے جیسا اس شخص نے کہا تھا کہ ہاں میں نے بادشاہ کو دیکھا ہے اس کے ایک سونڈ تھی اور آنکھیں ندارد تھیں ۔ مگر با ایں ہمہ ان کو کافر نہ کہیں گے کیونکہ ان کے اقوال سے خدا کا انکار صرف لازم آیا ہے التزام نہیں پا یا گیا ۔ اور لزوم کفر کفر نہیں ۔ التزام کفر کفر ہے ۔ اس لئے ہم ایسے مسلمانوں کو کافر نہیں کہتے پھر بھی یہ لوگ ہم پر اعتراض کرتے ہیں کہ مولوی مسلمانوں کو کافر بناتے ہیں ۔ میں اس کے جواب میں کہا کرتا ہوں کہ مولوی کافر بناتے نہیں بلکہ کافر بتاتے ہیں ۔ یعنی جو شخص اپنی حرکتوں سے کافر بن جاتا ہے مولوی اس کے کفر کو ظاہر کر دیتے ہیں جیسے کسی شخص کے کپڑے میں پاخانہ لگا ہوا ہو ۔ اور دوسرا شخص اس سے کہدے کہ آپ کے کپڑے میں پاخانہ لگ رہا ہے ۔ اس کو دھو لیجئے ۔ تو کہئے اس نے پاخانہ لگایا یا کہ پاخانہ لگا ہوا بتادیا پس آپ کا مولویوں پر جھلانا ایسا ہی ہے ۔ جیسا وہ شخص جس کے کپڑے میں پاخانہ لگ رہا ہے ۔ بتلانے والے کو دھمکانے لگے کہ واہ صاحب تم ہمارے لباس میں پاخانہ لگاتے ہو ۔ وہ کہے گا بیوقوف میں نے تو لگایا نہیں نہ میرے پاس پاخانہ موجود ہے جو میں لگاتا ۔ تو نے خود اپنی بے احتیاطی سے کہیں لگا لیا ہے ۔ میں نے تو تجھے اطلاع کی ہے ، کہئے ان دونوں میں کون حق پر ہے ۔

دیکھو کافر بنانا تو یہ ہے کہ کسی کو کفر کی تلقین کی جائے ۔ جیسے مسلمان بنانا یہ ہے کہ کسی کو اسلام کی تلقین کی جائے ۔ تو جس طرح ہم کافروں کو اسلام کی تلقین کر کے مسلمان بناتے ہیں کیا اسی طرح کسی مسلمان کو تلقین کفر کرتے ہوئے

آپ نے کسی مولوی کو دیکھا ہے۔ کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ مولوی کافر بناتے ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ وہ کافر بتاتے ہیں۔ ایک اور مزے کی بات سنئے۔ جب اہلِ سائنس نے خدا کا انکار کیا اور طبیعت کو فاعل مانا تو ان کو اس کی بھی فکر ہوئی کہ اسباب طبعیہ کے موافق انسان کی اصل دریافت کی جائے۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کا خدا کے ہاتھ سے پیدا ہوتا تو ان کو مسلم نہیں۔ یہ تو ان کی عقل سے بعید ہے۔ تو ڈارون کو یہ کہنا پڑا کہ انسان کی اصل بندر ہے۔ بندر ترقی کرکے انسان بن گیا۔ اس کا نام مسئلہ ارتقاء ہے اس بیچارہ کو اپنے مناسب تمام حیوانات میں بندر ہی نظر آیا۔ جب کوئی اس قول کی تردید کے درپے ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس قول کے انکار کی ضرورت نہیں اس کو اپنے نسب کا حال ہم سے زیادہ معلوم ہے اس لئے وہ اپنا نسب بیان کرتا ہے۔ وہ بندر ہی کی نسل سے ہوگا۔ اور ہم کو اپنے نسب کا حال اس سے زیادہ معلوم ہے کہ ہم آدم علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ تو تم اس کی بات کا کیوں انکار کرتے ہو وہ بیچارہ تو اپنا نسب بتلا رہا ہے، تمہارا نسب تھوڑا ہی بتلا رہا ہے اور جس دن وہ ہمارا نسب بتلائے گا ہم کہدیں گے۔ صاحب البیت ادری بما فیہ۔ کہ گھر والے کو اپنے گھر کی خبر دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے ہمارے نسب کی خبر تجھ کو ہم سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ ہمارے پاس شجرۂ نسب آدم علیہ السلام تک محفوظ ہے تجھے ہمارے نسب میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ ہاں تیرے پاس اپنا شجرۂ نسب محفوظ نہ ہوگا۔ تو تجھے اختیار ہے کہ جس سے چاہے اپنا نسب ملالے (مجہول النسب یہ نہ کرے تو اور کیا کرے ۱۲ جامع)

یہ ساری خرابی طبیعت کو فاعل ماننے سے لازم آئی۔ خدا کو مان لیتے تو اس جھگڑے میں نہ پھنستے۔ یہ تو اُن سائنس والوں کا حال تھا جو خدا کے منکر ہیں۔ اب اُن سائنس والوں کا حال سنئے جو برائے نام خدا کے قائل ہیں ان میں سے ایک صاحب علم کا قصہ ہے کہ جب انھوں نے دیکھا کہ قرآن میں آدم علیہ السلام کا قصہ ڈارون کی تحقیق کے مصادم ہے۔ تو وہ بولے کہ شاید وہ پہلا بندر

جس نے انسان کی طرف سب سے پہلے ترقی کی ہے (نعوذ باللہ) آدم علیہ السلام ہی ہوں۔ استغفر اللہ استغفر اللہ میرے تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔اس بات کی نقل سے بھی۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ یہ لوگ جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں اور خدا کا قائل بتلاتے ہیں یہ محض وضعداری ہے ورنہ حقیقت میں یہ خدا کے قائل نہیں۔ بھلا ڈارون کو تو اس قول پر اس بات نے مجبور کیا تھا کہ وہ خدا کو فاعل نہیں مانتا طبیعت کو فاعل مانتا ہے۔ اور طبیعت دفعۃً ترقی نہیں کرسکتی تدریجاً ترقی کرتی ہے کہ پہلے اجسام بسیط یعنی عناصر کی صورت اختیار کی۔ پھر اس سے ترقی کر کے جمادات مرکبہ کی صورت اختیار کی۔ پھر اس سے ترقی کر کے حیوانات کی صورت اختیار کی۔ پھر حیوانات میں سے کسی نے ترقی کر کے انسان کی صورت اختیار کر لی۔ مگر جو شخص خدا تعالےٰ کو فاعل مختار مانتا ہو اس کو اس قول کی طرف کس چیز نے مضطر کیا۔ اس کے نزدیک اس میں کیا استحالہ ہے کہ خدا تعالےٰ آدم علیہ السلام کے پتلہ کو مٹی اور پانی سے بنا کر دفعۃً اس کو انسان بنا دیں۔ اس ظالم کو ڈارون کی تقلید پر کس بات نے مجبور کیا کہ وہ خوامخواہ ایک نبی کی توہین پر آمادہ ہوتا ہے۔ پھر اس میں علاوہ توہین نبی کے یہ بھی خرابی ہے کہ یہ تاویل ڈارون کے قول پر بھی غلط ہے۔ کیونکہ ڈارون اس کا قائل نہیں کہ دنیا میں صرف ایک بندر ترقی کر کے انسان ہوا ہو جس کی نسل میں یہ سب انسان ہیں۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ جس وقت بندر کی طبیعت نے ترقی کی تو ایک خاص وقت میں ہر جگہ ہزاروں لاکھوں بندر آدمی بن گئے اور یہ سب ایک کی نسل سے نہیں تو اس شخص نے ڈارون کی تقلید میں قرآن کے اندر تحریف کی۔ اور وہ تحریف بھی ڈارون کے یہاں قبول نہ ہوئی تو ادھر سے بھی گئے ادھر سے بھی گئے ؎

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم ۔۔۔ نہ ادھر کے ہوئے نہ ادھر کے ہوئے

ہائے یہ لوگ ایک خدا کو چھوڑ کر کدھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ موحد کو ایک

خدا سے تعلق ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالےٰ سے بلاواسطہ علاقہ ہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال میں غلطی نہیں ہوسکتی۔ آپ کی شان یہ ہے ؎

گفتہ او بہ گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

(اس کا کہا ہوا اللہ تعالےٰ کا کلام ہے اگرچہ عبداللہ کے حلق سے وہ حروف نکلے ہیں یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حلق ہی سے قرآن نکلا مگر وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے)

اس لئے موحد کو اپنے علوم پر اطمینان ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو وہ علوم ہی اطمینان بخش ہیں موحد کہتا ہے کہ ہر چیز کا فاعل خدا ہے خدا نے آدم علیہ السلام کو دفعۃً مٹی سے پیدا کرکے دفعۃً انسان بنا دیا۔ اس کو کچھ ضرورت نہیں کہ اپنا نسب بندر یا سور سے ملائے تو خدا کو فاعل ماننے میں کیسی راحت ہے کہ سب جھگڑوں سے نجات ہوگئی۔ یہ تو علمی راحت ہے۔ اور دنیوی حسی راحت یہ ہے کہ حوادث و مصائب میں موحد مستقل و مطمئن رہتا ہے۔ وہ کہتا ہے قل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا ھو مولانا و علی اللہ فلیتوکل المومنون ؕ کہ ہم کو وہی پیش آئیگا جو خدا نے مقدر کردیا ہے۔ اس کے خلاف ہرگز کچھ پیش نہیں آسکتا اور حق تعالےٰ ہمارے آقا اور مولیٰ ہیں ان کی طرف سے جو کچھ بھی پیش آئیگا اس میں رحمت و حکمت ہی ہوگی اس لئے خدا ہی پر مسلمان کو بھروسہ کرنا چاہئیے بتلایئے جس کا یہ اعتقاد ہو وہ مصائب میں کب پریشان ہوسکتا ہے اور ملحد پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو اس کی پریشانی کی کوئی حد نہیں رہتی کیونکہ اس کو اسباب پر اعتماد تھا۔ اور اسباب اس کے مخالف ہوگئے تو اب اس کے پاس کوئی سہارا نہیں۔ اور موحد کو خدا پر اعتماد ہے اور خدا کو وہ اپنا مخالف نہیں سمجھتا بلکہ مولیٰ اور آقا سمجھتا ہے اُس کو اسباب کے مخالف ہوجانے پر بھی یہ امید ہے کہ شاید خدا تعالےٰ اسباب مخالفہ کو موافق بنا دیں اور اگر اسباب مخالف ہی رہے اور اس کو ناکامیابی بھی ہوجائے تب بھی وہ راضی ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی

طرف سے جو بات بھی آتی ہے اس میں خیر ہی ہوتی ہے پس اس صورت میں اگر دنیا کا ضرر ہوا۔ تو میری آخرت کی ترقی ہوگی قُلْ هَلْ تربّصون بنا الا احدی الحسنیین ط موحد کے لئے مصائب میں بھی فائدہ ہی ہے۔ اور وہ تکالیف سے بھی خوش ہوتاہے جیسے بچہ دودھ چھوٹنے کے وقت گو پریشان ہوتاہے اور اس وقت اس کو بہت تکلیف ہوتی ہے مگر بعد میں ماں کو دعار دیتاہے کہ ؎

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی　　مرا با جانِ جاں ہمراز کردی

(اللہ تعالیٰ تجھے جزائے خیر دیں کہ میری آنکھیں کھولدیں اور میری جان کو محبوب حقیقی سے آگاہ کردیا۔)

وہ کہتاہے خدا اس ماں کا بھلا کرے۔ جس نے دودھ چھڑا کر مجھے اس قابل کردیا کہ آج میں پلاؤ زردہ قورمہ اور کباب کھارہا ہوں اگر دودھ ہی پیتا رہتا تو یہ نفیس و لذیذ غذائیں کیونکر کھاتا۔ اسی طرح موحد کو مصیبت کے وقت گو ظاہر میں تکلیف ہوتی ہے مگر تکلیف کے بعد جب اپنی ترقی کا احساس ہوتاہے تو وہ خوش ہوکر یوں کہتاہے۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من　　دل فدائے یار دل رنجان من

(آپ کی طرف سے ناموافق بات بھی مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ میرا دل اس یار پر فدا ہے جو مجھ کو رنج دینے والا ہے)

اور موحد عارف کو تو عین مصیبت کے وقت اس کی حکمتیں اور اپنی ترقی محسوس ہوجاتی ہے اس لئے وہ تکلیف بھی لذیذ ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر مصیبت لوگوں کی نظر میں موت ہے۔ یہ منتہی المصائب ہے کہ وہ تمام مصائب کا انتہائی درجہ ہے اور اسی کے اندیشہ سے آدمی تمام مصائب سے گھبراتاہے مگر عارف موحد کے نزدیک یہ زہر کا پیالہ بھی شیریں ہے وہ کہتاہے ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم　　راحت جاں طلبم وزپئے جاناں بردم

(مبارک وہ دن ہوگا جس دن اس دنیا کے ویران سے رخصت ہوں گا اور

راحت جان طلب کروں گا اور اپنے محبوب کے پاس جاؤں گا)

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے تا درمیکدہ شادان وغزلخواں بروم

(میں نے نذر کیا ہے کہ جس دن اس محبوب حقیقی کا وصال مجھے عطا ہوگا تو میکدہ تک خوش خوش غزل پڑھتا ہوا جاؤں گا)

یعنی وہ تو موت کا مشتاق ہوتا ہے اور اس کے لئے نذریں مانتا ہے۔ شاید کوئی کہے کہ یہ سارا اشتیاق موت سے پہلے ہی ہوگا۔ مرتے وقت تو نانی یاد آئی ہوگی۔ صاحبو! نہیں نہ ان کو نانی یاد آئی نہ دادی یاد آئی۔ بلکہ وہی ایک یاد رہا۔ جس کے لئے موت کی تمنا کرتے تھے کون ایک، وہ ایک جس کے متعلق حضرت قلندر فرماتے ہیں ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن نہ دہم گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم

(اپنی آنکھ سے غیرت ہے مجھے کہ ان آنکھوں کو تجھے نہ دیکھنے دوں اور اپنے کان سے مجھے غیرت ہے کہ ان کو تیری بات نہ سننے دوں)

اور ؎

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد تا نہ بینم رخ تو روح رمیدن نہ دہم

(اور اگر ملک الموت میری جان لینے آوے گا تو میں جب تک آپ کا رخ نہ دیکھ لوں گا روح اپنی نہ نکلنے دوں گا)

اور ایک بزرگ مرتے وقت جب کہ لوگ رو رہے تھے۔ مگر وہ خوش ہوکر فرما رہے تھے ؎

چیست توحید آنکہ از غیر خدا فرد آئی در خلا و در ملا

(توحید کیا ہے یہ کہ تو غیر خدا سے تنہا رہے خواہ خلوت ہو یا جلوت ہو)

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم جسم بگذارم سراسر جاں شوم

(وقت وہ آگیا کہ میں عریاں ہوجاؤں یعنی جسم کو ترک کردوں اور صرف روح ہوجاؤں)

کہ اب تو مدت کے بعد وہ وقت آیا کہ میں جسم سے مجرد ہوکر سرتاپا روح ہوکر حق تعالیٰ

جناب میں پہونچوں گا اور اس قید خانۂ ناسوت سے نجات پاؤں گا تم روتے کس لئے ہو یہ تو خوشی کا وقت ہے۔ مگر یہ عدم توحش موت سے وہ محمود ہے جو حق کی محبت سے ناشی ہو ورنہ بعضے ایسے متہور بھی ہیں جو باوجود معاصی میں مبتلا ہونے کے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایسے بہادر ہیں ہم جیل خانہ سے نہیں ڈرتے ہم کو موت کا خوف نہیں سو چونکہ منشاء اس کا محض اتباع نفس اور دعوے ہے اس لئے کوئی کمال نہیں بلکہ جرأت مذمومہ ہے عارف کو موت کا اشتیاق ہوتا ہے مگر وہ ڈینگیں نہیں مارا کرتا۔ دعوے کرنا اور ڈینگیں مارنا اتباع نفس کی علامت ہے یہ کچھ کمال نہیں ایسے متہور تو کفار میں بھی ہوتے ہیں ان کو بھی جیل خانہ کا خوف نہیں ہوتا نہ موت کا اندیشہ مگر یہ سب حقیقت بینی سے پہلے ہی پہلے ہے۔ باقی جب موت کے فرشتے نظر آنے لگتے ہیں اُس وقت ساری بہادری خاک میں مل جاتی ہے۔ اگر یہ تہور بھی کچھ کمال ہے تو ایسے کافروں کو بھی صاحب کمال کہنا چاہیئے۔ جو کہ موت سے نہیں ڈرتے۔ پھانسی کے وقت بعض کفار نے جرأت ظاہر کی ہے مگر ظاہر ہے کہ کفر کے ساتھ کوئی دینی کمال جمع نہیں ہو سکتا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ یہ تہور دینی کمال نہیں۔ بس دینی کمال یہ ہے کہ جہاں خدا کہے وہاں خوشی سے جان دو۔ ورنہ اپنی جان کو آرام دو۔ خدا کی مرضی کے موافق جب آدمی جان دیتا ہے تو اس کو عین موت کے وقت بھی راحت نصیب ہوتی ہے جس کے آثار مخفی نہیں رہتے۔ اس وقت دیندار اور متہور میں فرق ظاہر ہو جاتا ہے (کما قال الشاعر) ؎

اذا اشتبکت الدموع علے خدود　　　تبین من بکی ممن تباکی

(جب آنسوؤں کی لڑیاں رخساروں پر بہتی ہیں اس وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سچ مچ رو رہا ہے اور کون رونے کے لئے منہ بنا رہا ہے ۱۲ جامع)

بہادری ہر موقعہ میں کمال نہیں اور جان دینا ہر وقت دین کا کام نہیں۔ بلکہ جس وقت خدا کا حکم ہو اس وقت جان دینا دین ہے۔ ورنہ اتباع نفس ہے۔ اگر کسی موقعہ میں خدا تعالےٰ جان دینے سے منع کر دیں اس وقت جان کی حفاظت

فرض ہے۔ دیکھو شریعت نے ایک وقت میں نماز کو حرام کیا ہے۔ اور پاخانہ میں جانا فرض کیا ہے۔ اس وقت نماز پڑھنے سے گناہ ہوگا اور پاخانہ میں جانے سے ثواب ہوگا اسے کہتے ہیں حکومت کہ بندہ کو اپنے حکم کا تابع بنایا ہے۔ جب چاہا طاعت کو حرام کردیا۔ اور نفس کی راحت دینے کو واجب کردیا شاید تم اس مسئلے کو نہ سمجھے ہو۔ مگر فقہاء نے صاف تصریح کی ہے کہ تقاضائے بول و براز کے وقت نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور پاخانہ پیشاب سے فراغت کرنا واجب ہے۔ اب جو عاشق ہیں وہ ہر وقت حکم کا اتباع کرتے ہیں خواہش نفس کا اتباع نہیں کرتے۔ ایک وقت ان کا جی چاہتا ہے کہ نماز پڑھیں مگر شریعت حکم دیتی ہے کہ پاخانہ جاؤ تو وہ حکم شریعت کو نفس کی خواہش پر مقدم کریں گے۔ گو اس میں اُن کی جماعت فوت ہو جائے اور لوگ ملامت کریں۔ مگر ان کو ملامت کی پروا نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر کسی وقت بہادری کا جوش ہو اور دین کے لئے جان دینے کا تقاضا ہو مگر شریعت اجازت نہ دے تو وہ اپنے تقاضے کو روک لیں گے اور حکم شریعت کا اتباع کرکے جان کی حفاظت کریں گے۔ گو اس میں ان پر چاروں طرف سے ملامت ہو کہ بڑا بزدل ہے جان دینے سے ڈرتا ہے جیل خانہ جانے سے گھبراتا ہے مگر وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے اور صاف کہتے ہیں ؎

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں ۔۔۔ مانمی خواہیم ننگ ونام را

(اگرچہ عاقلوں کے نزدیک بدنامی ہے لیکن ہم ننگ و نام نہیں چاہتے)

عشق کا خاصہ ہے کہ یہ سب سے پہلے ننگ و ناموس کو پھونکتا ہے۔ عاشق کو بدنامی اور رسوائی کی پروا کبھی نہیں ہوتی۔ رضائے محبوب کے سامنے۔ دیکھو اگر کوئی شخص ایک طوائف پر عاشق ہو اور وہ اس سے یہ کہے کہ میاں میں تم سے کچھ نہیں مانگتی بس یہ چاہتی ہوں کہ تم سب کپڑے اتار کر ایک لنگوٹی باندھکر بازار کے بیچ میں سے نکل جاؤ۔ تو اگر یہ عاشق ہے گو فاسق ہی ہو تو گذرے گا

کیوں ؟ اس لئے کہ عشق سے نخوت و ناموس خاک میں مل جاتی ہے۔ اسی لئے مولانا فرماتے ہیں ؎

شاد باش اے عشق و خوش سودائے ما اے طبیب جملہ علتہائے ما

(اے عشق تو خوش رہ اور اے سودا (جنوں و دیوانگی) تو خوش رہے تو تمام بیماریوں (علائق غیر اللہ) ہمارے کا طبیب ہے۔)

اے دوائے نخوت و ناموس ما اے تو افلاطون و جالینوس ما

(اے عشق تو ہماری نخوت و ناموس کی دوا ہے اور تو ہی ہمارے لئے افلاطون اور جالینوس ہے)

جب ایک چڑیل کے حکم کے سامنے عاشق کو اپنے عزت و ناموس کا خیال نہیں رہتا تو محبوب حقیقی کے عاشق کو اس کے احکام کے سامنے اپنی عزت و ناموس کا خیال اور مخلوق کی ملامت وطعن کا خوف کیونکر ہو سکتا ہے ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود گوئے گشتن بہر او اولےٰ بود

(عشق مولیٰ عشق لیلےٰ سے کم نہیں ہو سکتا محبوب حقیقی کے لئے گیند بن جانا اولیٰ ہے)

صاحبو! دنیا بھر کی گالیاں سننا آسان نہیں ہر وقت ملامت وطعن کا تحمل سہل نہیں مگر یہ عشق وہ چیز ہے کہ اس سے سب احکام سہل ہو جاتے ہیں اور کوئی کام مشکل نہیں معلوم ہوتا اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ نری عقل کافی نہیں عشق حاصل کرو۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ عقل بیکار محض ہے۔ عقل کا کام مبادی تک پہنچانا ہے۔ آگے عشق کی ضرورت ہے وہاں عقل کا دخل نہیں پس عقل کا کام اتنا ہے جتنا مشاطہ کا کام ہوتا ہے کہ وہ دولہا دلہن میں وصال کراتی ہے۔ اور دلہن کو بنا سنوار کر تیار کر دیتی ہے مگر وصال کے بعد الگ ہو جاتی ہے۔ اب اگر جھانکے تو جوتے کھائے گی۔ اسی طرح وصال کی ابتدائی مرحلہ تک عقل ساتھ رہتی ہی ہے۔ مگر جب وصال شروع ہو گیا تو اس کے بعد عقل بیکار ہے۔ اب عشق

ہی تنہا رہ جاتا ہے اب عقل کو کچھ دخل نہیں رہتا اور اس کو اسرار الٰہیہ میں گفتگو کرنے کا کچھ حق نہیں رہتا بلکہ اُس پر ہاں یہ حق ہے کہ اپنے کو تابع بنا دے۔ جب عقل تابع ہوگی عشق کی تو لازم ہے کہ اہل حق اتباع کریں اہل عشق کا۔ بلکہ اہل عشق کی شان بعض اوقات یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ ان کی غلطیاں بھی منقلب ہو جاتی ہیں صواب سے اور اسی کی طرف اشارہ ہے حدیث شریف میں اللھم ادر الحق معہ (اے مع علیؓ) حیث دار۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کے لئے دعاء فرماتے ہیں کہ اے اللہ حق کو علی کے ساتھ گھماتے رہیئے۔ جدھر وہ گھومیں۔ بظاہر یہ دعا اس طرح ہونی چاہیئے تھی اللھم ادرہ مع الحق حیث دار (یعنے اے اللہ علی کو حق کے ساتھ گھماتے رہیئے جدھر حق گھومے۔ مگر نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی کہ حق کو علی کے ساتھ گھماتے رہیئے۔ یعنی جس طرح علی حق کے تابع ہیں اسی طرح حق کو علی کا تابع کر دیجئے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ پر تنبیہہ فرمائی ہے کہ بعض لوگ ایسے مجبوب ہوتے ہیں کہ محبوبیت کے مقام میں امر حق ان کا تابع ہو جاتا ہے۔ کہ اگر وہ اجتہاد سے کسی غلط شوق کو بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ تو حق تعالیٰ اسی کو حق بنا دیتے ہیں۔ جیسے ایک بزرگ کسی پر اجتہاد سے ناراض ہوں اور واقع میں وہ ناراضی بے جا ہو تو غیب سے سامان ایسا ہو جاتا ہے کہ اسی مجلس ناراضی میں اس شخص سے کوئی حرکت ایسی صادر ہو جاتی ہے جس سے وہ ناراضی صحیح ہو جاتی ہے۔ یا کسی شیخ نے مرید کے اندر مرض کبر وعجب تشخیص کیا اور واقع میں یہ مرض اس کے اندر نہ تھا۔ اب اگر مرید نے شیخ کے قول کو بیچون وچرا تسلیم کر لیا۔ تب تو خیر وہ اس مرض سے محفوظ رہتا ہے کیونکہ شیخ کا بھی اس تشخیص سے مقصود یہی تھا کہ اس میں یہ مرض نہ رہے اور اگر اس نے شیخ کی تشخیص کو رد کیا اور اعتراض کیا تو حق تعالیٰ سامان ایسے پیدا کر دیتے ہیں جس سے اس میں وہ مرض پیدا ہو کہ شیخ کی تشخیص صحیح ہو جاتی ہے۔ تو ایسا شخص کیونکہ قابل اتباع نہ رہے گا۔ یہ تقریر بہت طویل ہو گئی۔ اصل میں میں یہ کہہ رہا تھا کہ احکام شرعیہ میں ہر اک کی رائے معتبر نہیں اس پر یہ مضمون

چل پڑا تھا کہ آزادی مطلق سے کبھی انتظام نہیں ہو سکتا نہ دنیا کا نہ دین کا بلکہ تابعیت ومتبوعیت ہی سے ہمیشہ انتظام درست ہوا ہے اس لئے دین میں بھی بعض کو تابع اور بعض کو متبوع ہونا چاہیئے ہر ایک کی رائے کو دخل نہ ہونا چاہیئے۔
اس پر جمہوریت وشخصیت کی بحث درمیان میں آگئی کیونکہ جمہوریت والے آزادی کے مدعی ہیں میں لے بتلا دیا کہ وہ بھی اسس دعوئے آزادی سے کسی نہ کسی وقت ہٹتے ہیں اور یہ ساری گفتگو اس پر شروع ہوئی تھی۔ کہ میں نے کہا تھا کہ فقہا وصوفیہ نے اس قاعدہ کا ہمیشہ لحاظ کیا ہے کہ جو مباح مفضی الی المعصیۃ ہو اس سے بھی منع کر دیتے ہیں اس پر میں نے بطور تنبیہ کے یہ کہا تھا کہ اس قاعدہ سے ہر شخص کو کام لینے کا حق نہیں کہ بس لگے مباحات کو حرام کرنے بلکہ یہ خاص خاص محققین کا منصب ہے۔ بہر حال مجاہدات حکمیہ میں جن چیزوں سے روکا جاتا ہے گو وہ فی نفسہ مباح ہیں مگر افضا الی المعصیت کی وجہ سے صوفیہ نے ان کے ترک کی تاکید کی ہے اور اس مجاہدہ حکمیہ کی چار قسمیں ہیں جن میں سے تین کا ذکر تو ہو چکا۔ اب ایک قسم کا ذکر رہ گیا جو کہ قلت اختلاط مع الانام ہے۔ آج اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے۔ یہ تو میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ قلت کلام کی ضرورت فی نفسہ اسس قلت اختلاط سے زیادہ ہے مگر قلت کلام عادۃ موقوف ہے قلت اختلاط پر کیونکہ لوگوں سے میل جول کرکے زبان کو سنبھالنا دشوار ہے اس لئے قلت کلام کی سہل صورت یہی ہے کہ مخلوق سے الگ رہے۔ گوشہ نشینی اختیار کرے کیونکہ مجمع کا قرب بھی اختلاط کی مثل ہے۔ مجمع کے قرب سے بھی سکوت نہیں ہو سکتا اس لئے صوفیہ نے عزلت کو اختیار کیا ہے اور اس کی بہت تاکید کی ہے۔ البتہ سلف کے کلام کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلف میں مجاہدات کا یہ طرز نہ تھا جو متاخرین میں ہے گو اصل سب کی موجود ہے۔ مگر ہیئت مختلف ہے۔ اسی وجہ سے سلف کے کلام میں عزلت اور گوشہ نشینی کی تاکید بہت کم نظر آتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلف میں عزلت کا وہ اہتمام نہ تھا جو متاخرین میں ہے بلکہ وہ اختلاط زیادہ کرتے تھے اسی وجہ سے ان کے کلام میں منافع

اختلاط کا زیادہ ذکر ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ اختلاط میں ایک نفع تو یہ ہے کہ تعلیم و تعلم اسی پر موقوف ہے۔ عزلت سے تعلیم و تعلم کا باب مسدود ہو جائے گا دوسرے اختلاط میں خدمت خلق کا موقع ملتا ہے جو شخص سب سے منعزل ہوگا۔ وہ خدمت خلق کی فضیلت سے محروم رہے گا۔ تیسرے جماعت کی فضیلت اختلاط ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔ جو شخص عزلت گزیں ہوگا وہ جماعت کے ثواب سے محروم رہے گا۔ چوتھا نفع اختلاط میں یہ ہے کہ اس سے تواضع پیدا ہوتی ہے جب آدمی مخلوق سے ملے گا تو بہت لوگوں کو اپنے سے افضل پائے گا تو اس شخص کی نظر اپنے اعمال پر کم ہوگی کیونکہ اپنے سے افضل کے اعمال کو دیکھ کر سمجھے گا کہ میں کرتا ہی کیا ہوں اللہ کے بعض بندے مجھ سے زیادہ عمل کرنے والے ہیں اور عزلت میں دوسروں کے اعمال تو پیش نظر ہوتے نہیں۔ بس اپنے ہی اعمال پر نظر ہوتی ہے تو اس سے بعض دفعہ عجب و کبر پیدا ہو جاتا ہے۔ پانچواں نفع یہ ہے کہ اختلاط میں بزرگان دین سے فیض حاصل ہو جاتا ہے بدون اختلاط کے بزرگوں سے فیض حاصل کرنا دشوار ہے اس کے سوا اور بھی منافع اختلاط میں انھوں نے بتلائے ہیں۔ اب جو لوگ محقق نہیں ہیں وہ سلف کے کلام میں اختلاط کے یہ منافع دیکھ کر ایک غلطی میں مبتلا ہو گئے وہ مطلقاً اختلاط کو عزلت پر ترجیح دینے لگے اور عزلت کی مذمت کرنے لگے۔ پھر حالت یہ ہوئی کہ یہ لوگ مخلوق سے اختلاط تو حظ نفس کے لئے کرتے ہیں اور تمسک بزرگوں کے اقوال سے کرتے ہیں۔ یہ نہ دیکھا کہ جس اختلاط کے یہ فضائل سلف نے بیان کئے ہیں وہ کونسا اختلاط ہے کیا یہ وہ اختلاط ہے جس میں تم مبتلا ہو جس سے حظ نفس کے سوا کچھ مقصود نہیں۔ نہ غیبت سے احتراز ہے نہ کذب و زور سے نہ لایعنی باتوں سے پرہیز ہے نہ فضول بک بک سے اس حالت میں بزرگوں کے اقوال و افعال سے ان کا تمسک کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص طبیب کو سنکھیا کے منافع بیان کرتے ہوئے دیکھ کر خود سنکھیا کھانے لگا نتیجہ یہ ہوا کہ میاں کھاتے ہی مر گئے۔ یا کسی

مریض نے طبیب کو ایک قوی غذا کھاتے ہوئے دیکھا۔ مریض اس کو دیکھ کر خود بھی کھانے لگے۔ انجام یہ ہوا کہ میاں مرنے کے قریب ہو گئے۔ کیونکہ طبیب نے جو سنکھیا کے منافع بیان کئے تھے اس میں کچھ شرائط و قیود بھی تھیں کہ بدرقہ کے ساتھ استعمال کیا جائے پہلے اس کو مدبر کیا جائے۔ اس شخص کو ان قیود کی تو خبر نہ تھی لگا ویسے ہی استعمال کرنے تو اب بجز ہلاکت کے کیا نتیجہ ہوگا یا طبیب کو جو قوی غذا کھاتے ہوئے دیکھا تھا اس کے لئے معدہ کا تندرست ہونا شرط تھا اور مریض کا معدہ تندرست نہ تھا اس نے اپنے کو طبیب پر قیاس کر کے وہ چیز کھالی ظاہر ہے کہ اس کو ضرر ہوگا اسی طرح جس اختلاط کے منافع بزرگوں نے بیان کئے ہیں ان کے لئے غوائل نفس سے مامون ہونا شرط ہے۔ اور تمہارے اندر یہ شرط مفقود ہے پس تم کو اس باب میں ان کے اقوال سے تمسک کرنے کا حق نہیں کسی نے خوب کہا ہے ؎

تو صاحب نفسی اے غافل میاں خاک وخوں میخور
کہ صاحب دل اگر زہرے خورد آں انگبیں باشد

(تو صاحب نفس ہے اے غافل میاں خاک وخوں شراب پیتا رہ تو کیا جانے
کہ اہل دل اگر زہر بھی کھالیں تو وہ شکر ان کے اندر بن جاتا ہے)

اسی لئے نیم ملا خطرہ ایمان ہوتا ہے جیسے عالمگیر کے دربار میں ایک عورت کا مقدمہ پیش ہوا جس نے چار نکاح کر رکھے تھے اور ایک خاوند کو دوسرے کی اطلاع نہ تھی۔ ظالم نے ہر ایک سے یہ شرط کر رکھی ہو گی کہ میں سال میں تین مہینہ تمہارے گھر رہوں گی اور نو مہینہ اپنے گھر رہوں گی۔ تین مہینے کے بعد وہ دوسرے خاوند کے پاس رہتی اس سے بھی غالباً یہی شرط تھی پھر تین مہینہ کے بعد تیسرے خاوند کے پاس رہتی ان میں ہر اک یہ سمجھتا تھا کہ شرط کے موافق نو مہینے اپنے گھر رہنے گئی ہے یہ خبر کسی کو نہ تھی۔ کہ یہ اس مدت میں اپنے دوسرے آشناؤں کے پاس جاتی ہے۔ دہلی بڑا شہر ہے وہاں ایسے واقعات کا مخفی رہ جانا کچھ دشوار

نہیں مگر کب تک۔ آخر کو بھانڈا پھوٹا۔ اور عالمگیر کے دربار میں یہ واقعہ پیش ہوا۔ عالمگیر کا زمانہ ایسا نہ تھا جیسا آجکل کا زمانہ ہے کہ رضامندی کے ساتھ زنا پر کوئی مواخذہ ہی نہیں غیر غیر مسلم ایسا قانون مقرر کریں تو کچھ زیادہ تعجب نہیں افسوس یہ ہے کہ آجکل بعض مسلمانوں کی بھی یہی رائے ہے۔ چنانچہ رڑکی میں چند مسلمانوں کا ایک مجمع ہوا تھا۔ جس میں یہ رائے پیش ہو رہی تھی کہ نکاح کی کیا ضرورت ہے، خوامخواہ کی قید ہے۔ بس جس کو جو عورت پسند آئے اُس کو اپنے پاس رضامندی سے رکھ لے۔ جب دوسری پسند آئے پہلی کو الگ کر کے دوسری کو رکھ لے اسی طرح اپنی خواہش کو پورا کر لینا چاہیئے جس میں طرفین کو کو آزادی ہے کوئی کسی کا پابند نہیں نہ کسی قسم کی قید ہے۔ آج کل مسلمانوں میں بھی یہ رائے رکھنے والے موجود ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مگر عالمگیر اس خیال کے مسلمان نہ تھے۔ وہ نہایت پابند شریعت تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ سلطنت کا زوال عالمگیر سے ہوا کہ تمام راجاؤں کو اپنا مخالف بنالیا رعایا کو بددل کر دیا مگر میں کہتا ہوں کہ سلطنت کا زوال عالمگیر سے نہیں ہوا بلکہ اکبر نے اس کو زائل کیا ہے۔ اُس نے غیر قوموں کو سلطنت میں دخیل کار بنا کر ان کے ہاتھوں میں سلطنت کی باگ دیدی تھی۔ اگر غیر قوموں کا یہی اقتدار باقی رہتا تو ایک نہ ایک دن سلطنت پر ضرور زوال آتا۔ عالمگیر نے اس کی اصلاح کرنی چاہی تھی اور غیر قوموں کے اقتدار کو کم کرنا چاہا تھا اگر سب مسلمان اس میں ان کا ساتھ دیتے تو سلطنت کی بنیاد مستحکم ہو جاتی مگر افسوس مسلمانوں ہی نے اس میں مخالفت کی اور عالمگیر کا ساتھ نہ دیا۔ اس لئے ہندوؤں کی بغاوت کو ترقی ہوگئی۔ تو بتلایئے اس میں عالمگیر کی کیا خطا ہے قصور اُس شخص کا ہے جس نے سلطنت میں غیروں کو دخل دیا۔ دیکھئے اگر کوئی شخص کسی کو سوئی کھلا دے اور وہ پیٹ میں جا کر زخم ڈال دے اور ایک ڈاکٹر سوئی نکالنے کے لئے اس کا آپریشن کرے اور آپریشن کر کے پیٹ میں ٹانکے لگا دے۔ مگر اس شخص کی انگڑائی لینے سے ٹانکے ٹوٹ جائیں جس کے صدمے سے وہ ہلاک ہو جائے

تو آپ کیا کہیں گے کیا یہ کہیں گے کہ ڈاکٹر نے اس کو ہلاک کیا یا یہ کہیں گے کہ سوئی کھلانے والے نے ہلاک کیا یقیناً ہر عاقل سوئی کھلانے والے کو قاتل کہے گا ڈاکٹر کی خطا کوئی نہ بتلائے گا اس بیچارہ نے تو صحت کی تدبیر کی تھی۔ اگر وہ آپریشن نہ کرتا جب بھی سوئی کے پیٹ میں ہونے سے وہ ضرور ہلاک ہوتا۔ اور اپریشن کے بعد ٹانکے نہ ٹوٹتے تو ساری عمر کے لئے صحت ہو چکی تھی۔ اس نے تو احسان کیا تھا مگر اس کی انگڑائی سے نقصان ہو گیا۔ یہی حال اکبر و عالمگیر کا ہے۔ اکبر نے سلطنت کے پیٹ میں ایک سوئی چبھا دی تھی جس سے ناسور پڑ گیا تھا عالمگیر نے شریعت کی طب پڑھی تھی اس نے شریعت کے موافق اپریشن کر کے ناسور صاف کیا پھر ٹانکے لگا دیئے مگر مسلمانوں کی مخالفت نے ٹانکو کو توڑ دیا۔ اس لئے سلطنت پر زوال آیا اگر سب متفق ہو کر عالمگیر کا ساتھ دیتے تو زوال کی کوئی وجہ نہ تھی۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ بہر حال مقدمہ پیش ہوا۔ اور وہ عورت طلب کی گئی۔ ایک طالب علم نے اس عورت سے کچھ رقم لینا کی۔ اور رہائی کی تدبیر بتلائی کہ تو یہ کہہ دینا کہ میں نے ایک مولوی صاحب کو وعظ میں یہ کہتے سُنا تھا کہ لوگ فضول حرامکاری کرتے ہیں۔ خدا تعالےٰ نے تو چار نکاح تک کی اجازت دی ہے۔ اور اگر یہ دریافت کیا جائے کہ مولوی صاحب نے یہ اجازت مردوں کے لئے بیان کی تھی یا عورتوں کے لئے۔ تو کہہ دینا کہ بس میں نے تو اتنا ہی سُنا تھا۔ کہ پھر میں ساگ لینے چلی گئی۔ میں نے تو اس اجازت کو عام ہی سمجھا تھا تو جیسے یہ طالب علم نیم ملّا خطرہ ایمان تھا کہ اس نے چار نکاحوں کی اجازت کو کو عام کر دیا ایسے ہی وہ لوگ بھی نیم ملّا ہیں جو اختلاط کے منافع کو عام کرتے ہیں اور بزرگوں کے اقوال میں منافع اختلاط کا ذکر دیکھ کر اپنے نفسانی اختلاط کو اس میں داخل کرتے ہیں حالانکہ اختلاط زہر ہے اور سنکھیا کھانے کا طبیب ہی کو حق ہے کیونکہ اس کے پاس تریاق بھی ہے۔ تم کو یہ حق نہیں۔ تم اپنے کو اس پر قیاس نہ کرو۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

لقمہ و نکتہ است کامل را حلال | تو نئی کامل مخور می باش لال

(لقمہ و نکتہ کامل کو حلال ہے تو کامل نہیں ہے تو مت کھا خاموش ہو جا)

یعنی بعض غذائیں ایسی ہیں جو کامل کے لئے حلال ہیں۔ تمہارے واسطے حلال نہیں تم ان کو نہ کھاؤ۔ ایک جگہ دونوں میں فرق بتلاتے ہیں ؎

این خرد گردد پلیدی زو غذا | واں خورد گردد ہمہ نور خدا

(اہل نفس کی اس غذا سے عقل پلید ہو جاتی ہے اور کامل جو کھاتا ہے اس کے اندر نور خدا بنتا ہے)

تم کھاؤ گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ساری غذا گندگی بن جائے گی۔ اور کامل کھاتا ہے تو رب کا سب نور بن جاتا ہے۔ مجھے اس شعر پر شبہ ہوا تھا کہ اس کا کیا مطلب ہے کیا بزرگوں کو پاخانہ نہیں ہوتا۔ جیسے ہمارے یہاں لوگ ایک بزرگ کو حضرت حضرت کہتے تھے۔ تو ایک بڑھیا ہمارے گھر میں آکر کہنے لگی کہ اے بہو لوگ فلانے کو حضرت حضرت کہتے ہیں۔ میں یوں پوچھوں کہ حضرت کہیں ہگا بھی کریں ہیں۔ تو اس بڑھیا کے نزدیک حضرت بننے کے لئے یہ بھی شرط تھی کہ وہ ہگا نہ کریں تو مجھے حیرت تھی کہ کیا اس شعر کا بھی وہی مطلب ہے جو اس بڑھیا کا اعتقاد تھا۔ پھر ہم حضرت حاجی صاحب کے پاس سبق پڑھنے کے لئے گئے تو حضرت نے فرمایا ؎

این خورد گردد پلیدی زو جدا | یعنی اخلاق رذیلہ پیدا شوند

(یعنی اہل نفس جو کھاتا ہے اس سے اخلاق رذیلہ پیدا ہوتے ہیں)

واں خورد گردد ہمہ نور خدا | یعنی اخلاق حمیدہ ہویدا گردند

(اور اہل دل کامل جب کھاتا ہے تو اس کی غذا سے نور بننے کا مفہوم یہ ہے کہ اس سے اخلاق حمیدہ ظاہر ہوتے ہیں)

اب معلوم ہوا کہ یہ مطلب نہیں کہ بزرگوں کو پاخانہ نہیں ہوتا بلکہ مطلب یہ ہے کہ ناقص ایک غذا کو کھاتا ہے تو اس میں اخلاق رذیلہ پیدا ہوتے ہیں اور کامل

اسی کو کھاتا ہے۔ تو اس میں اخلاق حمیدہ ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ فرق ہے تمہارے کھانے میں اور بزرگوں کے کھانے میں۔ اسی طرح مجھے مثنوی کے ایک اور شعر پر اشکال ہوا تھا مولانا نے اول ایک تمثیل کے ضمن میں مسئلہ وحدۃ الوجود کی طرف اشارہ فرمایا ہے، چنانچہ کہتے ہیں ؎

ماہمہ شیراں ولے شیر علم　　حملہ شاں از باد باشد دمبدم

کہ ہم بھی ظاہر میں شیر معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ہم ایسے شیر ہیں جیسے جھنڈے پر شیر کی تصویر بنی ہوتی ہے کہ جب ہوا سے جھنڈا ہلتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا شیر حملہ کر رہا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں ؎

حملہ شاں پیدا و ناپیدا ست باد　　آنکہ ناپیدا ست ہرگز کم مباد

یعنی شیر علم کا حملہ تو ظاہر ہوتا ہے اور ہوا مخفی ہوتی ہے اور حقیقت میں اس حملہ کا ظہور اُسی سے ہو رہا ہے۔ اسی طرح ہم لوگ ظاہر میں فاعل مختار معلوم ہوتے ہیں مگر ہم کو جو حرکت دے رہا ہے وہ مخفی ہے یعنی حق تعالیٰ تو ناپیدا سے مراد یہاں حق تعالیٰ ہیں اب آگے فرماتے ہیں کہ وہ جو ناپیدا ہے خدا کرے وہ کم نہ ہو تو میں یہ سمجھا کہ اس میں ظاہراً تو خدا تعالیٰ کو دعا دینا لازم آتا ہے۔ کہ ان کے کمالات میں کمی نہ آوے۔ تو مجھے حیرت تھی کہ خدا تعالیٰ کو یہ دعا کیسی یہ تو ویسی ہی دعا ہوئی جیسے کانپور میں جاہل عورتیں حق تعالیٰ کی سلامتی گایا کرتی ہیں۔ بعضی خاص رات ہوتی ہے جس میں رت جگا کرتی ہیں اس میں یہ فقرہ خدا تعالیٰ کی سلامتی منایا کرتا ہے۔ مگر چونکہ وہ محبت میں یہ مضمون گاتی ہیں اس لئے شاید مواخذہ بھی نہ ہو۔ جیسے کانپور میں مجھ سے ایک پورب کے رہنے والے صاحب نے ایک عجیب حکایت بیان کی تھی ایک جاہل سنی کہیں غالی شیعہ کی مجلس میں پھنس گیا وہاں ظالموں نے ایک نقل بنا رکھی تھی۔ بہت سے پتلے تیار کئے تھے جس میں کسی کا نام امام حسین تھا، کسی کا نام امام حسن تھا کسی کا نام حضرت علی تھا۔ ایک پتلہ کا نام حضرت فاطمہ تھا۔ ایک پتلہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب تھا اور ایک سب سے بڑا پتلہ

تھا نعوذ باللہ وہ خدا کا پتلہ تھا۔ پہلے امام حسین کا پتلہ لایا گیا اور صدر مجلس جو کہ مجتہد بنا ہوا تھا۔ اس سے پوچھا کہ ان کے واسطے کیا حکم ہے۔ اس نے کہا کہ سارا فساد انہی کا ہے۔ انھوں نے خوامخواہ یزید سے بغاوت کی اور اس کی فوج سے مقابلہ کیا اور سارے خاندان اہلبیت کو تباہ و برباد کیا اگر تقیہ کر لیتے تو کچھ بھی نہ ہوتا لہٰذا ان کی گردن ماردو۔ پھر امام حسن کا پتلہ آیا۔ کہ ان کے واسطے کیا حکم ہے۔ کہا یہی تو بانی فساد ہیں۔ انھوں نے اپنے کو خلاقت سے معزول کر کے (حضرت) معاویہ کو خلافت سونپ دی جبھی تو یزید کو سلطنت ملی اور اُسے خاندان نبوت کے برباد کرنے کا موقع ملا۔ اگر یہ اپنے کو خلافت سے معزول نہ کرتے تو یزید کو یہ موقع کیوں ملتا لہٰذا ان کی بھی گردن ماردو۔ پھر حضرت علیؓ کا پتلہ آیا کہ ان کے واسطے کیا حکم ہے۔ کہا ارے سارا بیج فساد کا انہی کا بویا ہوا ہے۔ انھوں نے (حضرت) ابوبکر و عمر کا ساتھ دیا۔ اور ان کے زمانہ میں خلافت بلافصل کا دعوے نہ کیا جس سے خلافت دوسروں کے ہاتھ میں پہونچ گئی تو انھوں نے امیر معاویہ کو شام کا حاکم بنا دیا جس کی بدولت حضرت علی سے مقابلہ کی ان کو ہمت ہوئی۔ اگر یہ اول ہی سے خلافت بلافصل کا دعوے کرتے تو غیروں کو یہ حوصلہ نہ ہوتا کہ وہ اہل بیت کے مقابلہ میں سر اٹھائیں لہٰذا ان کی بھی گردن ماردو۔ پھر حضرت فاطمہ کا پتلا لایا گیا کہ ان کے واسطے کیا حکم ہے۔ کہا یہ اپنے ابّاجان سے دعا کرا کے سب کچھ کرا سکتیں تھیں۔ ان کو معلوم تھا کہ حسین شہید ہوں گے پھر بھی انھوں نے دشمنوں کے واسطے بد دعا نہ کرائی یہ بھی قصوروار ہیں ان کی بھی گردن ماردو۔ پھر نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پتلہ آیا کہ ان کے واسطے کیا حکم ہے۔ کہا یہی تو سب سے بڑے قصوروار ہیں (نعوذ باللہ) یہ تو خدا تعالیٰ سے کہہ کر سب کچھ کرا سکتے تھے مگر باوجود شہادت حسین کے علم کے انھوں نے کچھ نہ کیا لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پتلے کے واسطے بھی وہی حکم ہوا جو اوروں کے واسطے ہوا تھا۔ سنّی بے چارہ یہ خرافات دیکھ کر دل میں

پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ حیران تھا کہ یہ کیا قصہ ہے۔ سب کے بعد وہ لمبا پتلا لایا گیا جو نعوذ باللہ خدا کا پتلہ تھا۔ پوچھا ان کے واسطے کیا حکم ہے۔ مجتہد نے کہا ارے یہ تو سب کچھ کر سکتے تھے۔ سارے عالم کے خدا تھے ان کے قبضہ میں تو سب کچھ تھا مگر انھوں نے قصداً امام حسین کو شہید کرایا اور یزید کا ساتھ دیا۔ پھر اس کے لئے بھی وہی حکم ہوا جو اوروں کے واسطے ہوا تھا جب اس پتلہ کی گردن مارنے کو چلے تو سنی سے نہ رہا گیا وہ غریب سمجھا کہ سچ مچ یہی خدا ہے اسے فکر ہوئی کہ جب اللہ میاں نہ رہے تو پھر بارش کون دے گا۔ روزی کون دے گا۔ اولاد کون دے گا بس جوش محبت میں اٹھ کر وہ پتلہ شیعہ کے ہاتھ سے چھین یہ جا وہ جا۔ شیعہ لاٹھیاں لیکر اس کے پیچھے دوڑے کہ ہماری مجلس میں یہ غیر کون آگیا۔ مگر وہ کسی کے ہاتھ نہ آیا قریب ہی سنیوں کی بستی تھی انھوں نے جو شور سُنا باہر نکل آئے اور دیکھا کہ ایک سنی کو مارنے کو شیعہ آرہے ہیں لوگوں نے سنی کو بچا لیا۔ شیعہ بھی سنیوں کی جمعیت دیکھ کر لوٹ گئے۔ اب لوگوں نے اس پردیسی کو تسلی دی کہ تم مطمئن رہو خدا کا شکر ہے کہ اس نے تم کو ان موذیوں سے بچا لیا تو وہ کہتا ہے کہ واہ میں نے ہی خدا کو بچا لیا وہ مجھے کیا بچاتے۔ میں نہ ہوتا تو شیعہ ان کو بھی مار ڈالتے۔ لوگوں نے کہا توبہ کر توبہ کر کمبخت کیا کہتا ہے تو خدا کو کیا بچاتا اور انھیں کون مار سکتا ہے اس نے کہا کہ یہ پتلہ جو میں لیکر بھاگا ہوں یہی تو خدا ہے میں نے اسے بچا لیا شیعہ اس کو مارے ڈالتے تھے۔ لوگوں نے سمجھایا کہ یہ کیا ہے شیعہ کی شرارت تھی یہ سب پتلے اُن کے بنائے ہوئے اور گھڑے ہوئے تھے بھلا خدا کا بھی کہیں پتلا ہو سکتا ہے اُسے تو کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا چہ جائیکہ وہ ان کے ہاتھوں میں آجائے تب اس کی تسلّی ہوئی اور سمجھا کہ یہ جھوٹ موٹ کی نقل تھی اور یہ پتلہ خدا نہیں ہے تو اس بیچارہ نے تو محبت ہی میں یہ فعل کیا تھا گو جاہل تھا شاید اس پر مواخذہ نہ ہو۔ اور محبت کی وجہ سے بخشدیا جاوے۔ ایسے ہی کانپور میں محبت کی وجہ سے خدا کی سلامتی گائی جاتی ہے شاید

اس پر بھی مواخذہ نہ ہو مگر مولانا پر حیرت تھی کہ عالم ہو کر خدا کو دعا کیسی دی جاتی ہے اس کے بعد شیخ محقق کی خدمت میں چلے جب یہ شعر پڑھا۔

"آنچہ ناپیداست یارب کم مباد" (جو کچھ کہ ظاہر نہیں یا رب کم نہ ہو)

حاجی صاحب نے فرمایا اے از دل ما۔ بس جان ہی تو پڑ گئی شعر میں۔ اب معلوم ہوا کہ یہ خدا کو دعا نہیں دی بلکہ اپنے واسطے دعا کی ہے کہ وہ جو ناپیدا ہے خدا کرے وہ ہمارے دل سے کم نہ ہو۔ یعنی اس کی یاد ہمارے دل سے کم نہ ہو واقعی محقق کی ضرورت قدم قدم پر ہے اسی طرح مجھے مثنوی کے ایک اور شعر کی تفسیر میں تحیر تھا۔ مصداق متعین نہ ہوتا تھا۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

نکتہا چوں تیغ پولاد ست تیز ؛ چوں نداری تو سپر واپس گریز

(سلوک کے باریک نکات مثل تیز تلوار کے ہیں جب تک فہم سلیم کی سپر نہ رکھو واپس بھاگو قریب مت ہو)

پیش ایں الماس بے اسپر میا ؛ کز بریدن تیغ را نبود حیا

(اس تلوار کے سامنے بدون سپر مت آؤ کیونکہ تلوار کو کاٹنے میں شرم نہیں آتی)

میں سوچتا تھا کہ سلوک میں باریک نکات کا ہونا تو مسلم مگر سپر کیا چیز ہے۔ حاجی صاحب نے فرمایا کہ سپر سے مراد فہم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان باریک نکات کے لئے فہم صحیح کی ضرورت ہے اگر فہم سلیم حاصل ہے تو حقیقت کو سمجھ جاؤ گے اور اگر فہم نہیں تو پھر بے سمجھے بوجھے بزرگوں کی تقلید کرو گے کہ جو کام دوسروں کو کرتے دیکھا خود بھی کرنے لگے پھر اس تقلید کا وہ انجام ہوگا جو بندر کی تقلید کا انجام ہوا تھا کہ ایک بندر کسی حجام کا استرہ لے کر بھاگ گیا تھا۔ حجام بڑا پریشان ہوا کہ اس سے کس طرح چھینوں۔ اس نے یہ عقلمندی کی کہ دوسرا استرا نکال کر آہستہ آہستہ اپنی ناک پر پھیرا۔ بندر کو اتنی عقل کہاں جو اس فعل کی حقیقت سمجھتا اس نے بھی تقلید کی اور استرہ کو زور سے اپنی ناک پر پھرایا۔ جس سے ناک کٹ گئی پھر تو بڑا

گھبرایا اور استرہ کو وہیں ڈال کر چلاّتا ہوا بھاگا۔ حجام نے اپنا استرہ اٹھالیا۔ تو بدون عقل کے تقلید کا یہ انجام ہوتا ہے اس لئے بزرگوں کے افعال کی تقلید کے لئے عقل کی بہت ضرورت ہے۔ شاید اس پر یہ شبہ ہو کہ اس سے تو تقلید کی مذمت ظاہر ہوتی ہے۔ تو بات یہ ہے کہ اس سے اس تقلید کی مذمت معلوم ہوئی جو عمل یں تقلید ہو بلا دریافت اُس کی بناء صحیح کے جیسے ایک صوفی سفر میں کسی خانقاہ میں ٹھہرا ان لوگوں پر کئی وقت کا فاقہ تھا۔ انھوں نے رات میں خادم کو غافل پاکر صوفی کا گدھا کھول کر بازار میں بیچ دیا اور خوب کھایا پیا اور صوفی کی بھی دعوت کی اور کھانے کے بعد قوالی ہوئی اور قوال سے فرمائش کر دی کہ یہ شعر پڑھو ؎

خر برفت و خر برفت و خر برفت ‌‌ خر برفت و خر برفت و خر برفت

(گدھا گیا گدھا گیا گدھا گیا)

اور چونکہ سب کھانا پینا اسی خر برفت کی بدولت تھا اسی خوشی میں صوفیوں پر حال بھی طاری ہو گیا اور سب یہی کہنے لگے۔

خر برفت و خر برفت و خر برفت

گدھے کا مالک بھی یہی کہہ رہا تھا۔ صبح کو جو دیکھا تو گدھا ندارد۔ خادم سے پوچھا اس نے کہا وہ تو رات سے غائب ہے۔ اور میں نے حضور کو اطلاع کرنا چاہی تھی مگر آپ خود ہی کہہ رہے تھے۔

خر برفت و خر برفت و خر برفت

میں سمجھا کہ آپ کو کشف سے اطلاع ہو چکی ہے اس لئے خاموش واپس آگیا کہنے لگا کمبخت مجھ کو کیا خبر تھی۔ میں تو اوروں کی تقلید میں کہہ رہا تھا۔ پس ایسی تقلید کو مولانا فرماتے ہیں ؎

خلق را تقلید شاں برباد داد ‌‌ کہ دو صد لعنت بریں تقلید باد

(مخلوق خدا کو ان جاہلوں کی تقلید نے تباہ کر دیا ایسی تقلید پر دو سو لعنتیں ہوں)

اس سے بعض غیر مقلدین نے تقلید کی مذمت پر استدلال کیا ہے۔ میں نے کہا کہ مولانا

نے مطلق تقلید پر لعنت کہاں کی ہے بلکہ وہ تو خاص قسم کی تقلید پر لعنت فرماتے ہیں یعنی خربرفت جیسی تقلید پر جس میں ایک فعل کی تقلید تھی بدون دریافت حال کے چنانچہ یہ نہیں فرمایا کہ لعنت برتقلید باد۔ بلکہ یہ فرمایا ہے کہ لعنت بریں تقلید باد۔ اور ہم جو بزرگوں کی تقلید کرتے ہیں۔ تو وہ ایسی تقلید نہیں ہے بلکہ بنا صحیح کی تحقیق کے بعد ہے۔اس لئے وہ اس شعر کا مصداق نہیں۔ الغرض بعض لوگوں نے اختلاط تو اختیار کر رکھا ہے حظ نفس کے لئے اور بزرگوں کے اقوال کو سند بنالیا ہے یہ ان کی غلطی ہے۔ بہرحال اسی تفاوت حالت کے سبب سلف کا اصل مذاق اختلاط ہے اور متاخرین نے عزلت کو ترجیح دی ہے اور اس کے منافع کثیرہ بیان فرماتے ہیں جن میں ایک نفع یہ ہے کہ عزلت میں گناہوں سے اجتناب ہوتا ہے بشرطیکہ ایسی عزلت نہ ہو کہ تنہائی میں رہ کر روشندان سے عورتوں کو گھورا کرے۔ بلکہ ایسی عزلت ہو جس میں نگاہ کی بھی حفاظت کرے۔ کان کی بھی حفاظت کرے دل کی بھی حفاظت کرے کہ قصداً کسی غیر کا خیال دل میں نہ لائے۔ اگر آجائے تو ذکر میں مشغول ہو کر اُسے دفع کردے۔ ایسی عزلت میں واقعی گناہوں سے بہت حفاظت ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ دفع مضرت مقدم ہے جلب منفعت پر تو عزلت اختلاط پر مقدم ہے۔ کیونکہ اختلاط میں گو منافع بہت ہیں مگر ساتھ ہی یہ مضرت بھی ہے کہ اس میں اکثر گناہ ہو جاتے ہیں۔ شیخ سعدی اس پر ایک حکایت فرماتے ہیں ؎

بزرگے دیدم اندر کوہسارے ؛ نشستہ از جہاں در کنج غارے

(ایک بزرگ کو پہاڑ میں دیکھا کہ تنہائی میں دنیا سے دور ہو کر بیٹھے ہیں)

چرا گفتم بشہر اندر نیائی ؛ کہ بارے بندے از دل برکشائی

(میں نے تو پوچھا کہ شہر کیوں نہیں آتے کہ دل کی گرہ ایک ایک بار تو کھول دے)

بگفت آنجا پریرویاں نغز اند ؛ چو گل بسیار شد پیلاں بلغزند

(فرمایا شہر میں حسین چہرے گاتے پھرتے ہیں اور جب کیچڑ زیادہ ہو جاتی ہے تو ہاتھی بھی پھسل جاتا ہے)

تو اس بزرگ نے اختلاط کی بھی مضرت بتلائی کہ اس میں نامحرم پر نگاہ پڑ جاتی ہے جس سے بعض دفعہ سنبھلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اسی لئے بعضے بزرگ منہ پر چادر لپیٹ کر سر جھکا کر چلتے ہیں کسی طرف نہیں دیکھتے بلکہ زمین پر نگاہ رکھتے ہیں۔ لوگوں نے اور اس کی وجہ میں بعض نے فرمایا ہے کہ شیطان نے ہر طرف سے انسان کے پاس آسکتا ہے۔ مگر نیچے اور اوپر سے نہیں آسکتا اور اوپر نگاہ رکھنا ہر وقت دشوار ہے اس لئے میں نگاہ نیچی رکھتا ہوں۔ قرآن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے قرآن میں **شیطان کے قول کی حکایت کی گئی ہے۔**

لآتینهم من بین ایدیهم ومن خلفهم وعن ایمانهم وعن شمائلهم

شیطان نے حق تعالیٰ سے کہا کہ میں بنی آدم کے پاس سامنے سے آؤں گا اور پیچھے سے اور دائیں سے اور بائیں سے اس میں صرف چار جہت کا ذکر ہے۔ فوق و تحت مذکور نہیں معلوم ہوا کہ فوق و تحت سے شیطان نہیں آسکتا (مگر فوق سے مراد وہ ہے جو کہ بالکل تحت کے مقابل ہو۔ جس میں جہت قدام کا شائبہ بھی نہ ہو۔ تو یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ اوپر نگاہ کرنے سے تو اکثر نامحرموں پر نظر پڑ جاتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ اگر نگاہ بالکل اوپر ہو تو نظر صرف آسمان پر پڑے گی اور وہاں کوئی نامحرم نہیں۔ ہاں نگاہ اونچی کرکے جب سامنے بھی نظر کو دوڑایا جاوے گا تب البتہ شیطان کو موقع ملے گا خوب سمجھ لو ۱۲ جامع)

بہرحال بزرگوں نے زمین پر نگاہ رکھنے کی تائید کی ہے۔ ہاں اگر اس سے امتیازی شان پیدا ہونے لگے۔ تو ہمارے مشائخ کا طرز یہ ہے کہ وہ امتیاز سے بچتے ہیں ایسی ہیئت سے نگاہ نیچی نہیں کرتے کہ گردن بھی جھک جائے بلکہ معمول کے موافق چلتے ہیں اور نگاہ نیچی رکھتے ہیں۔ نگاہ کے جھکانے کے لئے گردن جھکانے کی کیا ضرورت ہے۔ پس امتیازی شان نہ بنانا چاہیئے اسی لئے ہمارے بزرگ نہ عبا پہنتے ہیں نہ چوغہ نہ صدری کہ اس سے آدمی خواہ مخواہ دوسروں سے ممتاز معلوم ہوتا ہے۔ صدری میں آجکل ہماری جماعت میں اختلاف ہے

بعضے اس کی ضرورت سمجھتے ہیں، اور میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک یہ زائد چیز ہے۔ ہمارے مدرسہ میں ایک کیرانہ کا لڑکا صدری پہنتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کی کیا ضرورت ہے، اُس نے یہ ضرورت بتلائی کہ کرتا پھٹ رہا ہے اس سے کمر نظر آتی ہے۔ میں نے کہا پھر تم صدری کو کرتہ کے نیچے پہنو یہ ضرورت پوری ہو جائے گی کرتہ کے اوپر پہننا تو محض زینت کے لئے ہے یہ تو ایک امتیازی شان ہو گئی ہے۔ ہم نے اپنے اکابر کو صدری پہننے کا عادی نہیں دیکھا یہ رواج عموم ولز،ؤم کے ساتھ آجکل ہی نکلا ہے اور اس کو بھی لوگوں نے علماء کا خاص ایک امتیازی شعار بنا لیا ہے۔ جس سے ہمارے اکابر بچتے تھے۔ چنانچہ اگر کسی وقت عزلت سے بھی ہونے لگے تو ہمارے اکابر عزلت بھی اختیار نہ کرتے تھے۔ بلکہ اختلاط کے ساتھ زبان کی حفاظت کرتے تھے۔ مگر یہ کام صدیقین کا ہے کہ اختلاط کے ساتھ بھی کوئی بات خلاف شرع نہ کرے۔ بحمد اللہ ہمارے اکابر نے ایسا بھی کرکے دکھلا دیا ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اکثر اوقات لوگوں میں بیٹھے رہا کرتے تھے۔ تنہائی کے خاص اوقات تھے زیادہ وقت مولانا کا مجلس ہی میں گذرتا تھا مگر باوجود اختلاط کے باتیں بہت کم کرتے تھے مجلس میں بیٹھے ہوئے اکثر درود شریف پڑھتے رہتے تھے مگر جب باتیں کرتے تھے تو دریا بہتا تھا۔ پھر خاموش ہو جاتے تھے۔ بعض لوگوں کو یہ خاموشی ناگوار تھی مولانا کی شکایت کرتے تھے کہ بڑے روکھے ہیں ہم گھنٹوں بیٹھے رہے دو چار بات کے سوا کوئی بات ہی نہیں کی۔ میں نے دل میں

ےہ قلت ولکن فی لبسہ فوق القمیص من سہولۃ النزع وقت الحر وغیرہ مالیس فی لبسہ تحتہ ولذا لم یختلفوا فی الصدری المحشوا بالقطن واجازوا لبسہ فوق القمیص لاجل تلک العلۃ بعینہا وبالجملۃ ففی کونہ داخلا فی مالایعنی نظر نعم الخلاف فی قبحہ اذا لبسہ لمحض لزینۃ بدون الحاجۃ واللہ اعلم ۱۲ جامع وکذا اذا خیف علی المبتدی وقوعہ من الحاجۃ الی الزینۃ منعہ الشیخ سدا للباب مادام ہذا الخوف وہذا علی رای الشیخ ۱۲ اشرف علی۔

کہا تم بڑے سوکھے ہو جو مولانا کو روکھا بتلاتے ہو یا بہت تر ہو کہ ڈوبنے کے قابل ہو. بس تمہارے نزدیک بڑا سخی اور با اخلاق وہ ہے جو اپنا قیمتی وقت ضائع کرتا رہے۔ افسوس اگر سفید چمڑے والے وقت کا انضباط کریں تو اس میں تو حکمت ہے انتظام ہے اور مولوی وقت کا انضباط کریں تو بد خلقی ہے، روکھا پن ہے آخر دونوں میں فرق کیا ہے بس یہی فرق ہے نا کہ وہ امیر ہیں اور مولوی غریب ہیں۔ امیروں کی ہر بات اچھی معلوم ہوتی ہے گو بری ہی کیوں نہ ہو۔ اور غریبوں کی اچھی بات بھی بری معلوم ہوتی ہے۔ جیسے ایک غریب نے کہا تھا کہ آجکل غریبوں کی ایسی ذلت ہے کہ امیر گوز مارے تو کہتے ہیں مبارک ہو صحت ہوئی، سلامتی ہوئی۔ اور غریب گوز مارے تو کہتے ہیں بڑا بد تہذیب ہے۔ دماغ سڑا دیا واقعی بات تو یہی ہے۔

اس پر اگر کوئی یوں کہے کہ صاحب انگریز تو ہم سے مستغنی ہیں وہ اگر اپنے وقت کا انضباط کریں تو ان کو حق ہے مگر مولویوں کو کیا حق ہے کہ یہ ہم سے اینٹھیں اور بات بھی نہ کریں یہ تو چندہ کے لئے ہمارے گھروں پر آتے رہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ لعنت ہے ایسے چندہ پر جس کی وجہ سے لوگ علماء سے یہ توقع رکھیں کہ وہ ان کی آواز پر حاضر ہو جایا کریں۔ جو لوگ اس غرض سے چندہ دیتے ہیں مہربانی کر کے وہ اپنے چندہ کو اپنے گھر رکھیں، علماء اپنے واسطے چندہ نہیں کرتے بلکہ دینی کاموں کے واسطے کرتے ہیں اور دین سب مسلمانوں کا ہے تنہا مولویوں کا نہیں ہے پس علماء کا تم پر یہ احسان ہے کہ وہ تمہارا مال دین کے کام میں لگا دیتے ہیں تمہارا ان پر کیا احسان ہے۔ تمہارا احسان جب ہوتا جب تم ان کی ذات خاص کے واسطے چندہ دیتے۔ مگر جب تم خدا کے واسطے اور دین کے کاموں کے واسطے دیتے ہو تو یہ تو اپنے کام کے واسطے دینا ہوا تو اس دینے کا مولویوں پر کیا احسان ہے اور اس کی وجہ سے تم کو کیا حق ہے کہ مولویوں سے اپنی تعظیم و تکریم کی امید رکھو اور یہ کہ وہ تمہاری خاطر سے اپنا قیمتی وقت ضائع کیا کریں۔ اور یہ ساری خرابی اس کی ہے کہ علماء آجکل چندہ دینے والوں کا لمبے چوڑے القاب میں شکریہ ادا کرتے ہیں

مجھے تو یہ طرز بہت ناگوار ہے۔ آخر علماء پر انھوں نے کیا احسان کیا ہے جس کا وہ شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہاں دعاء دینے کا مضائقہ نہیں۔ یہ تو نص سے ثابت ہے۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ط وفی الحدیث انہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللھم صلے علی ال ابی اوفی اھ پس جب کوئی چندہ دیا کرے اس کے حق میں اس طرح دعا کرنے کا مضائقہ نہیں کہ حق تعالیٰ آپ کے چندہ کو قبول فرمائے اس کا اجر دے، آپ کو دین و دنیا میں ترقی دے۔ اعمال صالحہ کی توفیق بڑھائے وغیر ذلک۔ لیکن شکریہ ادا کرنے کے کیا معنے۔ اس کا تو مطلب یہ ہے کہ چندہ دینے والوں نے مولویوں پر کچھ احسان کیا ہے تو کیا یہ چندہ تمہارے گھر کے خرچ کے لئے دیا ہے یا تمہارا ارادہ اس کو اپنے خرچ میں لانے کا ہے جب یہ نہیں تو آپ پر کیا احسان اگر احسان کیا ہے تو دینے والے نے اپنی ذات پر احسان کیا ہے۔ کہ ثواب کے لئے خدا کے کام میں اپنا مال خرچ کرتا ہے۔ اس صورت میں تو چندہ دینے والوں کو علماء کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ وہ ان کا روپیہ اچھے مصرف میں لگا رہے ہیں۔ الٹا تم کیوں شکریہ ادا کرتے ہو ۱۲ جامع) اس سے لوگوں کے دماغ خراب ہو گئے ہیں اور وہ علماء کے اس شکریہ سے (جس کا منشا ان کی تواضع ہے ۱۲) یہ سمجھ گئے کہ سچ مچ ہم نے کچھ ان پر احسان کیا ہے۔ پس اب وہ اس کے منتظر رہنے لگے کہ علماء ہماری تعظیم و تکریم بھی کریں ہمارے لئے اپنے گھنٹے بھی ضائع کیا کریں۔ حالانکہ حقیقت میں ان کو اس کا کچھ حق نہیں کیونکہ میں بتلا چکا کہ اس چندہ سے وہ علماء پر کچھ بھی احسان نہیں کرتے۔ انصاف سے بتلاؤ اگر کسی وقت گورنمنٹ اپنی کسی ضرورت کے لئے رعایا سے چندہ طلب کرے اور تحصیلدار وغیرہ کو چندہ وصول کرنے کے لئے مامور کرے تو کیا اس وقت بھی آپ یہ سمجھیں گے کہ تحصیلدار صاحب پر ہم نے احسان کیا ہے اس لئے ان کو ہماری خاطر مدارات اور تعظیم و تکریم کرنی چاہیئے۔ ہرگز نہیں بلکہ وہاں تو آپ چندہ بھی دیں گے اور تحصیلدار صاحب کو

نذرانہ بھی دیں گے۔ اور اگر وہ نذرانہ قبول کرلیں تو ان کا احسان سمجھیں گے اس کا کبھی وسوسہ بھی نہ آئے گا کہ تحصیل دار پر ہم نے کچھ احسان کیا ہے پھر علماء کو چندہ دیکر آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ ان پر احسان ہوا بس یہی تو فرق ہے کہ حکام دنیا کی قلوب میں وقعت ہے اور دین کی وقعت نہیں اگر کسی درجہ میں آپ کی یہ بات معقول بھی ہو تب بھی آپ کو سب علماء سے یہ امید رکھنے کا حق نہیں کہ وہ آپ کی تعظیم و تکریم کریں۔ اور تمہارے لئے اپنا وقت ضائع کریں۔ اگر کچھ حق ہے تو ان علماء پر ہے جو تم سے چندہ مانگتے ہیں۔ اور جو چندہ نہیں مانگتے ان سے یہ امید رکھنے کا آپ کو کیا حق ہے اور اگر وہ انضباط اوقات کریں تو ان کی شکایت کیوں کی جاتی ہے۔ یہاں سے ان لوگوں کی حماقت ظاہر ہوگئی جو مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی کم گوئی پر اعتراض کرتے تھے۔ آخر مولانا ان کی وجہ سے اپنا وقت ضائع کیوں کرتے وہ کب اور کس دن ان سے چندہ مانگنے آئے تھے۔ ایک تحصیلدار صاحب مجھ سے کہتے تھے کہ میں مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے گیا تھا۔ اس وقت چارپائی پر لیٹے ہوئے جاگ رہے تھے مگر مجھے دیکھ کر آنکھیں بند کرلیں منہ پھیر لیا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئے، بہت ہی روکھے تھے۔ میں نے دل میں کہا کہ وہ تمہارے باپ کے نوکر تھے کہ جس وقت تم جاؤ اسی وقت اٹھ کر بیٹھ جائیں اور تم سے باتیں بنانے لگیں، یہ تمہاری حماقت تھی کہ سونے کے وقت ملنے گئے بھلا یہ وقت ملنے کا تھا تم کو چاہیئے تھا کہ حجرہ سے باہر بیٹھتے جب مولانا نماز کے لئے باہر آتے اور نماز سے فارغ ہو کر جلسہ عام میں بیٹھتے اس وقت ملتے پھر دیکھتے کہ مولانا روکھے ہیں یا تم سوکھے ہو۔

ایک صاحب نے مجھ سے ایک حاکم انگریز کی حکایت بیان کی کہ اس نے کسی دوسرے حاکم سے چارج لینے کے لئے دس بجے کا وقت مقرر کیا تھا۔ چنانچہ دس بجے کے قریب یہ انگریز کچہری میں پہونچا مگر قریب پہونچکر اس انگریز نے گھڑی دیکھی

تو دس بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے تو وہ کچہری کے اندر نہیں گیا۔ بلکہ پانچ منٹ تک کچہری کے باہر ٹہلتا رہا جب گھڑی میں پورے دس بج گئے اس وقت اس نے اندر قدم رکھا اور دوسرے حاکم سے چارج لیا۔ یہ حکایت بیان کرکے وہ بہت مدح کر رہے تھے کہ یہ لوگ اوقات کے بہت ہی پابند ہیں۔ وہ مدح کر رہے تھے اور میں حیرت کر تا تھا۔ کہ اگر کوئی مولوی ایسا کرے تو اس کی شکایت بیان کی جاتی ہے کہ ہم وقت سے پانچ منٹ پہلے پہونچے تھے تو ہم سے بات نہ کی۔ اور یہ شکایت محض اس لئے کی جاتی ہے کہ مولوی ان سے چندہ لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ معترض صاحب چندہ میں مولویوں سے زیادہ مبتلا ہیں ہر لکچر میں چندہ کی مانگ ہوتی ہے۔ آج کالج کیلئے چندہ ہو رہا ہے۔ کل یونیورسٹی کے لئے کبھی کانگریس کے لئے کبھی اور کسی خاک بلا کے لئے۔ اکبر حسین جج الہ آبادی لکھتے ہیں ؎

دریں ہر لکچر آخر چندہ ایست ؛ مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

(ہر لکچر کے بعد چندہ کا سوال ہے جو انجام پر نظر رکھتا ہے وہ مبارک بندہ ہے)

(یعنی جو ابتدا لکچر ہی سے انجام کو سمجھ لے کہ اخیر میں چندہ مانگا جائے گا اور یہ سمجھ کر پہلے ہی سے چلا جائے وہ بہت مبارک بندہ ہے ۱۲ جامع)

اکبر حسین مرحوم کہتے تھے کہ وعظ تو ہم نے چندہ سے خالی بہت سنے مگر لکچر ایک بھی اس سے خالی نہیں سنا ہے تو ظاہر میں دعوے مگر میں دعوی کی نیت سے نہیں کہتا کہ واللہ وعظ تو ہم پچاسوں چندہ سے خالی سنا دیں گے تم لکچر ایک تو اس سے خالی دکھا دو۔ مگر فرق یہ ہے کہ جنٹلمین چندہ کرتے ہیں قیمتی کپڑے پہن کر اور مولوی چندہ کرتے ہیں معمولی کپڑے پہن کر۔ اس پر ایک واقعہ یاد آیا کہ ہم جو بعض معززین کی درخواست پر شملے گئے تو وہاں وعظ کا اعلان ہوا۔ کرنیل عبد المجید صاحب نے اپنے نام سے اعلان کیا جس وقت میں وعظ کیلئے کھڑا ہوا تو میرے کپڑے دیکھ کر بعض جنٹلمینوں نے کرنل صاحب سے کہا کہ تمہارے علماء کے کپڑے تو ایسے ہیں جیسے ابھی پاخانہ سے نکل کر آ رہے ہوں حالانکہ میں کھدر

پہنے ہوئے بھی نہ تھا اور نہ میرا ارادہ کھدر پہننے کا ہے۔ چکن اور لٹھے کے کپڑے تھے اور چونکہ جمعہ کا دن تھا اس لئے صاف بلکہ کلف استری کے ہوئے تھے مگر ہاں کرتہ لمبا تھا اور پاجامہ اونچا تھا یہ نہ تھا کہ کرتہ اونچا ہو اور پاجامہ ٹخنوں سے نیچا ہو اُن نو تعلیم یافتہ صاحب کو یہ لباس حقیر معلوم ہوا کرنل صاحب نے اُن سے کہا کہ میں ابھی اس بات کا جواب دینا نہیں چاہتا۔ وعظ ختم ہونے کے بعد پوچھنا اس وقت جواب دوں گا۔ چنانچہ بعد ختم وعظ کرنل صاحب منتظر رہے کہ یہ اس اعتراض کا اعادہ کریں مگر وہ کچھ نہیں بولے تب کرنل صاحب نے خود یاد دلایا کہ اب آپ کہئے کیا کہتے تھے۔ کہنے لگے کچھ نہیں کہتا اور جو کچھ کہا تھا حماقت تھی۔ میں یوں سمجھتا تھا کہ لیاقت بھی کپڑوں کے موافق ہوتی ہے مگر اس وقت اپنی غلطی ظاہر ہوئی اور یہ معلوم ہوا کہ کپڑے معیار لیاقت نہیں۔ اتفاق سے یہ بات میرے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ میں نے دوسرے جلسہ میں ممبر پر آتے ہی کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض حضرات ہمارے لباس پر خاص رائے رکھتے ہیں اور میں حسن ظن منشا راس کا نیک نیتی ہی سمجھتا ہوں۔ غالباً محبت ہے۔ وہ چاہتے ہوں گے کہ علماء عمدہ اور قیمتی لباس پہن کر وعظ کہا کریں تاکہ سامعین کے قلوب میں ان کی عظمت ہو۔ اور اُن کی عظمت سے مضمون کی عظمت ہو۔ مجھے اس منشاء پر اعتراض نہیں اور میں اس کے حسن قبح سے اس وقت بحث نہیں کرنا چاہتا میں تسلیم کئے لیتا ہوں کہ علماء کو عمدہ لباس پہنکر ہی وعظ کہنا چاہئے۔ مگر سوال یہ ہے کہ عمدہ لباس آئے کہاں سے ہمارے پاس تو اتنا روپیہ نہیں جو آپ کی تجویز اور منشاء کے موافق لباس بنائیں تو اس صورت میں اتنا روپیہ کہاں سے آوے۔ زیادہ روپیہ حاصل کرنے کے جو ذرائع ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔ بعض تو شرعاً قبیح ہیں جن کو ہم جائز نہیں رکھتے جیسے ڈپٹی کلٹری وسب ججی وغیرہ اور بعض عقلاً بھی قبیح ہیں جن کو نہ ہم جائز رکھیں نہ آپ جیسے وعظ کہکر اپنی حاجت پیش کرنا جب یہ دونوں ذرائع ناجائز ہیں صرف ایک ذریعہ یہی رہ گیا کہ ہم میں کوئی مدرس ہے

ے کیونکہ کھدر پہننا آجکل گاندھی پرست جماعت کا شعار ہوگیا ہے ۱۲ جامع

کوئی مصنف۔ کوئی محشی کوئی کسی مطبع کا مصحح تو اس صورت ہماری مالی حیثیت اسی لباس کی ہوگی جو ہم پہنے ہوئے ہیں اور اگر اس سے زیادہ حیثیت بھی ہوتی تب بھی ہیں یہ کیونکر معلوم ہوتا کہ آپ کی منشا کے موافق کس قیمت کا لباس ہونا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ ہم اس موجودہ لباس سے بڑھیا لباس پہنکر آئیں اور آپ کی نظر میں وہ بھی حقیر ہو۔ اس لئے اس کی آسان صورت یہ ہے کہ معترض صاحب اپنی منشاء کے موافق نہایت عمدہ قیمتی جوڑے ہمارے لئے بنا دیں تاکہ جب تک ہم شملہ میں رہیں اسی لباس کو پہنکر وعظ کہا کریں اور اس کا ہم وعدہ کرتے ہیں کہ جب شملہ سے جانے لگیں گے وہ لباس آپ کے حوالہ کر جائیں گے اپنے ساتھ نہ لے جائیں گے تاکہ ہمارے بعد کوئی اور مولوی وعظ کہنے آئے تو آپ اس کو بھی وہ لباس دے سکیں کہ مولانا یہ کپڑے پہن کر وعظ فرمایئے اس میں آپ کا مقصود بھی حاصل ہوجائے گا کہ سامعین وعظ کی نظروں میں قیمتی لباس کی وجہ سے علماء کی عظمت ہوگی۔ اور ہم بھی خرچ کے بارے سبکدوش رہیں گے اور آپ کا بنایا ہوا لباس پھر آپ کے پاس واپس آجائے گا۔ آپ کو ہر مولوی کے واسطے بار بار جوڑا تیار نہ کرنا پڑے گا۔ ایک دفعہ کا بنایا ہوا برسوں کام دے گا اور غالباً معترض صاحب میں اتنی وسعت تو ضرور ہوگی کہ ایک دفعہ ہمارے لئے قیمتی جوڑے تیار کردیں۔ کیونکہ ہمارا لباس اس شخص کی نظروں میں حقیر ہوسکتا ہے جو بڑا مالدار صاحبِ وسعت ہو کیونکہ دوسرے مقامات پر ہمارے لباس کو کسی نے حقیر نہیں بتلایا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بہت ہی مالدار لوگ رہتے ہیں جن کی نظروں میں ہمارا چکن کا لباس بھی حقیر ہے۔ تو مہربانی فرماکر وہ لباس ہمارے لئے تیار کرادیں ہم اس کو پہنکر وعظ کہدیا کریں گے۔ اس سے ہمیں انکار نہ ہوگا اور یہاں سے روانگی کے بعد اگر کسی دوسری جگہ بھی ہمارے لباس کو حقیر سمجھا گیا تو ہم وہاں کے لوگوں سے بھی یہی کہدینگے جو آپ سے کہا ہے۔ اگر ان کو قیمتی لباس میں وعظ سننا ہوگا تو وہ بھی اس کا انتظام خود کریں گے۔ آپ کے بنائے ہوئے جوڑے ہم یہیں چھوڑ جائیں گے یہ صورت اس لئے بھی سہل ہے کہ وعظ کہنے والا تو ایک آدمی ہے جو سیکڑوں مقامات پر جاتا ہے۔

(باقی آئندہ ان شاء اللہ تعالیٰ)

(برنٹنگ محل کراچی)

تو ایک آدمی کو ہر جگہ کے مذاق کی رعایت کرنا دشوار ہے۔ اور ہر ہر شہر کے آدمیوں کو ایک جوڑا اپنے مذاق کے موافق تیار کر لینا آسان ہے۔ اب میں منتظر ہوں کہ ہمارے واسطے جوڑے تیار ہو کر کب آتے ہیں۔ اگر غیرت ہوگی تو بہت جلد اس کا انتظام کیا جا دے گا اس تقریر سے معترضین کی گردنیں جھک گئیں اور نگاہیں نیچی ہو گئیں۔ تو آجکل لوگوں کا مذاق ایسا بگڑا ہے کہ ان کی نظروں میں صرف قیمتی لباس والے کی عظمت ہوتی ہے حالانکہ چندہ کرنے میں جنٹلمین اور مولوی دونوں شریک ہیں مگر وہ لوگ قیمتی کپڑے پہن کر چندہ مانگتے ہیں۔ اس لئے ان کی ذلت نہیں ہوتی اور مولویوں کو ذلیل سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ عقل کا مقتضا یہ ہے کہ چندہ مانگنے والے کو قیمتی لباس نہ پہننا چاہیئے۔ کیونکہ اس کا اثر مسلمانوں پر یہ ہوتا ہے کہ غریب آدمی چندہ میں شرکت نہیں کر سکتا وہ سوچتا ہے کہ جو شخص سو روپیہ کا لباس پہن کر سوال کر رہا ہے اسے چار پانچ روپے کیا دوں کم از کم سو پچاس تو دوں اور جو وسعت والے بھی ہیں اگر ان کی نیت بیس روپے دینے کی ہوتی ہے تو وہ لکچرار کے لباس کو دیکھ کر اور اس کی شان و شوکت سے دب کر بیس کی جگہ پچاس دیتا ہے۔ اور جو چندہ دباؤ سے وصول ہو وہ حرام ہے مگر افسوس ہے کہ عوام میں پھر بھی ان ہی لوگوں کی عزت ہے جو دباؤ سے چندہ لیتے ہیں۔ مولوی تو دس پانچ روپیہ پر ہی قناعت کر لیتے ہیں۔ اور دینے والے کو دعائیں دیتے ہیں اور جنٹلمین دو سو پانچسو سے کم پر قناعت ہی نہیں کرتے اور اگر کوئی یہ کہے کہ مولوی چندہ کھاتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ واللہ مولوی اگر کھاتے بھی ہیں تو جنٹلمینوں سے کم کھاتے ہیں۔ ان میں اگر

کوئی کمبخت کھاتا بھی ہے تو بہت سے بہت چار پانچسو روپیہ کھالے گا اور جنٹلمین تو ہزاروں لاکھوں کھا کر بھی ڈکار نہیں لیتے چنانچہ آجکل جو چندوں میں خیانت کا راز کھلا ہے تو معلوم ہوا کہ بعضے جنٹلمین ہزاروں لاکھوں روپیہ ہضم کر گئے اور ایک پیسہ کا بھی حساب نہیں دیا۔ تو مولوی تو برزخ ہیں قبر ایک ہی مردہ سے بھر جاتی ہے اور یہ لوگ دوزخ ہیں جس کی حالت یہ ہے یَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ۝ دوزخ کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا وہ یہی کہتی رہے گی کہ اور لاؤ اور لاؤ۔ پس جو لوگ چندہ کے باب میں مولویوں پر اعتراض کرتے ہیں وہ ان سے زیادہ محل اعتراض ہیں لیکن اس پر بھی میں علماء سے یہی کہتا ہوں کہ خدا کے لئے تم یہ چندہ کا کام چھوڑ دو۔ اگر جنٹلمین چندہ کریں انھیں کرنے دو۔ تم یہ کام مت کرو واللہ شرم کی جگہ ہے کہ لوگ یہ سمجھیں کہ روپیہ مولوی کی حاضرات ہے کہ جہاں فلیتہ سلگایا اور جن حاضر ہو گئے اور یہ شبہ نہ کیا جائے کہ چندہ کے بغیر دین کا کام کیونکر چلے گا۔ میں کہتا ہوں کہ دین کا کام سب مسلمانوں کا کام ہے سب لوگ مل کر کام کریں۔ مولویوں کا کام وعظ کہنا تبلیغ کرنا درس دینا وغیرہ ہے یہ کام تو وہ کریں۔ چندہ کرنا ان امراء ورؤسا کا کام ہے جن پر کسی کو یہ شبہ نہ ہو سکے کہ یہ اپنے واسطے مانگ رہا ہے۔ کیونکہ جانتے ہیں کہ اس کی اتنی بڑی حیثیت ہے کہ ہم دس دیں گے تو یہ اپنے پاس سے پچاس دے سکتا ہے۔ ایسے شخص کا چندہ کرنا ذلت کا سبب نہیں ہو سکتا تو یہ کام امراء ورؤسا کریں یہ لوگ چندہ جمع کر کے پھر علماء سے پوچھ کر کام میں لگا دیں اس طرح کر کے دیکھئے معلوم ہو جائے گا کہ دین کا کام چلتا ہے یا نہیں باقی مولویوں کو تو چندہ کے لئے وعظ بھی ہرگز نہ کہنا چاہیئے۔ ہاں اس کا مضائقہ نہیں کہ دینی ضرورتوں سے مسلمانوں کو مطلع کر دیا جائے کہ فلاں جگہ یہ کام دین کا ہو رہا ہے اس میں مسلمانوں کی امداد کی

ضرورت ہے اس کے بعد اگر کوئی چندہ دے تو تم اپنے ہاتھ میں بھی ہرگز نہ لو بلکہ اس سے کہدو کہ منی آرڈر وغیرہ کے ذریعہ سے خازن کے پاس خود بھیجو اگر قسمت میں ہے تو واللہ وہ روپیہ مدرسہ میں ضرور آئے گا۔ ایک صاحب نے تھانہ بھون کے مدرسہ میں دو سو روپے بھیجے اور خط میں اتنا اور لکھدیا کہ زیارت کا بہت اشتیاق ہے۔ کوئی تاریخ مقرر فرمائی جائے تو بہت عنایت ہو، میں نے روپیہ واپس کر دیا اور لکھدیا کہ خط میں اگر میرے آنے کی تحریک نہ ہوتی تو میں روپیہ وصول کر لیتا۔ مگر اب نہیں لے سکتا کیونکہ مجھے شبہ ہو گیا کہ شاید آپ مدرسہ میں یہ رقم دے کر مجھ پر دباؤ ڈالنا چاہتے ہیں کہ اب ضرور آئے گا کیونکہ ہم مدرسہ کے اتنے بڑے معاون ہیں تھوڑے دنوں کے بعد روپیہ پھر واپس آیا جس کی ساتھ ایک خط بھی آیا اس میں لکھا تھا کہ واقعی مجھ سے بڑی بدتہذیبی ہوئی مجھے رقم بھیجنے کے ساتھ شوق زیارت کا ذکر نہ کرنا چاہیئے تھا۔ اب میں اپنی اس تحریک کو واپس لیتا ہوں۔ للہ آپ یہ رقم وصول کر کے مدرسہ میں داخل کر دیجئے میں تو مدرسہ میں یہ رقم دے رہا ہوں آپ کو تھوڑا ہی دے رہا ہوں۔ اس لئے آپ پر اس کا کچھ بھی احسان نہیں نہ کسی قسم کا دباؤ ہے۔ اس شائستہ جواب کے بعد میں نے رقم لے کر مدرسہ میں داخل کر دی۔ اور ان کو جواب میں لکھا کہ پہلے آپ کو اشتیاق ملاقات تھا۔ اب مجھ کو آپ سے ملنے کا اشتیاق ہو گیا۔ آپ کی سلامتی طبیعت سے بہت دل خوش ہوا۔ پھر انھوں نے کئی ماہ کے بعد مجھے بلایا میں نے لکھا کہ اس شرط کے ساتھ آ سکتا ہوں کہ مجھے نذرانہ کچھ نہ دیا جائے اور اگر کچھ دیا گیا تو میں واپس کر دوں گا۔ انھوں نے شرط منظور کر لی۔ میں چلا گیا واپسی کے وقت انھوں نے اپنی والدہ کی طرف سے کچھ دینا چاہا اور کہا کہ میں نے تو آپ کی شرط پر عمل کیا۔ مگر والدہ سے کوئی شرط نہ ہوئی تھی یہ رقم انھوں نے پیش کی ہے۔ اس کو قبول

کرلیا جائے ۔ میں نے کہا والدہ اور ولد سب ایک ہیں اس لئے میں قبول نہیں کر سکتا یہ بھی میری شرط کے خلاف ہے ۔ وہ کہنے لگے پھر کسی کا دل ہدیہ کو چاہے تو وہ کیونکر پیش کرے میں نے کہا کیا ہدیہ دینے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ گھر پر بیلا کر دیا جائے یہ بھی تو طریقہ ہے کہ میرے گھر پر آ کر دو۔ آپ تھانہ بھون تشریف لاویں وہاں ہدیہ دیں گے تو میں لے لوں گا۔ چنانچہ وہ تھانہ بھون آئے اور مجھے تین گنی دیں میں نے لے لیں ۔ گھر پر تو وہ غالباً ایک یا دو ہی گنی والدہ کی طرف سے دے رہے تھے ۔ شاید اُس پر انکار کی وجہ سے ایک یا دو اور بڑھ گئیں ۔ کیونکہ نخروں سے قیمت بڑھ جاتی ہے۔

ایک صاحب نے طلبہ کے لئے پانچ روپے بھیجے اور ساتھ ہی دعا کی استدعا بھی لکھی میں نے روپے واپس کر دیئے کہ یہاں دعا کی دوکان نہیں ہم بدون ہدیہ کے بھی سب مسلمانوں کی بھلائی کے لئے دعا کرتے ہیں روپیہ پھر واپس آیا اور ساتھ میں خط بھی آیا کہ مجھ سے حماقت ہوئی۔ واقعی مجھے ہدیہ کے ساتھ دعا کی درخواست نہ کرنی چاہیئے تھی اب میں دعا نہیں کرانا چاہتا۔ آپ للہ طلبہ کے لئے یہ ہدیہ قبول فرمالیں۔ اب میں نے لے لیا۔ اور اُن کو لکھدیا کہ آپ کے مقصد کے لئے دعا بھی کر دی گئی ۔ تو جہاں روپیہ لینے سے دین کی وقعت کم ہوتی ہو وہاں ہرگز روپیہ بھی نہ لیا جائے واپس کر دینا چاہیئے۔ واللہ لاکھوں اور کروڑوں روپیہ بھی ملتے ہوں مگر دین کی عزت کم ہو تو ایسے روپیہ پر لعنت بھیجنی چاہیئے ۔ اور مانگنا تو در کنار رہا

یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ باوجود اختلاط کے باتیں کم کرتے تھے ۔ بعض لوگوں کو یہ بات ناگوار تھی یہ لوگ مولانا کو روکھا بتلاتے تھے اس پر یہ ساری گفتگو درمیان میں آگئی کہ لوگ علماء کی اچھی باتوں پر بھی اعتراض کرتے ہیں اور وہی باتیں امراء کریں تو مدح ہوتی ہے۔ بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ اختلاط کے ساتھ قلت کلام بہت دشوار ہے یہ

کام صدیقین و کاملین کا ہے۔ ورنہ اکثر حالت یہی ہے کہ اختلاط میں فضول باتیں بہت کرنا پڑتی ہیں۔ اب اگر یہ دستورالعمل رکھا جاوے کہ جو شخص بھی ملنے آئے اس کے ساتھ خاطر مدارات و تعظیم و تکریم کا معاملہ کیا جائے اور گھنٹوں باتیں بنائی جائیں تو سارا وقت اسی کا ہو رہے اپنا کوئی کام بھی نہ ہوگا۔ اور اگر ایک کے ساتھ یہ برتاؤ کیا دوسرے کے ساتھ نہ کیا تو اس کو ناگوار ہوگا اور جس کی تم نے خاطر مدارات کی تھی اس کے ساتھ حسد پیدا ہو جائے گا کہ اس کی بہت خاطر ہوتی ہے۔ پھر یہ شبہ بھی ہونے لگے گا کہ شاید کسی نے شیخ سے میری شکایت کی ہوگی۔ اس لئے میرے حال پر وہ عنایت نہیں جو دوسروں کے حال پر ہے۔ اب گمان ہی گمان پر کسی کی غیبت شروع کر دی جس سے دشمنی بڑھ گئی۔ دشمنی کے بعد رات دن اس کو اس کی ایذا کی فکر ہے۔ اس کو اس کی فکر ہے۔ بس اسی کے ہو لئے نہ ذکر میں دل لگتا ہے نہ نماز میں نہ تلاوت میں نہ کسی کام میں ہر وقت فکر سوار ہے۔ ضرر کثرت اختلاط کا یہ ہے کہ آپ کے وہ دوست صاحب ہر روز تمہارے پاس موجود ہیں۔ دو گھنٹے تین گھنٹے روز ضائع کرتے ہیں کسی معمول کو لے کر بیٹھے تھے کہ دوست صاحب آ گئے۔ بس معمول تو رخصت ہوا ان کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گئے۔ اس طرح اوقات و اوراد کا بہت ناس ہوتا ہے۔ اسی لئے میں نے خانقاہ میں قاعدہ مقرر کر دیا ہے۔ کہ نہ کسی سے دوستی بڑھاؤ نہ دشمنی پیدا کرو نہ زیادہ مجلس آرائی کرو۔ کیونکہ یہ مجلس آرائی فساد کی جڑ ہے ہم نے دیکھا ہے کہ چوپال میں بیٹھ کر زیادہ باتیں کرنے سے اکثر لڑائی ہو جاتی ہے اس لئے سلامتی عزلت و قلت اختلاط ہی میں ہے۔ مگر ایک بات قابل لحاظ ہے۔ وہ یہ کہ قلت اختلاط سے بھی بعض دفعہ شہرت ہو جاتی ہے اور شہرت دنیا و دین دونوں کے لئے مضر ہے۔

مگر تجربہ یہ ہے کہ اگر قلت اختلاط اول ہی سے اختیار کرلو تو شہرت بھی نہ ہوگی کیونکہ لوگوں کی نظر میں یہ حالت کوئی نئی بات نہ ہوگی۔ جانیں گے کہ اس شخص کی طبیعت ہی ایسی ہے، اور اختلاط کے بعد اگر قلت اختلاط کرو گے تو شہرت ہو جائے گی کیونکہ لوگوں کو ایک نئی بات معلوم ہوگی کہیں گے کہ آجکل فلاں شخص چلا کشی کر رہا ہے۔ گوشہ نشین ہو گیا ہے۔ پھر شہرت کے بعد چین نہ ملے گا۔

اسی زمانہ میں ایک بزرگ نے اختلاط کے بعد رجوع. لت اختیار کی تو پہلے سے زیادہ شہرت ہوگئی۔ مخلوق کا رجوع زیادہ ہو گیا بڑے پریشان ہوئے ایک دوسرے بزرگ نے ان کو لکھا ؎

آنروز کہ مہ شدی نمی دانستی — کانگشت نمائے عالمے خواہی شد

(جس دن تم چاند بنے تھے نہیں جانتے تھے کہ انگشت نمائے عالم ہو جاؤ گے)

یعنی اب کیا گھبراتے ہو جس دن تم چاند بنے تھے اس دن تمہیں معلوم نہ تھا کہ چاند انگشت نمائے عالم ہوا کرتا ہے۔ اس لئے لازم تھا کہ پہلے ہی سے چاند نہ بنتے یعنی اختلاط کر کے اپنے کو ظاہر نہ کرتے پس شہرت کے طریقے سے بچنا چاہیئے اور اول ہی سے گمنامی اختیار کرنا چاہیئے کیونکہ زیادہ شہرت دین و دنیا دونوں کے لئے ضرر رساں ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

خویش را رنجور سازو زار زار — تا ترا بیروں کنند از اشتہار

(اپنے کو خراب و خستہ حالت میں رکھو تاکہ تم کو شہرت سے آزادی حاصل رہے)

کیوں اس لئے کہ ؎

اشتہار خلق بند محکم است — بند ایں از بند آہن کے کم است

(مخلوق میں شہرت مضبوط قید ہے یہ قید لوہے کی قید سے کم نہیں ہے)

اینش گوید نے منم ہمراز تو — آنش گوید تے منم انباز تو

(کوئی تو یہ کہتا ہے میں آپ کا ہمراز ہوں کوئی کہتا ہے کہ میں آپکا ساتھی ہوں)

او چو بیند خلق را سرمست خویش
از تکبر می رود از دست خویش
(جب خلق کو اپنا عاشق و دیوانہ دیکھتا ہے تو تکبر کے سبب سے اپنے سے
باہر ہو جاتا ہے)

یعنی جب وہ دیکھتا ہے کہ ساری دنیا میری معتقد ہے۔ کوئی ہاتھ چومتا ہے کوئی پیر تو آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ یہ تو دین کا ضرر ہے۔ اور دنیا کا ضرر یہ ہے۔

چشمہا و خشمہا و رشکہا ۔ بر سرت ریزد چو آب از مشکہا
(مشہور ہونے کے بعد عوام کا غصہ اور حسد اور رشک تجھ پر اس طرح ہوگا
جیسے مشک سے پانی ٹپکتا ہے)

چنانچہ مشہور آدمی سے عام لوگوں کو بھی حسد اور رشک پیدا ہو جاتا ہے اور حکام کی نظر بھی مشہور لوگوں پر زیادہ ہوتی ہے جب کوئی قصہ ہوتا ہے تو سب سے پہلے مشہور لوگوں پر آفت آتی ہے آجکل جو عوام حکومت کے مقابلہ میں بہادر بنے ہیں اس کا راز یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ ہم کو پوچھتا کون ہے۔ ہاں جو لوگ مشہور ہیں ان کا حکومت سے مقابلہ کرنا بے شک بہادری ہے کیونکہ ان کو ہر وقت اپنے اوپر خطرہ ہے۔ گو اس سے بحث نہیں کہ یہ بہادری جائز ہے یا حرام اور یہ دینی شجاعت ہے یا نفسانی تہور۔ اس کو علماء سے پوچھو۔ مگر صاف بات یہ ہے کہ علماء بھی سب نہیں ہیں۔ بلکہ علماء حقیقت میں صرف وہ ہیں جو لیڈروں کے تابع نہ ہوں حکم شرعی کے تابع ہوں اور جو علماء لیڈروں کے تابع ہیں ان کی تو حالت یہ ہے کہ واللہ اگر لیڈر آج اپنی رائے کو بدل دیں تو یہ علماء بھی ادھر ہی ہو جائیں مگر ہیں عقلمند فوراً اپنے فتوے کو نہ بدلیں گے کیونکہ اس سے عوام کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ان کے فتوے لیڈروں کی رائے کے تابع ہیں بلکہ آہستہ آہستہ اپنی رائے کو بدل کر لیڈروں کے راستہ پر آجائیں گے آج کل علما لیڈروں کے ساتھ دو وجہ سے ہیں۔ یا تو اس لئے کہ ان سے

علیحدگی میں زوال جاہ کا اندیشہ ہے چنانچہ مشاہد ہے کہ جو علماء ان کے ساتھ نہیں ہیں۔ ان کو عوام نے کیسا بدنام کیا اور کتنا بُرا بھلا کہا۔ یا روپیہ کی طمع سے ان کے ساتھ ہیں کہ اگر ہم نے ان تحریکات میں شرکت نہ کی تو مدرسہ کا چندہ بند ہو جائے گا کوئی مدرسہ کی اعانت نہ کرے گا۔ ایک عالم نے مجھے لکھا تھا کہ ان تحریکات سے علیٰحدگی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اکیلے رہ جاؤ گے۔ کوئی تمہارے ساتھ نہ ہوگا۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے خدا کا ساتھ ہونا کافی ہے اور کسی کے ساتھ ہونے کی ضرورت نہیں۔ لعنت ہے ایسے مال و جاہ پر جس سے مخلوق کی رضا مقصود ہو۔ مسلمانوں کی شان تو یہ ہونا چاہیئے کہ رضاء الٰہی کے سامنے اس کو کسی کی پرواہ نہ ہو۔ اگر مخلوق اس کو پاگل بنا کر چھوڑ دے مگر خدا راضی ہو تو وہی اس کے لئے سلطنت ہے اگر وہ پاگل بھی ہے تو کس کا پاگل ہے ؎

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم — مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(ہم اگر قلاش اور اگر دیوانہ ہیں لیکن اس ساقی ازل کے مست و دیوانہ ہیں)

اس کے نزدیک جو خدا کا دیوانہ ہو وہ خود دیوانہ ہے ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد — مرعسس را دیدہ و در خانہ شد

(وہی دیوانہ ہے جو ان کا دیوانہ نہ ہوا۔ کوتوال شہر کو دیکھا اور گھر کے اندر نہ ہوا)

مگر ان کی دیوانگی بے عقلی کی دیوانگی نہیں بلکہ مستی عقل سے ان پر ایک نشہ سوار ہے یہ وہ دیوانگی ہے جس پر ہزار عقلیں قربان ہیں ؎

او گل سرخ ست تو خونش مخواں — مست عقل است او تو مجنونش مخواں

(وہ گلاب کا پھول ہے اس کی سُرخی کو تم خون مت کہو وہ مست عقل ہے اس کو دیوانہ مت کہو)

کوئی تو اس کے لئے نیند میں پڑا سو رہا ہے کہ روٹی نہیں ملی فاقہ گذر رہا ہے اور

یہ اس لئے نیند میں ہے کہ کھا بہت گیا ہے۔ بہت کھانے سے بھی نیند آیا کرتی ہے۔ اسی طرح کوئی تو اس لئے مجنوں ہے کہ اس کے پاس عقل نہیں۔ اور کوئی اس لئے مجنوں ہے کہ غلبہ عقل سے مست ہو گیا ہے۔ یہ لوگ مصالح کو مسالہ کی طرح پیس ڈالتے ہیں ان کی بڑی مصلحت یہ ہوتی ہے۔ کہ ایک کو راضی کر لیں ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار

بگذارند و خم طرہ یارے گیرند

(میری بصیرت کی رائے یہ ہے کہ یاران طریق سب کام چھوڑ کر محبوب حقیقی کی رضا کے طالب ہو جائیں زلف محبوب کے خم سے یہی مراد ہے)

یاد رکھو سلطنت خود مقصود بالذات نہیں۔ بلکہ اصل مقصود رضائے حق ہے اگر ہم سے خدا راضی نہ ہو تو ہم سلطنت کی حالت میں فرعون ہیں اور لعنت ہے ایسی سلطنت پر جس سے ہم فرعون کے مشابہ ہوں۔ اگر سلطنت مقصود بالذات ہوتی تو فرعون و ہامان و نمرود و شداد بڑے مقرب ہونے چاہئیں۔ حالانکہ وہ مردود ہیں معلوم ہوا کہ سلطنت وہی مطلوب ہے جس میں رضاء حق بھی ساتھ ساتھ ہو اور جس سلطنت میں رضاء حق نہ ہو وہ وبال جان ہے۔ اگر ہم سے خدا راضی ہو تو ہم پاخانہ اٹھانے پر بھی راضی ہیں اور اسی حالت میں ہم بادشاہ ہیں۔ آخر حضرت ابراہیم بن ادہم کیا تمہارے نزدیک پاگل تھے ان کو تو سلطنت ملی ہوئی تھی پھر کیوں چھوڑ دی محض اس لئے کہ مقصود میں خلل واقع ہوتا تھا معلوم ہوا کہ سلطنت خود مقصود نہیں بلکہ مقصود دوسری چیز ہے۔ کہ اگر اس میں خلل واقع ہونے لگے تو اس وقت ترک سلطنت ہی سلطنت ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادھم ہر فن کے امام ہیں۔ حدیث میں ثقہ اور محدث ہیں اور فقہاء میں فقیہہ۔ اور صوفیہ میں تو امام ہیں ان کو کوئی پاگل نہیں کہہ سکتا جو ان کو پاگل کہے وہ خود پاگل ہے۔ پھر دیکھ لو انھوں نے کیا کیا۔ جب رضاء حق میں سلطنت کو

مزاحم دیکھا تو بادشاہت پر لات مار کے الگ ہو گئے۔ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو سلطنت مضر مقصود نہ تھی تو ان کو اجازت دی گئی کہ منصب خلافت کو قبول کریں اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے لئے مضر مقصود تھی تو ان کے لئے حکم ہے لا تلین مال یتیم ولا تقضین بین اثنین اس سے صاف معلوم ہوا کہ سلطنت خود مقصود نہیں بلکہ مقصود رضائے حق ہے اگر سلطنت سے مقصود میں خلل واقع ہو تو اس وقت اس سے منع کیا جائے گا۔ حضرت ابوذر تو اتباع احکام کا ارادہ بھی کرتے تھے۔ ان کو جب بھی قضاء و حکومت کی اجازت نہ دی گئی۔ اور تم تو اتباع احکام کا بھی قصد نہیں کرتے اس حال پر تم کو کیونکر اجازت دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو کہ جو لوگ ابھی تھوڑا زمانہ ہوا پنچایت میں مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے ان کے کتنے فیصلے شریعت کے موافق ہوتے تھے اور وہ خود اتباع احکام کتنا کرتے تھے حالت یہ تھی کہ خود لوگوں کے حقوق دبائے ہوئے ہیں اور پنچایت میں فیصلے کر رہے ہیں جن میں اکثر فیصلے خلاف شریعت ہوتے تھے۔ اگر ان لوگوں کو سلطنت مل جاتی تو مخلوق کو کچا کھا جاتے تو کیا تم یہ چاہتے ہو کہ خدا تعالیٰ اس ظلم کی حالت میں تم کو سلطنت دے دیں گے۔ ارے اگر تم بادشاہ بن جاتے تو نہ معلوم مخلوق کا کیا حال ہوتا۔ بڑی خیر ہوئی کہ خدا نے گنجے کو ناخن ہی نہ دیئے۔ اتنا ہی فرق دیکھ لو اپنے میں اور ان لوگوں میں جن کو خدا نے سلطنت دے رکھی ہے کہ تم نے اپنے مخالفوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا اور اہل سلطنت نے تمہارے ساتھ باوجود تمہاری اس مخالفت کے کیا برتاؤ کیا۔ اگر تم بادشاہ ہوتے اور اس وقت تمہارے ساتھ کوئی اس طرح مقابلہ سے پیش آتا جیسا تم اس وقت سلطنت کے ساتھ برتاؤ کر رہے ہو تو نہ معلوم تم کتنوں کو پھانسی پر لٹکا دیتے اور یہ ساری خرابی اس کی ہے کہ تم صرف سلطنت کو مقصود سمجھتے ہو رضاء حق کو مقصود نہیں سمجھتے اس لئے

تم کو خلاف شرع اقوال و افعال سے ذرا باک نہیں۔ حالانکہ فقیر کا مقصود پلاؤ[ل] ہے۔ اگر رکابی بھی ساتھ میں مل گئی فبہا ورنہ صرف ڈھوبرے جمع کرنے سے کیا فائدہ یہ تو نری حماقت ہے، خصوصًا پھوٹے ہوئے ڈھوبرے جمع کرنا تو سخت حماقت ہے۔ لوگ تو پھوٹا ہوا بیل بھی نہیں لیتے۔ اس پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ کہ ایک شخص نے بیل خریدا تھا۔ وہ موتنے لگا تو اس نے بیچنے والے سے کہا کہ اپنا بیل لے جاؤ ہم نہیں خریدتے یہ تو پھوٹا ہوا ہے۔

غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ جاہ سے دین اور دنیا دونوں کا ضرر ہوتا ہے اس لئے عزلت میں ایسا طریقہ اختیار نہ کرنا چاہیئے جس سے شہرت و جاہ حاصل ہو لیکن جس جاہ سے ضرر ہوتا ہے یہ وہ جاہ ہے جو طلب سے حاصل ہو۔ اور جو بدون طلب کے حاصل ہو وہ مضر نہیں ہوتی۔ اس میں خدا تعالےٰ کی امداد ہوتی ہے۔ اگر لوگ اس پر حسد کریں اور اس کو بُرا بھلا کہنے لگیں تو حق تعالےٰ اس کے دل کو قوی کر دیتے ہیں جس سے کوئی اذیت اس کے نزدیک اذیت نہیں رہتی نیز ان مصائب سے جو باطنی ترقی ہوتی ہے حق تعالےٰ اُسے قلب پر منکشف فرما دیتے اور ہر واقعہ کی حکمت پر مطلع فرما دیتے ہیں۔ اب اُسے کچھ تکلیف نہیں ہوتی بلکہ خوش ہوتا ہے جیسے انسپکٹر اپنے عہدہ سے خوش ہوتا ہے۔ اگرچہ کبھی ڈاکوئں کے مقابلہ میں گولی بھی لگتی ہے مگر بایں ہمہ اس عہدہ پر مبارکباد ہی دی جاتی ہے، اور گولی کھانے کے بعد بھی کوئی اس عہدہ کو نہیں چھوڑتا کیونکہ

[ل] رضارحق کو پلاؤ سے تشبیہ دی ہے اور سلطنت کو رکابی سے۔ اور ظاہر ہے کہ پلاؤ بدون رکابی کے بھی مقصود ہے اور رکابی بدون پلاؤ کے بے کار ہے۔ اسی طرح رضا رحق بدون سلطنت کے بھی مقصود ہے اور سلطنت بدون رضار حق کے بے کار محض ہے خوب سمجھ لو خصوصًا جبکہ سلطنت بھی ظلم و بے انتظامی کی سلطنت ہو وہ تو پھوٹی ہوئی رکابی کے مشابہ ہے ۱۲ جامع

اس حالت میں ترقی کی امید ہوتی ہے۔ سو یہاں تو صرف امید ترقی پر گولیاں کھانا آسان ہو گیا اور جس کو مصیبت کی حالت میں اپنی ترقی محسوس ہو رہی ہو اس کا تو کیا حال ہوگا۔ پس طلب شہرت سے جو جاہ حاصل ہوتا ہے وہ تو دنیا و دین دونوں کے لئے مضر ہے۔ اور بدون طلب کے جو جاہ حاصل ہو وہ مضر نہیں۔ اور اس کی تائید حدیث شریف سے ہوتی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے فرمایا یاعبد الرحمٰن بن سمرۃ لا تسئل الامارۃ فانك ان عطیتھا من مسئلۃ وکلت الیھا وان اعطیتھا عن غیر مسئلۃ اعنت علیھا۔ اے عبد الرحمٰن بن سمرہ حکومت کا سوال نہ کرنا کیونکہ اگر تم سوال کے بعد حکومت دیئے گئے تو تم کو اسی کے حوالہ کر دیا جائیگا اور اگر بدون سوال کئے دیئے گئے تو تمہاری اعانت و امداد کی جائے گی پس اختلاط میں ایک ضرر تو یہ ہے کہ اس کے بعد عزلت اختیار کرنے میں شہرت ہوتی ہے۔ اور ایک ضرر اختلاط میں یہ ہے کہ اس میں ذکر کا موقع نہیں ملتا اور فکر کا موقع تو بہت ہی کم ملتا ہے فکر تو اختلاط میں ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے لئے تو یکسوئی اور تنہائی کی سخت ضرورت ہے اور فکر بہت بڑی چیز ہے۔ حق تعالےٰ نے جہاں ذکر کا بیان فرمایا ہے وہاں فکر کو بھی ساتھ ساتھ بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ط یاد رکھو تمام علوم و اسرار کا ورود قلب پر فکر ہی کی برکت سے ہوتا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ فکر کے بغیر علوم و اسرار قلب پر نہیں آتے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ورود علوم و اسرار کی قابلیت بدون فکر کے حاصل نہیں ہوتی۔ قلب علوم و اسرار کے قابل فکر ہی سے ہوتا ہے پھر قابلیت کے بعد بدون فکر کے بھی علوم آنے لگتے ہیں اس وقت یہ حال ہوتا ہے ؎

بینی اندر خود علوم انبیا ـــــ بے کتاب و بے معید و اوستا

(تو اپنے اندر علوم انبیا دیکھے گا بے کتاب اور بے تکرار کرانے والے اور بے استاد کے)

جو شخص عرصہ تک فکر میں مشغول رہ چکتا ہے اس کے بعد اختلاط میں بھی اس کے دل پر اسرار و علوم منکشف ہوتے رہتے ہیں۔ بشرطیکہ تھوڑا بہت وقت خلوت کے لئے بھی رکھے اس لئے ہر سالک کے لئے ایک وقت خلوت کا ہونا ضروری ہے جس میں وہ یکسوئی کے ساتھ ذکر و فکر میں مشغول ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون ہوگا آپ نے بھی اپنے لئے ایک وقت خلوت کا مقرر کر رکھا تھا چنانچہ آپ رات کو جب سب لوگ سو جاتے تھے اٹھ کر نماز وغیرہ میں مشغول ہوتے تھے حق تعالے نے قیام لیل کی حکمت یہی بتلائی ہے کہ دن میں مشاغل کثیرہ کی وجہ سے یکسوئی کا وقت نہیں مل سکتا اس لئے رات کو اٹھنا چاہیئے اِنَّ نَاشِئَةَ اللَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْأً وَّ اَقْوَمُ قِیْلًا اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا ط وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا ط یعنی رات کے اٹھنے میں نفس پر مشقت بھی زیادہ ہے اور بات بھی اچھی طرح زبان سے نکلتی ہے۔ تجربہ ہے کہ رات کو اٹھنے کے بعد نماز و غیرہ میں زبان سے ذکر و قرآن میں سے جو بات نکلتی ہے گو یا دل سے نکلتی ہے۔ آگے ارشاد ہے کہ دن میں آپ کو بہت شغل ہے اس لئے رات کو اٹھنا چاہیئے اور اس وقت خدا کا ذکر کیجئے، اور اسی کی طرف یکسو ہو جایئے۔ یہ خلوت شب تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر اختیار کی اور نبوت سے پہلے چھ مہینہ تک رات دن آپ خلوت میں رہتے تھے اور غار حرا میں جاکر جو مکہ مکرمہ سے فاصلہ پر ہے تنہا رہتے تھے۔ خلوت کی مثال ایسی ہے جیسے کنویں سے پانی خوب بھر کر تھوڑی دیر کے لئے اس کو چھوڑ دیتے ہیں تاکہ پانی کی آمد زیادہ ہو اور اچھی طرح جمع ہو جائے اس کے بعد پھر بھرنے لگتے ہیں۔ اگر کچھ دیر کنویں کو نہ چھوڑا جائے پھر گارا کیچڑ آنے لگتا ہے پانی شفاف نہیں آتا۔ اسی طرح

جو لوگ ہر وقت اختلاط میں رہتے اور باتیں ہی بناتے رہتے ہیں ان کا قلب خالی ہو جاتا ہے اور دل کا خالی ہو جانا بہت ہی بُرا ہے اس لئے چاہیئے کہ ایک وقت خلوت کا ضرور ہو جس میں قلب انوار ذکر و فکر سے پر ہو جائے پھر اختلاط کے وقت علوم و اسرار ظاہر ہوں گے اور اختلاط کے بعد پھر خلوت ہونی چاہیئے تاکہ اختلاط سے جو انوار میں کمی ہوئی تھی وہ پوری ہو جائے اور جن لوگوں کا کوئی وقت خلوت کے لئے مخصوص نہیں ہوتا رفتہ رفتہ ان کا قلب انوار سے بالکل خالی ہو جاتا ہے پھر بجائے علوم و اسرار کے ظلمانی اقوال اُن کی زبان سے ظاہر ہونے لگتے ہیں بزرگان دین جلوت میں جو اسرار و علوم بیان کرتے ہیں وہ خلوت میں ان کی تلقی کرتے ہیں اور گو یہ مسئلہ فی نفسہ اختلافی ہے کہ عزلت بہتر ہے یا اختلاط۔ بعض صوفیہ نے اختلاط کو ترجیح دی ہے اور وہ اس کے منافع بیان کرتے ہیں اور عزلت میں مفاسد بتلاتے ہیں بعض نے عزلت کو ترجیح دی ہے اور اس کے منافع بیان کئے ہیں اور اختلاط میں مضرتیں بتلاتے ہیں جس کا سب سے اچھا فیصلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ الوحدۃ خیر من جلیس السوء والجلیس الصالح خیر من الوحدۃ یعنی نہ خلوت مطلقاً بہتر ہے نہ جلوت بلکہ ملنے والے بد ہوں تو ان سے علیحدگی اور خلوت ہی بہتر ہے اور نیک ہوں تو اُن سے ملنا خلوت سے بہتر ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ آجکل جو حالات واقع ہیں وہ مقتضی خلوت ہی کی ترجیح کو ہیں۔ میری رائے اس باب میں یہاں تک ہے کہ گو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بزرگوں سے ملنا خلوت سے ہر حال میں بہتر ہوگا۔ مگر میں آجکل کبھی کبھی اپنے احباب کو ایک مشورہ دیا کرتا ہوں وہ یہ کہ بعض لوگوں کو بزرگوں کی زیارت کا بہت شوق ہوتا ہے وہ آئے دن سفر ہی میں رہتے ہیں۔ آج ایک بزرگ کے پاس جا رہے ہیں کل دوسرے بزرگ کے پاس، میں ان کو منع کیا کرتا ہوں کہ بزرگوں سے بہت نہ ملا کرو۔ بس ایک کو اپنا بزرگ بنا لو اور جم کر اس کے پاس رہو۔ اور

اُس کے پاس بھی زیادہ آمدورفت نہ کرو۔ بلکہ ایک دفعہ بہت سارہ لو۔ پھر اپنے گھر بیٹھو۔ برس میں ایک دفعہ پھر مل لینا۔ ہر مہینہ اس کے پاس بھی نہ جاؤ۔ اوراس مشورہ کا راز یہ ہے کہ حدیث شریف میں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے الجلیس الصالح خیر من الوحدۃ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جلیس صالح سے اختلاط کرنا ہر حال میں وحدت سے بہتر ہے بلکہ قاعدۂ بلاغت[1] کے موافق اس کا مطلب یہ ہے کہ جلیس صالح سے ملنا صلاح کے لئے مقصود ہے تو جب تک اس کے اختلاط سے صلاح حاصل ہو اسی وقت تک اس سے ملنا وحدت سے بہتر ہے۔ اور کبھی بزرگوں کی زیارت سے بھی صلاح حاصل نہ ہو بلکہ فساد بڑھنے لگے تو اس وقت اختلاط صالح سے بھی منع کر دیا جائے گا۔ اب واقعات یہ ہیں کہ بعض لوگ تو بزرگوں کی زیارت کا نام کرتے ہیں اور مقصود سیر وسیاحت ہوتی ہے تاکہ سیاحت سے تفریح حاصل ہو اور عمدہ عمدہ غذائیں کھانے کو ملیں یہ مقصود تو ان کو حاصل ہو جاتا ہے مگر باطن کا ضرر ہوتا ہے، کیونکہ جب نیت درست نہیں۔ تو بزرگوں سے فیض حاصل نہیں ہوتا۔ پھر رات دن گشت سے اوراد میں خلل پڑتا ہے جس میں یہ لوگ اپنے کو سفر کی وجہ سے معذور سمجھتے ہیں۔ حالانکہ سفر عذر کی وجہ سے نہیں کیا تھا۔ اور مسافر وہی معذور ہے جو ضرورت کی وجہ سے سفر کرے۔ اور بعضوں کو زیارت ہی مقصود ہوتی ہے سیر وسیاحت کا قصد نہیں ہوتا مگر یہ لوگ ایک مستحب کو ادا کرتے ہیں اور بہت سے فرائض میں خلل ڈالتے ہیں چنانچہ بہت لوگ بزرگوں کے یہاں ہفتوں قیام کرتے ہیں اور اپنے

---

[1] وہ قاعدہ یہ ہے کہ جب مسند الیہ مشتق ہو یا منعوت بنعت ہو تو علت حکم مادۂ اشتقاق یا لغت ہوا کرتی ہے کما فی قولہ تعالیٰ۔ والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما فالعلۃ السرقۃ ولعبد مؤمن خیر من مشرك فعلۃ الخیریۃ الایمان وامثال ذلك واللہ اعلم ۱۲ جامع

کھانے کا خود انتظام نہیں کرتے بزرگوں ہی کے سر پڑ جاتے ہیں وہ مروت کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے مگر انتظام وغیرہ میں ان کو کلفت ضرور ہوتی ہے۔ اور بلا وجہ ایک مسلمان کو خاص کر اپنے بزرگ کو تکلیف دینا کہاں جائز ہے۔

سفر میں بعض دفعہ نمازیں قضا ہو جاتی ہیں اور جماعت کا خون تو ضرور ہوتا ہے، بلا وجہ جماعت کو ترک کرنا کب مناسب ہے اگر سفر کا عذر کرو تو میں کہہ چکا کہ سفر وہی عذر ہے جو ضرورت سے ہو بلا ضرورت سفر عذر نہیں۔ عارف مسعود بک تو اس حال میں حج نفل سے بھی منع کرتے ہیں ؎

اے قوم بحج رفتہ کجا ئید کجا ئید
معشوق دریں جاست بیا ئید بیا ئید

(اے قوم جو حج کے لئے گئی ہے کہاں تم ہو کہاں تم ہو معشوق حقیقی تو اسی جگہ ہے یہاں آؤ یہاں آؤ)

یعنی جس حج کے تم طالب ہو وہ اس حالت میں بیت اللہ میں نہ ہوگا بلکہ اپنے گھر رہ کر ہوگا۔ کیونکہ تم ایک حج نفل کے لئے بیسیوں نمازیں ضائع کرو گے، اوراد و تہجد میں خلل ڈالو گے جس سے بجائے ترقی کے تنزل کا اندیشہ ہے تمہارا حج (یعنی ترقی) اسی میں ہے کہ اپنے گھر رہو اور معمولات و فرائض کو پابندی سے ادا کرتے رہو۔ ایک خرابی بزرگوں کی زیادہ زیارت میں یہ ہے کہ بعض دفعہ ان کی حالت سمجھ میں نہیں آتی۔ جیسے شیخ یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص ملنے گیا دیکھا ان کی گود میں ایک حسین لڑکا بیٹھا ہوا ہے اور سامنے شراب کی بوتل رکھی ہے۔ یہ شخص بدون تحقیق حال کے اُن سے بدگمان ہو گیا، حالانکہ وہ لڑکا ان کا بیٹا تھا اور بوتل میں کوئی شربت بصورت شراب تھا۔ لوگوں کے امتحان کے لئے انھوں نے یہ صورت

اختیار کی تھی۔ تو بزرگوں کی ایسی حالت کے دیکھنے سے بعض دفعہ قلب میں انکار پیدا ہو جاتا ہے اور اہل اللہ کے انکار قلب میں پیدا ہو جانا سخت وبال کا باعث ہے جس سے بعض دفعہ ایمان سلب ہو جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد
تا دل صاحب دلے نامد بدرد

(کسی قوم کو حق تعالیٰ رسوا نہیں فرماتے جب تک کہ وہ قوم کسی اہل دل کو نہیں ستاتی)
بزرگوں پر انکار کرنا اور اُن پر طعن کرنا عذاب کا سبب ہے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات
با دردکشاں ہر کہ درافتاد برافتاد

(بارہا تجربہ کیا ہم نے اس جہان مکافات میں کہ جس نے ستایا اہل اللہ کو وہ تباہ کر دیا گیا)

ایک خرابی یہ ہے کہ اگر ایسی حالت دیکھ کر بزرگوں سے بداعتقادی نہ ہوئی اور حقیقت بھی منکشف نہ ہوئی تو یہ شخص خود بھی وہ کام کرنے لگتا ہے جس میں بزعم خود بزرگ کو مبتلا دیکھا تھا۔ ان کی گود میں تو اپنا بیٹا تھا۔ یہ اجنبی لڑکوں سے اختلاط کرنے اور ان کے ساتھ ناجائز افعال کرنے لگتا ہے۔ بزرگ کے سامنے تو شربت کی بوتل تھی یہ سچ مچ شراب پینے لگتا ہے۔ اس کا دین تو برباد ہوا۔ تو جس پیر سے ایسے اعمال ظاہر ہوں جو تاویل کے محتاج ہوں اس سے زیادہ نہ ملو بلکہ ناقص العقل کے لئے تو فتویٰ یہ ہے کہ اُس سے بالکل نہ ملے۔ لوگ بزرگوں کی زیارت کو روٹی کا نوالہ سمجھتے۔ مگر بعض دفعہ وہ لقمہ گلے میں ایسا پھنستا ہے کہ جان پر بن جاتی ہے۔ اہل اللہ پر مختلف حالات کا ورود ہوتا ہے جن کی حقیقت بہت کم لوگوں کی سمجھ میں

آتی ہے۔ ناسمجھ کا وہاں کام نہیں اس کا تو بیڑا ہو جاتا ہے۔ مولانا ایسے ہی قول کے باب میں فرماتے ہیں ؎

بیم سر یا بیم سر یا بیم دین — امتحان نیست ما را مثل ایں

(راز کا خوف یا عجب و کبر کا خوف یا دین کا خوف اس کے مثل ہمارا امتحان نہیں ہے)

اور اختلاف حالات کے متعلق فرماتے ہیں ؎

گہ چنیں بنماید و گہ ضد ایں — جز کہ حیرانی نباشد کار دیں

(کبھی ایسا دکھاتے ہیں کبھی اس کا ضد دکھاتے ہیں سوائے حیرانی کار دین نہیں ہے)

ان مختلف حالات کو دیکھ کر طالب حیران ہو جاتا ہے۔ پھر بعض تو اس وقت بھی شیخ سے بداعتقاد نہیں ہوتے اور نہ خود ویسے اعمال کرتے ہیں بلکہ انکشاف حقیقت کے منتظر رہتے ہیں اور بعض یا تو شیخ سے بداعتقاد ہو گئے یا بدون کشف حقیقت کے تقلید کرنے لگے۔ ایک خرابی مختلف بزرگوں سے ملنے میں یہ ہے کہ شاید کوئی بزرگ اس کو اپنے پیر سے زیادہ نظر آ گئے ان کی کوئی ادا پسند آ جائے جس نے اس کو فریفتہ کر دیا۔ جیسے جہانگیر تو لڑکپن میں نور جہاں کی کہ وہ بھی اس وقت بچی تھی۔ اس ادا پر فریفتہ ہو گیا تھا کہ کسی میلہ میں شہزادہ بھی گیا تھا۔ وہ بھی آئی تھی۔ شہزادہ کے پاس دو کبوتر تھے۔ ہاتھ سے کوئی کام لینے کی ضرورت ہوئی اتفاقاً یہ سامنے موجود تھی۔ شہزادہ نے وہ دونوں کبوتر اس کے ہاتھ میں دے دیئے کہ ان کو تھامے رہے۔ جب جہانگیر فارغ ہوا تو ایک کبوتر ندارد، پوچھا کبوتر کیا ہوا۔ نور جہاں نے کہا اڑ گیا۔ اس نے غصہ میں کہا کہ کیسے اڑ گیا۔ نور جہاں نے دوسرے کو بھی چھوڑ دیا کہ ایسے اڑ گیا جہانگیر اس ادا پر سو جان سے فریفتہ ہو گیا۔ حالانکہ یہ بات اور زیادہ موجب غضب تھی کہ ایک تو گیا ہی تھا اس نے دوسرا بھی کھو دیا۔ مگر دل کے آنے کا کچھ قاعدہ نہیں۔ بعض دفعہ یہ دل ایسی بات پر فریفتہ ہو جاتا ہے جو حقیقت میں قابل فریفتگی کے نہیں ہوتی۔

اسی طرح ممکن ہے کہ آپ کو کسی بزرگ کی کوئی ادا پسند آجائے کیونکہ اس کے کمالات ظاہر تھے اور آپ کے شیخ کے کمالات مخفی تھے۔ وہاں تک نظر نہیں پہنچی۔ اب لگے دوسرے بزرگ سے بیعت ہونے وہ صاحب فراست تھے اُنھوں نے پوچھا کہ تم کسی سے بیعت تو نہیں۔ اس نے اقرار کیا کہ جی ہاں فلاں بزرگ سے بیعت ہوں، اب وہ خفا ہو گئے کہ پھر تم مجھ سے کیوں بیعت ہوتے ہو، وہ تو بڑے کامل ہیں۔ تم ان سے کیوں انحراف کرتے ہو جاؤ میں تم کو بیعت نہ کروں گا۔ اب دونوں طرف سے راندہ گیا۔ اپنے شیخ سے تو اعتقاد نہ رہا اس لئے وہاں سے فیض بند ہو گیا اور دوسرے نے بیعت نہ کیا۔ وہاں سے بھی محروم رہا اور اگر دوسرے نے بیعت بھی کر لیا اور بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو فلاں شخص سے بیعت تھا اس نے مجھے دھوکہ دیا کہ یہ بات مجھ سے ظاہر نہ کی تو اب بعد میں وہ اس سے خفا ہو گئے اور بیعت فسخ کر دی پھر بھی دونوں جگہ سے منہ کالا ہوا۔

اور ایک خرابی مختلف بزرگوں کے ملنے میں یہ ہے کہ کسی وقت دوسرے بزرگ کے مریدوں سے یہ اپنے شیخ کی تعریف کرنے لگتا ہے اس کے جواب میں وہ اپنے شیخ کے فضائل بیان کرتے ہیں۔ پھر یہ اپنے شیخ کے کمالات ظاہر کرتا ہے وہ اس کے جواب میں اس کے شیخ کے عیوب بیان کرتے ہیں۔ یہ ان کے شیخ میں عیوب نکالتا ہے۔ اب تبرّا ہونے لگا اور شیعہ سنیوں کی طرح پارٹی بندی ہو گئی جس کے مفاسد ظاہر ہیں، محتاج بیان نہیں۔ پس آج کل مختلف بزرگوں کی زیارت میں صلاح حاصل نہیں ہوتی بلکہ فساد بڑھتا ہے۔ اس لئے میں بعض لوگوں کو اس سے منع کیا کرتا ہوں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اپنے پیر کے پاس بھی کم جاؤ زیادہ نہ لپٹو۔ کیونکہ گاہے گاہے خاص اوقات میں اس کے پاس جاؤ گے تو اس کو ذکر میں مشغول دیکھو گے رزانت و متانت کی حالت میں پاؤ گے اس سے اعتقاد بڑھے گا اور اگر

ہر وقت لپٹے رہو گے تو کبھی نکتے دیکھو گے کبھی موتتے ہوئے کبھی تھوکتے سنکتے دیکھو گے اس سے تمہیں اعتقاد کم ہو گا، ہاں عقلاء کو ان حالات کے مشاہدہ سے اعتقاد بڑھتا ہے کیونکہ وہ جانیں گے کہ یہ شیخ فرشتہ نہیں بشر ہے مگر بشر ہو کر بے شر ہے تو بڑا کامل ہے اور ناقص العقل کبھی شیخ میں اور اس کی بیوی میں جھگڑا دیکھے گا۔ اس کا ان باتوں سے اعتقاد کم ہو گا، اور اگر اعتقاد بھی کم نہ ہو تب بھی ہر وقت نہ لپٹو کیونکہ آخر شیخ کو بھی تو اپنے اوقات کی پابندی ضروری ہے۔ زیادہ لپٹنے سے اس کو کدورت ہو گی۔ اور شیخ کو مکدّر کرنا طالب کے لئے مضر ہے اس کی رعایت بہت ضروری ہے کہ جس کے پاس جاؤ ایسے وقت میں جاؤ کہ اس وقت تمہارے جانے سے اس کو کدورت نہ ہو۔ فقہاء نے تو اس کی یہاں تک رعایت کی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی جہالت کی وجہ سے کسی دن میں عیادت کو منحوس سمجھتا ہو تو اس کی عیادت کو اس دن نہ جاؤ کیونکہ اس سے اس کو وحشت ہو گی۔ اب بعض خشک مولوی اس مذاق کے ہیں کہ تمہیں اسی دن جانا چاہیئے اور اس کے عقیدے کی اصلاح کرنا چاہیئے۔ سبحان اللہ اصلاح عقیدہ کا وقت بھی یہی رہ گیا یاد رکھو اس دن میں جانے سے جب پہلے ہی اس کو توحش ہو جائے گا تو وہ تمہاری بات پر توجہ بھی نہ کرے گا اصلاح کا طریقہ بھی یہ ہے کہ دوسرے دن جاؤ اور باتوں باتوں میں اس کے عقیدہ کی اصلاح کرو۔

واقعی حضرات فقہاء کا وجود بھی امت کے لئے رحمت ہے۔ مسلمانوں کو تکدّر اور وحشت سے بچانے کا کتنا خیال کیا ہے کہ عیادت میں جاہلانہ عقائد کی بھی رعایت کی ہے کہ جس دن میں جہلا عیادت کو منحوس سمجھتے ہوں اس دن عیادت نہ کرو۔ ورنہ وہ عیادت ایسی ہو گی۔ جیسے ایک بہرہ اپنے دوست کی عیادت کو گیا تھا وہ اس کی صورت ہی دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ یہ کمبخت کہاں آمرا۔ اپنی سب کہے گا اور میری کچھ نہ سنے گا۔ چنانچہ بہرہ نے مزاج پرسی کی کہ اب کیا حال ہے۔ مریض نے جھلّا کر کہا کہ مر رہا ہوں۔

وہ سمجھا یوں کہتا ہے اب افاقہ ہے۔ تو آپ فرماتے ہیں الحمدللہ۔ پھر پوچھا کہ آج کل کونسی دوا استعمال میں ہے۔ مریض نے کہا کہ زہر پی رہا ہوں آپ سمجھے کہ کسی دوا کا نام لیا ہوگا۔ تو فرماتے خدا اسے رگ رگ میں پیوست کرے۔ پھر پوچھا کون سے حکیم کا علاج ہے۔ مریض نے کہا ملک الموت کا بہرہ نے جواب دیا کہ خدا ان کے قدم کو مبارک کرے بڑے اچھے طبیب ہیں۔ تو بتلایئے ایسی عیادت سے کیا نفع جس سے مریض کو بجائے تسلّی کے وحشت ہو اس لئے عیادت کے واسطے وہ لوگ جائیں جن سے مریض کو انس ہو اور اُن کے جانے سے تسلّی ہو ایسے لوگوں کی عیادت سے واقعی مرض میں تخفیف ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک بار کانپور میں مجھے والدصاحب کا خط ملا کہ میں آجکل ایک ضرورت سے الہ آباد آیا تھا یہاں مجھ کو بخار ہوگیا ہے۔ میں خط دیکھتے ہی الہ آباد آگیا۔ پس میرے جاتے ہی والدصاحب بالکل اچھے ہوگئے۔ تو عیادت کے لئے صرف ایسے لوگوں کو جانا چاہیئے جن سے مریض کو انس ہو۔ اور دوسرے لوگ جائیں بھی تو وہاں جاکر زیادہ باتیں نہ بنانی چاہئیں اس سے مریض کو وحشت ہوتی ہے۔ پس مزاج پرسی کرکے تھوڑی دیر بیٹھیں پھر اپنے کام میں لگیں۔ مگر آج کل عادت یہ ہے کہ مریض کے پاس گھنٹوں بیٹھتے اور باتیں بناتے ہیں جس سے اس غریب کو تکلیف ہوتی ہے۔ مگر یہ اپنے گمان میں اس پر احسان کر رہے ہیں۔ افسوس غیرمسلموں میں یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی کسی سے ملنے جاتا ہے تو وہ پوچھ لیتا ہے کہ آپ کو کچھ کہنا ہے اگر کہنا ہوا تو فوراً سن لیا اور جو کچھ کہنا نہ ہوا تو فوراً رخصت کر دیتے ہیں۔ مگر ہمارے یہاں کوئی ایسا کرے تو کمبختی آجائے طعن وتشنیع ہونے لگے اور اس کا راز یہ ہے کہ ہم لوگوں کو کوئی کام نہیں اس لئے وقت کی بھی قدر نہیں الغرض تعزیت میں ان لوگوں کو جانا چاہیئے جن سے وارثوں کو تسلّی ہو باقی لوگوں کو خط سے تعزیت کرنا چاہیئے مگر آج کل قاعدہ یہ ہے کہ جہاں برادری میں کوئی مرا چاروں طرف سے گاڑیاں لیکر برادری والے اس کے یہاں ذحقیہ ڈلتے ہیں اس بیچارے کو ایک غم تو اپنے

عزیز کے مرنے کا تھا دوسرا غم ان زندوں کے کھلانے پلانے کا ہوتا ہے پھر گاڑیوں کے گھاس دانے کا الگ تردد۔ یہ بھی کوئی انسانیت ہے۔ ضلع بلند شہر میں بھی یہی رواج تھا کہ چالیسویں کے دن میت کے گھر ساری برادری جمع ہوتی تھی ایک رئیس زادے نے اس کا خوب علاج کیا اس کے والد کے انتقال کے بعد جب موقع پر ساری برادری جمع ہوئی اُسے ناگوار ہوا کہ مجھے ایک تو والد کا غم تھا دوسرا غم برادری کے کھلانے پلانے کا سر پڑا اُس نے ملامت کے خوف سے عمدہ عمدہ کھانے تو پکوائے اور سارا انتظام کیا جب کھانا تیار ہوگیا اور برادری کے لوگ کھانے کے واسطے بیٹھے اس وقت رئیس زادہ نے سب کو خطاب کرکے کہا کہ مجھے آپ حضرات سے ایک بات عرض کرنی ہے وہ یہ کہ سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ میرے سر پر سے والد صاحب قبلہ کا سایہ اُٹھ گیا ہے اور اس کا جتنا رنج و غم بیٹے کو ہوتا ہے سب جانتے ہیں تو اس حالت میں میری ایک ہمدردی کرنا چاہیئے۔ کیا یہی ہمدردی ہے جو آپ لوگ کر رہے ہیں۔ آپ لوگوں کو شرم نہیں آتی کہ میں تو غم میں مبتلا اور آپ پلاؤ زردہ کھانے کے واسطے تیار۔ بس مجھے جو کہنا تھا کہہ چکا' اب بسم اللہ کیجیئے۔ لوگوں نے کہا کہ تم نے جوتے تو پہلے ہی کھلا دیئے اب کھانا خاک کھا دیں۔ یہ کہہ کر سب لوگ دستر خوان پر سے اٹھ گئے اور دوسرے مکان میں جمع ہوکر ان کی کمیٹی ہوئی کہ واقعی یہ رسم بہت واہیات ہے، اس کو توڑنا چاہیئے، چنانچہ طے ہوگیا کہ میت کے گھر تعزیت کے لئے سب کو جانے کی ضرورت نہیں خاص خاص عزیزوں کو جانا چاہیئے اور برادری والے جائیں بھی تو تعزیت کرکے فوراً واپس چلے آئیں وہاں کھانا نہ کھائیں۔ یہ طے کرکے سب چلے آئے اور وہ کھانا غرباء کو کھلایا گیا۔ یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ میں نے کہا تھا کہ شیخ کے پاس ایسے وقت میں جانا چاہیئے جس میں تمہارا جانا اس پر گراں نہ ہو' بزرگوں کو زیادہ لپٹنے میں یہ بھی خرابی ہے کہ بعض دفعہ ایسی حرکات تم سے صادر ہوں گی جن سے ان کو انقباض ہوگا تھوڑی دیر پاس بیٹھنے میں تو تم اپنی حرکات کی نگہداشت کرسکتے ہو اور ہر وقت پاس رہنے میں اس کی رعایت دشوار ہے۔ اور اہل اللہ میں چونکہ لطافت زیادہ ہوتی ہے

اس لئے ان کو بعض ایسی حرکات سے انقباض ہو جاتا ہے جن کو تم معمولی بات سمجھتے ہو۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک مرید سال میں دو دفعہ آیا کرتا تھا۔ ایک بار ان سے عرض کیا کہ حضرت مجھے حاضر خدمت ہوتے ہوئے اتنا زمانہ گذر گیا آپ نے مجھ سے کوئی فرمائش نہیں فرمائی میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کوئی فرمائش کریں اور میں اس کو پورا کروں۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ بھائی تم محبت سے مل لیتے ہو بس یہی کافی ہے۔ فرمائش کی کیا ضرورت ہے۔ اس نے پھر اصرار کیا۔ تو فرمایا کہ تمہارے اصرار کے بعد میں ایک فرمائش کرتا ہوں بُرا نہ ماننا۔ اس نے کہا حضرت میں تو غلام ہوں۔ میری کیا مجال کہ حضرت کی فرمائش سے بُرا مانوں۔ خصوصاً جب میرے اصرار ہی سے آپ فرمارہے ہیں۔ فرمایا بھائی میری تم سے یہ فرمائش ہے کہ تم سال میں دو دفعہ آیا کرتے ہو اب سے ایک دفعہ آیا کرو کیونکہ تم کھاتے بہت ہو تمہارے کھانے کو دیکھ کر میرے پیٹ میں گڑبڑ ہونے لگتی ہے پھر جب تک مسہل نہیں لے لیتا اس وقت تک طبیعت درست نہیں ہوتی تو سال میں ایک بار مسہل لینا تو آسان ہے۔ مگر دو دفعہ مشکل ہے۔ کیا ٹھکانا ہے لطافت کا کہ دوسرے کو زیادہ کھاتے ہوئے دیکھ کر آپ کے پیٹ میں گڑبڑ ہونے لگتی ہے۔ چاہے کھانے والے کو خاک بھی اثر نہ ہوتا ہو۔

اسی طرح ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت ان کے پاجامہ میں سلوٹیں ایک طرف کم تھیں ایک طرف زیادہ پڑی ہوئی تھیں، مرزا صاحب کی نظر جو سلوٹوں پر پڑی پریشان ہو گئے۔ اتنے تو نازک تھے مگر اسی کے ساتھ آپ کے عدل کی یہ حالت تھی کہ ایک مرید سے آپ نے فرمایا کہ تم اپنے بچوں کو ہمارے پاس نہیں لاتے وہ بیچارہ کچھ بہانہ کر دیتا۔ کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ مرزا صاحب بہت نازک مزاج ہیں اور بچے شوخ ہوتے ہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی کسی حرکت سے آپ کو تکلیف پہونچے جب آپ نے کئی بار تقاضا کیا تو تین چار دن ٹال کر وہ اپنے بچوں کو لائے اور اس عرصہ میں ان کو خوب تعلیم دی کہ اس طرح سر جھکا کر بیٹھنا

یوں ادب کرنا۔ مجلس میں ادھر اُدھر نہ دیکھنا۔ بچوں نے اسی طرح کیا کہ سلام کر کے بت کی طرح خاموش بیٹھ گئے نہ نگاہ اوپر اٹھائی نہ کوئی بات کی۔ اب مرزا صاحب ان کو کھولنا چاہتے ہیں تو کھلتے نہیں۔ مرزا صاحب نے مرید سے فرمایا کہ میاں تم آج بھی اپنے بچوں کو نہ لائے اس نے عرض کیا حضرت یہ حاضر تو ہیں، فرمایا یہ بچے ہیں یہ تو تمہارے بھی ابا ہیں۔ بچے تو کھیلتے ہیں کودتے ہیں، شوخیاں کرتے ہیں، کوئی ہماری ٹوپی اتارتا کوئی کمر پر سوار ہوتا بچے تو ایسے ہوتے ہیں اور یہ تو تمہارے بھی ابا بن کر بیٹھ گئے۔ اُس وقت معلوم ہوا کہ مرزا صاحب نازک نہیں ہیں بلکہ لطیف المزاج ہیں اور لطافت میں خلافِ اعتدال حرکات ناگوار ہوا کرتی ہیں۔ اور بچوں کی شوخی اعتدال کے خلاف نہیں۔ کیونکہ بچپن کا مقتضا یہی ہے کہ بچہ بچوں کی طرح شوخ ہو۔ باوا دادا کی طرح متین نہ ہو۔ اس لئے یہاں آپ کو شوخی ہی پسند تھی متانت پسند نہ تھی۔ غرض اہل اللہ میں چونکہ ذکر اللہ سے لطافت بڑھ جاتی ہے اس لئے ان کو لوگوں کی بے ڈھنگی حرکات سے انقباض ہوتا ہے اور جب شیخ کو انقباض ہوگا تو اس کا قلب تم سے مکدر ہو جائے گا۔ اور شیخ کی مثال پرنالہ جیسی ہے۔ اگر پرنالہ میں گارا کیچڑ بھر دو تو پانی بھی گدلا آئیگا اسی طرح جب تم شیخ کو مکدر کر دو گے تو فیض بھی مکدر ہو کر آئے گا اس لئے اپنے شیخ کو بھی زیادہ نہ لپٹنا چاہیئے۔ ایک ضرر شیخ کو زیادہ لپٹنے سے یہ ہوتا ہے کہ تم نے بزرگوں کے قصے دیکھے تھے کہ فلاں بزرگ رات میں سو رکعتیں پڑھتے اور اشراق کی اتنی رکعتیں پڑھتے تھے اور دن رات میں اتنا ذکر کرتے تھے۔ زیادہ اختلاط سے تم نے اپنے شیخ کو ویسا نہ پایا۔ تو اب تم شیخ سے ضعیف الاعتقاد ہو گئے۔ حالانکہ تم کو اپنے شیخ کے سامنے کسی کی طرف التفات بھی نہ کرنا چاہیئے تھا۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اگر کسی مجلس میں جنید و شبلی ہوں۔ اور حاجی صاحب بھی ہوں تو ہم تو جنید و شبلی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ بس حاجی صاحب ہی کی طرف اپنی نگاہ رکھیں۔ ہاں حاجی صاحب کا جی چاہے وہ ان کی طرف دیکھیں ہم تو کسی کی طرف

بھی نہ دیکھیں گے۔ سبحان اللہ یہ حضرات ہیں شیخ کی قدر جاننے والے۔

جب میں مکہ معظمہ گیا تو حاجی صاحب کی مجلس کے سوا کہیں نہ جاتا تھا۔ اس وقت خلیل پاشا بہت بڑے بزرگ وہاں موجود تھے۔ حاجی صاحب بھی ان کی تعریف فرماتے تھے مگر میں کبھی ان کی خدمت میں نہیں ایک دفعہ خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ تم خلیل پاشا سے ملنے نہیں گئے میں نے کہا کہ شیوخ طُرق ہیں اور طُرق کی مثال ایسی ہے جیسے کراچی اور بمبئی مکہ مکرمہ پہونچنے کے لئے تو اب جو شخص کراچی بندر سے سوار ہوا اس کو بمبئی کے بندر پر آنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور جو بمبئی کے بندر سے سوار ہوا اس کو کراچی جانے کی کیا ضرورت ہے مقصود تو کعبہ ہے اس کے لئے کسی ایک بندر سے سوار ہونا کافی ہے اسی طرح مقصود وصول الی اللہ ہے اس کے لئے ایک شیخ کی صحبت کافی ہے۔ دنیا بھر کے شیوخ کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے میرے اس جواب پر وہ بزرگ خاموش ہو گئے۔

تو جس طرح اپنے شیخ کے ہوتے ہوئے دوسرے شیوخ احیار کی طرف التفات خلاف ادب ہے اسی طرح شیوخ اموات کی طرف التفات بھی مضر ہے اور اپنے شیخ کے حالات کو ان کے حالات سے موازنہ کرنا تو بہت ہی حماقت ہے مگر کثرت اختلاط میں بعض لوگ اپنے شیخ کے اعمال کو پہلے بزرگوں کے اعمال سے موازنہ کرنے لگتے ہیں یہ طالب کے لئے بہت مضر ہے بزرگوں کی صحبت کے آداب سلاطین کی صحبت سے بھی زیادہ ہیں کیونکہ سلاطین تو اپنی سلطنت کے بقاء کے لئے بعض دفعہ اہل دربار کی رعایت بھی کرتے ہیں کہ مبادا یہ ہم سے برگشتہ ہو کر کسی دوسرے کو بادشاہ نہ بنالیں۔ نیز سلاطین میں بزرگوں کے برابر لطافت بھی نہیں ہوتی اس لئے ان کو اہل دربار کی بعض حرکتوں پر التفات بھی نہیں ہوتا اور اہل اللہ کو نہ کسی کا خوف ہے بجز خدا کے نہ کسی کا ان پر دباؤ ہے اور لطافت ان میں بہت ہوتی ہے اس لئے ان کی صحبت کے آداب بہت سخت ہیں جو ان آداب کی رعایت نہ کر سکے اس کو بزرگوں کے زیادہ اختلاط سے منع کیا جائے گا اور جب بزرگوں سے زیادہ اختلاط کرنا بھی مضر ہوتا ہے تو اشرار سے اختلاط کیوں

مضر نہ ہوگا بس سالک کو اکثر اوقات عزلت میں رہنا چاہیئے ہاں جس شخص کی صحبت میں دین ہی دین ہو۔ صلاح ہی صلاح ہو فساد کا بالکل اندیشہ نہ ہو۔ اس سے ملنے کا مضائقہ نہیں بلکہ ایسی جلوت خلوت سے بہتر ہے اور جس کے اختلاط میں فساد کا کچھ بھی اندیشہ ہو اس سے نہ ملے حتیٰ کہ اگر اپنے شیخ کی مجلس میں بھی غیبت ہونے لگے تو فوراً اٹھ جاوٴ جیسے بارش عمدہ چیز ہے اور اس میں نہانا مفید بھی ہے مگر اولے پڑنے لگیں تو بھاگنا ہی چاہیئے۔ اسی طرح شیخ کی باتیں بارش کے مشابہ ہیں اور غیبت وغیرہ اولے کے مشابہ ہے جب تک بارش ہی بارش ہو جمے رہو اور جب اولے پڑنے لگیں تو بھاگو۔

جب آپ کو کثرت اختلاط کے مفاسد اور قلت اختلاط کے منافع معلوم ہو چکے تو اب سنئے کہ شریعت نے قلت اختلاط کی کیا صورت تجویز کی ہے شریعت نے قلت اختلاط کی صورت اعتکاف تجویز کی ہے اور رمضان میں اس کا خاص اہتمام کیا گیا ہے چنانچہ عشرہ اخیرہ میں اعتکاف کرنا سنت موٴکدہ علی الکفایہ ہے اس لئے رمضان سے اس کو بھی خاص تعلق ہے بہرحال تقلیل اختلاط کی یہ ایسی صورت ہے کہ کوئی صاحب ریاضت اسکی نظیر نہیں دکھلا سکتا اعتکاف میں نہ وہ غوائل ہیں جو خلوت محضہ میں ہیں نہ وہ غوائل ہیں جو اختلاط صرف میں ہیں۔ کیونکہ معتکف خلوت میں بھی ہے اور جلوت میں بھی۔ یہ ریاضت خلوت وجلوت دونوں کو جامع ہے۔ ایسی ریاضت جو دونوں کو جامع ہو کسی صاحب ریاضت کے خواب میں بھی نہ آئی ہوگی۔ اہلِ اختلاط نے عزلت میں ایک خرابی یہ بتلائی تھی کہ اس سے تعلیم وتعلم کا باب مسدود ہوتا ہے تو یہ خرابی اعتکاف میں نہیں کیونکہ معتکف کو تعلیم وتعلم سے منع نہیں کیا گیا اور چونکہ اعتکاف مسجد میں ہوتا ہے جہاں اہل علم آتے رہتے ہیں اس لئے معتکف کو تعلیم وتعلم میں کوئی دقت بھی نہیں ہوسکتی۔ ایک خرابی یہ بتلائی تھی کہ عزلت میں جماعت کے ثواب سے محروم ہو جاتا ہے۔ اعتکاف اس سے بھی منزہ ہے کیونکہ اعتکاف کے لئے مسجد جماعت شرط ہے معتکف سے زیادہ تو جماعت کا ثواب کسی کو مل ہی نہیں سکتا وہ تو ہر نماز میں تکبیر اولیٰ کو پاتا ہے اور ہر وقت جماعت کے انتظار میں رہتا ہے اور انتظار جماعت کا ثواب بھی جماعت کے برابر ہے۔ ایک خرابی یہ بتلائی تھی کہ عزلت میں بزرگوں کے فیض سے محروم ہو جاتا ہے

اعتکاف اس سے بھی منزہ ہے کیونکہ یہ شخص پانچوں وقت نمازیوں سے ملتا ہے جن میں بعض اولیاء بھی ہوتے ہیں۔ ایک خرابی یہ بتلائی تھی کہ عزلت میں صرف اپنے اعمال پیش نظر ہوتے ہیں جس سے عجب و کبر کا اندیشہ ہے اور اختلاط میں اپنے سے افضل کے اعمال پر بھی نظر پڑتی ہے تو تواضع پیدا ہوتی ہے۔ اعتکاف میں یہ عائلہ بھی نہیں کیونکہ مسجد میں بہت لوگ نماز کے لئے آتے ہیں جن میں بعضے بہت عبادت کرنے والے ہوتے ہیں معتکف کی نظر ان کے اعمال پر بھی پڑتی ہے تو کبر و عجب پیدا نہیں ہو سکتا۔ ایک خرابی یہ بتلائی تھی کہ عزلت سے شہرت ہو جاتی ہے۔ اعتکاف میں یہ بات بھی نہیں کیونکہ معتکف کسی پہاڑ کی کھو میں نہیں بیٹھتا جس سے شہرت ہو بلکہ بستی کی مسجد میں بیٹھتا ہے جہاں سب سے ملاقات ہوتی رہتی ہے اور اس کو عرفاً گوشہ نشینی اور عزلت گزینی نہیں شمار کیا جاتا اس لئے معتکف کی شہرت بھی نہیں ہوتی۔ ہر سال بیسیوں آدمی اعتکاف کرتے ہیں کوئی بھی بزرگ مشہور نہیں ہوتا۔ اسی طرح اعتکاف میں وہ غوائل بھی نہیں جو اختلاط صرف میں تھے۔ اختلاط میں ایک مضرت یہ تھی کہ اس میں اشرار کی صحبت بھی بعض دفعہ ہوتی ہے اور اشرار کی صحبت سے دین کا ضرر ہوتا ہے سو معتکف اس سے محفوظ ہے کیونکہ اشرار مسجد میں آتے ہی نہیں مسجد میں نمازی آتے ہیں اور نمازی اکثر نیک ہوتے ہیں اور اگر بعضے بد بھی ہوں تو نماز کے وقت تو وہ نیک ہی بن جاتے ہیں اس لئے ان کی صحبت مضر نہیں ہوتی۔ پھر وہ صحبت طویل نہیں ہوتی ایسے لوگ مسجد میں نماز کے بعد ٹھہرتے ہی نہیں تو صرف نماز کے وقت میں تھوڑی دیر کی صحبت ہوتی ہے اور اس میں بھی اشرار شر سے خالی اور نیک کام میں مشغول ہوتے ہیں ایک مفسدہ یہ بتلایا گیا تھا کہ اختلاط میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ باتوں میں وقت برباد ہوتا ہے معتکف اس سے بھی محفوظ ہے کیونکہ اس کے پاس باتیں کرنے والے آتے ہی نہیں مسجد میں نماز سے فراغت کے بعد ٹھہرتا کون ہے جو معتکف سے باتیں کرے دوست احباب بھی گھر پر ہی آتے ہیں مسجد میں کوئی نہیں آتا اس لئے معتکف کو باتیں بنانے کا موقع نہیں ملتا۔ اور کثرت کلام کے غوائل سے وہ محفوظ رہتا ہے اور ذکر و فکر و تلاوت و نماز کے لئے اس کو بہت وقت ملتا ہے۔

ایک مفسدہ اختلاط میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اس میں نگاہ کی حفاظت نہیں ہوتی معتکف اس سے بھی محفوظ ہے اس کے پاس نامحرم عورت کوئی نہیں آتی اور مسجد میں امارد بھی کم آتے ہیں اور جو آتے ہیں وہ نماز کے بعد بھاگ جاتے ہیں غرضکہ معتکف سے ایسا اختلاط کسی کا نہیں ہوتا جو اس کا وقت ضائع ہو یا دوستی یا دشمنی پیدا ہو اور مزہ یہ ہے کہ معتکف سے نماز کے وقت سب ملنے آتے ہیں یہ کسی سے ملنے نہیں جاتا اور ویسے بھی کسی کو اس سے ملنا ہو تو خود ہی آئے گا۔ یہ کہیں نہیں جاتا تو خوب آزاد رہتا ہے اور اس کی آزادی کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

نہ بر اشتر سوارم نہ چو اشتر زیر بارم
نہ خداوند رعیت نہ غلام شہریارم

(نہ تو اونٹ پر سوار ہوں اور نہ مثل اونٹ زیر بار ہوں میں نہ کسی رعایا کا مالک ہوں نہ کسی بادشاہ کا غلام ہوں)

غرض اعتکاف ایسی عجیب ریاضت ہے کہ خلوت و جلوت دونوں کے منافع اس میں موجود ہیں اور غوائل سے دونوں کے مبرا ہے اس لئے شریعت میں اعتکاف کی بہت فضیلت بیان کی گئی ہے اور اس کی ترغیب دی گئی ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے ھو (ای المعتکف) یعتکف الذنوب و یجزی لہ من الحسنات کعامل الحسنات کلھا رواہ ابن ماجہ کہ معتکف گناہوں سے الگ رہتا ہے اس پر بظاہر ایک اشکال وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر کوئی شخص اعتکاف نہ کرے اور ویسے ہی گھر بند کر کے خلوت اختیار کر لے وہ بھی گناہوں سے بچ سکتا ہے پھر اعتکاف کی اس میں کیا خصوصیت ہے اور اگر خصوصیت نہیں تو اس حکم کو بعنوان معتکف بیان کرنا صحیح نہ ہو گا کیونکہ بقاعدہ بلاغت مسند الیہ مشتق میں مادۂ اشتقاق علت حکم ہوا کرتا ہے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ کف عن الذنوب کی علت اعتکاف ہے اور یہ مطلب بدون خصوصیت کے صحیح نہیں ہو سکتا جواب یہ ہے کہ گناہوں کے ترک کرنے کی دو قسمیں ہیں اور ہر ایک کا جدا جدا حکم سو ایک ترک تو اصلی ہے یعنی گناہ کا عدم اصلی کے ساتھ منعدم ہوتا اور ایک وہ ترک ہے جو عزم کے ساتھ ہو یعنی ترک کو قصد کے ساتھ متعلق کیا سو اول قسم ہو تو کوئی ثواب

نہیں ملتا اس لئے کہ ثواب اعتقاد قصد پر ہے۔ دوسرے ایسے تروک تو غیر متناہی ہیں۔ تو چاہیئے ہر آن میں غیر متناہی اجر ملا کرے۔ اور اس کا کوئی قائل نہیں اس کا التزام خلاف اجماع ہے اور دوسری قسم پر ثواب ہوتا ہے یعنی کسی معصیت کی طرف التفات ہو اور اس سے اپنے کو روک لیا اس پر ثواب ملتا ہے یہ قاعدہ تو عام ہے اب سمجھو کہ اعتکاف میں یہ تخصیص ہے کہ معتکف کو تمام تروک پر ثواب ملتا ہے گو وہ اس کے ذہن میں بھی نہ ہوں اور اس نے ان کے ترک کا قصد بھی نہ کیا ہو بس یہ خصوصیت ہے اعتکاف میں جو مطلق خلوت میں نہیں جس کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ھوا (ای المعتکف) یعتکف الذنوب اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ویجزی لہ من الحسنات کعامل الحسنات کلھا یعنی جن حسنات پر یہ قادر تھا اور اعتکاف کی وجہ سے نہیں کر سکتا گو اس نے ان کی نیت بھی نہ کی ہو ان سب کا ثواب اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا ہے (اور دلیل اس عموم کی الحسنات کلھا کا عموم ہے) پس جب معتکف کے لئے تمام حسنات کا ثواب لکھا جاتا ہے تو اس سے پہلے جملہ کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام گناہوں سے بچنے کا ثواب بھی لکھا جاتا ہے گو اس نے ان سے بچنے کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ اہل اختلاط نے جو عزلت میں یہ خرابی بیان کی تھی کہ اس کی وجہ سے آدمی خدمت خلق کے ثواب سے محروم ہو جاتا ہے اعتکاف اس سے بھی بری ہے کیونکہ اس میں تمام طاعات کا جن پر معتکف قادر تھا مگر اعتکاف کی وجہ سے نہ کر سکا ثواب ملتا ہے پس مطلق خلوت اعتکاف کے برابر نہیں ہے گو گناہوں سے بچنا اس میں بھی ممکن ہے اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اعتکاف میں عبدیت زیادہ ہے کہ لوگ کمانے کھانے اور سیر و تفریح میں مشغول ہیں اور معتکف اپنے آقا کے دروازہ پر پڑا ہے اور زبانِ حال سے یوں کہہ رہا ہے ؎

خسرو غریب است و گدا افتادہ در کوئے شما ‌‌ ‌ شاید کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

(خسرو غریب الوطن آپ کی گلی میں پڑا ہوا ہے امید کہ اللہ کے لئے ہم غریبوں کی طرف توجہ فرمایئے)

اگر معتکفین اس شعر کے مضمون کو مستحضر رکھیں تو اعتکاف میں ان کو ایک خاص کیفیت حاصل ہوگی بلکہ گاہے گاہے اس شعر کو پڑھ لیا کریں تو اور اچھا ہے۔ غرض شریعت نے جو مجاہدہ بھی تجویز کیا ہے وہ نہایت عجیب ہے کہ منافع مجاہدہ کے اس میں سب مجتمع ہیں بلکہ مع شئے زائد اور غائلہ کچھ نہیں۔ بحمداللہ اب چاروں مجاہدات کا بیان ختم ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ رمضان میں مجاہدات اربعہ کی ایسی عجیب طرز سے رعایت کی گئی ہے کہ کسی صاحب ریاضت نے آجتک ایسی رعایت نہیں کی اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ بقیہ ایام میں ہم کو عمل کی توفیق دیں۔ اور اگر روزہ و ذکر و تلاوت قرآن و تراویح وغیرہ میں ہم سے کچھ کوتاہی ہو گئی ہو تو حق تعالیٰ بقیہ ایام میں اس کی تلافی کی ہمت عطا فرمادیں ابھی ایک رات اور باقی ہے جس میں شب قدر کا احتمال ہے کیونکہ شب قدر بعض قول پر رمضان کی تیسویں شب میں بھی ہوتی ہے[۱] اور اگر شب قدر نہ بھی ہو تب بھی رمضان کی رات تو ہے اور رمضان کی ہر رات قابل قدر ہے اور اگر چاند بھی ہو جاوے تو شب عید تو ہے جس کے احیاء کو فقہاء نے مستحب فرمایا ہے۔ کما فی الدر المختار۔ بلکہ رمضان اور عید کی کیا خصوصیت ہے رات کو ہر اک ہی قابل قدر ہے کسی نے خوب کہا ہے ؎

اے خواجہ چہ پرسی زشب قدر نشانی
ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی

(اے خواجہ شب قدر کی نشانی کیا پوچھتے ہو تم ارے ہر شب شب قدر ہے اگر تو قدرداں ہوتا)

---

[۱] کما فی النواوی وقیل تختص باوتار العشر وقیل باشفاعها کما فی حدیث ابی سعید اه والحدیث رواه مسلم وفیه فالتمسوها من العشر الاواخر من رمضان التمسوها فی التاسعة والسابعة والخامسة قال قلت یا ابا سعید انکم اعلم بالعدد منا قال اجل نحن احق بذلك منکم قال قلت ما التاسعة والسابعة والخامسة قال اذا مضت واحدة وعشرون فالتی تلیها اثنتان وعشرون وهی التاسعة فاذا مضی ثلث وعشرون فالتی تلیها السابعة فاذا مضی خمس وعشرون فالتی تلیها الخامسة الحدیث قلت وکذا اذا مضی سبع وعشرون فالتی تلیها الثالثة اذا مضی تسع وعشرون فالتی تلیها هی الاولیٰ فهذه تسع لیال واللّٰه اعلم ۱۲ منه

اس لئے اس رات میں جاگنا چاہیئے اور اگر کسی کو خود جاگنا نہ آتا ہو تو کم از کم جاگنے والوں کے پاس ہی آ پڑے ان کی حالت دیکھ کر جبھی ہو جائے گی پھر خود بھی جاگنا آسان ہو جائے گا۔ اس لئے مولانا نے اس جماعت کی مجاورت ہی کا مشورہ دیا ہے فرماتے ہیں ؎

خواب را بگذار امشب اے پدر
یک شبے در کوئے بے خواباں گذر

(اے پدر خواب کو ایک رات ترک فرمائے ایک رات کسی بے خواب کی گلی میں جاسے)

جن لوگوں کو تہجد کی عادت نہ ہو وہ چند روز خانقاہ میں آکر رہیں انشاء اللہ بہت بہت جلد عادت ہو جائے گی۔ ایک بات قابل تنبیہ یہ ہے کہ شب قدر میں تمام رات جاگنا لازم نہیں بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ شب قدر میں تمام رات جاگنا ضروری ہے جبھی اسکی فضیلت حاصل ہوتی ہے اور کہتے ہیں کہ شب قدر ایک خاص وقت کا نام ہے جس میں تجلّی ہوتی ہے یہ صحیح نہیں بلکہ تمام رات کا ہر حصہ شب قدر ہے چنانچہ قرآن میں ہے ھی حتی مطلع الفجر اور یہ جو حدیث میں آتا ہے من حرمھا فقد حرم الخیر کلہ وہ بھی ہماری ہی دلیل ہے کیونکہ محروم ہونا یہ ہے کہ کچھ نہ ملے اور اگر کچھ مل جائے تو وہ محروم نہیں جیسے سائل کو ایک روپیہ یا ایک پیسہ ہی مل جائے تو اس کو محروم نہیں کہہ سکتے۔ پس اگر کوئی شخص تمام رات نہ جاگے۔ بلکہ سحری ہی میں اٹھ کر صبح سے پہلے دو رکعت نماز پڑھ لے اس نے بھی شب قدر کی فضیلت حاصل کر لی محروم نہیں ہوا چنانچہ شامی نے امداد سے ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے وقیل بساعۃ منہ باب السنن والنوافل اور جو ہمت کر کے زیادہ جاگے بیشک اس کو زیادہ فضیلت حاصل ہوگی لیکن احیاء لیل کے لئے تمام رات جاگنا ضروری نہیں بلکہ بعض کو تو ساری رات جاگنا ممنوع ہے جن کو اس سے اپنے بیمار ہونے کا اندیشہ ہو۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جو طالبین جمع ہوتے تھے وہ سب کے سب دو بجے رات کو جاگتے تھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی دو بجے اٹھنا چاہتے تو حاجی صاحب ان سے فرماتے کہ ابھی بہت رات ہے سو رہو۔ بس مولانا صبح کے قریب اٹھتے تھے کیونکہ بوجہ نازک مزاجی کے مولانا کو زیادہ جاگنا مضر تھا

اس لئے حاجی صاحب دو بجے اٹھنے سے ان کو منع فرماتے اور ایسے ہی موقع پر حضرت حاجی صاحب یہ شعر پڑھ دیتے تھے ؂

گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم
بس ہے اپنا ایک بھی نالہ اگر پہونچے وہاں

یہ شعر حاجی صاحب ہی کا ہے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ زیادہ محنت کرنے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ قاعدہ کے ساتھ کام کرنے سے نفع ہوتا ہے ایک شخص دو بجے سے جاگ کر ذکر میں مشغول ہوگیا مگر سر میں درد ہے، کام میں جی نہیں لگتا یا نیند کے جھونکے آرہے ہیں یہ مفید نہیں اس شخص کو تین بجے اٹھنا چاہیئے جب نیند خوب بھر جائے اب جو یہ کام میں لگے گا دماغ تازہ ہوگا توجہ بھی خوب ہوگی اس سے نفع ہوگا۔ شب قدر کے متعلق یہ ضروری مضمون تھا اس لئے بیان کردیا۔

اب میں ختم کرتا ہوں۔ اور اس بیان کا نام "تقلیل الاختلاط مع الانام فی صورۃ الاعتکاف فی خیر مقام" تجویز کرتا ہوں اور خیر مقام سے مراد مسجد ہے۔ جیسے یہ وعظ لمبا ہے ایسے ہی اس کا نام بھی لمبا ہوگیا اور مجموعہ مواعظ اربعہ کا نام "ابواب المجاہدہ" رکھتا ہوں۔ چونکہ یہ چاروں وعظ ایک ہی آیت کے متعلق ہیں اور ان میں مضمون بھی ایک ہی بیان ہوا ہے یعنی مجاہدہ کا اس لئے جو صاحب ان کو طبع کریں وہ سب کو یکجا طبع کریں متفرقاً طبع نہ کریں کہ اس سے مضمون میں تشتت ہوجاوے گا۔ اس سے پہلے بھی رمضان کے متعلق چند مواعظ یکجا ہی طبع ہوئے ہیں جن کا لقب ہفت اختر ہے چونکہ یہ وعظ چار ہیں اس لئے ان کا لقب عناصر اربعہ مناسب ہے کیونکہ ان میں مجاہدہ کے چار ارکان بیان ہوئے ہیں اور لغت میں ارکان و عناصر ہم معنے ہیں۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ فہم سلیم عطا فرمائے اور عمل کی توفیق دے آمین

وصلی اللہ تعالیٰ وسلم علی خیر خلقہ سیدنا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین واخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین

والحمد للہ الذی بنعمتہ وجلالہ تتم الصالحات

تمت

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ مسمّٰی بہ

طریق القلندر

لحریق السمندر

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی —— دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ / ایم اے جناح روڈ کراچی ۱

ضروری اطلاع :- خط وکتابت کرتے وقت یا پتہ تبدیل کرتے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمایا کریں

سلسلہ التبلیغ کا وعظ مسمّٰی بہ

طریق القلندر ــــ تحریق السمندر

أین	متٰی	کم	کیف	لِمَ	ماذا	من المخاطب	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر میں ہوا	کس طرح ہوا	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	[illegible]	کس نے ضبط کیا	سامعین کی تعداد	متفرقات
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	احقر عبدالحسن نہایت محجوب ہے کہ تقریباً ۱۴ سال کے بعد احقر چار ماہ کی رخصت لیکر حاضر خانقاہ ہو کر بفیض حضرت اقدس مدظلہ العالی یہ وعظ قابل اشاعت ہو سکا۔ اس سے قبل اتنی طویل فرصت میسر ہی نہ آئی اس وعظ کا احباب کو بیحد اشتیاق اور اصرار تھا۔ الحمدللہ کہ وہ پورا ہوا یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ وعظ صرف اپنی حقیقت ہی ص

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور

ص کے لحاظ سے قلندرانہ شان نہیں رکھتا بلکہ جس ہیئت سے بیان کیا گیا جس کیفیت سے سنا گیا اور جس صورت سے صاف ہوا وہ بھی قلندرانہ تھی چنانچہ صاف ہونے کی تو یہ صورت ہوئی کہ چودہ برس میں طویل وقفات کے بعد اس کی تکمیل ہوئی اور بیان کے وقت حضرت واعظ کی ہیئت تھی کہ ایک منہ تا دیہاتی لٹھ سر سے اونچا ہاتھ میں (کیونکہ عین وقت پر کوئی ہلکا عصا مل نہ سکا) کمر بند گھٹنوں سے نیچا لٹکا ہوا عمامہ کے پیچ ادھر اُدھر ڈھلے ہوئے اچکن کے بٹن اور بند کھلے ہوئے لیکن دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ اس وارستہ حالی میں بھی حضرت پر ایک عجب شان دلربائی برس رہی تھی اور ہزار حسن اس ادا پر قربان ہو رہے تھے بس اس شعر کا پورا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے تھا ؎ قبا واکردہ و کاکل پریشاں کردہ می آیند ؛ ببیں ایں بے سروساماں چہ ساماں کردہ می آید۔ سامعین کی یہ کیفیت تھی کہ گویا کھلی آنکھوں اس کا مشاہدہ ہو رہا تھا ع قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ جب قریب اختتام حضرت نے یہ فرمایا کہ میں اب صرف پانچ منٹ اور بیان کروں گا تو بزبان حال یہ کہہ رہے تھے (بقول کسے) ؎ دلربا پہلو سے اٹھ کر اب جدا ہونے کو ہے ؛ کیا غضب ہے کیا قیامت ہے یہ کیا ہونے کو ہے۔ ؎ آج تو جی بھر کے پی لینے دے اے ساقی مجھے ؛ جان ہی جاتی رہے گی اور کیا ہونے کو ہے۔ اور بوقت رخصت یہ ؎ کہتے جاؤ آرزو پوری کسی مشتاق کی ؛ ایک ذرا ٹھہرو کوئی تم پر فدا ہونے کو ہے ؛ شوخ رفتاری کا اپنی دیکھ تو مڑ کر اثر ؛ ساتھ ساتھ اٹھ کر رواں ہر نقش پا ہونے کو ہے صوفیوں پر تو وجد کی کیفیت طاری تھی۔ اللہ تعالیٰ حضرت واعظ کو مدت مدید تک بعافیت تمام سلامت باکرامت رکھے اور ممدوح کے فیوض و برکات کو تا قیامت جاری رکھے ویرحم اللّٰہ عبداً قال آمینا ؎ آخر میں عرض ہے کہ واللہ یہ محض حضرت کی دعا کی توجہ کی برکت ہے کہ اس قدر دشوار کام مجھ جیسے سہل انگار اور لا ابالی شخص سے لے لیا گیا جس کو چودہ برس تک میں نہ کر سکا یہ زمانہ رخصت بھی یوں ہی ختم ہو گیا تھا صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا جبکہ حضرت کو خاص توجہ ہوئی پھر تو یہ حال تھا کہ دن رات ایک کر دیئے اور الحمدللہ کہ خانقاہ کو چھوڑنے سے صرف دو دن قبل وعظ ختم ہو گیا اور آج یہ تمہید بھی ختم ہوئی اور کل یہاں سے بصد حسرت و یاس روانہ ہو جاؤں گا ؎

دیکھ لیں سب قوت بازوئے دوست ؛ مجھ سے سرکش پر ہوا قابو دوست۔ والسلام جمعہ ۲۲ ذی الحجہ ۱۳۵۰ھ

ؔ اس ترکیب ایمائی میں مقصود تشبیہ دینا ہے طریق کو یعنی عشق کو نار کے ساتھ وہ قلندر کو یعنی عاشق کو سمندر کے ساتھ کہ آتشی جانور ہے اور نار اس کی غذا ہے اسی طرح عشق غذا عاشق کی ہے ۱۲

انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وعلےٰ اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ط ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝

(ترجمہ) اے ایمان والو جو شخص تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایسی قوم پیدا کر دے گا جن سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہو گی اور اللہ تعالےٰ سے ان کو محبت ہو گی۔ مہربان ہوں گے وہ مسلمانوں پر۔ تیز ہوں گے کافروں پر جہاد کرتے ہوں گے اللہ کی راہ میں اور وہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خیال نہ کریں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہیں عطا فرماویں اور اللہ تعالےٰ بڑی وسعت والے ہیں بڑے علم والے ہیں تمہارے دوست تو اللہ اور اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم اور ایمان دار لوگ ہیں جو کہ اس حالت سے نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں کہ ان میں خشوع ہوتا ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے دوستی رکھتا ہے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اور ایمان دار لوگوں سے سو اللہ کا گروہ بلاشک غالب ہے۔

جن آیتوں کی میں نے تلاوت کی ہے ان میں ہر چند کہ مضامین متعدد ہیں مگر باوجود تعدد کے غیر مربوط نہیں بلکہ ان مضامین میں باہم ارتباط ہے اور ارتباط بھی ایسا کہ تابعیت اور متبوعیت یا اصالت اور غیریت کا کیا معنی کہ ان میں بعض اجزا اصل ہیں اور بعض فروع د

توابع یا یوں کہئے کہ بعض مقصود ہیں اور بعض متمم اور مکمل یا یوں کہئے کہ بعض مقصود ہیں اور بعض علامات و آثار بہرحال جس عنوان سے چاہے تعبیر کیجئے حاصل یہ ہے کہ بعض مضامین اصل ہیں اور بعض تابع اب اس اصل کو جس لفظ سے چاہے تعبیر کر دیا جاوے اور تابع کو جس لفظ سے چاہے تعبیر کر دیا جاوے لیکن یہ خوب سمجھ لیا جاوے کہ تابع کے یہ معنی نہیں کہ وہ مقصود نہیں بلکہ مقصود وہ بھی ہیں مگر مقصود مقصود میں فرق ہوتا ہے یعنی ایک تو مقصود ہوتا ہے من کل الوجوہ اور ایک مقصود ہوتا ہے من بعض الوجوہ گو لزوم و وجوب دونوں میں مشترک ہوتا ہے مثلاً جیسے نماز اور وضو۔ ہر شخص جانتا ہے کہ نماز اصل ہے اور وضو تابع اور اس کی شرط ہے مگر باوجود اس کے یہ نہیں ہے کہ وضو کسی درجہ میں بھی مقصود نہیں یعنی اس معنی کر غیر مقصود نہیں ہے کہ بلا وضو بھی نماز کو جائز سمجھا جاوے بلکہ دونوں میں عجیب تعلق ہے کہ وضو تو بلا نماز کے صحیح ہے لیکن نماز بلا وضو کے صحیح نہیں یعنی یہ تو ہے کہ بدون وضو کے نماز درست نہیں لیکن اس کا عکس نہیں ہے مثلاً اگر کوئی وضو تو کر لے مگر نماز نہ پڑھے یعنی جس نماز کے لئے وضو کیا ہے اس نماز کے وقت کے اندر اس وضو سے اس نماز کو ادا نہ کرے تب بھی جب دوسرا وقت نماز کا آئے گا تو کسی مفتی کا فتویٰ نہیں کہ اس دوسری نماز کے لئے پھر وضو کرنے کی ضرورت ہے بلکہ وہی وضو کافی ہوگا دوسری نماز کے لئے اداءً اور پہلی نماز کے لئے قضاءً غرض وضو بلا نماز صحیح ہوسکتا ہے لیکن نماز بلا وضو صحیح نہیں ہوسکتی یہ مثال اور اس مثال کے اندر یہ خصوصیت یاد رکھنے کے قابل ہے تاکہ اجمالاً ایک غلطی معلوم ہو جاوے جو بعض لوگ اعمال کے اندر کرتے ہیں کہ مقاصد غیر مقاصد کے اندر تفصیل کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اعمال غیر مقصود کا حذف بھی جائز ہے یعنی آجکل یہ بہت زبان زد ہے کہ مقصود تو حق تعالیٰ کی یاد ہے اور نماز روزہ وغیرہ محض اس کے ذرائع ہیں اور غیر مقصود ہیں۔ چنانچہ اس زمانہ میں بہت لوگوں نے یہ مشرب اختیار کر رکھا ہے۔ اس مثال سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ نماز روزہ وغیرہ کا غیر مقصود ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ وضو کا کہ گو غیر مقصود ہے لیکن کیا اس کو جائز الحذف

یا جائز الترک کہہ سکتے ہیں ہرگز نہیں بلکہ غیر مقصود ہونے کے معنی یہ ہیں کہ مقصود کے برابر نہیں اور غیر مقصود بھی محض اس درجہ میں ہے کہ نماز کا رکن اور اس میں داخل نہیں کیونکہ شرط ہمیشہ مشروط سے خارج ہوا کرتی ہے مگر بوجہ شرط ہونے کے مقصود کی تکمیل و متمم ہونے کے درجہ میں یہ بھی مقصود ہے۔ بہر حال مقصود کے درجات ہوا کرتے ہیں خوب سمجھ لیجئے۔ میرے الفاظ مقصود و غیر مقصود سے شبہ ہوسکتا تھا اس کو رفع کرنا ضروری تھا چنانچہ اس مثال سے اس کو رفع کردیا گیا بلکہ اس طرح کہا جاوے تو اور زیادہ واضح ہے کہ مقصود تو سب اعمال ہیں لیکن بعض مقصود ہیں اور بعض مقصود المقصود و مقصود اعظم ہیں۔ بہر حال وہ شبہ حذف ہوگیا اب بعد حذف شبہ کے میں پھر عود کرتا ہوں اپنی تقریر کی طرف یعنی جتنے اجزاء ان آیتوں میں ہیں وہ ہیں تو سب کے سب مقصود لیکن ان میں جو مضمون مقصود اعظم ہے اس کو اس وقت بیان کرنے کے لئے میں نے تجویز کیا ہے کیونکہ وہ مضمون از روئے قواعد شرعیہ کے نیز باعتبار اپنی نوع کے اصل ہے باقی مضامین اُسی کے متمم اور توابع اور لاحق ہیں یہ حاصل ہے اس مضمون کا۔ اس مضمون کا حاصل مفصل تو ان آیتوں میں ہے جو عنقریب بیان میں ان شاء اللہ تعالیٰ آنے والا ہے اور مجمل حاصل ایک اور بھی ہے کہ جو حضرت عراقی کے ایک شعر میں ایک دوسرے عنوان سے مذکور ہے جس کے متعلق ایک دوست نے مجھے مشورہ بھی دیا کہ اس شعر کا مضمون آج بیان کیا جاوے۔ وہ شعر حضرت عراقی کا یہ ہے ؎

صنمارہ قلندر سزد ار بمن نمائی　　　که دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(میرے مرشد مجھے تو طریق جذب کا رستہ دکھلادے۔ کیونکہ ریاضت و محنت کا راستہ بہت دشوار معلوم ہوتا ہے)

اس وقت اس فرمائش کو میں نے قبول نہیں کیا تھا مگر رد بھی نہیں کیا تھا وجہ یہ ہے کہ بیان بالکل اختیار میں نہیں نہ پہلے سے کوئی مضمون تجویز کیا جاتا ہے۔ عادت اللہ ہر ایک کے ساتھ جدا ہے اکثر اور غالب معاملہ اپنے ساتھ یہی دیکھا جاتا ہے کہ عین وقت پر

یا قریب کوئی مضمون خود تقاضا کرتا ہے قلب میں۔ بس اسی کا اتباع کیا جاتا ہے اور اسی کو بیان کر دیا جاتا ہے جس عنوان سے بھی میسر ہوا۔ تو اس وقت گو اس فرمائش کو قبول نہیں کیا گیا لیکن رد کی بھی کوئی وجہ نہ تھی بلکہ ذہن خالی تھا۔ مگر وقت کے قریب اسی مضمون کا تقاضا قلب میں پیدا ہوا ہیں نکتہ اس وقت یہ سمجھا تھا کہ چونکہ یہ بیان ایک بزرگ کے مزار کے قریب ہے جو بزرگ اسی لقب کے ساتھ مشہور ہیں (یعنی حضرت شرف الدین بوعلی شاہ قلندر قدس سرہٗ العزیز ۱۲ جامع) اس لئے یہ فرمائش کی گئی ہے۔ غرض میں یہ سمجھا تھا کہ محض شاعری نکتہ ہے اسی واسطے قلب نے اُس فرمائش کو قبول نہیں کیا لیکن بعد اُس کے اس کی ضرورت بھی معلوم ہوئی۔ وہ ضرورت یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی حالت دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر تو وہ ہیں کہ جنھیں اعمال کی طرف توجہ ہی نہیں۔ بہت سے ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ نہ نماز نہ روزہ اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ نماز روزہ کے ساتھ تمسخر بھی ہے۔ اور استہزار بھی ہے کوئی تہذیب کے ساتھ استہزار کرتا ہے کوئی بدتہذیبی کے ساتھ تو فقط ترک ہی نہیں بلکہ استہزار اور استخفاف بھی ہے۔ اور اگر خیر استہزا اور استخفاف نہ بھی ہو تو اخلال اور سستی اور کسل تو ضرور ہے استطاعت ہے اعمال کی مگر نہیں کرتے نماز روزہ کر سکتے ہیں مگر نہیں کرتے۔ بدنگاہی سے بچ سکتے ہیں مگر نہیں بچتے۔ غیبت سے بچ سکتے ہیں مگر نہیں بچتے۔ پرائے حقوق سے بچ سکتے ہیں ہیں مگر نہیں بچتے۔ سب وستم۔ لڑائی جھگڑا۔ مکروفریب ان سب سے بچ سکتے ہیں مگر نہیں بچتے۔ کثرت سے تو ہم لوگوں کی یہی حالت ہے کہ گویا اعمال ہیں ہی نہیں بلکہ بجائے ان کے دوسرے اعمال ہیں یعنی معاصی میں مبتلا ہیں۔ اور زیادہ ایسے ہی ہیں مگر اس کے ساتھ ان لوگوں کو اپنے اعمال وطاعات کا دعوے بھی نہیں اس لئے یہ لوگ اتنے زیادہ قابل شکایت نہیں جتنے قابل شکایت وہ لوگ ہیں کہ ان کے یہاں اعمال بھی ہیں تقویٰ بھی طہارت بھی اور اپنے کو عابد و زاہد بھی سمجھتے ہیں مگر ان اعمال میں روح نہ ہونے سے وہ اعمال ایسے ہیں جیسے بادام بلا مغز۔ یا دودھ بلا روغن۔ ان کے حال پر زیادہ تاسف ہے اور وہ زیادہ قابل رحم ہیں۔ دو وجہ سے

ایک تو یہ کہ بیچاروں نے محنت بھی کی مشقت بھی اٹھائی مجاہدے بھی کئے مگر افسوس پھر بھی مقصود حاصل نہ ہوا۔ سارے دن چلے دھوپ سہی، خاک پھانکی پیروں میں آبلے پڑے مگر منزل پھر بھی نہ قطع ہوئی مجھے یاد ہے کہ میرے ایک عزیز نے رات کو سفر کا قصد کیا۔ سواروں میں نوکر تھے رخصت قریب ختم تھی۔ ملازمت پر واپس جا رہے تھے۔ بھتیجے نے کہا بھی کہ اندھیری رات ہے اس وقت نہ جایئے پریشان ہو جیئے گا۔ لیکن نہیں مانا۔ کہا تم بچہ ہو۔ کیا سمجھو نوکری کا معاملہ ہے رضا ختم ہوگئی ہے میں کیسے رک سکتا ہوں۔ بھتیجہ نے کہا بہت اچھا جایئے مگر پریشان ہو جیئے گا۔ خیر صاحب چلے وہاں سے۔ رات ایسی اندھیری کہ چل تو رہے مگر کچھ پتہ نہیں کہ کدھر جا رہے ہیں۔ دو چار میل تو خیر ٹھیک چلے کیونکہ اپنے گاؤں سے اتنی دور تک تو راستہ ہر شخص کو معلوم رہتا ہی ہے بلے دیکھے بھی آدمی جا سکتا ہے مگر آگے چل کر خدا معلوم رُخ کس طرف کو ہو گیا کہ راستہ بھولے اور ایسے بھولے کہ بھولنے کو بھی بھول گئے۔ اور بھولنا تو وہی ہے کہ بھولنے کو بھی بھول جاوے، چنانچہ رستہ بھول کر خدا جانے کہاں کے کہاں پہونچے۔ اور بالآخر خدا جانے کیسا چکر کھایا کہ پھر اسی رستے کو ہو لئے جس سے روانہ ہوئے تھے، اب وہ تو سمجھ رہے ہیں کہ ہم آگے کو چل رہے ہیں اور حقیقت میں ہٹ رہے ہیں پیچھے۔ غرض ساری رات گھوم گھام کر صبح کو لوٹ کر پھر وطن شریف ہی میں آپہونچے۔ صبح صادق کا وقت تھا ان کے مکان کے قریب جامع مسجد ہے جو بہت کرسی دار ہے۔ اور اس کے فنا ر میں ایک برگد کا درخت ہے۔ جامع مسجد کو دیکھ کر کہا اخاہ یہ کونسا گاؤں ہے جس کی مسجد بھی ایسی ہی ہے جیسی ہمارے گاؤں کی پھر برگد ملا، کہا ارے میاں یہ تو درخت بھی ویسا ہی ہے جیسا ہمارے گاؤں کا، یہ گانوں تو ہمارے وطن کا مذکر ہے۔ بھائی یہ گانوں تو بہت اچھا ہے۔ آگے بڑھے تو اپنا سا مکان بھی معلوم ہوا۔ اب سمجھ میں آیا کہ کیا قصہ ہے بھتیجے صاحب مکان سے نکل کر نماز کو جا رہے تھے۔ انھوں نے کہا اسلام علیکم کہا کون۔ فلانے۔ کہا ہاں۔ کہا میاں یہ تو بتاؤ میں ہوں کہاں۔ کہا وہیں ہو

جہاں میں ہوں اور کہاں ہوتے۔ کہا ارے میاں میں تورات بھر چلتا رہا اور پھر گھر کے گھر ہی میں رکھے ہوئے لاحول ولا قوۃ۔ یہ تو بڑی واہیات بات ہوئی بھتیجے نے کہا میں نے آپ سے کہا نہ تھا لیکن آپ نے مانا ہی نہیں تو بڑا افسوس ہے ایسے مسافر پہ جو ساری رات تو سفر کرے اور صبح کو پھر وہیں آجاوے جہاں سے چلا تھا۔ تھکا بھی ماندہ بھی ہوا۔ وقت بھی صرف ہوا پھر بھی وہیں کا وہیں جہاں پہلے تھا خیر یہاں یہ بات تو نہیں ہے کہ یہ شخص بالکل مشابہ ہے اس مسافر کے۔ یہاں راستہ کچھ نہ کچھ قطع تو ہوتا ہے لیکن بالکل ناتمام یعنی ایسے جیسے چھکڑے کی چال کہ صبح سے شام تک تو چلا اور کتنا آیا۔ دس میل۔ اور ایک ریل ہے کہ اتنے میں دو سو میل نکل گئی۔ اب یہ دیکھنا چاہئے کہ ریل اور چھکڑے کی رفتار میں جو اس قدر تفاوت ہے تو اس کا سبب کیا ہے۔ ریل میں آخر وہ چیز کیا ہے جس نے اس کی رفتار کو اس درجہ تک پہنچا دیا ہے سبب اس تفاوت رفتار کا یہی ہے کہ ریل میں مشین لگی ہوئی ہے اُسی نے اس کو ہوا بنا رکھا ہے۔ اگر چھکڑے میں بھی ویسی ہی مشین لگا دیں تو اس میں بھی وہی بات پیدا ہو جاوے گی بالخصوص جبکہ اس میں مشین لگانا ممکن بھی ہوا ور سہل بھی ہو تو حسرت ہے اس شخص پر جو پھر بھی مشین نہ لگائے پھر ایسے لوگوں میں بھی بعض تو وہ ہیں جو متقی پرہیزگار ہیں اور بعضے ایسے ہیں جو محض ریاکار ہیں جس میں ریا اور نمائش ہے اس کی تو بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسے اس مسافر کی۔ اور بعینہٖ وہی حالت ہے کیونکہ ریا حابط عمل ہے گو فرض تو سر سے اتر جاتا ہے لیکن مقبول نہیں ہوتا اور مقصود مقبولیت ہی ہے جب مقبول ہی نہ ہوا تو وہ پھر عمل ہی کیا ہوا وہ تو لاشئی محض ہوا اس کی تو وہ پہلی ہی مثال ہے چنانچہ جو لوگ محض نمائش کے لئے عمل کرتے ہیں یعنی فقط اس واسطے کہ لوگ کہیں کہ صاحب یہ بڑے عمل کرنے والے ہیں۔ ان کی بابت حدیث شریف میں وارد ہے۔

فرماتے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ قیامت میں سب سے اول ایک

ایسے شخص کو لایا جاوے گا جو شہید ہوا ہوگا اللہ کے راستہ میں اس کو بتلایا جاوے گا کہ ہم نے تم کو یہ نعمتیں دی تھیں وہ ان سب نعمتوں کا اقرار کرے گا پھر اس سے پوچھا جاوے گا کہ ہم نے تو تم کو یہ یہ نعمتیں دیں اور تم نے اس میں عمل کیا کیا وہ عرض کریگا کہ میں نے آپ کی راہ میں جہاد کیا یہاں تک کہ اپنی جان دیدی۔ ارشاد ہوگا کہ تم جھوٹے ہو، ہم کو خوش کرنے کے لئے جان نہیں دی بل لیقال انك جری بلکہ اس لئے جان دی کہ سب میں یہ شہرت ہوجائے کہ بڑے بہادر تھے فقد قیل تو تمہاری تعریف اور شہرت ہوچکی۔ جو تمہارا مطلب تھا وہ دنیا ہی میں تم کو حاصل ہوچکا دوم تمہارا مدعا پورا ہوگیا۔ پھر حکم ہوگا کہ اس کو منہ کے بل جہنم میں پھینکدیا جاوے پھر بلایا جائیگا ایک بڑے عالم کو اسی طرح اس سے پوچھا جاوے گا کہ کہئے صاحب آپ نے کیا کیا وہ کہے گا میں نے یوں وعظ کہے یوں نصیحتیں کیں یوں لوگوں کو ہدیت کی اور یوں علم سکھایا ارشاد ہوگا یہ ہمارے واسطے نہیں کیا بل لیقال انك قاری بلکہ اس واسطے کہ لوگوں میں مشہور ہو کہ بڑے عالم ہیں بس تو آپ بھی وہیں تشریف لے جائیے جہاں آپ کے بھائی صاحب گئے ہیں۔ ذرا غور تو کیجئے یہ آیا ہے حدیث میں کہ اس کو بھی منہ کے بل جہنم میں پھینکدیا جاوے گا۔ پھر ایک سخی صاحب لائے جاویں گے ان سے بھی یہی سوال کیا جاوے گا۔ وہ کہے گا کہ میں نے بہت مال و دولت اللہ کے راستہ میں خرچ کیا تھا، ارشاد ہوگا کہ اس واسطے نہیں کیا کہ ہم راضی ہوں بل لیقال انك جواد بلکہ اس واسطے کہ لوگ کہیں کہ بڑے سخی ہیں، ان کی داد و دہش کا کیا کہنا ہے بس سارے شہر میں وہی تو ایک سخی ہیں اگر کوئی اور بھی سخی ہوگا تو فلانے کے برابر نہیں ہوگا۔ فقد قیل جو تمہارا مقصد تھا وہ حاصل ہوچکا لہٰذا تم بھی وہیں جاؤ جہاں تمہارے دو بھائی جاچکے ہیں چنانچہ اس کو بھی جہنم میں منہ کے بل پھینکدیا جاوے گا۔ تو حضرت یہ تین عمل کتنے بڑے بڑے ہیں۔ علم دین۔ سخاوت۔ شہادت اب ان سے بڑھ کر اور کون عمل ہوگا، لیکن دیکھ لیجئے ریا کی بدولت ان کی کیا گت بنی ہے وجہ یہ کہ

اس شخص کا عمل صرف صورت عمل ہے حقیقتاً عمل ہی نہیں اور واقعی جو لوگ محض ریا کار ہیں ان کا تو وہی حال ہے ؎

از بروں چوں گور کافر پُر حلل — واندروں قہر خدائے عزّ و جل

(باہر سے تو کافر کی قبر کی طرح آراستہ ہے۔ اور قبر کے اندر خدا کا قہر و غضب ہے)

از بروں طعنہ زنی بر بایزید — واز درونت ننگ می دارد یزید

(ظاہر میں تو تو بایزید بسطامی پر طعنہ زنی کرتا ہے۔ اور تیری اندرونی حالت سے یزید بھی شرماتا ہے)

ان بزرگوں کی تو یہ حالت ہوئی اور بعض وہ لوگ ہیں جن کے عمل ریا سے تو نہیں ہیں خلوص کے ساتھ ہیں مگر ناتمام اور غیر مکمل گویا جسد بلا روح ہیں خیر وہ کچھ ہیں تو سہی مگر ایسے ہی ہیں جیسے چھکڑے کی رفتار بمقابلہ ریل کے تو اگر کوئی نادان ایسا ہو کہ اس کو ریل عطا کی گئی ہو جس میں انجن بھی ہے اور سامان آگ کا بھی موجود ہے مگر صرف آگ ڈالنے اور مشین چلانے کی کسر ہے۔ اگر اس میں آگ چھوڑ دی اور بھاپ پیدا کر دی تو پھر وہ ریل ہے کہ صبح سے شام تک دو سو تین سو میل نکل گئی بلکہ زیادہ نہیں تو بس ایک ٹھیلہ ہے تو انجن بھی موجود آگ کا سامان بھی موجود لیکن بیوقوف ڈرائیور ہے کہ اس کو ٹھیلتا ہے ٹھیلنے کے لئے اول تو نیچے اترنا پڑتا ہے پھر بہت کچھ زور بھی لگانا پڑتا ہے گو اس طرح ٹھیلنے سے بھی وہ چلتی ہے کیونکہ آخر لوہے کی سڑک پر ہے، مگر کتنی صبح سے شام تک دو تین چار میل بس اور جہاں چھوڑ دیا بس کھڑی ہو گئی اگر فوراً نہیں تو کچھ دور اور چل کر سہی۔ غرض ٹھیلنے سے دن بھر میں دو چار میل چل سکتی ہے اور بہت سے بہت دس میل اگر اگر کوئی بہت ہی قوی ہوا اور برابر چلا گیا دھکیلتا ہوا تو اس شخص مذکور کی حالت اس کے مشابہ ہے اور یہ حالت بھی قابل افسوس ہے ہم نے بہت لوگ ایسے دیکھے ہیں۔ کہ تقویٰ بھی طہارت بھی ظاہری حالت بھی درست۔ ڈاڑھی بھی نیچی۔ پلائچے بھی ٹھیک۔ نماز بھی۔ روزہ بھی۔ یہ سب کچھ مگر ساتھ ہی اس کے روح جس کو میں آگے بیان کروں گا وہ نہیں۔ غرض ہر عمل بے روح ہے یعنی کم جان ہے گو بالکل بے جان نہیں اس کی رفتار

ایسی ہی سست ہے جیسی ٹھیلہ کی۔ حق سبحانہ تعالیٰ جل جلالہ و عم نوالہ نے ایک انجن گاڑی اس شخص کو دی جس کی کلیں بھی بہت اچھی اچھی ہیں بھاپ بنانے کے لئے سب سامان بھی دیا کوئلہ بھی۔ پانی بھی، دیا سلائی بھی۔ مگر آگ سلگائے کون اور بھاپ بنائے کون اس کی بلاستی کی وجہ سے ہاتھ پاؤں کو اتنی حرکت دینا بھی گراں ہو رہا ہے تو یہاں کسر کا ہے کی ہے۔ صرف بھاپ کی اور آگ سلگانے کی۔ چونکہ بھاپ نہیں ہے اس لئے رفتار تیز نہیں ہے اس وقت اسی بھاپ کو ذکر کیا جا رہا ہے اور یہی مراد ہے میری درج سے اور بھاپ نہ تو موجود ہے نہ اس کی فکر و کوشش ہے۔ اسی کو حضرت عراقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس شعر میں ذکر کیا ہے اشارۃً ؎

صنمارہ قلندر سزد ار بمن نمائی　　　که دراز دور دیدم ره و رسم پارسائی

(اے مرشد مجھ کو تو قلندری کا رستہ بتلا دیجئے۔ کیونکہ پارسائی کا رستہ تو بہت دور دراز ہے)

تو یہ ضرورت میری سمجھ میں آئی اس مضمون کی اور اس لئے یہ مضمون باوقعت معلوم ہوا کہ اس میں ایک بڑی کوتاہی کی تکمیل ہے اور اسی وجہ سے اس کو اختیار کیا گیا اور اس ضروری چیز کی شرح اور تعیین میں آگے چل کر کر دوں گا مگر اجمالاً حضرت عراقی کے اس شعر سے سمجھ میں آجاوے گی اصل تو یہ وجہ ہے اس شعر کے مضمون کو اختیار کرنے کی باقی اس میں وہ شاعری نکتہ بھی ہے جس کی بناء پر میرے دوست نے مجھے مشورہ دیا تھا یعنی مقام بیان میں اس لقب کے ایک بزرگ کا مزار ہوتا مگر ممکن ہے ان کا ذہن بھی اس مضمون کی ضرورت کی طرف ہو گیا ہو۔ بہرحال دو نکتے جمع ہو گئے۔ ایک تو یہ کہ فی نفسہ بھی یہ مضمون ضروری ہے، دوسرے خصوصیت مقام سے اس استحسان اور بڑھ جاتا کیونکہ جس مقام پر یہ بیان ہو رہا ہے وہاں ایک ایسے بزرگ کا مزار مبارک ہے جو اس لقب قلندر ہی کے ساتھ مشہور ہیں نیز ایک برکت کی بھی ان شاء اللہ تعالیٰ توقع ہے۔ پھر چونکہ یہ وعظ ایک بزرگ کے ساتھ نامزد ہے اس لئے بھی امید اس مضمون کے نافع ہونے کی ہے مگر یہ سب درجہ تائید و تزئین میں یہ نکتے درجۂ مقصودیت میں نہیں بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ مجھے اس وقت اس طریق کو بیان کرنا ہے جس کے متعلق ہم میں کمی ہو رہی ہے اور جس کی

طرف اب ہمارا التفات نہیں رہا اس وجہ سے یہ مضمون اختیار کیا گیا ہے تو حق سبحانہٗ تعالٰے نے جو مضمون اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے وہ اس طریق کی تفصیل ہے البتہ قرآن میں یہ اصطلاح نہیں ہے اور یہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ جو اصطلاح چاہے مقرر کر لے تعبیر کرنے والے کو اختیار ہے جس اصطلاح میں چاہے کسی مضمون کو تعبیر کرے گو اس آیت میں یہ اصطلاح نہیں ہے لیکن یہ مضمون ہے وہی چنانچہ تفصیل سے معلوم ہو جاوے گا لیکن اس کے قبل ممکن ہے کہ کسی کو اس شعر کے متعلق ایک شبہ ہو اس کو رفع کئے دیتا ہوں وہ شبہ یہ ہے کہ حضرات عراقی نے اس شعر میں رہ قلندر اور رہ پارسائی کو متقابل فرمایا ہے فرماتے ہیں ؏ صنما رہِ قلندر سزد ار بمن نمائی (اے مرشد مجکو قلندر کا رستہ بتلا دیجئے) ؏ کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی + کیونکہ رستہ پارسائی کا تو بہت دور دراز ہے۔ یہ ترجمہ ہے اس شعر کا اس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ قلندر کا رستہ پارسائی کے رستے کے متقابل ہے تو گویا اس طریق قلندری میں پارسائی نہ ہوتی ہوگی یعنی آدمی بالکل آزاد اور رند بے قید ہو جاتا ہوگا اسی ڈاڑھی رکھنی بھی ضروری نہ رہتی ہوگی اس پر نماز بھی فرض نہ رہتی ہوگی۔ شراب بھی اُسے حلال ہو جاتی ہوگی۔ غرض حلال حرام کی بالکل تمیز نہ رہتی ہوگی شاید طریق قلندری کا خلاصہ ذہنوں میں یہ ہوگا تو اللہ تعالیٰ بچاوے ایسے طریق سے غرض کسی کو یہ شبہ ہو سکتا ہے اس شعر کے مضمون سے اس کو پہلے رفع کئے دیتا ہوں کیونکہ اس کا رفع کرنا فی نفسہ بھی ضروری ہے نیز اس کی اس بیان میں بھی ضرورت ہوگی جو مجھے اس وقت کرنا ہے اور یہ اس بیان میں معین بھی ہوگا۔ اب یہاں ضرورت ہے تھوڑے سے علم درسی کی مگر خیر میں حتی الامکان آسانی سے سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ غیر اہل علم بھی بقدر ضرورت سمجھ سکیں۔

تقریر اس کی یہ ہے کہ عراقی کے شعر میں جو طریق قلندری و طریق پارسائی میں تقابل واقع ہوا ہے وہ ظاہر سیاق سے تبائن پر ضرور دال ہے جس کے لئے عدم تصادق لازم ہے لیکن تبائن و عدم تصادق کے لئے تنافی و عدم اجتماع ضروری نہیں دیکھئے کل میں اور اس کے اجزاء خارجیہ میں تبائن و عدم تصادق متحقق ہے لیکن تنافی نہیں۔

اور اجتماع ہوتا ہے جیسے بیت کے لئے جدار اور سقف اجزاء خارجیہ ہیں جن میں باہم تصادق نہیں بلکہ تقابل ہے لیکن ایک کُل ہے اور دوسرا جزء اور دلائل سے ثابت ہے جس کا کافی بیان اس وعظ میں بھی ہے کہ طریق قلندر کے دو جزء ہیں ایک عمل جو حقیقت ہے طریق پارسائی کی اور دوسرا محبت اور طریق قلندر نام ہے ان دونوں کے مجموعہ کا اور چونکہ یہ اجزاء خارجیہ ہیں ان میں تصادق تو نہیں مگر کلیت وجزئیت کا تعلق ہے پس طریق قلندر کل ہوا اور طریق پارسائی اس کا ایک جزء ہوا اور جزء کے انتفاء سے کل کا انتفاء لازم ہے پس طریق پارسائی جہاں منتفی ہوگا وہاں طریق قلندری بھی منتفی ہو جاویگا سو حاصل شعر کا یہ ہوا کہ محض طریق پارسائی کافی نہیں جو کہ ایک جزو ہے طریق قلندری کا بلکہ طریق قلندری مطلوب ہے جس میں دونوں جزء جمع ہیں۔ طریق پارسائی بھی اور طریق محبت بھی۔ پس اب کوئی شبہ باقی نہیں رہا۔ باقی اب یہ دوسری تحقیق ہے کہ ان دونوں میں اصل کون ہے محبت یا اعمال اس کا فیصلہ بھی ہوا جاتا ہے ان شاء اللہ تعالےٰ یہاں اتنا ہی سمجھ لیجئے کہ طریق قلندر وہ طریق ہے جو مرکب ہو محبت اور اعمال دونوں سے آگے ایک اصطلاحوں کا فرق ہے جو اصطلاح متقدمین میں پائی جاتی ہے اس کے اعتبار سے رہ قلندریں یہ بھی قید ہے کہ جس میں اعمال کی تقلیل ہو یعنی اعمال ظاہرہ مستحبہ کی کیا معنی کہ بہت نفلیں اور وظائف نہ ہوں بلکہ محبت کی خاص رعایت ہو یعنی تفکر اور مراقبہ زیادہ ہو۔ ایک تو یہ اصطلاح ہے اور ایک اصطلاح اور ہے یعنی خواہ ان اعمال کی تکثیر بھی ہو مگر غلبہ آزادی کو ہو لیکن آزادی خلق سے نہ کہ خالق سے کیا معنی کہ قلندر کو دنیا کی وضع اور رسوم کی پروا نہیں نہ مصالح پر نظر ہوتی ہے مثلاً ہم یہ بھی نظر کرتے ہیں کہ بھائی ایسا نہ کہو کوئی کیا کہیگا اور مثلاً ہم لوگ یہ بھی سوچتے ہیں کہ فلانے کو کچھ کہو مت۔ بُرا مانے گا۔ وحشت ہوگی بھائی مگر بشرطیکہ ان رعایتوں کا شریعت سے اذن بھی ہو اور قلندر کو اس کی کچھ پروا نہیں ہوتی کہ کوئی بُرا مانے گا یا بھلا مانے گا اس کا دل صاف اور سادہ ہوتا ہے۔

غرض وہ آزاد ہوتا ہے مصالح سے اس کی مصلحت صرف ایک ہوتی ہے ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار ۔۔۔ بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

(مصلحت دید میری یہ ہے کہ تمام دوست دنیا کو چھوڑ دیں اور صرف یار کی زلف کو پکڑ لیں)

اس کی بڑی مصلحت یہی ہوتی ہے کہ ایک کو لیکر سب کو ترک کردو اس کی تو بس یہ حالت ہوتی ہے۔

دل آرامے کہ داری دل در دبند — دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(اے دل جس کو تو دوست رکھتا ہے اسی میں دل لگا۔ اور تمام جہاں سے آنکھیں بند کرلے)

اور اس کا یہ مشرب ہوتا ہے ؎

ہمہ شہر پُر زخوباں منم و خیال ماہے — چہ کنم کہ چشم بدخو نہ کند بکس نگاہے

(تمام شہر حسینوں سے بھرا ہوا ہے اور میں ایک چاند ہی کے خیال میں محو ہوں۔ کیا کروں میں ۔
کاش کہ بدخو کی نظر کسی پر بھی نہ پڑتی)

سوائے محبوب کے کسی پر اس کی نظر ہی نہیں پڑتی بجز ایک کے سارے جہان کو انھوں نے ہیچ اور فنا کر دیا ہے جب انھوں نے اپنے ہی کو ہیچ اور فنا کر دیا تو پھر دوسرے پر کیا نظر کریں، کہتے ہیں ؎

عاشق بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا — اور جو خود ناکام ہو اس کو کسی سے کام کیا

جب اپنی ہی ہستی مٹادی تو دوسروں کی ہستی کی انھیں کیا پروا مشہور ہے کہ جب اپنی ہی ٹوپی اتاردی تو پھر دوسروں کی ٹوپی کی کیا پروا۔ جب وہ اپنی ہی ہستی کو مٹا چکا تو دوسروں کی ہستی کی پروا ہو اس کی جوتی کو ایسے شخص کو اصطلاح صوفیہ میں حُر کہتے ہیں بعض صوفیائے کرام نے قرآن مجید میں سے ایک لطیفہ نکالا ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ کے اس قول سے رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ (ترجمہ) اے پروردگار میں نے نذر مانی ہے آپ کے لئے اس بچہ کی جو میرے شکم میں ہے کہ وہ آزاد رکھا جائیگا سو آپ اس کو مجھ سے قبول کر لیجئے) اے اللہ میں تیرے نذر کرتی ہوں جو کچھ میری نیت میں ہے اور تیرے راستے میں اُسے آزاد کرتی ہوں اس کا یہ تھوڑا ہی مطلب ہے کہ وہ غلام تھا اب اُسے آزاد کرتی ہوں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اے اللہ میں اسے تیرے ہی لئے خاص کرتی ہوں اے اللہ میاں یہ خالص تمہارا ہے۔ تمہارے دین کی خدمت میں ساری عمر رہے گا۔ تو حُر کے معنی خالص کے ہوئے چنانچہ اہلِ لغت نے لکھا ہے طین حُر یعنی وہ مٹی جس میں کنکر وغیرہ نہ ملا ہو حُر خالص مٹی کو کہتے ہیں۔ یہاں بھی حُر کے معنی ہیں خالص اللہ کا۔ اور اب تو خالص کے وہ معنی ہو گئے جو مخالص کے ہیں یعنی اس کے

جو اصلی معنی ہیں اس معنی کر نہیں جیسے عوام پوچھتے ہیں کہ یہ گھی نخالص ہے بیچنے والا کہتا ہے کہ ہاں بالکل نخالص ہے۔ ایسے ہی احرار کی دو قسمیں ہیں ایک خالص ایک نخالص۔ نخالص کون جس میں میل ہو، میل کاہے کا ہو۔ میل ہو حُبِّ دنیا کا میل ہو حب غیر کا میل ہو معصیت کا شرک کفر کا۔ یعنی آجکل آزاد اس کو کہتے ہیں جو شریعت سے آزاد ہو۔ اللہ اکبر۔ ایسا شخص بھی کہیں آزاد کہا جا سکتا ہے۔ حضرت یہ تو وہ آزاد ہے جو ہزاروں قیدوں میں ہے یعنی معصیتوں میں مبتلا ہے پھر آزادی کہاں رہی کیونکہ معصیت کی قید تو سب قیدوں سے سخت قید ہے غرض بے قید کوئی نہیں۔ کوئی خدا کی قید میں ہے کوئی شیطان کی قید میں بہرحال قید سے تو خالی کوئی نہیں۔ اب اس کا فیصلہ خود کرلو۔ کہ کونسی قید پسند کے قابل ہے۔ حضرت سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

اسیرش نخواہد رہائی زبند　　　شکارش نجوید خلاص از کمند

(اس کا قیدی قید سے آزادی نہیں چاہتا۔ اس کا شکار کمند سے رہائی نہیں چاہتا)

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

گر دو صد زنجیر آری بگسلم　　　غیر زلف آں نگارے دلبرم

یعنی اگر سیکڑوں قیدوں میں بھی ڈالدیا جاؤں تو ساری قیدیں توڑ ڈالوں مگر معشوق کی زلف کی قید کہ اس کو توڑنا ہرگز گوارا نہ کروں۔ کیونکہ یہ قید تو محبوب قید ہے۔ غرض قید بھی دو طرح کی ہوتی ہے ایک تو محبوب قید اور ایک ناگوار قید دیکھو تو سہی اگر عاشق کو کسی دعوت کے لئے پکڑ دتو وہ رسّے توڑا کر بھاگے گا کہ ہمیں دعوت سے کیا مطلب ہم تو آزاد ہیں اب فرض کر و اسی رو میں محبوب بھی آگیا اور اس نے بھی کہا کہ چلو میاں تمہاری آج دعوت ہے ہمارے یہاں اور وہ اس سے بھی کہدے کہ نہیں جناب میں تو آزاد ہوں میں دعوتوں میں نہیں جایا کرتا۔ کوئی اس سے کہے کہ ارے احمق جس کی بدولت تو آزاد ہوا ہے اسی کے یہاں تو آج دعوت ہے جس کے لئے تو نے سارے تعلقات قطع کئے آج کی دعوت اسی شخص کے تعلق سے مسبب ہے اس کی دعوت میں بھی جانے سے تو آزاد بنتا ہے تو تو عاشق ہی نہیں یہ اچھی آزادی ہوئی صاحب کہ نماز بھی چھوڑدی روزہ بھی چھوڑدیا۔ یہ آزاد کہاں سے ہوا یہ تو ہزاروں قید کے اندر

جکڑا ہوا ہے ۔ آزاد وہ ہے جو غیر اللہ سے آزاد ہو۔ جو خالص اور حُرہ ہو تو قلندر کے یہ معنی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ متقدمین کی اصطلاح میں تو قلندر وہ ہے جس میں اعمال غیر واجبہ کی تقلیل ہو اور متاخرین نے اس کے معنے میں وسعت کی ہے یعنی قطع نظر اس سے کہ اعمال میں تقلیل ہو یا تکثیر لیکن غلق سے آزاد ہو اور یہ دونوں اصطلاحیں جُدا جدا ہیں لیکن ایک نکتہ کی بناء پر یہ دونوں اصطلاحیں متوافق بھی ہو جاتی ہیں یعنی یہ جو کہا جاتا ہے کہ قلندر کے اعمال میں تقلیل ہوتی ہے تو قلت اور کثرت امور اضافیہ میں سے ہیں ۔یعنی بمقابلہ دوسرے اہل اعمال کے تو وہ عمل میں بھی بڑھا ہوا ہے یعنی اوروں سے تو اس کا عمل بھی غالب ہے لیکن خود اس میں جو محبت اور عمل دو چیزیں جمع ہیں ان میں محبت کا حصہ عمل سے بڑھا ہوا ہے ۔پس اس کمی کا یہ مطلب نہیں کہ عمل میں فی نفسہ کوئی کمی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ گو عمل بھی بہت بڑھا ہوا ہے لیکن محبت میں اس سے زیادہ بیشی ہے عمل تو کامل ہے ہی مگر محبت کامل سے بھی آگے یعنی اکمل ہے اس تقریر سے یہ دونوں اصطلاحیں باہم متوافق ہو گئیں اب ایک اور تیسری اصطلاح جہلاء کی ہے جو بالکل بدعت ہے کہ قلندر وہ ہے جو چار ابرو کا صفایا کر دے اور نماز روزہ سب کو رخصت کر دے ایسے شخص کو جہلاء کہتے ہیں کہ صاحب یہ قلندر ہیں استغفر اللہ وہ کیا قلندر ہوتا ہاں اگر کوئی معذور ہو غیر مکلف ہو مثلاً مجنوں ہے دیوانہ ہے تو وہ مستثنیٰ ہے یعنی خدا کے یہاں اس سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا یہ دوسری گفتگو ہے کہ آیا وہ کامل بھی ہے سو یہ خوب سمجھ لیجئے کہ نہ وہ کامل ہے نہ مکمل کیونکہ مکمل ہونے کے لئے خود کامل ہونا ضروری ہے تکمیل کے لئے کمال شرط ہے ۔جو خود ہی درزی کا کام نہ جانتا ہو وہ دوسرے کو سینا کیونکر سکھا سکتا ہے تو مجاذیب اور بہلول جو ہوتے ہیں چونکہ یہ خود کامل نہیں ہوتے لہذا دوسرے کی تکمیل بھی نہیں کر سکتے کامل اور مکمل وہی ہے جو قدم بقدم ہو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے جس کا ظاہر ہو مثل ظاہر پیغمبر کے اور باطن ہو مثل باطن پیغمبر کے یعنی ہر امر میں اور ہر حال میں پیغمبر ہی اس کے قبلہ وکعبہ ہوں اس کے ظاہر کا قبلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ظاہر ہو اور اس کے باطن کا قبلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا باطن ہو اس کو خوب سمجھ لیجئے ۔ دیکھئے تو سہی نماز کی صحت کے لئے قبلہ رخ ہونا ضروری ہے ۔ہاں قبلہ سے تھوڑا فرق ہو تو خیر مضائقہ نہیں نماز صحیح

ہو جاوے گی چاہے رکعتیں بھی زیادہ نہ پڑھے اور چاہے قرأت میں بھی کچھ تقلیل ہو مگر ہو قبلہ رُخ تب ہی نماز کی صحت متحقق ہو گی اور اگر مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی تو چاہے رکعتوں کی تعداد بھی زیادہ ہو اور قرأۃ میں بھی تطویل ہو لیکن نماز صحیح نہ ہو گی۔ دیکھو یہ مسجد بنی ہوئی ہے (بیان مسجد سے متصل ہو رہا تھا ۱۲ جامع) اس کی سمت کی طرف نماز صحیح ہو جاتی ہے وجہ کیا کہ یہ مسجد خانہ کعبہ کی طرف گویا منہ کئے ہوئے ہے لہذا جو کوئی اس کی سمت کی طرف اپنا منہ کر کے نماز پڑھے گا چاہے دو رکعت ہی کیوں نہ ہوں اس کی نماز صحیح ہو جاوے گی برخلاف اس مسجد کی سمت کے مقابل مشرق کی جانب اگر آپ اس مسجد کی ایک شکل بنا کر (کیونکہ وہ مسجد کیا ہو گی مسجد کی محض شکل ہی ہو گی) اس میں نماز پڑھیں جس میں اتنی لمبی لمبی سورتیں ہوں کہ ایک رکعت میں تو سورۂ بقر ہو دوسری میں سورۂ آل عمران پھر تیسری میں سورۂ نساء اور چوتھی میں سورۂ مائدہ غرض چار رکعتوں میں یہ بڑی بڑی چار سورتیں ختم کی گئیں۔ اب آپ ہی کہئے یہ نماز کیسی ہوئی بالکل ہیچ در ہیچ، اس پر ثواب تو کیا ملتا بلکہ اور عذاب ہو گا۔ تو اس نماز میں کیا چیز کم ہے فقط کمی یہ ہے کہ رُخ قبلہ سے ملا ہوا نہیں ہے اس کے سوا اور کوئی کمی نہیں شکل بھی نماز کی مسجد کی بھی ساری ہیئت وہی لیکن تحریف قبلہ کے سبب وہ نماز ہرگز مقبول نہیں بلکہ مردود ہے نماز بھی اور نمازی بھی تو ہمارے اعمال کا قبلہ و کعبہ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال ہیں جس عمل کا رخ اس قبلہ کی طرف ہو گا وہی مقبول ہو گا۔ پس ہمارے ظاہر کا قبلہ پیغمبر کا ظاہر ہے اور باطن کا قبلہ پیغمبر کا باطن ہے۔ یعنی ہماری ظاہری حالت وہ ہونی چاہیئے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری حالت تھی۔ یعنی آپ کپڑا پہنتے تھے ہمیں بھی ننگا نہیں رہنا چاہیئے۔ آپ ڈاڑھی رکھتے تھے ہماری ڈاڑھی بھی منڈی یا کٹی نہ ہونا چاہیئے۔ آپ کے ٹخنے کھلے ہوئے رہتے تھے ہمارے بھی کھلے رہنے چاہئیں اور یہ ہی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ٹخنے کھلے رہتے تھے بلکہ یہ بھی ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹخنے ڈھانکنے سے منع بھی فرمایا ہے۔ اسی طرح حضور صلی علیہ وسلم کے ناخن

ترشے ہوئے اور لبیں بنی ہوئی رہتی تھیں یہ ہی حالت ہمارے ناخن اور لبوں کی ہونی چاہیئے غرض ہمارا ظاہر بالکل مشابہ ہونا چاہیئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر کے کہ بس صورت دیکھتے ہی معلوم ہوجاوے کہ یہ غلام ہے ایسے آقا کا ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید الہ آباد کے رہنے والے تھے، میں الہ آباد گیا ہوا تھا وعظ کے اندر دیکھتا ہوں کہ ایک بوڑھے شخص ڈارھی منڈی ہوئی خوب گورے چٹے گوٹہ ٹھپے کے کپڑے پہنے ہوئے بیٹھے ہیں جاڑے کے دن تھے رضائی جو اوڑھے ہوئے تھے اس پر بھی گوٹہ اور ہمیک لگی ہوئی تھی وعظ کے بعد میرے پاس آکر بڑی محبت سے بولے کہ مولوی منہ کھول دیں میں نے دل میں کہا کہ جب یہ ایسی محبت سے کہہ رہا ہے تو لاؤ منہ کھول دو میرا کیا بگڑتا ہے کوئی تھوک تو دے گا نہیں۔ غرض میں نے اپنا منہ کھول دیا اس نے فوراً ہی ایک لڈو میرے منہ میں رکھدیا میں نے کھا لیا کہ خدا کی نعمت ہے کسی کے ہاتھ سے دلوائیں میں نے پوچھا تم کون ہو۔ یہ سنتے ہی اس کی آنکھ سے آنسو جاری ہوگئے۔ تھا صاحب محبت۔ غلطی میں مبتلا تھا مگر کانہ تھا دو کا ندار نہ تھا' زار زار آنسو بہہ رہے تھے وہ خود ہی شرمندہ تھا اپنی اس حالت پر رو کر کہا اس نالائق کو بندۂ امداد اللہ کہتے ہیں مجھ کو بھی رحم آگیا۔ آخر پیر بھائی کا خیال ہوتا ہی ہے اور نہ بھی ہوتا پیر بھائی تو کیا تھا۔ جو شرارت اور سرکشی نہ کرے اور اپنے آپ کو خطاوار سمجھے اس پر رحم ہی آتا ہے۔ البتہ شرارت کرنے والے پر غصہ آتا ہے، خیر میں نے ان سے بات چیت کی اور مناسب تسلی دی اور اس وقت تو ان سے مفصل گفتگو کرنے کا موقع ملا نہیں۔ اتفاق سے ایک مرتبہ میں گنگوہ گیا ہوا تھا وہ بھی وہاں چلتے پھرتے آگئے میری جو خبر سُنی تو اطلاع کر کے مع ایک مجمع عظیم کے میرے پاس پہونچے اور آتے ہی پھولوں کا ہار میرے گلے میں ڈال دیا۔ میں نے ہار تو ہاتھ میں لے لیا اور انبساط کے لئے پوچھا یہ کیسے ہیں۔ کہا ہم ایک باغ میں گئے تھے۔ عوام الناس ایسوں کے بڑے معتقد ہوتے ہیں سمجھتے ہیں کہ قطب الاقطاب ہیں، ارے قطب الاقطاب ہوتے تو ڈاڑھی ہی کہاں جاتی مگر ان کے نزدیک تو ڈاڑھی کا نہ ہونا ہی دلیل قطبیت ہے، اگر یہ بات ہے تو پھر سارا چین اور جاپان بس اقطاب اور اغواث ہی سے بھرا پڑا ہے،

کیونکہ وہاں قدرتی طور پر کسی کے ڈاڑھی مونچھ نکلتی ہی نہیں۔ غرض ایسوں کو برکت کے لئے کوئی باغ میں لیجاتا ہے کوئی کھیتوں پر لیجاتا ہے۔ ان حضرات کو بھی کوئی اپنے باغ میں لے گیا ہوگا۔ غرض انھوں نے کہا کہ ہم ایک باغ میں گئے تھے باغ والے نے پھول دیدیئے تھے۔ سو کچھ تو حضرت شیخ عبد القدوس رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر چڑھائے۔ جی چاہا کہ کچھ تمہیں بھی دیدیں۔ کیونکہ وہ پیارے تھے مردوں میں تم پیارے ہو زندوں میں۔ اپنے پیاروں کو اچھی چیز دیا ہی کرتے ہیں۔ یہ انھوں نے تقریر کی۔ بڑا مجمع تھا میں نے کہا شاہ صاحب یہ پھول جو آپ نے شیخ کے مزار پر چڑھائے ہیں آپ کے نزدیک تو بڑی چیز ہیں۔ لیکن ایک مثال فرض کرو اگر کوئی شخص ہو جو سو روپیہ تولہ کا عطر سونگھنے والا ہو اور تم چار آنہ تولہ کا عطر بہت ہی گھٹیا اور چکٹا ہوا لے جاؤ اور جاکر اس کی ناک میں دیدو تو کیسا۔ کیا یہ ایذارسانی نہیں ہے۔ کہا بیشک۔ میں نے کہا اچھا اب یہ بتاؤ کہ حضرت شیخ تمہارے نزدیک شمائم وروائح جنت سے مشرف ہیں یا محروم ہیں کہنے لگے معاذ اللہ کون کہہ سکتا ہے کہ محروم ہیں میں نے کہا تو بس یہ جو پھول تم نے حضرت شیخ کے مزار پر چڑھائے ہیں دو حال سے خالی نہیں یا تو ان کی خوشبو پہنچتی ہے یا نہیں پہونچتی ہے۔ اگر نہیں پہونچتی تو پھول چڑھانا بیکار اور اگر پہونچتی ہے تو ان جنت کے پھولوں کے مقابلہ میں جو حضرت شیخ کو حاصل ہیں تمہارے یہ دنیا کے پھول سو روپیہ تولہ کے عطر کے مقابلہ میں چار آنہ تولہ کا چکٹا ہوا عطر ہے یا نہیں کہا بیشک میں نے کہا تو بس یہ تو وہی مثال ہوئی کہ سو روپیہ تولہ کے عطر سونگھنے والے کی ناک میں چار آنہ تولہ کا سڑا ہوا عطر دے دیا تم نے پھول چڑھا کر حضرت شیخ کی روح کو تکلیف پہنچائی ہے کہنے لگے میں توبہ کرتا ہوں یہ مسئلہ آج سمجھ میں آیا ہے۔ اب کبھی کسی مزار پر پھول نہ چڑھاؤں گا میری توبہ ہے اس کے بعد ہم لوگ نماز کے لئے مسجد میں گئے لوگ وضو کرنے لگے اور وہ ایک طرف بیٹھ گئے۔ میں ان کے پاس جا بیٹھا اور آہستہ سے کہا کہ تم میرے پیر بھائی ہو اس لئے تم سے ایک بات پوچھتا ہوں کہ تمہیں حضرت حاجی صاحب سے محبت ہے یا نہیں۔ بس رونے لگے کہا میں تو عاشق ہوں۔ میں نے کہا پھر عاشق ہو کر کیوں اپنے محبوب

کی مخالفت کرتے ہو۔ کیا حضرت حاجی صاحب کی ایسی ہی ڈاڑھی تھی۔ کہا میں توبہ کرتا ہوں میں اب کبھی ڈاڑھی نہیں منڈاؤں گا صاحب انھوں نے ڈاڑھی منڈانے سے بھی توبہ کرلی میں اس شبہ میں رہا کہ کہیں منہ دیکھے کی توبہ تو نہیں ہے۔ مگر پھر جو میرا الہ آباد جانا ہوا تو رستہ میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص خوب مقطع ڈاڑھی لئے ہوئے سامنے سے چلے آرہے ہیں میں نے پہچانا بھی نہیں۔ ایک شخص نے بتلایا کہ یہ فلانے ہیں تب میں بہت خوش ہوا اور بغلگیر ہو کر ملا۔ تو ان کی اصلاح اسی اصول سے کی گئی کہ جب تمہاری صورت حضرت حاجی صاحب جیسی نہیں پھر تم ان کے عاشق کیا ہوئے۔ تو قلندر کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اپنا ظاہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر کے خلاف رکھے نہ۔ بزرگوں کے کلام میں کہیں اس کے یہ معنی منقول ہیں محض لغو اصطلاح ہے اور اس غلط اصطلاح کے ہونے سے ایک اور خرابی ہوگئی وہ یہ کہ جن بزرگانِ دین کا جن میں کہ علماء دین بھی تھے قلندر لقب ہوگیا۔ چنانچہ حضرت قلندر صاحب صاحب مزار بھی عالم تھے، عوام ان کی نسبت اس لفظ کو سنکر یہ سمجھتے ہیں کہ معاذ اللہ یہ حضرات بھی ایسے ہی ہوں گے کہ نہ ڈاڑھی نہ مونچھ۔ نہ نماز نہ روزہ۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ حاشا وکلا یہ حضرات نہایت متبع سنت اور پابند شریعت تھے اور کوئی بزرگ بھی ایسے نہیں ہوئے جنھوں نے اتباع سنت نہ کیا ہو حتیٰ کہ اگر غلبہ حال سے کبھی اتباع میں کبھی کچھ کمی بھی ہوگئی ہے تو اپنی اس حالت کو ناقص سمجھا ہے اور کبھی اس پر اصرار نہیں کیا نہ کہ نعوذ باللہ اس کو قصداً اختیار کرتے۔ غرض یہ بالکل تہمت ہے کہ بعض بزرگوں کا طریق خلاف شریعت بھی رہا ہے سب بزرگوں کا ایک ہی طریق رہا ہے اور وہ طریق شریعت ہے ایک بزرگ فرماتے ہیں کُلُّ مَا رَدَّتْہُ الشَّرِیْعَۃُ فَھِیَ زَنْدَقَۃٌ یعنی جس حال یا جس مقال کو شریعت رد کرے وہ بالکل الحاد اور زندقہ ہے۔

حضرت خواجہ عبداللہ انصاری فرماتے ہیں۔ بر ہوا پری مگسے باشی برآب روی خسے باشی دل بدست آرکہ کسے باشی۔ اگر بزور کرامت ہوا پر بھی اڑو گے تو کیا ہے گویا مکھی ہو جاؤ گے کہ وہ بھی تو ہوا میں بلا تکلف اڑتی ہے، پانی پر چلو گے تو یوں سمجھو کہ ایک تنکا ہو گئے کیونکہ وہ بھی تو پانی کی سطح پر بہتا ہوا جاتا ہے ہاں اپنے دل کو قابو میں کرو تب انسان بنو گے۔ اور اسی قسم کے بہت سے اقوال ہیں میری کتاب تعلیم الدین میں جمع ہیں اس میں دیکھ لیجئے۔

حضرت جنیدؒ سے کسی نے کہا کہ ایک قوم ہے جو یہ کہتی ہے نَحْنُ وَصَلْنَا فَلَا حَاجَۃَ اِلَی الصَّلٰوۃِ وَالصِّیَامِ ہم واصل ہو گئے ہیں لہذا ہمیں حاجت نہیں رہی نماز کی اور روزہ کی۔ حضرت جنید نے اس کے جواب میں فرمایا صَدَقُوْا فِی الْوُصُوْلِ وَلٰکِنْ اِلٰی سَقَرِ یہ تو وہ سچ کہتے ہیں کہ واصل ہو گئے ہیں لیکن جہنم واصل ہوئے ہیں خدا واصل نہیں ہوئے پھر ارشاد فرمایا وَلَوْ عِشْتُ اَلْفَ عَامٍ لَمَا تَرَکْتُ مِنْ اَوْرَادِیْ شَیْئًا اِلَّا بِعُذْرٍ شَرْعِیْ یعنی اگر ہزار برس بھی میں بندہ رہوں تب بھی نماز تو بڑی چیز ہے کیونکہ فرض ہے۔ وظیفے جو محض مستحب ہیں بلکہ بعض مستحب کے درجہ میں بھی نہیں یہ بھی کبھی نہ چھوڑوں الابعذر شرعی، ہاں کوئی عذر شرعی لاحق ہو جاوے تو مجبوری ہے ورنہ کوئی وظیفہ تک بھی کبھی نہ چھوڑوں چنانچہ حضرت جنیدؒ اخیر عمر تک ہاتھ میں تسبیح رکھتے تھے۔ دیکھئے وظیفہ تو وظیفہ تسبیح رکھنا تک بھی عمر بھر نہ چھوڑا حالانکہ تسبیح کا رکھنا نہ سنت نہ مستحب کچھ بھی نہیں نہ موقوف علیہ کسی وظیفہ کا نہ کسی وظیفہ کے لئے شرط نہ منتہی ہو جانے کے بعد حضرت جنید کو اس کی حاجت باقی رہی تھی کیونکہ بیتدی کے لئے تو خیر وہ آلہ تذکرہ بھی ہو سکتی ہے منتہی تو تذکر میں راسخ ہو جاتا ہے اسی لئے منتہی کی شان میں لکھا گیا ہے خلوت و چلہ برد لازم نماند مگر اس پر بھی حضرت جنیدؒ نے اس اپنی ابتدا کی حالت کو بھی نہ چھوڑا کسی نے عرض بھی کیا کہ حضرت اب تو آپ منتہی اور واصل کامل ہو چکے اب آپ کو ہر وقت ہاتھ میں تسبیح لئے رہنے کی کیا ضرورت ہے فرمایا ارے اس تسبیح ہی نے تو مجھے واصل بنایا ہے اور اس درجہ تک پہونچایا ہے پھر کیا اب اس رفیق کو چھوڑ دوں اسی کی بدولت تو یہاں تک پہونچے کیا اسی کو رخصت کر دوں اسی نے تو محبوب تک پہنچایا ہے تو پھر یہ بڑی ناشکری ہے کہ آج اس کو جواب دے دوں اللہ اکبر کیسے تھے یہ حضرات جناب یہ ائمہ طریق ہیں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ ناواقف تھے یا خشک ملّا تھے یہ لوگ بڑے بڑے عارف کامل اور عاقل گذرے ہیں ان کے یہ اقوال وافعال ہیں حضرت جنیدؒ کی خدمت میں ایک شخص دس برس رہا چلتے وقت عرض کیا کہ حضرت میں نے اتنی مدت خدمت میں قیام کیا لیکن کبھی کوئی کرامت آپ کی نہیں دیکھی۔ میں نے سنا تھا کہ آپ بہت بڑے کامل ہیں اسی لئے خدمت میں

حاضر ہوا تھا کہ کچھ فیض حاصل کروں گا مگر اتنی مدت قیام کو گذر گئی کوئی کرامت آپ سے کبھی صادر نہ ہوئی۔ یہ سُن کر آپ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا جوش میں آکر فرمایا کہ اچھا یہ بتلا جنید سے تو نے اس عرصہ میں کوئی فعل سنت کے خلاف ہوتے بھی کبھی دیکھا ہے اس نے کہا نہیں یہ بات تو نہیں دیکھی اس پر آپ نے جوش میں آکر فرمایا کہ ارے پھر اس سے بڑھ کر جنید کی اور کیا کرامت ہو گی کہ اس نے دس برس تک اپنے خدا کو ایک لمحہ کے لئے بھی ناراض نہیں کیا اس سے بڑھ کر اور کیا کرامت ہو گی تو جنید کی دیکھنا چاہتا ہے واقعی اس سے بڑھ کر کیا کوئی کرامت ہو سکتی ہے حقیقی کرامت تو یہی ہے بڑی کرامت تو استقامت ہے۔ اَلْاِسْتِقَامَۃُ فَوْقَ الْکَرَامَۃِ اسی واسطے خدا تعالےٰ نے یہ دعا تعلیم فرمائی ہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ اور صراط اہل الکرامات نہیں فرمایا خوب سمجھ لو شریعت کا اتباع کسی حال میں متروک نہیں سب بزرگوں کا اس پر اتفاق ہے۔ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ طریق چشتیہ کے کتنے بڑے شیخ اور صاحب حال وقال درویش ہیں انہیں کے مکتوبات کو دیکھ لو، کوئی مکتوب اتباع شرع کی تاکید اور ترغیب سے خالی نہیں بغرض طریقہ تھا بزرگوں کا تو یہ معنی قلندر کے بالکل گھڑے ہوئے ہیں کہ نہ نماز ہو نہ روزہ نہ ڈاڑھی ہو نہ مونچھ غرض در اصل صرف دو اصطلاح صحیح ہیں جن کی حقیقت کی تفصیل میں پہلے عرض کر چکا ہوں ایک کتابی اصطلاح ہے ایک زبانی۔ ایک کتاب میں ہے اور ایک اگرچہ کتاب میں نہیں لیکن مستند حضرات کی زبان پر ہے چنانچہ حضرات عراقی نے بھی اپنے شعر میں اس دوسری ہی اصطلاح کو لیا ہے۔ اس اصطلاح میں خلاصہ طریق قلندر کا یہ ہے کہ وہ جامع ہوتا ہے اعمال اور محبت کا عمل اور محبت کے تفاوت کی ایسی مثال ہے جیسے ریل گاڑی کا بدون بھاپ کے ٹھیلنے سے چلنا اور جیسے بھاپ سے چلنا اگر انجن میں بھاپ نہیں ہے تو ریل ڈھکیلنے سے بھی چلے گی تو ضرور مگر کتنی زیادہ سے زیادہ دو چار چھ یا آٹھ دس میل اور وہ بھی بمشکل اور اگر انجن میں بھاپ ہے تو بس چھوٹتے ہی اڑ گیا ساری گاڑی کو لیکر ہوا کی طرح۔ ولایتی ڈاک کی رفتار نہیں دیکھی آخر اس میں کیا چیز زیادہ ہے۔

اس میں اور ایک ٹھیلہ گاڑی میں جس کو مزدور چلاتے ہیں کیا فرق ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ ایک میں بھاپ ہے اور ایک میں بھاپ نہیں ورنہ پہئے مشین گاڑیاں سب چیزیں ویسی ہی ہیں مگر فرق کیا ہے، دونوں میں صرف بھاپ کا فرق ہے اگر ولایتی ڈاک میں بھی بھاپ نہ رہے تو وہ بھی ٹھیلہ ہے۔ تو عمل مثل گاڑی کے ہے اور محبت گویا بھاپ ہے جو بمنزلہ گاڑی کی روح کے ہے تو اصل چیز ریل میں بھاپ ہی ہوتی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ پہئے توڑ کر رکھ دو۔ اگر کہیں پہئے توڑ کر رکھ دیئے تو بھاپ کا نہ ہونا تو خیر اتنا مضر بھی نہیں لیکن ایسی حالت میں بھاپ کا ہونا ہی بس غضب ہے۔ دیکھو ریل کبھی پٹڑی پر سے اُترتی ہے تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ ہاتھوں سے ٹھیلتے ہوئے لئے جا رہے ہیں۔ زور کی آندھی آئی یا کوئی اور سبب ہو گیا کہ پہئے لین سے اتر گئے اب چونکہ اس وقت وہ بھاپ کے زور سے نہیں چل رہی ہے اس لئے لین سے بھی اترے گی تو زمین کے اوپر ہی چلنے لگے گی اگر زمین سخت ہوئی ورنہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ کھڑی ہو رہے گی اور اگر کہیں خدانخواستہ ایسا ہوا کہ بھاپ کے زور میں اڑی چلی جا رہی تھی کہ پہیہ لائن سے اتر گیا تو بھاپ کی یہ برکت ہوئی کہ پہئے زمین کے اندر گھس گئے پرزے پرزے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ڈرائیور اور سواریاں سب ہلاک ہو گئیں ایک قیامت برپا ہو گئی تو بس بھاپ موجود ہونے کی صورت میں اگر یہ لین پر رہی تب تو یہ مسافت کو نہایت سہولت اور امن و عافیت اور تیزی کے ساتھ قطع کرتی رہے گی اور اگر کہیں لین کو چھوڑ دیا تو واللہ قیامت برپا ہو جاوے گی مشین کا بھی گاڑیوں کا بھی چلانے والے کا بھی مسافروں کا بھی سب کا تہس نہس ہو جاوے گا تو اس مثال میں گویا تین حالتیں ہوئیں ایک تو یہ کہ بھاپ نہیں ہے لیکن لائن پر ہے اس صورت میں رفتار ضرور آہستہ ہوگی لیکن خیر کوئی خطرہ بھی نہیں۔ دوسری حالت یہ ہے کہ بھاپ تو اس میں ہے لیکن لائن پر نہیں ہے یہ بس قیامت کا سامنا ہے اور ایک حالت نور علیٰ نور وہ یہ ہے کہ بھاپ بھی ہو اور لائن پر بھی ہو سبحان اللہ یہ ہے

البتہ لطف ۔ تو اے صاحبو جس نے اپنی ریل میں بھاپ تو پیدا کرلی لیکن اس کو لین پر سے اتار دیا واللہ وہ نہایت خطرناک حالت میں ہے اور وہ بھاپ کیا ہے وہ بھاپ ہے محبت جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں اور لین کیا ہے لین ہے صراط مستقیم شریعت کی یعنی جس نے محبت تو پیدا کرلی لیکن اعمال شریعت کو رخصت کردیا وہ قطع طریق تو کیا کرتا اور الٹا اس نے اپنے آپ کو ہلاکت باطنی میں ڈال دیا اور جس نے محبت تو پیدا نہیں کی لیکن عمل شریعت پر کرتا رہا تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے بلا بھاپ کی ریل کہ ٹھیل رہے ہیں اول تو رفتار نہایت سست پھر جہاں ٹھیلنا چھوڑ دیا بس رک گئی اس لئے یہ بھی کچھ نہیں۔ اے صاحب عمل کو اور محبت کو دونوں کو جمع کرلو یہ البتہ ہوگی وہ ریل جس میں بھاپ بھی ہے پہیئے بھی ہیں اور لین پر بھی ہے ۔ پھر دیکھو کیسی جلدی مسافت قطع ہوتی ہے ۔ تو میں نے ریل کی مثال میں جو یہ کہا تھا کہ بھاپ اصل چیز ہے اس کے یہ معنے نہ تھے کہ پہیوں کی ضرورت نہیں رہی اسی طرح محبت کو جو میں نے کہا ہے کہ اصل چیز ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ فقط محبت کافی ہے عمل کی حاجت نہیں بلکہ بھاپ کے اصل ہونے کے یہ معنی ہیں کہ پہیوں کی تیزی کا ذریعہ یہی ہے بغیر اس کے رفتار میں تیزی ممکن ہی نہیں لیکن اگر سرے سے پہیئے ہی ندارد ہوں تو نری بھاپ کیا کرسکتی ہے سوائے اس کے کہ وہیں کے وہیں۔ سی۔ سی بھک بھک ہوتی رہی اسی لئے جس میں محض جوش و خروش ہے اس میں سوائے اس کے کہ حق حق اور الا اللہ الا اللہ کے نعرے لگالئے اور بھی کچھ ہے نفع کیا اس سے غل شور تو بہت مگر ہیں وہیں جہاں پہلے تھے تو نفع کیا اس جوش و خروش سے یہ جوش و خروش تو ایسا ہی ہے جیسا اس ریل کا جس کے انجن میں آگ بھی دہک رہی ہے بھاپ بھی بھری ہوئی ہے مگر کسر ہے تو کیا کہ پہیئے ٹوٹ گئے ہیں تو وہ بیچاری سوائے اس کے کہ کھڑی دھواں دیئے جاویں اور ٹیں ٹاں ٹیں ٹاں "کئے جاوے اور کیا کرسکتی ہے۔ جہاں صبح تھیں حضرت وہیں شام ۔ اور جو گاڑی بے بھاپ کی چلی جارہی ہے اس میں غل شور تو بہت نہیں مگر راستہ آنًا فانًا قطع ہورہا

ہے کاش جس گاڑی میں بھاپ تھی پہیئے بھی درست ہوتے اور لین پر بھی ہوتی تب لطف تھا کہ ایک ساتھ کلکتہ جاکر دم لیتی اور اب تو نری بھاپ بالکل بیکار ہے۔ تو محبت کو جو میں نے اصل کہا ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اعمال کی تکمیل کا بلکہ خود اعمال کا بھی ذریعہ ہے کیونکہ یہ یقینی بات ہے کہ بدون محبت کے اعمال کا صدور بھی ممکن نہیں حتیٰ کہ محبت ضعیف یعنی محبت کا ادنیٰ درجہ وہ ہے جس کو ارادہ کہتے ہیں۔ اور یہ مسلم مسئلہ فلسفہ کا ہے کہ بلا ارادہ کے کوئی عمل وجود میں آہی نہیں سکتا ہر عمل کے لئے صدور سے قبل ارادہ کا متعلق ہونا شرط ہے تو محبت کا ادنیٰ درجہ ارادہ ہوا مثلاً ہم نے جب چاہا اور ارادہ کیا تو محبت ضعیف متحقق ہوگئی چونکہ چاہنے ہی کو تو محبت کہتے ہیں گو تڑپ نہ ہو یہ تو ادنیٰ درجہ کی محبت ہوئی جس کے بدون ادنے درجہ کا عمل ہی صادر نہیں ہو سکتا۔ اور اعلیٰ درجہ کی محبت یہ ہے کہ ؎

تو درد گم شو وصال این ست و بس　　گم شدن گم کن کمال این ست بس

(تو اس میں فنا ہو جا یہی وصال کافی ہے۔ اپنا گم ہو جانا بھول جا انتہائی کمال یہ ہے)

ہائے کیا اچھا مضمون ہے ؎

تو درد گم شو وصال این ست و بس　　گم شدن گم کن کمال این ست بس

گویا فنا کا درجہ جس کو کہتے ہیں وہ اعلیٰ درجہ ہے محبت کا یعنی تمام تعلقات غیر اللہ اس قدر مغلوب ہو جائیں کہ کوئی معبود ہونے میں شریک رہے جو حاصل ہے لا الہ الا اللہ کا اور نہ مقصود ہونے میں شریک رہے جو حاصل ہے فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (تو نیک کام کرتا رہ اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے) کا اور نہ سالک کے نظر میں موجود ہونے میں شریک رہے جو حاصل ہے كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں بجز ذات پروردگار کے) کا جب اسم فاعل کو معنی حال پر محمول کیا جاوے کما ہو احد الوجوہ فی التفسیر پس اول ادنیٰ درجہ کی محبت پیدا ہوئی اس سے عمل ادنیٰ درجہ کا

ہوتا ہے پھر اس عمل کی برکت سے محبت کا اس سے قوی درجہ پیدا ہوتا ہے پھر اس سے پہلے درجہ سے قوی عمل پیدا ہوتا ہے اسی طرح سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے تو ترتیب یوں ہوئی کہ اول محبت ضعیف سی ہوتی ہے جس کو ارادہ کہتے ہیں اس سے ایک عمل پیدا ہوا اور اس کے ساتھ اور بھی موئدات کو مدد کے لئے جمع کر لیا تو اس محبت میں اب ترقی ہوئی اس عمل کی برکت سے پھر اسی محبت زائد سے جو عمل پیدا ہوا اس سے اور محبت زیادہ پیدا ہوئی پھر اس محبت سے اور عمل پیدا ہوا۔ پھر اس عمل کی اور برکت ہوئی پھر اس سے اور عمل پیدا ہوا۔ خلاصہ یہ کہ دونوں میں یہ ترتیب رہتی ہے کہ اول محبت ضعیف پھر عمل ضعیف۔ پھر محبت زائد پھر عمل زائد۔ پھر اور محبت زائد، پھر اور عمل زائد۔ غرض ساری عمر یہ دونوں سلسلے چلتے رہتے ہیں کہ ہر عمل سے محبت اور ہر مزید محبت سے مزید عمل غرض نہ اس سے استغنا نہ اس سے ان میں سے اگر ایک چیز بھی کم ہوگئی تو بس سارا سلسلہ منقطع تو حضرت یہ تو ساری عمر کا دھندا ہے کہ محبت پھر عمل پھر محبت پھر عمل وعلیٰ ہذا۔ نہ اس سے کبھی فارغ نہ اس سے کبھی مستغنی یہ ہے گویا حاصل اس طریق جامع بین المحبت والعمل کا جس کو حضرت عراقی نے اپنے شعر میں طریق قلندر سے تعبیر کیا ہے۔ غرض ذہن میں یہ مضمون آیا تھا جو حضرت عراقی کے اس شعر میں مذکور ہے جس کو میں نے اس وقت بیان کرنے کے لئے اختیار کیا ہے۔

پھر میں نے سوچا کہ کیا کوئی آیت بھی اس مضمون کی ہے سو الحمد للہ قرآن کی یہ آیت بھی ذہن میں آگئی جس سے یہ ہی مضمون موجود ہے۔ اور یہاں سے بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ تصوف کے اصول صحیح قرآن و حدیث میں سب موجود ہیں اور یہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ تصوف قرآن حدیث میں نہیں ہے بالکل غلط ہے یعنی غالی صوفیوں کا بھی یہی خیال ہے اور خشک علمار کا بھی کہ تصوف سے قرآن و حدیث خالی ہیں۔ مگر دونوں غلط سمجھے۔ خشک علمار تو یہ کہتے ہیں کہ تصوف کوئی

چیز نہیں یہ سب واہیات ہے۔ میاں بس نماز روزہ قرآن حدیث سے ثابت اسی کو کرنا چاہیئے یہ تصوف صوفیوں نے کہاں کا جھگڑا نکالا ہے تو گویا ان کے نزدیک قرآن وحدیث تصوف سے خالی ہیں اور غالی صوفی یوں کہتے ہیں کہ قرآن حدیث میں تو ظاہری احکام ہیں تصوف علم باطن ہے ان کے نزدیک نعوذ باللہ قرآن حدیث ہی کی ضرورت نہیں۔ غرض دونوں فرقے قرآن حدیث کو تصوف سے خالی سمجھتے ہیں۔ پھر اپنے اپنے خیال کے مطابق ایک نے تو تصوف کو چھوڑ دیا اور ایک نے قرآن حدیث کو جنھوں نے قرآن حدیث کو چھوڑ دیا انھوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ قرآن حدیث تو محض ظاہری انتظام کی چیزیں ہیں درویشی کا ان سے کیا علاقہ میاں درویشی تو چیز ہی اور ہے جو باطن سے تعلق رکھتی ہے اے صاحبو کیا غضب کرتے ہو۔ خدا سے ڈرو اس کے متعلق میری ایک مستقل کتاب بھی ہے اول تو الحمدللہ یہ بات کہ قرآن حدیث سارا لبریز ہے تصوف سے ہر تصنیف سے۔ ظاہر ہے لیکن میں نے اس مضمون پر دو مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں ایک تو حقیقت الطریقۃ جو مدت ہوئی مکمل ہو کر شائع ہو چکی ہے۔ جس میں مسائل تصوف کی حقیقت احادیث سے ثابت کی گئی ہے۔ اب ایک رسالہ مستقل اور بھی آجکل لکھ رہا ہوں جس میں صاف طور پر ظاہر کیا گیا ہے کہ تصوف کے مسائل قرآن مجید سے بھی ثابت ہیں۔ پاؤ قرآن یعنی آٹھ پارے تو ہو گئے ہیں بائیس پارے اور باقی ہیں خدا مدد فرمائے۔ یہ رسالہ دراصل عربی میں ہے۔ پھر خیال ہوا کہ ساتھ ساتھ اردو میں بھی ترجمہ ہوتا جائے تو اچھا ہے۔ چنانچہ ہو رہا ہے اور وہ جو رسالہ ہے حقیقت الطریقہ وہ تو اصل ہی سے اردو میں ہے تو ان دونوں کتابوں سے معلوم ہوگا کہ قرآن حدیث لبریز ہے تصوف سے اور واقعی وہ تصوف ہی نہیں جو قرآن حدیث میں نہ ہو۔ غرض جتنے صحیح اور مقصود مسائل تصوف کے ہیں وہ سب قرآن میں موجود ہیں۔ کوئی آیت شائد خالی ہو جس میں ایک آدھ مسئلہ تصوف کا مذکور نہ ہو۔ چنانچہ اسی آیت کو دیکھئے جو اس وقت تلاوت کی گئی ہے، اس میں بھی تصوف موجود ہے۔ فرماتے ہیں۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِهٖ الی آخرالآیات[۱] حق سبحانہ تعالےٰ اپنے دین کے محفوظ ہونے کی خبر دے رہے ہیں کوئی یہ ناز نہ کرے کہ دین کا کام ہماری وجہ سے چل رہا ہے اے ایمان والو اگر تم میں سے کوئی نعوذ باللہ دین سے پھر جاوے تو سرکاری کام بند نہ ہوگا چاہے سارے ٹھیکیدار اور مزدور استعفا دیدیں. جیسے دنیا میں سارے عملے والے دفتر کا کام چھوڑ دیں تو حکام کو عین وقت پر پریشانی اور تشویش ضرور ہوتی ہے اس واسطے کہ جب عملے والے سب مخالف ہوگئے تو اب کام کس سے لیں۔ اسی طرح شبہ یہ ہو سکتا تھا کہ اگر نعوذ باللہ سب کے سب مسلمان مرتد ہو جائیں تو شاید اللہ میاں کو بھی سوچ ہو جیسے آج ہی میں ایک حکایت بیان کر رہا تھا کہ ایک نابینا حافظ نے مجھ سے بیان کیا کہ ہم چار آدمی نماز پڑھ رہے تھے تین مقتدی اور ایک امام۔ امام صاحب کا وضو ٹوٹا انھوں نے مجھے خلیفہ بنایا اور خود وضو کرنے چلے گئے اب ایک امام اور دو مقتدی رہ گئے مقتدیوں میں سے ایک نے دوسرے سے نماز کے اندر ہی چپکے سے پوچھا کہ ارے یہ کیا ہوا۔ بیچارہ نے استخلاف امام کا مسئلہ کبھی سُنا نہ تھا۔ دوسرا نصیحت کرتا ہے کہ ارے چپ رہ یوں بھی ہوا کرے ہے (ہوا کرتا ہے) یہ بڑے بوجھ بجکڑ تھے۔ اب امام صاحب کی سنئے جو خلیفہ بنائے جانے کے لائق سمجھے گئے تھے۔ آپ فرماتے ہیں ارے اب میں کسے نماز پڑھاؤں۔ یہ دو ہی تو مقتدی تھے اور ان دونوں کی نماز بولنے سے فاسد ہوگئی۔ غرض اس لے بھی اپنی نماز تباہ کی۔ تو دیکھئے ذرا سی بات میں اس کی نماز رخصت ہوگئی، یہاں کی نماز تو ایسی ہے کہ جب مقتدی نہ رہیں تو امام صاحب فرماتے ہیں کہ اب میں کسے نماز پڑھاؤں۔ اسی طرح اگر کسی بادشاہ سے ساری رعایا باغی ہو جائے تو اب وہ کس پر سلطنت کرے یہاں کے حکام تو ایسے ہیں کہ رعایا نے ہڑتال کر دی تو بس ان کی حکومت ندارد۔ اللہ میاں کو بھی شاید کوئی نعوذ باللہ ایسا ہی سمجھ جاتا۔ سو اللہ میاں فرماتے ہیں کہ ہمارے

[۱] اس آیۃ کریمہ کا ترجمہ خطبہ ماثورہ میں گذر چکا۔

یہاں یہ قصہ نہیں دین سے پھر کر دیکھ لو۔ سب ایک دم سے باغی ہو جاؤ۔ اول تو تمہارے پھر جانے سے ہمارا کوئی کام اٹکتا نہیں اور واقعی اللہ میاں کا ہمارے ایمان اور نماز روزہ سے کیا فائدہ مگر خیر جیسا بھی کچھ کام ہو رہا ہے گو وہ بندوں ہی کی مصلحت کے لئے ہو رہا ہے سو اس کے متعلق بھی خداوند تعالیٰ جل جلالہ وعم نوالہ فرماتے ہیں کہ کسی کے مرتد ہونے سے وہ بھی نہیں رک سکتا یہی حاصل ہے اس آیت کا یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ اے ایمان والو تم میں سے جو کوئی بھی اپنے دین سے پھر جاوے فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ نزدیک ہی یعنی بہت جلد ایسی قوم کو اللہ میاں پیدا فرما دیں گے جس کی ایسی شان ہو گی کہ یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ وہ اللہ میاں کو دوست رکھیں گے اور اللہ میاں ان کو دوست رکھیں گے دیکھئے سوف کے ساتھ فرماتے ہیں جو تقریب کے لئے آتا ہے یعنی فوراً اور واقعی انھیں کیا ضرورت ہے کسی انتظام یا اہتمام کی ایک لفظ کن سے مولوی، شیخ، غوث، ابدال، قطب جو چاہیں بنا دیں۔ اور جس کو چاہیں بنا دیں۔ چنانچہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے حضرت غوث اعظم کی ایک حکایت لکھی ہے۔

ان کے خادم کی روایت ہے کہ ایک بار اخیر شب میں حضرت اٹھے، خادم کہتے ہیں کہ میں سمجھا نماز تہجد کی تیاری کریں گے چنانچہ میں بھی اٹھا تاکہ حضرت کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ ویسے حضرت کو اپنے اٹھنے کی اطلاع نہ ہونے دی واقعی بزرگوں کی خدمت ہے بڑی مشکل انھوں نے جو کیا ٹھیک کیا اطلاع کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی کوئی احسان جتلانا تھوڑا ہی تھا۔ اب تو اگر کوئی خدمت کرتے ہیں تو جتلا کر کرتے ہیں حالانکہ ادب کی بات یہ ہے کہ خیال اور نگرانی تو رکھے مگر خواہ مخواہ جا کر مزاحمت نہ کرے اور تنہائی میں مخل نہ ہو خصوص اخیر رات میں تو بزرگ یہ چاہتے ہیں کہ نہ کوئی ہمیں وضو کے لئے پانی لا کر دے نہ استنجے کا ڈھیلا لا کر دے بلکہ اس وقت تو یہ جی چاہتا ہے کہ کوئی سامنے بھی نہ آئے۔ اپنے ہاتھ سے سب کام کریں کیونکہ وہ وقت ہی ایسا ہوتا ہے ؎

چہ خوش وقتے وخرم روزگارے | کہ یارے برخورد از وصل یارے

(کیا اچھا وقت اور کیا اچھا زمانہ ہے کہ کوئی محب اپنے محبوب کے وصال سے لطف اندوز ہو)

بس اس وقت یہ جی چاہتا ہے کہ بالکل تنہائی کا عالم ہو بلکہ یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اپنے وجود کو بھی جی چاہتا ہے کہ یہ بھی نہ رہے۔ خود اپنا وجود بھی حجاب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت قلندرؒ جو اس موقع کے صاحب مزا ہیں اسی مضمون کو اپنے ایک شعر میں بیان فرماتے ہیں ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم + لیجئے اپنی آنکھ پر بھی غصہ ہے یہ کیوں دیکھتی ہے میں ہی تجھے دیکھتا اور ؎ گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم + میں ہی تیرا کلام سنتا یہ کان کیوں سنیں۔ واقعی صاحب یہی حالت ہوتی ہے۔ حضرت عارف شیرازیؒ بھی اس مضمون کو فرماتے ہیں اور وہ تو قسم کھا رہے ہیں ؎

بخدا کہ رشکم آید ز دو چشم روشن خود | کہ نظر دریغ باشد بہ چنیں لطیف روئے

(خدا کی قسم مجھے اپنی دونوں روشن آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ایسے حسین سے بھی میری نظر دور رہتی) آنکھوں پر بھی رشک آتا ہے سو وہ تو وقت ہی ایسا ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو بھی مٹانے کو جی چاہتا ہے۔ اور اگر کوئی اپنا خادم خاص بھی اس وقت پاس کھڑا ہو تو وہ بھی پسند نہیں آتا اسی واسطے مؤدب خدام یہ کرتے ہیں کہ پاس کو تو لگے رہے لیکن اس طرح کہ اپنی موجودگی کی تو خبر نہ ہونے دی لیکن جب دیکھا کہ کوئی کام مخدوم کے قابو کا نہیں ہے فوراً حاضر ہو کر شریک ہو گئے اور بعد فراغت پھر غائب۔ چنانچہ اس خادم نے بھی ایسا ہی کیا کہ خفیہ طور پر حضرت غوث پاکؒ کے پیچھے پیچھے لگا رہا ادھر حضرت نے کچھ توجہ بھی نہیں کی کہ میرے ساتھ کوئی اور شخص تو نہیں ہے، غرض حضرت اٹھ کر خانقاہ سے نکلکر سیدھے شہر پناہ کے پھاٹک پر پہونچے حضرت شیخ کی برکت اور کرامت سے شہر پناہ کا قفل خود بخود کھل کر گر گیا۔ حضرت کواڑ کھول کر شہر سے باہر ہو گئے چند ہی قدم چلے تھے کہ ایک بڑا بھاری شہر نظر پڑا۔ حالانکہ بغداد کے قریب کوئی اتنا بڑا شہر کہاں اب خادم کو بڑی حیرت کہ یا اللہ میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں لیکن بولے نہیں

چپ چاپ ساتھ چلتے رہے یہاں تک کہ اُس شہر کے اندر داخل ہو کر ایک مقام پر پہونچے۔ وہاں ایک مکان تھا اس کے اندر داخل ہوئے اس میں چند آدمیوں کا ایک مختصر سا مجمع تھا اور ایک مسند پر تکیہ لگا ہوا تھا جیسے کسی کی آمد کا انتظار ہو رہا ہو حضرت شیخ کو دیکھتے ہی وہ لوگ تعظیم کے لئے اُٹھے اور حضرت کو مسند پر بٹھایا پھر اشاروں سے کچھ عرض معروض کی جس کو حضرت ہی سمجھے خادم کی سمجھ میں نہ آیا۔ اس کے بعد ایک طرف سے آواز کراہنے کی آئی آہ آہ۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ آواز بند ہوگئی، پھر کچھ دیر بعد ایسی آواز آنے لگی جیسے پانی ڈالنے کی ہوتی ہے پھر وہ بند ہوگئی پھر تھوڑی دیر بعد ایک حجرہ کھلا اور اس کے اندر سے ایک جنازہ نکلا جس کے ہمراہ چند آدمی تھے ان میں ایک بوڑھے نورانی شکل کے بزرگ بھی تھے۔ حضرت شیخ کے سامنے جنازہ رکھا گیا حضرت نے نماز جنازہ پڑھائی۔ پھر وہ لوگ جنازہ کو لے گئے۔ ادھر یہ لوگ جنھوں نے حضرت شیخ کا استقبال کیا تھا پھر آکر سب حضرت کے گرد بیٹھ گئے اور اسی طرح اشاروں میں دوبارہ پھر کچھ عرض کیا اس پر حضرت شیخ اسی وقت گردن جھکا کر مراقب ہوئے تھوڑی دیر گذری تھی کہ ایک زنار دار شخص عیسائی لباس پہنے ہوئے حاضر ہوا آپ نے اپنے دست مبارک سے اُس کا زنار توڑا اور کلمہ شریف پڑھا کر اس کو مسلمان کیا پھر حاضرین سے ارشاد فرمایا کہ یہ ہے پھر حضرت اس جگہ سے اپنے مکان پر لوٹ آئے۔ خادم کو اسی ادھیڑ بن میں اور حیرت میں صبح ہوگئی کہ اے اللہ کیا قصہ ہے۔ یہ حضرت کی خدمت میں کچھ سبق بھی پڑھتے تھے کیونکہ پہلے درویش اکثر عالم بھی ہوتے تھے تو چونکہ یہ خادم محض مرید نہ تھے بلکہ شاگرد بھی تھے اس لئے دل کھلا ہوا تھا کیونکہ یہ علاقہ شاگردی استادی کا بے تکلفی کا ہوتا ہے بخلاف پیری مریدی کے تعلق کے کہ اس میں اتنی بے تکلفی نہیں ہوتی چنانچہ انھوں نے رات کے واقعہ کے متعلق دریافت کیا کہ حضرت یہ کیا معاملہ تھا مجھے اس قدر حیرت ہے کہ میرے حواس درست نہیں فرمایا کہ وہ شہر موصل تھا جو بغداد سے بہت دور ہے لیکن حق تعالٰے نے میرے لئے اُسے بالکل قریب کر دیا

اور طے ارض ہوگیا اور وہ مجمع جنھوں نے میرا استقبال کیا ابدال تھے اور ان ہی میں سے ایک ابدال قریب مرگ تھے جن کے کراہنے کی آواز آرہی تھی۔ اور وہ بوڑھے نورانی شکل والے بزرگ جو جنازہ لے کر نکلے تھے وہ حضرت خضر علیہ السلام تھے اس جماعت نے مجھ سے باطنی طور پر مجھ کو اطلاع دے کر دریافت کیا کہ اس کی جگہ کون ابدال مقرر کیا جائے میں نے حق سبحانہ تعالیٰ کی طرف توجہ کی ارشاد ہوا کہ قسطنطنیہ کے گرجا میں اس وقت ایک نصرانی صلیب کو پوج رہا ہے اس کو کر دیا جائے ۔ چونکہ کافر کو کسی عہدۂ باطنی پر ہو نہیں سکتا جیسا آجکل لوگ سمجھتے ہیں کہ چمار چوڑھے بھی صاحب خدمت ہوتے ہیں کیا اللہ میاں کو خدمت کے لئے مسلمان نہیں ملتے جو چوڑھوں چماروں سے کام لیں ۔ سبحان اللہ اچھی قدر کی ولایت کی خوب سمجھ لو کہ کافر ہرگز ولی نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی کافر کو ولی کرنا بھی ہوتا ہے تو اول اس کو اسلام کی توفیق دی جاتی ہے۔ چنانچہ اس نصرانی کے معاملہ میں بھی یہ ہی ہوا کہ قسطنطنیہ سے ایک دم میں زمین کی طنابیں کھینچکر اس کو حضرت شیخ کی خدمت میں پہنچایا گیا اور حضرت شیخ کی توجہ کی برکت سے کلمہ پڑھنے کے ساتھ ہی وہ رتبہ ابدالیت پر پہنچ گیا، حالانکہ نہ کوئی مجاہدہ کیا نہ ریاضت اسی کو تو کہتے ہیں حضرت مسعود بک سے مرشد جو کامل ست چلہ شد شد لشد لشد + لیکن یہ محض شاذ و نادر ہے کبھی ایسا بھی ہوجاتا ہے ورنہ چکّی ہی پیسنا پڑتی ہے جو کچھ ملتا ہے چکی ہی پیسنے سے ملتا ہے، خدا کے واسطے کہیں اس شاذ و نادر ہی پر نہ بیٹھ رہنا۔ شاذ و نادر پر بیٹھے رہنا تو ایسا ہے جیسے کوئی عورت اس بنا پر بے نکاح بیٹھی رہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کے بھی تو بے مرد کے اولاد ہوگئی تھی یا کوئی مرد صاحب اس بھروسہ پر کسی عورت کو نکاح کے لئے تلاش نہ کریں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے حضرت حوا علیہا السلام بدون عورت ہی پیدا ہوگئی تھیں میری پسلی سے ایک حوّا (چھوٹی ہ سے) نکل آئے گی یہ دونوں بالکل احمق ہیں۔ میاں خدا نے ایک دفعہ یوں بھی کر دیا کہ بلا نکاح کے

([illegible])

(باقی ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ)

عورت کو اولاد دے دی اور ایک مرتبہ یہ بھی قدرت دکھلادی کہ مرد کی پسلی سے عورت پیدا کردی اب یہ تو نہیں کہ روز روز ایسا ہی ہوا کرے اور لوگ اس شاذ و نادر ہی کے منتظر بیٹھے رہیں نہ عورت مرد سے نکاح کرے نہ مرد عورت کی فکر کرے آجکل یہ عجیب واہیات ہے کہ طالبین شاذ و نادر پر بیٹھے رہتے ہیں کہ پیر ایک نظر کردے گا تو بس بیڑا پار ہو جائیگا اور خود کچھ کرتے کراتے نہیں کیوں جی وہ تمہارے باوا کا نوکر تو ہے نہیں اگر نظر نہ کرے تو کیا کر لوگے یہ کیا بے وقوفی کی بات ہے نیز اس کے قبضہ کی بھی تو بات نہیں اگر کسی کے اختیار میں ہوتا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ابو طالب کے قلب میں ضرور اسلام ڈال دیتے، بھائی بلا کام کئے بھی کہیں کامیابی ہوتی ہے اصل طریق تو یہی ہے کہ ؎

کارکن کار بگذار از گفتار کاندریں راہ کار باید کار

(کام کر بیکار باتیں چھوڑ اس طریق الفت میں صرف عمل ہے)

؎ قدم باید اندر طریقت نہ دم کہ اصلے ندارد دمِ بے قدم

(طریقت میں عمل کرنا چاہیئے نہ کہ دعویٰ کیونکہ دعویٰ بغیر عمل کے بے حقیقت ہے)

نری آرزوؤں اور ہوس سے کام نہیں چلتا اسی کو کہتے ہیں ؎

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

(عرفی اگر رونے سے وصال میسر آجائے تو اس کی تمنا میں سو سال تک رو سکتا ہوں)

تو کیا ہوتا ہے نری آرزوؤں اور تمناؤں سے کام تو کام کرنے ہی سے ہوتا ہے اور کام بھی ایسا جس میں کام ہی کو ثمرہ سمجھا جاوے گو اور کوئی ثمرہ نہ ملے جب کام اور ثمرہ ایک ہی چیز ہے تو بدون کام کئے ثمرہ کا حصول چہ معنی جب کام نہیں تو ثمرہ بھی نہیں کیونکہ ثمرہ تو وہی کام تھا۔ حضرت سرمد رحمۃ اللہ علیہ اسی طرف اشارہ فرماتے ہیں ؎

سرمد گلہ اختصار می باید کرد یک کار ازیں دو کار می باید کرد

ضروری اطلاع :- خط و کتابت کرتے وقت یا پتہ تبدیل کراتے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمایا کریں۔

(اے سرمد شکایت کو مختصر کر اور دو کاموں میں سے ایک کام کر)

۵ یا تن بہ رضائے دوست می باید داد یا قطع نظر زیار می باید کرد

(یا تو بدن کو دوست کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وقف کردے۔ یا دوست سے قطع نظر کر)

ثمرات میں ناکامی کی شکایت کرنے والوں سے کہتے ہیں کہ میاں ان حکایات شکایات کے دفتر کو تو طے کرو۔ زیادہ قیل وقال کی حاجت نہیں ہم تو ایک مختصر سی بات کہتے ہیں کہ بعض ان دو کاموں میں سے ایک کام کو اختیار کرلو۔ یا تو یہ کرو کہ جس بات میں محبوب حقیقی راضی ہو خواہ وہ ناکامی ہی کیوں نہ ہو اس پر راضی رہو یعنی کام ہی کو ثمرہ سمجھو کیونکہ یہ تسلیم و رضا جب ہی ہوسکتی ہے جبکہ عطائے حق کو کہ توفیق عمل ہے ثمرہ سمجھے اور اگر یہ پسند نہیں اور اس سے تم خفا ہونے ہو تو بھائی سیدھی بات یہ ہے کہ پھر اپنے لئے کوئی دوسرا خدا ڈھونڈ لو۔ اس خدا کو چھوڑ دو۔ یہ حضرت سرمد نے خوب دو ٹوک بات کہی واقعی یہ مجذوبوں والی ہی بات ٹھیک ہے کہ ؎

یا تن بہ رضائے دوست می باید داد یا قطع نظر زیار می باید کرد

غرض کام ہی کو مقصود سمجھ کر اس میں لگا رہے کام کرکے بھی ثمرات کا انتظار نہ کرے نہ کہ بے کام کئے ثمرات کی توقع رکھے ایں خیال ست و محال ست و جنوں بہرحال کام کرنا چاہیئے کہ ثمرات بھی حسب سنۃ اللہ کام ہی سے ملتے ہیں۔ لیکن کبھی خدا تعالٰی اپنی یہ قدرت بھی دکھلا دیتے ہیں کہ بلا اسباب بھی مقصود پیدا کر دیتے ہیں چنانچہ اس آیت میں بھی اپنی ایسی ہی قدرت کا بیان فرماتے ہیں ارشاد ہوتا ہے فسوف یاتی اللہ یعنی تمہارے مرتد ہوجانے سے خدائی کام میں کچھ فطور واقع نہ ہوگا جیسے کوئی یہ غلط قیاس کرلے کہ ساری رعایا کے باغی ہوجانے سے سلطنت کا کام تو نہیں چل سکتا تو خدا کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو وہ کسی سے مجبور نہیں ان کی ذات قادر مطلق ہے دم میں جو چاہیں کردیں فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ عنقریب ایک ایسی قوم پیدا کردیں گے جس کی

شان ایسی ایسی ہوگی آگے اس کی حالت کا بیان ہے یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ الخ تو اس موقع پر جس قوم کا ذکر فرمایا ہے وہ قوم ظاہر ہے کہ بہت ہی اعلیٰ درجہ کی ہوگی اس واسطے کہ مقابلہ کے موقع پر سُنا رہے ہیں کہ بجائے تمہارے ان کو تیار فرمادیں گے تو لازمی طور پر وہ قوم ایسی ہونی چاہیئے جو ہر طرح کامل اور اعلیٰ درجہ کی ہو تاکہ مرتد ہونے والوں کو معلوم ہو جائے کہ ہمارے پھرنے ہٹنے سے کیا ہوا ہماری جگہ دوسری قوم ہم سے بھی بڑھ چڑھ کر اسلام میں داخل ہو گئی تو کیا اس قوم کا اعلیٰ درجہ کی صفات سے متصف ہونا خود سیاق کلام سے ثابت ہوتا ہے۔ غرض جو صفات اس مقام پر مذکور ہوں گی وہ نہایت عظیم الشان اور قابل اعتبار ہوں گی۔ اب ان صفات کو سنئے کہ وہ کیا ہیں سب سے اول جو صفت بیان کی گئی وہ یہ ہے کہ یحبھم ویحبونھم یعنی خدا کو ان سے محبت ہوگی اور ان کو خدا سے دیکھئے حضرت سب سے پہلے حق تعالےٰ نے یہی صفت بیان فرمائی ہے کہ وہ لوگ اہل محبت ہوں گے اس تقدیم ذکر سے صفت محبت کا سب سے زیادہ مہتم بالشان ہونا ثابت ہوتا ہے۔
اسی سے میں نے استدلال کر کے یہ عرض کیا تھا کہ بس دین میں محبت ہی اساس ہے راس ہے جڑ ہے اصل ہے اور بنیاد ہے، جب یہ بات ہے تو اے صاحبو آپ نے کیا کوشش کی اپنے اندر محبت پیدا کرنے کی نمازی بھی ہو گئے روزہ دار بھی ہو گئے حاجی بھی ہو گئے مگر محبت جو اصل چیز ہے آخر اس کی بھی کچھ کوشش کی کچھ بھی نہیں کوشش تو کیا اور الٹا یہ کیا ہے کہ جو محبت والے ہیں ان پر ہنستے ہیں ان کو پاگل اور مجنوں اور نہ جانے کیا کیا خطاب دے رکھے ہیں اور ان کی بھی بڑی کوتاہی ہوگی اگر وہ پاگل اور مجنوں کا لقب سن کر برا مانیں کچھ خبر بھی ہے یہ لقب تو بہت بڑا ہے، ارے یہ لقب تو ایسا لقب ہے کہ اس کو سن کر تمہیں خدا کا شکر کرنا چاہیئے نہ کہ برا مانو۔ کیونکہ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مخالف بھی تمہارے اعلیٰ درجہ کے محب خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کی شہادت دینے لگے بات یہ ہے کہ مخالف یہ لقب اسی کو دیتے ہیں جو اعلیٰ درجہ کا محب ہو اور اس کا راز یہ ہے کہ جو شخص اعلیٰ درجہ کا محب

ہوتا ہے اس کے افعال عقل معاش اور دنیوی مصلحتوں کے خلاف ہوتے لگتے ہیں اور یہی تو وجہ ہے کہ جو لوگ محض عقل معاش رکھتے ہیں وہی ایسے شخص کو مجنون اور بے وقوف کہتے ہیں اور یہ لقب بہت پرانا ہے، چنانچہ کلام مجید اس پر شاہد ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ (اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی ایمان لے آؤ جیسا ایمان لائے ہیں اور لوگ تو کہتے ہیں کیا ہم ایمان لاویں گے جیسا ایمان لائے ہیں یہ بے وقوف لوگ) دیکھئے حضرات صحابہ کو جو اعلیٰ درجہ کا ایمان رکھتے تھے منافقین نے نعوذ باللہ سفہا کا لقب دے رکھا تھا کیونکہ وہ حضرات اپنے سب ا۱۰۶ا اقربا کو چھوڑ کر اور مال و متاع کو خیرباد کہہ کر ایمان لائے تھے جو بظاہر عقل معاش کے بالکل خلاف تھا اسی لئے منافقین کہتے تھے کہ ان کی عقل ماری گئی ہے کہ اپنا اتنا بڑا نقصان کر کے ایمان لائے ہیں یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح یہ بے وقوف ایمان لے آئے ہیں تو دیکھئے ان احمقوں نے حضرات صحابہ کو بھی نعوذ باللہ بیوقوف بتایا اس زمانہ میں بھی یہی حال ہے۔

ہمارے قصبہ میں ایک شخص نومسلم ہیں وہ پہلے بہت امیر کبیر گھرانے کے تھے جب وہ مسلمان ہو گئے تو ظاہر بات ہے کہ پھر ظالم لوگ بھلا وہ دولت و ثروت ان کو کہاں دیتے، بے چارے ہمارے بھائی کے یہاں دس بارہ روپیہ کے نوکر ہیں۔ یا تو خود صاحب جائداد تھے یا اب نوکری کرتے ہیں اور اپنا پیٹ پالتے ہیں، مگر جس جگہ نوکر ہیں وہاں پر ہیں بہت عزت اور آرام کے ساتھ جس جگہ کے رہنے والے ہیں وہاں ایک مرتبہ کسی کام سے ان کا جانا ہوا وہاں ان کے عزیز قریب سب ہی ہیں مگر اب ان سے کیا علاقہ لہٰذا وہ جا کر کسی موقع پر ٹھیر گئے ان کے عزیز قریب سب ملنے آئے اور اُن کی بڑی خاطر کی۔ وہ خود اپنا واقعہ بیان کرتے تھے کہ میں لیٹا ہوا تھا اور وہ لوگ بھی پاس بیٹھے تھے وہ سمجھے کہ یہ سو رہا ہے لیکن میں جاگ رہا تھا۔ ایک بولا کہ ارے سنا ہے یہ بڑے آرام میں ہے۔ ایک شیخ کے یہاں کارندہ ہے اس کی بہت بڑی حویلی ہے نوکر چاکر

گائیں بھینسیں سبھی کچھ ہے اور یہ سب پر حکومت کرتا ہے، بڑی عزت ہے بڑے مزہ میں ہے۔ دوسرا بولا کہ بھائی سب کچھ سہی مگر اس نے کی بہت کھوٹی بات (یعنی بُری بات) کہ اپنے عزیز قریب، بیوی بچے سب چھوڑ دیئے اور مسلمان ہو گیا۔ لیجئے یہ ان کو لقب ملا۔ تو سمجھنے کی بات ہے کہ باپ بھائی جائیداد۔ بیوی سب کو چھوڑ دینا آسان کام نہیں ان کی پہلی بیوی مسلمان نہیں ہوئی وہ اب بھی موجود ہے اور اب بھی کبھی کبھی جب ساس نندول سے پریشان ہوتی ہے ان سے کہلا بھیجتی ہے کہ تم میری مدد نہیں کرتے۔ اب بھی اتنا ناز ہے۔ بہرحال انھیں بیوقوف اس بناء پر قرار دیا کہ عزیز قریب سب کو چھوڑ دیا اور ایمان کے مقابلہ میں کسی چیز کی پروانہ کی تو صاحب یہ شان ہوتی ہے اعلیٰ درجہ کے محب کی اور یہ لقب اس کو ملتے ہیں اور لیجئے سب سے بڑھ کر عاقل سید العقلاء حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کفار نعوذ باللہ مجنون کہتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جا بجا ان کے یہ اقوال موجود ہیں اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ بِہٖ جِنَّۃٌ پارہ ۱۸ ترجمہ (یا یہ لوگ آپ کی نسبت جنون کے قائل ہیں) وَیَقُوۡلُوۡنَ اِنَّہٗ لَمَجۡنُوۡنٌ پ ۲۹ ترجمہ (اور کہتے ہیں کہ یہ (محمد صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم) مجنون ہیں (معاذاللہ) اور خدا تعالٰی نے اس کی نفی فرمائی ہے۔ مَآ اَنۡتَ بِنِعۡمَتِ رَبِّکَ بِمَجۡنُوۡنٍ پ ۲۹ (آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں) گو یہ احتمال بھی ہے کہ اور کچھ تو بن نہ پڑتا تھا محض جل کر یہ کہہ دیتے ہوں کوئی اور منشاء نہ ہو اس قول کا مگر یہ ظاہر کے خلاف ہے۔ چنانچہ شاعر اور ساحر بھی تو کہتے تھے تو وہ لوگ یہ تینوں لقب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اطلاق کرتے تھے یعنی شاعر، ساحر اور مجنون۔ اور شاعر اور ساحر کا منشاء ہمیں معلوم ہے چنانچہ میں ابھی عرض کروں گا جب دو کا منشاء معلوم ہے تو ظاہر یہ ہے کہ تیسرے لقب کا منشاء بھی ضرور ہوگا۔ شاعر اور ساحر کہنے کا منشاء سنئے وہ ایسا ہے جیسا کسی نے کہا ہے بمعشوق من آنست کہ نزدیک تو زشت است۔ شاعر اور ساحر اس لئے کہتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام مبارک میں ایسا اثر تھا کہ جب کفار سنتے تھے تو ان کے خیالات میں عظیم الشان تبدیلی واقع ہو جاتی تھی، پس طرز بیان کی تاثیر کو تو شاعری اور

مضمون کی تاثیر کو ساحری کہتے تھے اسی لئے کوشش کرتے تھے کہ کسی طرح لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہ سنیں چنانچہ ڈرتے تھے اور کہتے تھے کہ دیکھو ان کا کلام مت سنو لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ خبردار قرآن مت سُننا بس اس کا سُننا ہی غضب ہے وَالْغَوْا فِيْهِ اور اگر وہ پڑھنے ہی لگیں تو تم شور وغل مچانا گھپڑ سپڑ کرنا شروع کردو لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ شاید اسی سے جیت جاؤ (اس طرح سے کہ وہ مجبور ہو کر خاموش ہو جائیں) یہ تہذیب تھی ماشاء اللہ۔ غرض وہ بہت ہی ڈرتے تھے کہ یہ تو شاعر اور ساحر ہیں ان کا کلام سنا نہیں اور اثر ہوا نہیں بس اسی واسطے شاعر اور ساحر کہتے تھے غرض کلام کے قوتِ تاثیر اس کا منشا تھا۔ اسی طرح مجنون جو کہتے تھے تو اس کا بھی ایک منشا تھا وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کے مقابلہ میں ساری دنیا کی مصلحتوں کو چھوڑ دیا یعنی ان بے وقوفوں کے نزدیک نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عقل کے خلاف بات کی۔ چنانچہ سب نے مل کر ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں ایک سفیر بھیجا جو حاضر ہو کر آپ کی خدمت میں منافع و مصالح پیش کرے اس نے آکر عرض کیا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ سردار بننا چاہتے ہیں تو ہم لوگ سب آپ کو بخوشی اپنا سردار بنالیں کیونکہ آپ نہایت شریف النسب ہیں۔ آپ جس قبیلہ میں پیدا ہوئے وہ حسب نسب میں سب سے بڑھ کر ہے ان کو اپنا سردار بنالینے میں ہم کو کوئی عار نہیں۔ مگر ہمارے بتوں کو برا نہ کہئے۔ اگر آپ عورتیں چاہتے ہیں تو قریش کی ساری لڑکیاں حاضر ہیں ایک سے ایک حسین موجود ہے جتنی چاہیں پسند کر لیجئے اپنی بہنیں اور لڑکیاں آپ کے نکاح میں دینا ہمارے لئے فخر ہے بلکہ انھیں خود آپ کی لونڈیاں بننا باعث عزت ہے۔ اور اگر مال کی خواہش ہے تو ہم ابھی ایک بڑا خزانہ آپ کے لئے فراہم کردیں بس آپ قرار اور سکون سے بیٹھے رہیئے اور ہمارے بتوں کو برا کہنا چھوڑ دیجئے۔ جب سفیر یہ سب باتیں کہہ چکا تو آپ نے بجائے جواب کے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر سورۂ حم سجدہ کا شروع کا حصہ تلاوت

فرمایا حٰمٓ تَنْزِیْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ الی آخرالآیات
(یہ کلام رحمٰن۔ رحیم کی طرف سے نازل کیا گیا ہے یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں صاف صاف بیان کی گئی یعنی ایسا قرآن ہے جو عربی ہے ایسے لوگوں کے لئے ہے جو دانشمند ہیں بشارت دینے والا ہے ڈرانے والا ہے سو اکثر لوگوں نے روگردانی کی پھر وہ سنتے ہی نہیں)

اور اس کی یہ حالت تھی کہ بالکل ساکت اور صامت تھا جیسے کہ نقش دیوار۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھتے پڑھتے یہ آیت تلاوت فرمائی فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (پھر اگر یہ اعراض کریں تو آپ کہد یجئے کہ میں تم کو ایسی آفت سے ڈراتا ہوں جیسی عاد و ثمود پر آئی تھی) تو گھبرا کر کہنے لگا بس کیجئے بس کیجئے، اب سننے کی تاب نہیں اس قدر اثر ہوا کہ سنا نہیں گیا اور اٹھ کر بھاگا اور بھاگ کر اپنے ساتھیوں میں پہنچا جنھوں نے اُسے بھیجا تھا یعنی ابو جہل وغیرہ وہ سب منتظر بیٹھے تھے ابو جہل بڑا ذہین تھا۔ اس نے دور ہی سے دیکھ کر تاڑ لیا کہا کہ بھائی یہ گیا تو تھا اور چہرہ سے اور آرہا ہے اور چہرہ سے ایسا شریر تھا کہ دور ہی سے پہچان گیا کہ ارے یہ تو کچھ ڈھیلے ڈھیلے گھٹنوں سے آرہا ہے اس کے چہرہ کا تو کچھ رنگ ہی بدلا ہوا ہے۔ گیا تھا اور چہرہ سے آرہا ہے اور چہرہ سے جب پاس پہنچا تو سب نے پوچھا کہ ارے یار کہہ تو سہی کیا گذری۔ اس نے کہا اجی کیا پوچھتے ہو جب میں سب باتیں پیش کر چکا تو انھوں نے ایک ایسا کلام پڑھا کہ واللہ اگر میں وہاں تھوڑی دیر اور بیٹھا رہتا تو سخت اندیشہ تھا کہ کوئی بجلی میرے اوپر آگرتی کیا پوچھتے ہو کیا کیفیت تھی اثر کی جب انھوں نے یہ کہا کہ میں تم کو ایک ایسی کڑک سے ڈراتا ہوں جیسی کہ عاد اور ثمود پر گرائی گئی تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ بس اب بجلی گری خدا جانے کیا کلام تھا اور کس غضب کا اس میں اثر تھا واللہ اگر اور تھوڑی دیر بیٹھوں اور سنوں تو بجز اس کے کہ مسلمان ہو جاؤں اور کوئی صورت نہ تھی مشکل سے اپنا پیچھا چھوڑا کر آیا ہوں۔ تو یہ حال تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اثر کا چونکہ وہ لوگ

رات دن دیکھتے تھے کہ یہ الٹ پلٹ کر دیتے ہیں ایک جلسہ تمام قوموں کو (قوموں جمع ہے قوم کی بمناسبت مقابلہ لفظ جلسہ جامع ۱۲) اس واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ شاعر اور ساحر کہتے تھے جب اس قوم نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سرداری مل رہی ہے وہ نہیں لیتے اونٹ مل رہے وہ نہیں لیتے، مال مل رہا ہے تو وہ نہیں لیتے حسین حسین عورتیں مل رہی ہیں وہ نہیں لیتے تو وہ نامعقول سمجھے بھلا یہ کونسی عقل کی بات ہے جب دنیا کی ساری نعمتیں مل رہی ہیں تو پھر خوامخواہ انکار ہے عقل کی بات تو یہ ہے کہ میاں جب اتنا چندہ اور روپے مل رہے ہیں تو لے لو کام آویں گے۔ احمقوں نے اپنے اوپر قیاس کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ ایک مقام پر میری ایک انگریز سے جو کہ جنٹ تھا اس کی خواہش پر ملاقات ہوئی۔ دوران گفتگو میں اس نے پوچھا کہ ہم نے سنا ہے آپ نے قرآن شریف کی تفسیر لکھی ہے میں نے کہا ہاں صاحب لکھی ہے تو آپ کیا کہتے ہیں آپ کو کتنا روپیہ ملا' میں نے دل میں کہا کہ واہ وا بس یہ ہے آپ کا مبلغ پرواز اور مطمح نظر۔ جب میں نے کہا کچھ بھی نہیں ملا تو بڑے تعجب سے پوچھا کہ آپ نے اتنی بڑی کتاب لکھی اور کچھ بھی نہیں ملا تو پھر کیا فائدہ ہوا اتنی محنت ہی پھر کیوں کی۔ اس کے نزدیک جسے روپیہ نہ ملے وہ کوئی دین کا کام ہی نہ کرے۔ خیر میں نے اسی کے مذاق کے موافق اسے سمجھایا میں نے کہا کہ اس سے مجھے دو فائدے ہوئے ایک تو یہ کہ علاوہ اس زندگی کے ہم مسلمانوں کے اعتقاد کے موافق ایک دوسری زندگی بھی ہے جس کو ہم لوگ آخرت کہتے ہیں وہاں ایسے کاموں کا عوض ملنے کی ہمیں توقع ہے اور دوسرا فائدہ دنیا کا بھی ہے وہ یہ کہ میں نے جو تفسیر لکھی ہے اپنے بھائی مسلمانوں کے فائدہ کے لئے لکھی ہے اور یہ ایک قومی خدمت ہے جب میں اس تفسیر کو اپنے بھائیوں کے ہاتھوں میں دیکھتا ہوں تو مجھے اس بات سے خوشی ہوتی ہے کہ میری قوم کو اس سے نفع پہونچ رہا ہے چونکہ یہ تقریر اس کے مذاق کے موافق تھی اس کو سن کر اس کی نظر میں میری بڑی وقعت ہوئی۔ تو جو روپیہ پیسے اور جاہ کو مقصود سمجھے گا تو وہ ضرور ایسے شخص کو کہیگا کہ یہ بڑا بے وقوف ہے کہ اس نے محض دین کیلئے اپنا جاہ و مال سب برباد کر دیا۔ ہمارے ایک دوست نے ناجائز ہونے کی بنا پر ڈپٹی کلکٹری چھوڑ دی ہے (یہ واقعہ ضابط واعظ کا ہے) تو اب سب لوگ انھیں لتاڑتے ہیں کہ عقل ہی ماری گئی ہے ہم یہ کہتے ہیں کہ تمہاری ہی عقل ماری گئی ہے جو اس کو خلاف عقل کہتے ہو ع اودست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد جو لوگ جاہ اور مال ہی کو مقصود سمجھتے ہیں اور جنھوں نے فقط دنیا ہی کو اپنا قبلہ توجہ بنا رکھا ہے

ایسوں پر ہنستے ہیں لیکن اگر وہ ہم پر ہنستے ہیں تو ہم ان پر ہنستے ہیں فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ (ہم تم پر ہنستے ہیں جیسا تم ہم پر ہنستے ہو) حضرت نوح علی نبیا و علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب حسب ارشاد خداوندی کشتی بنائی تو ان کی قوم ان پر ہنستی تھی۔ کوئی پوچھتا کہ کشتی کیوں بنائی جارہی ہے آپ فرماتے ایک بڑا سخت طوفان آنیوالا ہے اس وقت یہ کام آویگی۔ لوگ یہ سن کر کہتے کہ قحط تو پڑ رہا ہے آپ کو طوفان کی سوجھ رہی ہے لوگ ان پر ہنستے کہ بس نبوت تو ختم ہوئی اب نجاری شروع کی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نہایت متانت سے فرماتے ہیں اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ (اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم تم پر ہنستے ہیں جیسا تم ہم پر ہنستے ہو سو ابھی تم کو معلوم ہوا جاتا ہے کہ وہ کون شخص ہے جس پر ایسا عذاب آیا چاہتا ہے جو اس کو رسوا کر دے گا اور اس پر دائمی عذاب نازل ہوتا ہے) تم اس وقت ہم پر ہنستے ہو ہم اس وقت تم پر ہنسیں گے اس میں تو دونوں برابر۔ کل فرق معلوم ہوگا کہ کس پر عذاب آتا ہے اور کون ذلیل ہوتا ہے تو لوگ احمق ہوئے ہیں جو ایسوں کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔ ایک بزرگ تھے حضرت محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پیر بھائی قصبہ رامپور کے ایک رئیس کے بیٹے ان کے مرید ہو گئے یعنی حضرت حکیم ضیاء الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان دونوں بزرگوں کی خدمت میں آنے جانے لگے ان کے فیض صحبت سے ان کی حالت بدل گئی دنیا کی طرف سے بے رغبتی اور آخرت کی جانب رغبت پیدا ہوگئی ان کے باپ کے پاس ایک دفعہ کچھ گنوار آئے اور کہنے لگے کہ تھارے (یعنی تمہارے) بیٹے کا بڑا افسوس ہے فقیر ہو گیا وہ بولے خیر بھائی۔ تو ایک گنوار کیا کہتا ہے اجی بُری صحبت ایسی ہی ہو ہے (یعنی ہوتی ہے) جبھی تو بڑے بوڑھے بُری صحبت سے منع کریں ہیں (کرتے ہیں) دیکھو نہ۔ بگڑ گیا فقیر ہو گیا تو گویا بیوقوف نے دینداروں کی صحبت کو بُری صحبت سمجھا۔ استغفر اللہ۔ ان ہی حضرت حافظ صاحب کا ایک اور واقعہ ہے کوئی نوجوان شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا اس کی حالت بدلنے لگی ایک بار اس کا باپ حاضر ہو کر نہایت بے باکی سے کہنے لگا کہ جب میرا بیٹا آپ کے پاس آنے لگا بگڑ گیا۔ حضرت تھے بڑے جلالی فرمایا اپنے بیٹے کو ہمارے پاس نہ آنے دو روک دو ہمارے پاس

جو کوئی آئے گا ہم تو اسے بگاڑیں ہی گے۔ جس کو لاکھ مرتبہ غرض ہو اور بگڑنا چاہے وہ ہمارے پاس آئے ہمیں تو بگاڑنا ہی آتا ہے ہمیں بھی تو کسی نے بگاڑا ہی ہے ہمنے تو اپنے پیر سے بگڑنا ہی سیکھا ہے اجی جو بگڑنے سے ڈرے وہ ہمارے پاس آوے ہی کیوں ایسے کے پاس جائے جسے سنوارنا آتا ہو ہمیں تو بگاڑنا ہی آتا ہے۔ اللہ اکبر ایک شخص کی جیب میں کوڑیاں تھیں اس نے ان کو نکال کر پھینکدیا اور ان کی جگہ اشرفیاں بھر لیں تو کیا وہ بیوقوف ہے وہ ہرگز بےوقوف نہیں البتہ جو لوگ اشرفیوں کی قیمت سے واقف نہیں وہ کوڑیاں پھینکتے وقت اُسے ضرور بُرا بھلا کہیں گے کہ لو جی بھری ہوئی جیب ہی خالی کردی ارے تمہیں کیا خبر اس نے کوڑیوں سے جیب خالی کرکے اشرفیوں کے لئے جگہ کی ہے اگر ایک شخص کے پاس ایک لاکھ روپیہ موجود ہے اس سے کوئی کیمیا سکھانے والا کہے کہ مجھے ایک لاکھ روپیہ دیدو میں کیمیا بنا تا سکھا دوں گا اور وہ وعدہ کرنے والا نہایت معتبر ہو تو وہ فوراً لاکھ روپیہ دیدے گا۔ پھر اس نے ایک لاکھ روپیہ لے کر کیمیا سکھلادی تو اب وہ سیکھنے والا اس قدر خوش ہے کہ پھولا نہیں سماتا اُسے اسکا مطلق افسوس نہیں کہ میں نے ایک لاکھ روپیہ کیوں دیدیا بلکہ وہ زبان حال سے کہتا ہے ؎

جمادے چند دادم جاں خریدم — بحمداللہ عجب ارزاں خریدم

مگر اس کا پڑوسی جو کیمیا کا قائل اور اس فن کو جانتا نہیں وہ اسے بیوقوف بناتا ہے کہ میاں تم بھی بڑے احمق ہو ایک لاکھ روپیہ یوں ہی دیدیا اتنی بڑی رقم فضول ہی ضائع کردی جب وہ کہتا ہے کہ بھائی میں نے یہ رقم ضائع نہیں کی بلکہ اس کے بدلے کیمیا بنانا سیکھ لیا ہے تو کہتا ہے جاؤ میاں بیٹھو بھی۔ بیوقوف ہوئے ہو کیسی کیمیا۔ لاکھ روپیہ دے دیا ایک وہمی اور فضول سی چیز کیمیا کے لئے یہ حضرت صرف لاکھ روپے کو رو رہے ہیں مگر وہ ایک ہی دن میں لاکھ روپیہ بنالے گا۔ بلکہ جسے کیمیا بنانا آتا ہے وہ دل کا اس قدر غنی ہو جاتا ہے کہ اسے بنانے کی بھی ضرورت نہیں رہتی وہ ہر وقت مطمئن ہے کہ جب چاہوں گا اور جتنا چاہوں گا لاکھ دو لاکھ بنا لوں گا۔ تمہیں کیا خبر کہ جس نے مال اور جاہ کو چھوڑا ہے اسے کیا کیمیا مل گئی ہے ؎

کیمیا ئیست عجب بندگیٔ پیر مغاں — خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند

(مرشد کی تابعداری عجیب کیمیا ہے کہ مجھ کو اس کے پاؤں کی خاک بننے سے بڑے درجے ملے)

دوش وقتِ سحر از غصّہ نجاتم دادند　　　داندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

(کل صبح کے وقت مجھ کو غصہ سے نجات دی گویا اندھیری میں مجھ کو آب حیات بخشی)

یہ ہے وہ کیمیا اور وہ دولت جو حاصل ہوتی ہے اور جس کے حصول کے بعد جوش میں آکر یہ کہتے ہیں ؎

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند　　　داندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

دوسروں کو کیا خبر اس دولت کی اندھے مادر زاد کو کیا خبر کہ نظر کسے کہتے ہیں اور روشنی کیسی ہوتی ہے عنین کیا جانے کہ نکاح میں کیا مزہ ہے اور منکوحہ کیسی قابل قدر چیز ہے اسی طرح جن کی باطنی آنکھیں پٹ ہیں وہ باطنی دولت کی حقیقت کیا سمجھیں وہ تو ظاہری جاہ ومال چھوڑنے والوں کو بیوقوف ہی بتاویں گے کہ لو صاحب روپیہ پیسہ ملتا تھا نہیں لیا سرداری مل رہی تھی نہیں قبول کی۔ اب دیکھئے کہ یہ کس کی حالت تھی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان تھی۔ تو اعلیٰ درجہ کی حالت یہ ہے کہ عقلاء زمانہ بیوقوف کہا کریں اور دیوانہ سمجھا کریں یہ تو بڑے فخر کی بات ہے ایسی دیوانگی تو مطلوب ہے یہ دیوانگی تو وہ ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد　　　مرعسس را دید درخانہ نشد

اور ؎ ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم　　　مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

اور حافظ شیرازی فرماتے ہیں ؎

اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی　　　بے زر وگنج بصد حشمت قاروں باشی

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں　　　شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

بلکہ اگر وہ جنون کم ہوجائے تو غم ہوتا ہے اور جب وہ پھر عود کرتا ہے تو خوش ہوکر فرماتے ہیں ؎

باز دیوانہ شدم من اے طبیب　　　باز سودائی شدم من اے حبیب

باز آمد آب من درجوئے من　　　باز آمد یار من درکوئے من

خوش ہوتے ہیں اور خدا کا شکر کرتے ہیں کہ دیوانگی پھر آگئی اور عقل کو یوں خطاب کرتے ہیں ؎

آزمودم عقل دور اندیش را　　　بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ　　جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

تو یہ حالت ہوتی ہے۔ تو حالت مطلوب کیا ہوئی یہ ہوئی کہ طلب میں ایسی حالت ہو جائے کہ لوگ دیوانہ سمجھنے لگیں۔ حدیث میں بھی تو آتا ہے حصن حصین میں ہے۔ اذکروا اللہ حتی یقولوا انہ لمجنون اللہ تعالیٰ کی اتنی یاد کرو کہ لوگ تم کو پاگل کہنے لگیں اور واقعی ایسی حالت ہو جاتی ہے۔ ایک بزرگ تھے وہ خط بنوا رہے تھے مگر زبان سے ذکر اللہ جاری تھا۔ نائی نے لبیں لیتے وقت عرض کیا کہ حضور تھوڑی سی دیر کے لئے خاموش ہو جائیں ورنہ ہونٹ کٹ جائے گا آپ نے فرمایا کہ اگر ہونٹ کٹ جائیگا تو کیا ڈر ہے پھر جوڑ جائیگا لیکن اگر اللہ کی یاد کو میں نے منقطع کر دیا تو جو سانس غفلت میں گذرے گا اس کا کوئی تدارک نہیں بس میں اپنا کام کروں تم اپنا کام کرو۔ اگر ہونٹ کٹتے ہیں کٹنے دو چاہے سارے ہی کٹ جائیں میں ذکر کو منقطع نہ کروں گا۔ ہائے مولانا نے بھی ایک ایسی ہی حکایت لکھی ہے ؎

زاہدے راگفت یارے در عمل　　کم گری تا چشم را نا ید خلل

ایک زاہد تھے جو رویا بہت کرتے تھے ان کے ایک رفیق طریق نے کہا کم رویا کرو ورنہ آنکھیں خراب ہو جائیں گی ؎

گفت زاہد از دو بیروں نیست حال　　چشم بیند یا نہ بیند آں جمال

زاہد نے کہا کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو یہ کہ آنکھیں وہ جمال دیکھیں گی یا نہ دیکھیں گی ؎

گر بہ بیند نور حق خود چہ غم است　　در وصال حق دو دیدہ کے کم است

اگر ان آنکھوں سے میں نے جمال حق دیکھ لیا تو پھر ان آنکھوں کے نہ رہنے کا کیا غم یہ دو آنکھیں کیا ایسی ایسی لاکھوں آنکھیں بھی ہوں تو اس جمال پر نثار ہیں ؎

ورنہ بیند نور حق را گو برو　　ایں چنیں چشم شقی گو کور شو

اور اگر اس جمال کو نہ دیکھا تو ایسی کمبخت آنکھوں کا پھوٹ جانا ہی بہتر ہے وہ آنکھ ہی کیا جس کو وہ جمال دکھائی نہ دے اور وہ کان ہی کیا جس کو وہ خطاب نہ سنائی دے ایسی آنکھ اور ایسے کان ہی کو میں کیا کروں گا۔ حضرت یہ لوگ آنکھ کو کان کو جان کو مال کو

سب کو محبت حق میں فنا کر دیتے ہیں ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ؎

ہو فنا ذات میں کہ تو نہ رہے　　تیری ہستی کی رنگ و بو نہ رہے

جتنا تعلق ذات حق سے بڑھتا جاتا ہے اور سب کو فنا کرتے جاتے ہیں تو ایسوں کو لوگ بیوقوف تو بتاویں ہی گے کہیں گے اچھے متقی ہوئے ہونٹ ہی کٹا بیٹھے اور گرد اللہ اللہ کوئی ان سے کہے کہ میاں تمہیں کیا ہونٹ کٹے تو ان کے کٹے تم سے تو شکایت نہیں۔ ایک بزرگ صرف ستو ہی گھول کر پی لیتے کہ کھانا کھانے میں دیر لگتی ہے۔ حرج بہت ہوتا ہے ستو گھولا اور جلدی سے ایک گھونٹ پی لیا پھر اپنے اللہ کی یاد میں لگ گئے ان کی غذا تو بس یہ ہے۔ ایسے شخص کو ظاہر ہے کہ لوگ بیوقوف ہی کہیں گے چونکہ ہر وقت توجہ حق کی طرف رہتی ہے ایک استغراق کا سا عالم طاری رہتا ہے اور جب توجہ ہی کسی اور طرف نہیں تو بہت سی باتوں میں بھول ہو جاتی ہے محبوب حقیقی کے سوا انھیں اور کچھ یاد ہی نہیں رہتا بقول احقر جامع (۱۲) ؎

گشتہ حیرت کوئی مجھ سا بھی نہیں ہے　　میں خود ہوں کہیں دل ہے کہیں ہوش کہیں ہے

سہ ہمیشہ رہتا ہوں اک بیخودی کے عالم میں　　جہاں نہ میرے لئے ہے نہ میں جہاں کے لئے

تو ایسے شخص کو اہل دنیا پاگل نہ کہیں گے تو اور کیا کہیں گے۔ میں نے اپنے استاد علیہ الرحمۃ سے خود سنا ہے مولانا علاوہ زبردست عالم ہونے کے بڑے درویش اور صاحب باطن شیخ تھے فرماتے تھے کہ میں نے ایک مرتبہ خط لکھ کر آخر میں دستخط کرنا چاہے تو اپنا نام ہی بھول گیا بہت یاد کیا مگر یاد ہی نہ آیا۔ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے استغراق کا کہ اپنا نام ہی یاد نہ رہا ایسا حیرت ناک واقعہ ہے کہ اگر میں نے خود حضرت سے نہ سنا ہوتا تو باور آنا بھی مشکل تھا۔ حضرات صحابہ میں بھی اس رنگ کے ایک بزرگ گذرے ہیں۔ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دن آپ کی صاحبزادی صاحبہ بھی ساتھ جا رہی تھیں لوگوں نے پوچھا یہ لڑکی آپ کی ہے تو آپ بہت غور سے اس کو دیکھ کر فرماتے ہیں کہ ہاں گھر والے کہتے تو تھے کہ یہ میری لڑکی ہے۔ یعنی یہ بھی یاد نہیں رہا کہ یہ میری لڑکی ہے، گھر والوں کے قول سے استدلال کیا۔

میں نے حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ کی زیارت کی ان کا بھی یہی رنگ تھا۔ ایک بار مولانا کے پوتے کی شادی کا ہنگامہ تھا۔ مجمع کو دیکھ کر پوچھا کہ ارے بھائی یہ لوگ کیوں جمع ہیں عرض کر دیا گیا کہ حضرت کے پوتے کا نکاح ہے فرمایا اچھا ان کا نکاح ہے تھوڑی دیر بعد پھر فرماتے ہیں ارے بھائی یہ لوگ کیوں جمع ہیں پھر عرض کر دیا گیا کہ پوتے صاحب کا نکاح ہے فرمانے لگے ہاں میاں ہاں ابھی تو تم نے کہا تھا کہ نکاح ہے ہم بھول ہی گئے تمہارا کیا قصور ہے ہمارا ہی یاد خراب ہے، یاد ہی نہیں رہتا پھر تھوڑی دیر بعد وہی سوال کیا کہ میاں یہ کیا ہو رہا ہے یہ لوگ کس لئے جمع ہوئے ہیں۔ پھر کہدیا گیا کہ حضرت نکاح ہے فرمایا ارے بھائی ہم تو بھول بھول جاتے ہیں کیا کریں۔ اب ہم پوچھیں بھی تو مت بتلانا کوئی کہاں تک بتائے۔ اجی ہوگا ہمیں پوچھنے ہی کی کیا ضرورت ہے حضرت شیخ عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ کا حال حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس قدر استغراق تھا کہ ہمیشہ تو نماز جماعت سے جامع مسجد میں پڑھتے تھے لیکن راستہ عمر بھر بھی یاد نہ ہوا یہ کیفیت تھی استغراق کی کہ حضرت کے ایک خادم تھے بختیار۔ وہ آگے آگے چلتے اور حق حق کہتے جاتے بس اس آواز پر چلتے جاتے اور مسجد تک پہنچ جاتے کیا ٹھکانا ہے استغراق کا کہ تیس برس تک ایک ہی مسجد میں نماز پڑھی مگر راستہ ہی یاد نہ ہوا اس قدر تو استغراق تھا مگر اتباع سنت کا یہ حال تھا کہ کسی ادنیٰ سنت کو بھی کبھی ترک نہیں کیا۔ غرض تیس برس تک نماز با جماعت جامع مسجد میں ادا کی لیکن پھر بھی راستہ یاد نہ ہوا وجہ یہ کہ ایک دل میں دو چیزیں نہیں سما سکتیں اہل اللہ کے قلب میں ایک ایسی چیز بس گئی ہے کہ کسی دوسری چیز کی اس میں گنجائش ہی نہیں رہی حضرت ایسوں کو عقلاء مجنون نہ کہیں تو کیا کہیں جنہیں نہ راستہ یاد نہ اولاد یاد نہ خادم یاد۔ عقلاء، تو ایسوں کے بارے میں یہی کہیں گے کہ معلوم ہوتا ہے دماغ میں خلل ہے ارے نادانوں تمہارے ہی دماغ میں خلل ہے۔ جو چیز ان کے اندر ہے اگر تمہارے اندر ہو تو کلیجہ پھٹ جائے (بقول احقر جامع ؎

درد یہ اور کو ملتا تو وہ مر ہی جاتا ⁂ کر کے نالے بھی مجھے ناز شکیبائی ہے)

یہ ان کی دماغ ہی کی توصحت و قوت ہے اس قدر ضبط ہے چنانچہ حضرت مخدوم عبد الحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ باوجود اس قدر مغلوب الحال ہونے کے فرماتے ہیں ۔منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بہ فریاد آمد اینجا مردانند کہ دریا ہا فرد برند و آروغ نزنند۔ ہم کو تو نقل کرتے بھی جھجک ہوتی ہے لیکن ان کو حق حاصل ہے فرماتے ہیں منصور بچہ تھا کہ ایک قطرہ میں شور مچانے لگا یہاں مرد ہیں کہ سمندر کے سمندر چڑھا جائیں اور ڈکار نہ لیں۔ (بقول جامع)

کر چکے رندی بس اے مجذوب تم ایک چلّو میں یہ حالت ہو گئی

تو معلوم ہوا کہ ان کے اندر ایک ایسی چیز تھی جس کو منصور بھی ضبط نہ کر سکے جب منصور سے وہ چیز ضبط نہ ہو سکی تو اوروں سے تو کیا ہو سکتی ہے ایسی چیز جس کے اندر ہو کیا اسے جامع مسجد کا راستہ یاد رہ سکتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی استقامت ایسی تھی کہ نماز تو نماز جماعت بھی کبھی نہ چھوٹی یہ تھا اتباع حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اور اسی اتباع ہی کی برکت سے اس درجہ تک پہنچے اور یہ رتبہ پایا اور اتباع میں ایسی برکت ہونے کا ایک راز ہے جس کے متعلق پہلے ایک حکایت سن لیجئے۔ قنوج میں ایک وکیل ہیں شیخ محمد عالم وہ خود مجھ سے اپنا واقعہ بیان کرتے تھے کہ ایک مرتبہ کسی اور بستی میں جا رہا تھا راستہ میں ایک مکان کی دہلیز میں سے ایک بڑی بی کی آواز آئی۔ انھوں نے مجکو بلا کر بڑی محبت سے میرے سر پر اور میری کمر پر ہاتھ پھیرا اور پیار کیا اور بیٹھلا کر میرے لئے حلوا تیار کیا اور کہا کہ اگر کبھی تمہارا آنا ہوا کرے تو میرے پاس ہو کر جایا کرو۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اس بڑھیا سے نہ میری جان نہ پہچان یہ کیوں ایسی محبت سے پیش آرہی ہے۔ آخر میں نے پوچھا کہ بڑی بی تم میری کیوں اتنی خاطر کر رہی ہو اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا کہ تمہاری شکل کا ایک میرا بیٹا ہے وہ بہت دن سے پردیس میں ہے اس کی ایسی ہی شکل ہے جیسی تمہاری، تمہیں دیکھ کر مجھے وہ یاد آگیا اور اس کی سی شکل ہونے کی وجہ سے مجھے تم سے محبت ہو گئی تم میرے بیٹے کی شکل ہو اس لئے تم پر پیار آگیا۔ یہ ایک مثال ہے اسی طرح حق تعالیٰ کے محبوب جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو شخص آپ کی سی ہیئت بناتا ہے اس پر خدا

خدا ہی کو محبت اور پیار آتا ہے کہ یہ میرے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ہمشکل ہے۔ یہ راز ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں خاص برکت کا اور یہ ایسا طریق ہے وصول کا جو سب سے زیادہ نزدیک ہے اس کو جو اختیار کرے گا وہ بہت جلد پہونچے گا اور وہ بہت جلد کامیاب ہوگا ورنہ ؎

خلاف پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

(رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف راستہ اختیار کرنیوالا آدمی کبھی منزل مقصود تک نہیں پہونچ سکتا)

مپندار سعدی کہ راہ صفا
تواں رفت جز در پئے مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

(سعدی یہ مت خیال کر کہ سیدھا راستہ بغیر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے طے ہو سکتا ہے)

بدون حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے کچھ نہیں ہو سکتا خود حق تعالےٰ کا ارشاد ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ۔ کہدیجئے یا رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کہ اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میرا اتباع کرو خدا کو تم سے محبت ہو جائے گی۔

ظاہری نسق کلام کا یہ مقتضا تھا کہ یوں فرماتے کہ تم کو خدا سے محبت ہو جائیگی یوں نہیں فرمایا، گویا اس طرف اشارہ ہے کہ تم تو کیا خدا سے محبت کرتے تمہارا تو کیا منہ ہے ہاں خدا ہی کو تم سے محبت ہو جائے گی اگر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرو گے۔ اللہ اکبر ہم اگر چاہتے اور کوشش کرتے کہ ہم سے خدا کو محبت ہو جائے تو قیامت تک بھی یہ دولت نصیب نہ ہو پاتی کیوں کہ کہاں ممکن کہاں واجب چہ نسبت خاک را با عالم پاک لیکن اتنا بڑا رتبہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع سے حاصل ہو جاتا ہے۔ تو صاحبو بڑی چیز یہ ہے یعنی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا اتباع۔ حضرت شیخ عبد الحق ردولوی کو بھی اتنا بڑا رتبہ حضور صلی اللہ علیہ

وسلم ہی کے اتباع سے حاصل ہوا تھا۔ چنانچہ آپ سے کبھی کوئی سنت ترک نہ ہوتی تھی مگر استغراق اتنا رہتا تھا کہ تیس برس تک جامع مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے جاتے آتے رہے لیکن راستہ یاد نہ ہوا تو ایسا استغراق تھا۔ ایک دن ردولی سے باہر دور ایک ندی کے کنارے جا رہے تھے یہ جگہ بہت پسند آئی فرمایا یہ تو بڑے لطف کی جگہ ہے اب یہیں رہا کریں گے بختیار خادم تھے عاشق عرض کیا بہت بہتر اور دونوں وہیں رہنے لگے بہت زمانہ کے بعد ایک دن کچھ افاقہ ہوا تو دفعتہً دریا پر نظر پڑی خادم سے فرمایا کہ ارے میاں ردولی میں تو پہلے کوئی دریا نہ تھا اب یہاں دریا بھی بہنے لگا سیر و تفریح کی جگہ ہو گئی خادم نے عرض کیا کہ حضرت یہ ردولی کہاں ہے یہ تو فلانے مقام کا دریا ہے ردولی سے آئے ہوئے تو حضور کو بہت دن ہو گئے۔ تب فرمایا کہ اگر یہ ردولی نہیں ہے تو چلو بھائی یہاں سے گھر سے بے گھر ہونا ٹھیک نہیں لیجئے یہ بھی خبر نہیں کہ یہ ردولی ہے یا کوئی اور مقام ایسے شخص کو عقلا ر زمانہ لیکن جہلا ر آخرت کیا پاگل نہ کہیں گے۔ مگر مقبول ہے یہ لقب اور مطلوب ہے یہ حالت اس واسطے کہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی کہا گیا ہے جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں۔ اور اولیاء اللہ کو بھی یہی کہا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہے وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۔ کفار اہل ایمان کو ذلیل سمجھ کر اُن پر ہنستے ہیں اور ان کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں لیکن ایمان والوں کو اس سے دلگیر نہ ہونا چاہیئے ہنسنے والے یہاں ایمان والوں پر ہنس لیں اور اپنے آپ کو ان سے بڑھا ہوا سمجھ لیں لیکن قیامت کے روز اہل تقویٰ اُن سے بڑھے ہوئے رہیں گے اور یہ گھٹے ہوئے ہوں گے۔ (بقول حضرت سعدی علیہ الرحمۃ ؎

بسا سوار کہ آنجا پیادہ خواہد شد — بسا پیادہ کہ آنجا سوار خواہد بود

(بہت سے سوار وہاں پیدل ہو جائیں گے اور بہت سے پیدل وہاں سوار ہو جائیں گے)

یا بقول ملّا در رسالہ مناظرہ مسٹر و مُلّا ؎

یہاں رکھتی ہے میری کامرانی شکل حرمانی — وہاں اپنی حقیقت تجکو دکھلاؤں گا اے مسٹر

مطلب میرا یہ ہے کہ شریعت کا اتباع کرنے والے مصالح دنیویہ کو پیش نظر کیوں رکھتے ہیں وہ یہ کیوں چاہتے ہیں کہ مصالح دینیہ و دنیویہ دونوں کو جمع رکھیں یعنی اس معنی کر کہ دنیا بھی خوب کماؤ کھاؤ اور دین کے بھی بھلے بنے رہو۔ ادھر مخلوق کو بھی راضی رکھو اُدھر خدا کو بھی۔ اگر خدا کو

معبود اور مقصود سمجھتے ہو تو مخلوق کو راضی یا ناراضی کرنے سے قطع نظر کرلو۔ قصداً تو کسی سے لڑو بھڑو نہیں لیکن اس کی بھی کوشش نہ کرو کہ مخلوق ہم سے راضی ہی رہے بس اس شان کا ہونا چاہیئے مسلمان کو لیکن یہ ضروری بات ہے کہ یہ شان جبھی پیدا ہو سکتی ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا پورا اتباع کیا جائے گو یہ بھی ضرور ہے کہ اس حالت میں لوگ ملامت کریں گے مگر تمہارا یہ مذہب ہونا چاہیئے ؎

نسازد عشق را کنج سلامت　　　خوشا رسوائی کوئے ملامت

(عشق سلامتی کے گوشہ کی موافقت نہیں کرتا۔ اسکو تو ملامت کے کوچہ کی رسوائی اچھی معلوم ہوتی ہے)

اور خوش ہونا چاہیئے کیونکہ اس میں ایک راز ہے وہ یہ کہ جس میں ملامت ہو جاتی ہے اس میں آدمی پکا ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی نے داڑھی رکھ لی تو داڑھی منڈانے والے اس پر ہنسیں گے کہ آیئے مولانا صاحب آیئے حضرت قبلہ یہ ضرور ہوگا۔ اور یہ ناگوار بھی ہوگا لیکن اس کا اثر یہ ہوگا کہ اگر کبھی جی بھی چاہے گا منڈانے کو تب بھی اس غصہ میں آکر نہ منڈائے گا اور انکی ضد میں داڑھی رکھنے کا اور بھی پختہ عزم کرلے گا۔ تو یہ نفع ہے ملامت میں۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں ملامت کی ہرگز پرواہ نہ کرنی چاہیئے اگر لوگ تم پر ہنسیں یا طعن کریں تو دلگیر ہونے کی کیا وجہ ہے۔ سبحان اللہ میاں یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے یہ تو وہ رتبہ ہے جو حضرات صحابہ کو حق تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا اس وقت بھی اہل ایمان پر یوں ہی لوگ ہنسا کرتے تھے تو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرو گے لوگ ہنسیں گے ضرور لیکن اس کی کچھ پرواہ نہ کرو۔ اب فرض کرو تم نے کوئی شادی کی بلا رسم تو لوگ طعنے دینا شروع کریں گے اور سینکڑوں لتاڑیں پڑنی شروع ہوں گی کہ یہ بڑے متقی نکلے ہیں کہ باوا دادا سے بھی بڑھ گئے۔ باوا دادا سے جو رسمیں چلی آرہی تھیں سب ناجائز ہی قرار دیدیں، ایسے کنجوس ہیں کہ برادری کا کھانا بھی اڑا دیا۔ یہ سب طعن و تشنیع سن کر بھی تم خوش رہو اور کچھ پرواہ مت کرو۔ عشق میں بھلا رسوائیوں سے بھی کوئی سلامت رہا ہے۔ لہٰذا تم کو خوش ہونا چاہیئے اور یہ کہنا چاہیئے ؎

نسازد عشق را کنج سلامت　　　خوشا رسوائی کوئے ملامت

(عشق سلامتی کے گوشہ کی موافقت نہیں کرتا اس کو تو ملامت کے کوچہ کی رسوائی اچھی معلوم ہوتی ہے)

اور سنو اگر لباس شرع کے موافق پہنو گے تو جنٹلمین لوگ ہنسیں گے کہ یہ کیا دقیانوسی لباس پہنا ہے اُول جلُول کتے کی جھول۔ چہرہ دیکھو تو وحشت برستی ہے ارے عاشقوں کے چہرہ پر تو وحشت ہی زیب دیتی ہے۔ مانگ پٹی تو زنانوں کا شعار ہے واللہ وہ عاشق نہیں جو کوٹ بوٹ سے درست ہو۔ خدا کی قسم جن کے دلوں میں محبت گھس گئی ہے انھیں اپنے سر اور پاؤں کی بھی خبر نہیں کوٹ بوٹ تو کیا پہنتے اگر ان کے پاس پھٹی جوتی اور پھٹا لباس بھی ہوگا تو انھیں عار نہ ہوگی۔ میں پھر کہتا ہوں کہ ہاں وہ عاشق نہیں جسے سر و پاؤں کی خبر ہو جو عاشق ہوگا وہ تو ایسا ہی ہوگا جسے نہ سر کی خبر ہوگی نہ پاؤں کی اور واقع میں یہ نہیں کہ اُسے خبر نہ ہوگی۔ خبر تو ہوگی مگر پرواہ نہ ہوگی اور اب تو یہ حالت ہے کہ بھلا مرد تو مرد عورتوں نے باریک کپڑے پہننے شروع کر دیئے ہیں اگر کوئی اچھے کپڑے شریعت کے موافق پہنے تو کہتی ہیں کہ یہ کیا کنجڑوں اور قصائیوں[1] کے سے کپڑے پہنے ہیں اس قدر چست اور منڈھا ہوا لباس پہنتی ہیں کہ بدن کی ساخت اور ساری ہیئت ہی ظاہر ہونے لگتی ہے اگر اتفاق سے غیر محرم کی نظر پڑ جائے تو کس قدر بے غیرتی ہے اور پائنچے ایسے چست کہ پنڈلی میں چکلی لیں تو کھال بلکہ گوشت کی بوٹی تک اکھڑ آئے پھر اوپر سے کھڑے جوتے حالانکہ حرام ہیں عورتوں کے لئے مردوں سے مشابہت حدیث میں لعنت آئی ہے ایسی عورتوں پر جو مردوں سے مشابہت کریں اور اس قدر چست پائنچے یا زار والی فاسق فاجر عورتوں کا شعار ہے اور مشابہت فساق فجار کی بھی ناجائز ہے اُس کا منشار فقط تفاخر ہے مقصود یہ ہے کہ ذرا آن بان سے رہیں اور خوبصورت معلوم ہوں اور کوئی یوں نہ کہے کہ یہ کیسے باؤلوں کے سے ڈھیلے پائنچے ہیں جیسے جھلّی مارنی پہنے پھرتی ہیں (یعنی سینگی لگانے والیاں) تو اب عورتیں بھی اس طرح سے طعن کرنے لگی ہیں غرض عورتوں نے بھی اب آپس میں مردوں کا سا تفاخر کرنا شروع کر دیا ہے مینڈکی کو بھی لو زکام ہوا۔ مردوں کو تو یہ مرض تھا ہی عورتوں کو بھی ہوا اور مردوں کا تفاخر تو خیر چل بھی سکتا ہے کیونکہ ایک کو دوسرے کی اندرونی حالت معلوم نہیں جیسا چاہا ہو اپنے کو ظاہر کر سکتے ہو مگر عورتیں گھروں میں آنے جانے والیاں ایک کو دوسرے کے گھر کی ہر ایک

[1] قصائی کا مؤنث ۱۲

حالت کی خبر ہے یہ ایک دوسرے سے کیونکر اپنا اصلی حال چھپا سکتی ہیں اس لئے مرد اگر تفاخر کرتے ہیں تو ان کی اتنی بیوقوفی نہیں کیونکہ ایک کو دوسرے کا حال معلوم نہیں کہ گھر میں چوہے قلابازی کھا رہے ہیں قلعی نہیں کھلتی بس ایک جوڑا انگریزی بنا لیا اور ہر موقع پر اچھے خاصے جینٹلمین بن گئے جو غریب ہیں انھوں نے بھی بس ایک اچکن بڑھیا بنوالی اور ہر موقع پہ وہی اچکن ڈاٹ لی اور نواب کے بچے بن گئے حالانکہ گھر میں خاک بھی نہیں، بعض لوگ انگریزی کا ایک حرف بھی نہیں جانتے لیکن جینٹلمین رنگ و روغن بناتے ہیں روغن پر ایک حکایت یاد آئی، کوئی ایسے ہی تھے شیخی باز۔ ظاہری وضع تو نہایت امیرانہ اور گھر میں کھانے تک کو نہیں روز گھر سے آکر اپنے دوستوں میں شیخی بگھارا کرتے کہ آج گوشت بہت مزیدار پکا تھا، پلاؤ بھی اچھا تھا چاہے گھر میں دال اور خشکہ بھی میسر نہ آیا ہو میاں فاقہ ہی سے ہوں اور ترکیب یہ کرتے کہ گھر میں جو جلنے کا چراغ تھا اس کا تیل انگلیوں اور مونچھوں کو لگا لیتے تاکہ دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ واقعی نواب صاحب بہت مرغن گوشت اور پلاؤ کھا کر آرہے ہیں ایک دن عجب دل لگی ہوئی حسب دستور چراغ میں سے تیل لیکر جو مونچھوں کو چپڑنے لگے تو اتفاق سے بتی بھی مونچھوں میں لپٹ گئی اور چونکہ وہ جلتے جلتے چھوٹی سی رہ گئی تھی اس لئے ان حضرت کو وہ محسوس بھی نہ ہوئی۔ باہر آکر حسب عادت دوستوں ڈینگیں مارنے لگے کہ واللہ آج کا پلاؤ تو بہت ہی مزیدار تھا۔ ایک صاحب کی نظر مونچھوں پر پڑی تو کیا دیکھتے ہیں کہ چراغ کی بتی لپٹی ہوئی ہے بس ساری قلعی کھل گئی کہ حضرت چراغ کا تیل مونچھوں میں لگا لگا کر آتے ہیں تاکہ لوگوں پر ظاہر ہو کہ بہت مرغن کھانے کھاتے ہیں فوراً انھوں نے کہا کہ جناب بجا ہے اور دیکھئے پلاؤ کا ایک چاول بھی مونچھوں میں لپٹ آیا ہے ہاتھ پھیر کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ چراغ کی بتی ہے بہت ہی خفیف ہوئے تو اس شیخی بازی سے فائدہ کیا خیر یہ تو اتفاقی بات تھی کہ لوگوں کو پتہ چل گیا۔ ورنہ مردوں کی شیخی تو کچھ چل بھی جاتی ہے کیونکہ گھر کے اندر کا حال مردوں کو کیا معلوم لیکن عورتوں کو تو ایک دوسری کا حال معلوم ہے کہ اتنے پانی میں ہے پھر شیخی کیسی۔ پھر بیگم صاحبہ خوامخواہ ہی اینٹھ مروڑ میں مری جاتی ہیں۔ پھر ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ اگر لباس قیمتی ہی پہننے کا شوق ہو! پہنو تو ایک تو شریعت کے خلاف نہ ہونا چاہیئے دوسرے

زینت میں غلو نہ ہو بس اتنا تجمل کافی ہے کہ کوئی ذلیل نہ سمجھے کوئی باؤلا جھلا نہ کہے (یعنی پاگل)
اور اصلی بات تو یہ ہے کہ نہ ذلت کی پروا ہو نہ بدنامی کی یہ دونوں شانیں عشق کے لوازم میں
سے ہیں یحبھم و یحبونہ اور لایخافون لومۃ لائم اسی طرف اشارہ ہے محبین پر تو ملامت
ہوتی ہے۔ مثلاً پردہ ہی ہے بعض عورتیں جو متشرع ہیں وہ سب نامحرموں سے پردہ کرتی ہیں
حتیٰ کہ چچا زاد بھائی بھی ان کے اوپر بڑے طعن ہوتے ہیں کہ بھلا بھائی سے بھی کہیں پردہ ہوتا
عورتوں کے نزدیک چچا کا لڑکا ایسا ہے جیسے سگا بھائی، ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ سگا بھائی
ہے لیکن ایسا سگا ہے جو سگ سے ماخوذ ہے اور الف جو آخر میں ہے وہ ایسا ہے جیسے کسی
بڑی ہانڈی کو ہنڈا کہہ دیتے ہیں اسی طرح یہاں سگا کے معنے ہیں بڑا سگ۔ ایک شہری
بچہ سے کسی نے پوچھا کہ فلانا تمہارا سگا بھائی ہے تو وہ کہتا ہے کہ وہ میرا حقیقی بھائی ہے۔
سگ تو کتے کو کہتے ہیں۔ چھوٹا سا بچہ تھا لیکن کسی سے سن لیا ہوگا کہ سگ کتے کو کہتے ہیں تو
کہتا ہے کہ حقیقی بھائی کہئے سگ نہ کہئے۔ تو غرض یہ کہ عورتیں چچا زاد بھائی کو مثل حقیقی بھائی
کے سمجھتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اس سے کیا پردہ عورتیں تو عورتیں ایسے پردہ سے مرد بھی خفا ہیں،
کسی نے ہمت کر کے اپنے قریبی نامحرم رشتہ داروں سے بھی پردہ کرنا شروع کیا تو اب چاروں
طرف سے اعتراض کی بھرمار ہے ایک صاحب کہتے ہیں کہ میاں کچھ نہیں اب عزیزوں میں
آپس میں محبت ہی نہیں رہی دوسرے صاحب بھی اینٹھ گئے کہ ان کے گھر جاویں تو کیا دیواروں
سے بولیں۔ اب ہم ان کے یہاں جانا ہی بند کر دیں گے کہ سبحان اللہ کیا عزیزوں کے تعلقات
اور آپس کا میل جول بے پردگی ہی پر موقوف ہے اگر یہ معنی ہیں تو یہ تو نعوذ باللہ میاں
پر اعتراض ہے کہ ایسے قریبی رشتہ داروں کو بھی نامحرم قرار دیدیا استغفر اللہ مگر اسی میں بعضی ایسی
بھی ہمت والیاں ہیں کہ چاہے کوئی ہو وہ کسی نامحرم کے سامنے نہیں آتیں چاہے کوئی برامانے یا
بھلا مانے اور اکثر جگہ تو پردہ کی ایسی کمی ہے کہ محرمیت نہیں کچھ نہیں دور دور کے رشتہ داروں
کو بے تکلف گھر میں بلا لیتی ہیں اور بے محابا ان کے سامنے آجاتی ہیں یہ بالکل ناجائز ہے اور گناہ
ہے مردوں کو چاہیئے کہ وہ انھیں تنبیہ کریں اور سب نامحرموں سے پردہ کرائیں۔ اگر کسی کو ناگوار
ہو تو بلا سے ہو کچھ پروا مت کرو ہرگز ڈھیلا پن نہ برتو بلکہ مردوں کو چاہیے کہ اگر کوئی نامحرم

عورت اُن سے پردہ نہ کرے تو وہ خود اس سے چھپا کریں۔ میری ایک خالہ تھیں یعنی میرے والد صاحب کی سالی یہ دستور ہے ہی کہ عموماً سالیاں بہنوئی سے پردہ نہیں کرتیں چنانچہ وہ بھی والد صاحب کے سامنے آنے لگیں۔ والد صاحب اگرچہ عمر میں اُن سے بہت بڑے تھے اور باپ کے برابر تھے لیکن ان کو غیرت آئی اور سامنے آنے سے منع کر دیا انھوں نے مانا نہیں اور پھر بھی سامنے آئیں گو والد صاحب دنیادار تھے مگر غیرت دار بڑے تھے۔ ایک بار عوب ڈانٹا کہ خبردار جو کبھی میرے سامنے آئیں ٹانگیں توڑ دوں گا۔ بہت برا مانا اور بہت روئیں کہ بھائی نے مجھے ایسا ایسا کہا۔ مگر پھر کبھی سامنے نہیں آئیں پردہ کرنے لگیں تو انھوں نے بُرا مانا مگر والد صاحب نے کچھ پرواہ نہ کی پردہ کرا کر چھوڑا اسی طرح تم کرو۔ اگر کوئی بُرا مانتا ہے مانا کرے کچھ پرواہ نہیں کرنی چاہیے بُرا مان کر کوئی کرے گا کیا۔ اچھا تو ہے سب چھوڑ دیں کوئی اپنا نہ رہے یوں ہی تعلق خلق سے گھٹے جب کوئی اپنا نہ رہے گا اور سب سے توقع منقطع ہو جائے گی۔ تب تو سوچے گا کہ بس جی اب تو اللہ میاں ہی سے تعلق پیدا کرنا چاہیے بقول کسی کے۔ ع

جب کیا تنگ بتوں نے تو خدا یاد آیا (بقول جامع ؎

دشمنی خلق میری رہنما ہونے کو ہے	اب مرا دست طلب دست دعا ہونے کو ہے
بیکسی ہی سے حصول مدعا ہونے کو ہے	کوئی مت پوچھو مجھے میرا خدا ہونے کو ہے

اب سمجھئے گا کہ اعزہ اقربا یار دوست یہ سب حجاب تھے اب کوئی حجاب نہ رہا (بقول جامع ؎

اب تو میں ہوں اور شغل یاد دوست	سارے جھگڑوں سے فراغت ہو گئی

اب خدا کے بنو جتنے تعلقات کم ہوں اتنا ہی اچھا ہے ہمارے ایک بزرگ تھے ماموں امداد علی صاحب ویسے تو ایک آزاد منش دُرویش تھے مگر باتیں بڑی حکمت کی فرمایا کرتے تھے کہتے تھے کہ تارک الدنیا **ہونا تو** بہت مشکل ہے۔ مگر ہاں جب کسی پر میاں کا فضل ہوتا ہے تو اس کو متروک الدنیا بنا دیا جاتا ہے یعنی ایسے اسباب غیب سے پیدا ہو جاتے ہیں کہ خود دنیا اس کو چھوڑ دیتی ہے یہ صورت ہوتی ہے ترک دنیا اور ترک تعلقات کی یعنی جب متروک الدنیا ہو گیا تو دنیا سے نفور ہو کر تارک الدنیا بھی ہو ہی گیا اور بھائی یہ تو سوچو کہ کس کس کو راضی کرو گے۔ راضی تو ایک ہی ہوتا ہے کئی تو راضی ہوا نہیں کرتے تو حضرت یہ کیجئے کہ صرف ایک اللہ کو

راضی رکھتے بہت سے آدمیوں کو کہاں تک راضی رکھتے گا۔ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلاً رَّجُلاً فِیْہِ شُرَکَآءُ مُتَشَاکِسُوْنَ وَرَجُلاً سَلَماً لِّرَجُلٍ ھَلْ یَسْتَوِیَانِ مَثَلاً (ترجمہ) اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک شخص ہے جس میں کئی ساجھی ہیں جن میں باہم ضدّا ضدّی ہے اور ایک اور شخص ہے کہ پورا ایک ہی شخص کا ہے کیا ان دونوں کی حالت یکساں ہے ؎

دلا رامے کہ داری دل درو بند　　دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

میں کہتا ہوں کہ ایک مردار بازاری عورت کی محبت میں اس کی رضامندی کی خاطر اپنی آبرو جائداد اور خاندان کی عزت سب برباد کردیتے ہو کسی چیز کی پروا نہیں کرتے تو کیا خدا کی محبت اس سے بھی کم ہوگئی۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق مولا کے کم از لیلےٰ بود　　گوئے گشتن بہر او اولےٰ بود

کیا عشق مولا عشق لیلیٰ سے بھی کم ہوگیا۔ دیکھو لیلیٰ کی محبت میں مجنوں کی کیا کیفیت تھی۔ پھر تم تو خالقِ لیلیٰ کے مجنون ہو تمہاری تو اس سے بھی بڑھ کر حالت ہونی چاہیئے خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالےٰ کی رضا کے مقابلہ میں کسی کی ناراضی کا خیال نہ کرو۔ یہ میں نہیں کہتا کہ باؤلے بنو۔ بلکہ مستقیم رہو شریعت پر اور پختہ کار ہو جاؤ محبت میں اگرچہ سارا جہان خلاف ہوجاوے ساری دنیا لتاڑے۔ بُرا بھلا کہے ملامت کرے (بقول احقر جامع ؎

تری رضا میں ہے سارا جہاں خفا ہم سے
اگر یہی ہے زیاں تب تو کچھ زیاں نہ ہوا

بلکہ ملامت سے تو عشاق خوش ہوتے ہیں اور ایک راز ہے خوش ہونے کا۔ ایک تو اس سے خوش ہوتے ہیں کہ الحمد للہ ہمیں لوگ اللہ میاں کا عاشق سمجھتے ہیں ایک یہ کہ ضد میں دین اور پختہ ہو جاتا ہے مثلاً شادی کی اور بارات میں صرف چار آدمی لے گئے۔ پھر اس پر چاروں طرف سے لتاڑ پڑنا شروع ہوا تو اس سے اور بھی چڑ پیدا ہوجائے گی۔ اور ضد میں آکر کہے گا کہ اب کی بار اس سے بھی مختصر لو۔ اب کے تو چار آدمی بھی تھے اب کے دیکھنا ان شاء اللہ تعالےٰ چار آدمی بھی ہوں۔ کرلو میرا کیا کرتے ہو۔ اگر لتاڑ نہ پڑے تو اتنے پختہ نہ ہوں جتنے لتاڑ میں پختہ ہو جاتے ہیں اس لئے لتاڑ بھی اللہ میاں کی

بڑی رحمت ہے بس تو نیک کام پر اگر لساڑ پڑے تو خدا کا شکر کرو۔ خلاصہ یہ کہ طریق محبت اصل لیکن اس کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے اس واسطے کہ اگر عمل نہ کیا تو محبت باقی نہیں رہتی بلکہ گھٹ جاتی ہے اور گھٹتے گھٹتے بالآخر بالکل ہی فنا ہو جاتی ہے (جیسے چراغ میں اگر تیل ڈالنا چھوڑ دیں تو لو کم ہوتی چلی جائے گی اور رفتہ رفتہ چراغ گل ہو جائے گا) چنانچہ اسی طریق محبت کی طرف اشارہ ہے آیت کے اس جزو میں یحبھم و یحبونہ یعنی وہ لوگ ایسے ہوں گے جن سے اللہ تعالیٰ محبت کریں گے۔ اور وہ اللہ تعالےٰ سے محبت کریں گے اس سے معلوم ہوا کہ اصل تو محبت ہے آگے ان کی علامت مذکور ہے کہ وہ کیسے ہیں وہ ایسے ہیں کہ اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکَافِرِیْنَ یعنی اللہ کے ماننے والوں کے سامنے تو نرم ہیں کیونکہ جس سے محبت کی ہے اس کے متعلقین سے بھی محبت ہوتی ہے اور اللہ کے مخالفین کے سامنے سخت ہیں یعنی فقط یہی نہیں کہ ان سے محبت اور میل جول نہیں بلکہ ان سے اعراض ہے اور ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ ہے۔ محبت کا تو یہی مقتضا ہے کہ محبوب کے مخالفین سے اعراض ہو۔ صاحب یہ کیسی محبت ہے کہ محبوب کی نافرمانی کرنے والوں سے بھی محبت ہے۔ حق سبحانہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَوْ کَانُوْٓا اٰبَآءَھُمْ اَوْ اَبْنَآءَھُمْ اَوْ اِخْوَانَھُمْ اَوْ عَشِیْرَتَھُمْ اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ وَیُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ آپ نہ پاویں گے ان لوگوں کو جو اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھتے ہوں کہ وہ دوستی کریں اللہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مخالفوں کے ساتھ چاہے وہ اُن کے باپ ہوں یا اولاد ہوں یا بھائی ہوں یا چاہے ان کا کنبہ ہی کیوں نہ ہو ان سب کو مخاطب کر کے صاف کہدیا ہے

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد　　خدائے یک تن بیگانہ کآشنا باشد

(ہزار رشتہ دار جو خدا سے بے تعلق ہوں اس ایک بیگانہ شخص پر قربان ہیں جو خدا کا دیوانہ ہے)

اور صاف کہدیا کہ سن لو صاحب ہم میں تم میں میل نہیں ہے ہمارا تمہارا مذہبی اختلاف ہے ہم سے

تم سے کوئی تعلق نہیں بس معاف کرو۔ خیر اگر اتنی ہمت نہ ہو تو کم از کم محبت اور دوستی تو نہ ہو
مثلاً میل جول شادیوں میں شرکت وغیرہ یہ اور بات ہے۔ مصرع۔ مل گئے صاحب سلامت
ہو گئی۔ حدیث شریف میں بھی اہل باطل کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرنے کا حکم ہے ارشاد ہے
لَا تُصَلُّوْا عَلٰی جَنَازَتِهِمْ وَلَا تَعُوْدُوْهُمْ یعنی اگر بیمار پڑیں تو جا کر ان کی عیادت مت کرو
اور اگر مر جائیں تو ان کے جنازہ کی نماز مت پڑھو اگر مخالفین حق سے قطع تعلق ہی ہو گیا تو
ہو جانے دو۔ آخر یہ علاقے کیا کام آئیں گے بلکہ ان علاقوں کے قطع ہو جانے پر حق سبحانہٗ
تعالیٰ ایسی ایسی بشارتیں دے رہے ہیں فرماتے ہیں اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ یعنی
یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں خدا نے ایمان کو راسخ کر دیا ہے آگے سبحان اللہ کیا وعدہ
ہے وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ یعنی خدا نے مدد دی ان کو ایک روح کے ساتھ وہ روح کیا ہے
نسبت باطنی خدا کے ساتھ اس سے ایسی قوت قلب میں پیدا ہوتی ہے کہ اگر سارا عالم بھی
مخالف ہو جائے تو بھی کچھ پروا نہیں ہوتی تعلق مع اللہ سے ایک نور قلب میں پیدا ہوتا ہے
اس نور کو روح اس لئے کہدیا کہ اس سے قلب میں حیات پیدا ہوتی ہے حق تعالیٰ
کے ساتھ ایسا تعلق بڑھتا ہے کہ بس یہ شان ہو جاتی ہے ؎

موحد چہ بر پائے ریزی زرش ... چہ شمشیر ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد زکس ... ہمیں است بنیاد توحید و بس

(موحد کے قدموں پر سونا نچھاور کر دیا اس کے سر پر ہندی تلوار رکھدو امید
و خوف اس کو کسی سے نہ ہوگا بس توحید کی بنیاد یہی ہے)

اور بھی بشارت سنئے وَیُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا
یعنی ان کو ایسی جنتوں میں داخل کر دیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور اس سے
بھی بڑی نعمت یہ ہو گی رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ خدا ان سے راضی ہو گا اور
وہ خدا سے راضی ہوں گے۔ پھر فرماتے ہیں اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ یہ خدا کی جماعت
ہے یہ خدائی پارٹی ہے اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ اور سن لو خدا ہی کی پارٹی
کے لوگ فلاح پانے والے ہیں تو حضرت اب کیا تو برادری کیا رشتہ داری دور دور کی

کہتے ہیں کہ صاحب برادری کو تو چھوڑا نہیں جاتا کیا کریں۔ بہت اچھا صاحب برادری کو نہیں چھوڑا جاتا تو پھر اللہ میاں کو چھوڑ دو۔ کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ایک دل میں اللہ بھی ہو اور اللہ کا مخالف بھی ہو تو حضرت نماز روزہ تو ہے مگر محبت نہیں جس کے آثار آگے مذکور ہیں۔ یہ آثار مسلمانوں میں گم ہیں اِلَّا مَا شَآءَ اللہ محبت کے آثار یہ ہیں اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکَافِرِیْنَ اللہ والوں کے ساتھ نرم ہیں اور اللہ کے مخالفوں کے ساتھ سخت ہیں ایک تو یہ آثار ہیں دوسرے آثار کیا ہیں یہ ہیں یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللہِ بڑی محنت کے عمل کرتے ہیں۔ تو دیکھئے محبت کے آثار میں سے عمل بھی ہے اور صاحب کیوں نہ ہو اگر محبت ہو تو وہ ظاہر کیوں نہ ہو گی (بقول شخصے ؎ ممکن نہیں کہ آگ لگے اور دھواں نہ ہو) بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر کہیں تمہارا محبوب مدتوں کے بعد ترستے ترستے تم کو مل جاوے تو بھائی ایمان سے کہو تمہارا کیا جی چاہے گا؟ کیا یہ جی نہ چاہے گا کہ اس کو فوراً سلام کریں اور دوڑ کر اس کے پاس پہنچیں اور جا کر اس سے لپٹ جائیں اور کیا مزے لے لیکر اس سے گفتگو نہ کرو گے اور کیا زبان سے یہ نہ کہو گے کہ اللہ کا شکر ہے مدتوں کی آرزو پوری ہوئی اور کیا یہ دعائیں نہ دو گے کہ خدا عمر دراز کرے اور زیادہ ہمت ہوئی تو کیا اس کی جوتیاں بھی ہاتھ میں لے لے کر سر آنکھوں پر نہ رکھو گے اور کیا اس کے تلووں سے آنکھیں نہ ملو گے غرض کیا کیا نہیں کرو گے اگر اس سے محبت ہے اور ایک عاشق ایسا ہے کہ معشوق ملا اور یہ منہ پھیر کر بیٹھ گئے کسی نے پوچھا یہ کیا۔ کہا تم کیا جانو ہم اہلِ باطن ہیں ہمارے باطن میں محبت بھری ہوئی ہے ہمارا باطن لبریز ہے محبت سے مگر اظہار کی ضرورت نہیں بھائی دنیا میں کوئی بیوقوف سے بیوقوف بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کو محبت ہے۔ بلکہ ہر شخص یہی کہے گا۔ اور بالکل سچ کہے گا کہ جھوٹا ہے مکّار ہے ؎

تعصی الالٰہ و انت تظہر حبہ　　ھذا العمری فی الفعال بدیع
لو کان حبک صادقاً لاطعتہ　　ان المحب لمن یحب مطیع

(ترجمہ) نافرمانی کرتا ہے تو خدا کی اور ظاہر کرتا ہے اس کی محبت کو یہ قسم ہے میری جان کی کہ عجیب بات ہے اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو اس کی اطاعت کرتا۔ کیونکہ محب جس سے محبت رکھتا ہے اس کا مطیع ہوتا ہے تو صاحبو ایسے شخص کو بھلا کوئی بھی عاشق کہے گا جو کوئی سنے گا یہی کہے گا کہ واہ صاحب اچھے عاشق ہیں اور اچھی محبت ہے کہ معشوق نے پکارا تھا بولے ہی نہیں۔ بلایا تھا گئے ہی نہیں یہ شخص ہرگز عاشق نہیں جھوٹا ہے نالائق ہے خوامخواہ شیخی بگھارتا ہے کیا عاشق ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اجی حضرت یہ تو بڑی بات ہے کہ کہنا نہ مانا۔ اہل صدق نے تو ذرا سی بات سے عاشق کو اہل وفا کے زمرہ سے خارج کر دیا ہے چنانچہ کسی ہوسناک کا شعر تھا ۔

اس کے کوچہ سے جب اُٹھ اہل وفا جاتے ہیں   تا نظر کام کرے رو بقفا جاتے ہیں

اب سنئے ایک عاشق نے اس کا کیا خوب جواب دیا ہے ۔

اس کے کوچہ سے کب اُٹھ اہل وفا جاتے ہیں   وہ ہوسناک ہیں جو رو بقفا جاتے ہیں

جو عاشق ہوگا وہ کوچۂ محبوب سے اُٹھ کر ہی کیوں جائے گا۔ محبوب ہی اٹھ کر چلا جائے تو یہ دوسری بات ہے تو دیکھئے اس کو بھی خلاف محبت کہا۔ صاحب اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا تو دعویٰ اور حال یہ کہ جب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ نماز پڑھو۔ تو آپ کہتے ہیں نہیں صاحب میں تو نہیں پڑھتا جب زکوٰۃ کا حکم دیتے ہیں تو کہتے ہیں میں نہیں دیتا جب روزہ کے لئے کہا جاتا ہے تو کہتے ہیں میں نہیں رکھتا۔ اسی طرح جب خلاف شرع لباس سے شرک سے بدعت سے منع کیا جاتا ہے تو جواب ملتا ہے کہ نہیں صاحب میں تو نہیں مانتا اور کہنے کو اللہ کے عاشق ہیں زبان پر ہے ہائے اللہ ہائے اللہ یہ اچھے عاشق ہیں صاحب میں کہتا ہوں کہ جیسے مخلوق کی محبت تھی کہ محبوب کو دیکھتے ہی رہ نہ سکا بدون ہاتھ پاؤں چومے بدون لپٹے بدون قدموں پر گرے بدون تلوے چاٹے تو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک جانے سے گر پڑنے سے تعریف کرنے سے کیسے رہا گیا۔ اگر محبت ہوتی تو تعظیم کے کلمات بھی کیوں نہ زبان سے نکلتے جھک بھی کیوں نہ جاتا سجدہ میں بھی کیوں نہ گر پڑتا اسی کا تو نام نماز ہے تو نماز تو پڑھتے نہیں اور اللہ کے

عاشق ہیں اچھے عاشق ہیں۔ کوئی شعر سنا تھا یا گانا بجانا سنا تھا اس پر کودنے لگے بس عاشق ہیں اگر یہی ہے تو پھر سانپ بھی اولیاء اللہ ہیں کیونکہ جب بین کی آواز سنتے ہیں تو وہ بھی مست ہو جاتے ہیں آدمی کیا بہت سے جانور بھی گانے بجانے پر عاشق ہیں۔ بھلا یہ کوئی محبت ہے۔ محبت تو وہ چیز ہے کہ خدا کی قسم نہ گانے کی ضرورت نہ بجانے کی ضرورت اور بے چین ہیں ؎

کسانیکہ یزداں پرستی کنند برآواز دولاب مستی کنند

(جو لوگ خدا کی پوجا کرتے ہیں وہ رہٹ کی آواز پر مستی کرتے ہیں)

بلکہ اس کی بھی ضرورت نہیں ان کی تو ہر وقت یہ شان ہے ؎

خوشا وقت شوریدگانِ غمش اگر ریش بینند وگر مرہمش

(اس کے غم کے پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے اگر غم دیکھتے ہیں اور اگر اس پہ مرہم رکھتے ہیں)

؎ دمادم شراب الم در کشند دگر تلخ بینند دم در کشند

(ہر وقت غم کی شراب پیتے ہیں جب اس میں رنج کی تلخی دیکھتے ہیں خاموش رہتے ہیں)

؎ گدایانے از بادشاہی نفور بامیدش اندر گدائی صبور

(ایسے فقیر کہ بادشاہی سے نفرت کرلے اس کی امید پر فقیری میں قناعت کرنیوالے)

حضرت ان کے سر پر ہر وقت آرے چلتے ہیں ان کی حالت کی دوسرے کو کیا خبر کسی نے خوب کہا ہے

؎ اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست حال شیرانے کہ شمشیر بلا برسر خورند

(اے تیرے پاؤں میں تو کانٹا تک نہیں لگا تو ان شیروں کا حال کیا جانے جن پر مصیبت کی تلوار پڑی ہے)

؎ کشتگانِ خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر ست

(مقتولان خنجر تسلیم تو ہر گھڑی یاد خدا میں لذت محسوس کرتے ہیں)

ان کی حالت تو یہ ہے کہ ان سے ذرہ برابر نافرمانی نہیں ہوتی حضرت عشق اور محبت تو یہ ہے اسی واسطے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یُجَاھِدُوْنَ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ وہ لوگ اللہ تعالیٰ

کی راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں یعنی صرف عمل نہیں بلکہ سخت سے سخت محنت کے کام کرتے ہیں پھر ایسوں کو بھلا کہاں بھوک پیاس کہاں چین آرام کہاں حظوظ و لذائذ کا اہتمام کہاں مرغن کھانوں کی رغبت ہاں خدا دے تو کھا بھی لیتے ہیں مگر اہتمام نہیں نہ ان چیزوں سے ان کو دلچسپی بلکہ ان کا مذہب یہ ہوتا ہے ؎

عاقبت سازد ترا از دیں بری　　این تن آرائی و این تن پروری

(تیرا بدن سجانا اور تن پروری آخر کار تجھکو دین سے دور کر دے گا)

وہ تو ان سب خرافات سے یکسو ہو چکے ہیں اور ہر وقت خدا جانے کس شغل میں ہیں (بقول احقر جامع ؎)

اب تو ہیں ہوں اور شغل یاد دوست　　سارے جھگڑوں سے فراغت ہوگئی

چونکہ وہ اہل محبت ہیں اس واسطے سخت سے سخت کام بھی کر لیتے ہیں مشکل سے مشکل کام بھی ان کے لئے آسان ہو جاتا ہے (بقول احقر جامع ؎

درد دل نے اور سب دردوں کا درماں کر دیا　　عشق کی مشکل نے ہر مشکل کو آسان کر دیا)

تو دیکھئے خود حق تعالٰے کے ارشاد یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ سے معلوم ہوا کہ محب کے واسطے عمل معاف نہیں بلکہ اس پر اور زیادہ محنت پڑتی ہے۔ نیز محبت کے آثار میں سے یہ بھی ہے کہ لَا یَخَافُوْنَ فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لَآئِمٍ یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں کسی کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔ کوئی کچھ کہے پرواہ نہیں کرتے اپنے کام میں مشغول ہیں کوئی کچھ ہی کہا کرے۔ ذرہ برابر التفات نہیں کرتے آگے فرماتے ہیں ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ اور اللہ میاں بڑی وسعت والے ہیں تو سب کو یہ نعمت عطا فرما دیں مگر وہ علیم بھی ہیں وہ جانتے ہیں کہ کون دینے کی قابل ہے کون نہیں۔ جو مانگتا ہے اسی کو دیتے ہیں کسی کے سر نہیں منڈھتے۔ یہ ہے آیت کا ترجمہ اس سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ کن لوگوں کی مدح ہے اور مدح کا کیا حاصل ہے۔ مدح کا حاصل یہ ہے کہ خدا سے کامل محبت رکھتے ہیں۔ خدمت اور طاعت میں پوری مشقت اٹھاتے ہیں۔

اور کسی کی ملامت سے نہیں ڈرتے بس اسی شان کے شخص کو قلندر کہتے ہیں اور یہی معنی قلندر کے حضرت عراقی کے اس شعر میں ہیں ؎

ضمارہ قلندر سزد ار بمن نمائی   کہ دراز و دور دیدم رہ ورسم پارسائی

(میرے مرشد مجکو تو طریق جذب کا رستہ دکھلا دے ۔کیونکہ محنت وریاضت کا راستہ بہت دشوار معلوم ہوتا ہے)

تو گویا عراقی کا شعر خلاصہ ہے قرآن مجید کی آیت کا اور قرآن مجید کی آیت تفصیل ہے عراقی کے قول کی پس قلندر وہ ہے جس میں عمل اور محبت دونوں جمع ہوں اور جس کی یہ شان ہو

؎ برکفِ جام شریعت بر کفے سندان عشق   ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

(ایک ہاتھ میں شریعت کا جام دوسرے ہاتھ میں عشق کا ہتھوڑا۔ ہر بوالہوس جام اور سندان سے کھیلنا نہیں جانتا)

(احقر جامع کا شعر ہے ؎

دیکھا نہ زمانہ میں مجذوب سا مستانہ   فرزانہ کا فرزانہ دیوانہ کا دیوانہ

اور رہ پارسائی وہ ہے جس میں نرا عمل ہو بلا محبت اب میں صرف پانچ منٹ اور بیان کروں گا پھر ختم کردوں گا چونکہ بہت دیر ہوگئی ہے اس لئے نیت تو یہیں ختم کردینے کی تھی لیکن اصل مقصود بیان کرنے سے باقی رہ گیا ہے یعنی رہ قلندر کی حقیقت تو بیان ہوچکی ہے مگر اس کا طریق عمل بیان کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ محض حقیقت کا معلوم ہوجانا عمل کے لئے کافی نہیں لہٰذا رہِ قلندر کی تحصیل کا طریق بھی بیان کرتا ہوں اور یہ اوپر معلوم ہوچکا ہے کہ وہ ایسا طریق ہے جو محبت اور عمل دونوں کا جامع ہے۔ پس ان دونوں چیزوں کی تحصیل کا طریق معلوم ہونا چاہیئے سو عمل کے متعلق تو خیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمت کرو عمل ہوجائے گا پس اس کا یہی طریق ہے لیکن سوال یہ ہے کہ محبت کیونکر پیدا ہو۔ تو لیجئے میں اس کا ایک نسخہ لاکھوں روپیہ کا مفت بتائے دیتا ہوں وہ نسخہ مرکب ہے چند اجزاء سے اور وہ سب چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں غور سے سنئے وہ چند چیزیں ہیں سب سے اول ہے عمل کیونکہ میں اول ہی تقریر

یں عرض کر چکا ہوں کہ عمل میں خاصیت ہے محبت پیدا کر دینے کی اور اس کو بہت بڑا دخل ہے محبت پیدا کرنے میں چاہے تجربہ کر لو روز روز کسی کے پاس جایا کرو دیکھو محبت ہو جاوے گی پہلے تھوڑی ہو گی پھر جاتے جاتے ایسا تعلق ہو جاوے گا کہ بہت ہی زیادہ غرض یہ مسلم امر ہے کہ میل جول جتنا زیادہ ہو گا اتنی ہی زیادہ محبت ہو گی وہ جو کہتے ہیں پالے کی محبت اس کی یہی تو اصل ہے غرض ایک عمل میں یہ برکت ہے کہ اس سے محبت حق پیدا ہو جاتی ہے اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم تو مدت سے نیک عمل کر رہے ہیں مگر محبت پیدا نہیں ہوئی جواب یہ ہے کہ نیک عمل کے مفہوم میں ایک یہ ہی جزء تو نہیں کہ بس عمل کر لیا۔ بلکہ وہ مرکب ہے اور اجزاء سے بھی ایک جزء تو عمل کرنا ہے دوسرا جزء یہ ہے کہ عمل کو اس کے طریق کے مطابق کیا جائے مثلاً صرف ٹکریں مارنے کو نماز نہیں کہتے ، نیک عمل جس طرح کیا جاتا ہے اور جو اس کا مامور بہ طریق ہے اس طریق سے اس کو کر دیکھو محبت کیسے نہیں پیدا ہوتی۔ تیسری وجہ اثر نہ ہونے کی یہ ہے کہ تم نے عمل کو صرف عادت سمجھ کر کیا اس نیت سے نہیں کیا کہ اللہ کی محبت بڑھ جاوے عمل میں یہ نیت نہیں کی کہ اے اللہ آپ کی محبت پیدا ہو جائے سو اس نیت سے عمل کرو پھر دیکھو ان شاء اللہ تعالیٰ کیسا اثر ہوتا ہے ۔بہر حال ایک جزء تو اس نسخہ کا یہ ہے کہ نیک عمل میں بہ نیت ازدیاد محبت استقامت کے ساتھ مشغول رہو۔ دوسری بات ضروری یہ ہے کہ اللہ کا نام لو جی لگا کر یعنی تھوڑا اللہ اللہ بھی کرو تیسری بات یہ ہے اور بہت ہی ضروری ہے کہ اہل محبت کی صحبت اختیار کرو۔ اس سے لوگ بھلکتے ہیں۔ اول تو اس طرف توجہ ہی نہیں کہ کسی بزرگ کی خدمت میں جا کر رہیں بس تھوڑی سی کتابیں پڑھ لیں اور سمجھ لیا کہ ہم کامل مکمل ہو گئے بھلا نری کتابوں سے بھی کوئی کامل مکمل ہوا ہے ہاں تم کمبل تو ہو گئے یعنی کمبل پوش باقی نہ کامل ہوئے نہ مکمل ارے بھائی موٹی بات ہے کہ بلا بڑھئی کے پاس بیٹھے کوئی بڑھئی نہیں بن سکتا حتیٰ کہ اگر بسولہ بھی بطور خود ہاتھ میں لیکر اٹھائے گا تو وہ بھی قاعدہ سے نہ اٹھا جا سکے گا۔ بلا درزی کے پاس بیٹھے سوئی کے پکڑنے کا اندازہ بھی نہیں آتا۔ بلا خوشنویس کے پاس بیٹھے ہوئے اور بلا قلم کی گرفت اور خط کی کشش کو دیکھے ہوئے ہرگز خوشنویس نہیں ہو سکتا۔ غرض بدون صحبت کامل کے کوئی کامل نہیں بن سکتا لہٰذا پیر کامل کی صحبت لازمی ہے پھر تو ایسا ہوتا ہے

کہ کبھی مرید پیر سے بھی بڑھ جاتا ہے مگر ابتدا میں تو کسی شیخ کامل کی صحبت کے بغیر چارہ نہیں اور آجکل اسی کی ضرورت کسی کی سمجھ میں نہیں آتی کبھی کسی مصلح کے پاس گئے بھی تو وہاں تو ہوتی ہے اصلاح پہونچتے ہی لتاڑ پڑنا شروع ہو گئی تو اب یہ حضرت گھبرائے کہ میاں کس مصیبت میں آپھنسے ہم تو آئے تھے بزرگ سمجھ کر انھوں نے لتاڑنا ہی شروع کیا یہ کیسے بزرگ ہیں یہ کیسے اللہ والے ہیں اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کوئی معدہ کا مریض طبیب کے پاس جاکر کہے کہ دیکھو جی ہم اپنے گھر حلوے کھایا کرتے تھے حلوے ہی ہمارے لئے تجویز کرنا۔ ذرا حماقت تو دیکھئے حالانکہ خدا کے فضل سے آپ کو دست بھی ہو رہے ہیں معدہ بھی خراب ہے ہضم بھی درست نہیں۔ یہ تو حضرت کی حالت اور حلوے کی فرمائش طبیب بھلا اس کی کیوں رعایت کرتا۔ اس نے اس کی حالت کے مناسب کڑوا مسہل تجویز کیا اور جب اس نے پینے سے انکار کیا اور تین پانچ کی تو گرا کر زبردستی چمچوں کے ذریعہ سے پلا دیا لیکن اس نے قصداً قے کر کرکے سارے پئے ہوئے مسہل کو پیٹ سے نکال دیا آپ قے کرتے جاتے ہیں اور بڑبڑاتے جاتے ہیں کہ واہ جی ہم تو اپنے گھر میں حلوے کھایا کرتے تھے حکیم جی نے نہ جانے کیا الایلا پلا دی کاش کوئی خیر خواہی سے کہتا کہ ارے بیوقوف تو کیا سمجھے تجھے جو وہ اس وقت کڑوا مسہل پلا رہا ہے تو تیرے ساتھ وہ دشمنی نہیں کر رہا ہے بلکہ دراصل وہ تجھے حلوے کھلانے کے قابل بنا رہا ہے ابھی تیرا معدہ حلوے کے قابل نہیں ایسی ہی حالت میں حلوا کھانے سے تو تجھے دست ہو رہے ہیں۔ تو حضرت اصلاح تو اصلاح ہی کے طریقہ سے ہوتی ہے مولانا نے مثنوی میں اسی مضمون کو ایک حکایت کے ضمن میں لکھا ہے۔ حکایت یہ لکھی ہے کہ ایک قزوینی نے ایک دلاک سے کہا کہ تم میرے شانہ پر ایک تصویر شیر کی گود دو چنانچہ اس نے گودنا شروع کیا اور سوئی لیکر کچے سے کر دیا۔ قزوینی کو جو تکلیف ہوئی تو ہائے واویلا کرنے لگا اور کہنے لگا کہ ارے میاں یہ کیا کر رہے ہو۔ اس نے کہا کہ کر کیا رہا ہوں شیر کی شکل بنا رہا ہوں۔ پوچھا کس عضو سے شروع کیا ہے کونسی چیز بنا رہے ہو۔ کہا دم کی طرف سے شروع کیا ہے دم بنا رہا ہوں کہا میاں اس شیر کے لئے دم کی کیا ضرورت ہے بے دُم ہی کا سہی۔ اجی چھوڑو بھی اس دُم کو میرا تو اس نے دُم ہی نکال دیا۔ پھر اس نے دوسری طرف سے شروع کیا۔ پھر کچے سے سوئی چبھوئی پھر وہ چیخنے چلانے لگا اور پھر پوچھا کہ اب کونسا عضو بنا رہے ہو کہا کہ اب کی دفعہ کان بنا رہا ہوں وہ بولا کہ ارے میاں بعضے شیر بُوچے بھی تو

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہوتے ہیں کان بھی چھوڑو۔ بوچا ہی شیر سہی۔ پھر تیسری جگہ سوئی لگائی تو وہ پھر چلانے لگا۔ اور پوچھنے لگا کہ بھائی اب کیا بنارہے ہو۔ کہا پیٹ کہا میاں تم بھی عجب آدمی ہو ابھی وہ سسرا کھائے پیئے گا تھوڑا ہی جو پیٹ بنارہے ہو۔ یہ بھی رہنے دو۔ اب تو اب تو دلاک کو بڑا غصہ آیا۔ سوئی اٹھا کر زمین پر پھینکدی اور جھلا کر کہا ؎

شیر بے گوش و سر و اشکم کہ دید　　این چنیں شیرے خدا ہم نافرید

(میاں ایسا شیر تو خدا نے بھی نہیں بنایا جس کے نہ سر ہو نہ کان نہ پیٹ)

پھر مولانا اس سے نتیجہ نکالتے ہیں اور فرماتے ہیں ؎

چوں نداری طاقت سوزن دن　　این چنیں شیر ژیاں پس دم مزن

تم جو شیخ کے پاس اصلاح کی غرض سے آئے ہو تو اس کی سختی اور لتاڑ کو برداشت کرو اور اگر قزوینی کی طرح سوزن کی برداشت نہیں ہے تو شیر کا نام ہی مت لو۔ اصلاح کی درخواست ہی نہ کرو۔ بھائی وہاں تو اصلاح اصلاح ہی کے طریقہ سے ہوگی۔ پھوڑا لیکر گئے ہو تو نشتر لگے ہی گا۔ اب وہاں تو نشتر لگانا ضروری اور یہاں یہ حال ؎

تو بیک زخمے گریزانی ز عشق　　تو بجز نامے چہ می دانی ز عشق

(تو تو عشق کے زخم سے ہی بھاگتا ہے۔ تو نے عشق کے نام کے سوا دیکھا ہی کیا ہے)

بس نام ہی نام ہے عشق کا ایک ہی زخم لگا تھا کہ بھاگے وہاں کا تو ادب یہ ہے کہ ؎

چوں گزیدی پیر نازک دل مباش　　سست و ریزندہ چو آب و گل مباش

(جب تو بھاگے پیر نازک دل نہ بن پانی اور مٹی کی طرح سست اور گرنے والا نہ بن)

ورنہ ہر زخمے تو پُر کینہ شوی　　پس کجا بے صیقل آئینہ شوی

(اگر ہر زخم پر بغض اور کینہ دل میں رکھنے لگے گا تو کیسے بغیر پالش کے آئینہ بن جائیگا)

یہ مصیبت ہو گئی ہے تو حضرت نرا وظیفہ اصلاح کے لئے ہرگز کافی نہیں نرے وظیفہ والے پیروں سے واللہ ثم واللہ ثم واللہ جو کبھی اصلاح ہو اصلاح تو ہوتی ہے اصلاح کے طریقہ سے تو اہل محبت کے پاس جاؤ اور وہ جو کہیں وہ کرو تھوڑے دنوں میں دل نور سے معمور ہو جائے گا اور خدا کی قسم اس قدر محظوظ ہوگے کہ تمہاری نظر میں پھر سلطنت کی بھی کچھ حقیقت

اور وقعت نہ رہے گی (حضرت حافظ فرماتے ہیں ؎

چو بےخود گشت حافظ کے شمارد — تبیک جو مملکت کاؤس کے را

(جب حافظ بیخود ہو گیا۔ ایک جو کے برابر بھی کیکاؤس کی حکومت کو کب شمار میں لا سکتا ہے)

جامع کے شعر ہیں ؎

دل ہو وہ جس میں کچھ نہ ہو جلوہ یار کے سوا — میری نظر میں خاک بھی جام جہاں نما نہیں

کسی کی یاد میں بیٹھے جو سب سے بے غرض ہو کر — تو اپنا بوریا بھی پھر ہمیں تخت سلیماں تھا

جناب میرے پاس اس قسم سے زیادہ کوئی ذریعہ یقین دلانے کا نہیں لے صاحب میں مکرر قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو اس طریق سے اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کر لیگا وہ ایسا ہو جائے گا کہ پھر اس کو نہ موت کا خوف ہوگا نہ ذات الجنب کا نہ نمونیہ کا نہ بخار کا نہ قحط کا نہ وبا کا کوئی غم نہ رہے گا بس بالکل جنت کی سی حالت ہو جائے گی ہاں غم ہوگا تو ایک کہ اللہ میاں تو ناراض نہیں۔ خدا کے نزدیک میں کیسا ہوں نہ جانے وہ مجھ سے راضی ہیں یا ناراض بس اس غم کے سوا اور کوئی غم نہ ہوگا مگر یہ غم ایسا لذیذ ہے کہ ہزاروں خوشیاں اس پر نثار اس شخص سے اگر کوئی کہنے لگے کہ لاؤ تمہارا یہ غم تو ہم لے لیں اور اس کے عوض اپنی ساری خوشیاں تمہیں دیدیں تو کبھی نہ بدلے گا تو حضرت یہ دولت ملے گی اہل اللہ کے پاس جانے سے اور ان کا اتباع کرنے سے تو حاصل طریق کا یہ ہے کہ اعمال میں ہمت کر کے شریعت کے پابند رہو ظاہراً و باطناً اور اللہ اللہ کرو۔ اور کبھی کبھی اہل اللہ کی صحبت میں جایا کرو۔ اور ان کی غیبت میں جو کتابیں وہ بتائیں ان کو پڑھا کرو۔ لو جی یہ چار چیزیں ہیں۔ میں ٹھیکہ لیتا ہوں کہ جو ان چار پر عمل کر کے دکھلا دے گا وہ یحبھم ویحبونہ کا مصداق یعنی اللہ تعالیٰ کا محبوب اور محب ہو جاوے گا ضرور ہو جاوے گا ضرور ہو جاویگا ضرور اور بالضرور ہو جاوے گا۔ لو صاحب اب اختیار ہے جو چاہے عمل کر کے دیکھ لو اور تجربہ کر لو۔ اور اس کی ضرورت نہیں کہ مرید ہو جاوے۔ اجی کس کی پیری مریدی لئے پھرتے ہو یہ تو پکھنڈ ہے بیعت کی صورت ضروری نہیں۔ اصل چیز بیعت کی روح یعنی اتباع ہے (احقر جامع کا شعر ہے) ؎ تین حق مرشد کے ہیں رکھ ان کو یاد؛ اعتقاد و اعتماد و انقیاد جیسے طبیب سے رجوع کرتے وقت کوئی یہ نہیں کہتا کہ تحقیق نیت کرتا ہوں میں کہ آج سے

بناؤں گا تم کو طبیب اپنا اللہ اکبر اسی کی طرح اس کی کیا ضرورت ہے کہ پیر کہے میں نے تمہیں مرید کیا اور مرید کہے میں نے تمہیں پیر بنایا اس پٹہ اور قبولیت کی ضرورت ہی کیا ہے اگر پکے کاشتکار ہو گے اور طریقہ سے کاشتکاری کرو گے تو بلا پٹہ اور قبولیت کے بھی غلّہ پیدا ہو گا۔ غرض مرید ہونے کی ضرورت نہیں پیر کے کہنے کے مطابق کام شروع کر دو بس ہو گیا تعلق۔ واللہ وہی نفع ہو گا جو پیری مریدی میں ہوتا ہے۔ اب لوگوں کا عجب حال ہے کہ کام بتاؤ تو نہ کریں بس بیعت کا نام کرنا چاہتے ہیں بیعت کیا ہے محض رسم ہی رسم رہ گئی ہے چنانچہ جو پیر ایسے ہیں کہ مرید تو کر لیتے ہیں لیکن کام کچھ نہیں تبلاتے ان سے تو لوگ بہت خوش ہیں اور میں مرید تو کرتا نہیں لیکن کام تبلاتا ہوں تو مجھ سے ناراض ہیں یوں سمجھ رکھا ہے کہ وہ بھید میں فقیر کے وہ انجھر ہیں پریم کے وہ مریدوں ہی کو بتائے جاتے ہیں۔ یہ خیال ہے کہ مرید کرتے ہی پیر بس پریم کے وہ انجھر بتا دیگا اور اللہ والے ہو جائیں گے۔ دھرے تھے انجھر دھرے تھے بھید ڈلے پتھر۔ میاں خدا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام لو اور احکام بجالاؤ۔ بس یہی انجھر ہیں اصلاح نفس کے طریقے پیر سے پوچھو یہی بھید ہیں اگر کوئی کہے کہ کیا باطنی طریق بس یہی ہے تو ہم بآواز دہل کہیں گے کہ ہاں یہی ہے اور کبھی اس طریق میں بڑے بڑے حالات بھی پیش آئیں گے بڑی بڑی کیفیات بھی طاری ہوں گی یہ سب ہو گا مگر مقصود نہیں ہے۔ بھائی حالات تو سڑک کے درخت ہیں پھولوں کے نظر آئے تو کیا نہ نظر آئے تو کیا سڑک تو بہر حال قطع ہو گی درختوں اور پھولوں کا نظر نہ آنا سڑک کے قطع ہونے کے لئے ضروری نہیں نظر پڑیں گے تب قطع ہو گی نہ نظر پڑے گی تب قطع بس چلتے رہنا شرط ہے اور بعضوں کو یہ درخت اور پھول عمر بھر بھی نظر نہیں آتے۔ واللہ جن حالات کو آپ بڑا کمال سمجھتے ہیں طریق میں بس ایسے ہیں جیسے سڑک پر دو طرفہ درخت لگے ہوں گلاب اور بیلے کے کبھی نظر نیچی کر کے چلتے ہیں تو کیا راستہ قطع نہیں ہوتا۔ راستہ تو برابر قطع ہوتا ہے چاہے درخت نظر پڑیں یا نہ پڑیں افسوس ہے تصوف کا ناس کر دیا ہے ان جاہل صوفیوں نے اور فقیری کو ہاؤ بنا رکھا ہے کہتے ہیں کہ چلے کھینچو بیوی کو طلاق دیدو اولاد کو عاق کر دو دروازہ کو تیغا کر دو چالیس چنے رکھ لو اور ایک چنا روز کھاؤ بدون اس کے اصل فقیری ملتی ہی نہیں۔ میں کہتا ہوں واللہ دو مثالوں میں گدے تکیوں میں سلطنت میں مرغن کھانوں میں فقیری ملتی ہے مگر گھر میں نہیں شیخ کامل کی

خدمت میں ملتی ہے چنانچہ حضرت شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ جن کی شان اتنی بڑی ہے کہ مولانا روم جیسے عارف کی ان کے بارہ میں یہ رائے ہے ؎

ہفت شہر عشق را عطار گشت ۔۔۔ ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

(عطار نے عشق کے سات شہروں کی سیر کی ہے ہم تو ابھی عشق کے ایک کوچہ ہی کے بیچ و خم میں جل رہے ہیں)

وہ فرماتے ہیں ؎

گر ہوائے ایں سفر داری دلا ۔۔۔ دامن رہبر بگیر د بس بیا

(اے دل اگر اس محبت کے سفر کو طے کرنے کی خواہش رکھتا ہے تو کسی رہبر کامل کے دامن کو مضبوط پکڑ لے چلا آ۔)

در ارادت باش صادق اے فرید[۱] ۔۔۔ تا بیابی گنج عرفاں را کلید

؎ بے رفیقی ہر کہ شد در راہِ عشق ۔۔۔ عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق

(بلا مرشد کے طریق عشق میں جس نے قدم رکھا اس نے عمر ضائع کی اور عشق سے آگاہ نہ ہوا)

مگر شیخ ہونا چاہیئے کامل اور کامل شیخ کی پہچان یہ ہے کہ شریعت کا پورا متبع ہو بدعت اور شرک سے محفوظ ہو کوئی جہل کی بات نہ کرتا ہو۔ اس کی صحبت میں بیٹھنے کا یہ اثر ہو کہ دنیا کی محبت گھٹتی جائے اور حق تعالیٰ محبت بڑھتی جائے اور جو مرض باطنی بیان کرو اس کو بہت توجہ سے سن کر اس کا علاج تجویز کرے اور جو علاج تجویز کرے اس علاج سے دم بدم نفع ہوتا چلا جائے اور اس کے اتباع کی بدولت روز بروز حالت درست ہوتی چلی جائے۔ یہ علامت ہے شیخ کامل کی ایسا شخص مل جائے تو وہ اکسیر اعظم ہے تو یہ ہے طریقہ محبت پیدا کرنے کا۔ اس سے تو ہو گی محبت آگے رہا عمل تو اس کے لئے ضرورت ہو گی ہمت کی۔ اب ایک اور غلطی میں لوگ مبتلا ہیں کہ پیر بنا کر اس کو ٹھیکہ دار اور ذمہ دار اعمال کا سمجھتے ہیں اس میں ان کا قصور نہیں کیونکہ ان کو بہکایا ہے دوکانداروں نے چنانچہ ایک گاؤں میں ایک پیر صاحب آیا جایا کرتے تھے ایک بار آئے تو کچھ دبلے ہو رہے تھے گھر پر مرغن کھانے نہ ملے ہوں گے۔ ایک چودھری نے جو مرید تھا دیکھ کر کہا کہ اے پیر یہ کیا بات ہے توں (یعنی تو) دبلا بہت ہو رہا ہے اب کیا تھا انھیں موقع مل گیا کہا چودھری جی دبلا نہ ہوں تو کیا ہوں تمہاری طرف سے کام بھی تو مجھے بہت کرنے پڑتے ہیں تم نماز نہیں پڑھتے تمہاری طرف سے مجھے نماز پڑھنی پڑتی ہے تم روزے نہیں رکھتے تمہاری طرف سے مجھے

---

[۱] اے فرید حسن عقیدت و ارادت کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے تاکہ تجھ کو گنج معرفت کی کنجی حاصل ہو جائے)

روزے رکھنے پڑتے ہیں اور سب سے مشکل کام یہ ہے کہ تمہاری طرف سے مجھے پلصراط پر چلنا پڑتا ہے جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے بس اسی فکر میں جان سوکھی جاتی ہے اب تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ کیوں دُبلا ہو رہا ہوں ان ہی وجہوں سے دبلا ہو گیا۔ یہ سنکر چودھری کو بڑا رحم آیا کہنے لگا دُہ دُہ (کلمۂ تاسف) ارے پیر تجھے تو بڑے کام کرنے پڑتے ہیں تیرے اوپر تو بڑی محنت پڑرہی ہے جا میں نے تجھے اپنا مونجی کا کھیت دیا پیر صاحب نے سوچا کہ یہ گاؤں کے لوگ ہیں ان کا کیا اعتبار ہے ابھی چل کر کھیت پر قبضہ کرلینا چاہیئے ورنہ ممکن ہے بعد کو رائے بدل جائے فوراً کہا کہ چودھری جی میں نے تمہارا وہ کھیت کبھی دیکھا نہیں چل کے مجھے دکھا دو اور قبضہ کرا دو اس نے کہا چل۔ اب پیر صاحب تو آگے آگے اور مرید صاحب پیچھے پیچھے کھیتوں میں راستہ نہیں ہوتا پتلی پتلی ڈولیں ہوتی ہیں خاص طور سے مونجی اور دھان کے کھیتوں کی ڈول بہت اونچی اور پتلی ہوتی ہیں اور کھیتوں میں پانی بھرا رہتا ہے یہ دونوں بھی ایک پتلی سی ڈول پر چلے جا رہے تھے۔ دفعۃً پیر صاحب کا پاؤں پھسلا اور دھڑام سے نیچے آرہے کیونکہ پانی کی وجہ سے مٹی بھی چکنی ہو رہی تھی چودھری نے کود کر اوپر سے ایک لات رسید کی اور کہا کہ ٹھہرے تو تو کہے تھا کہ میں پلصراط پر چلوں ہوں جو بال سے بھی باریک ہے تو بالکل جھوٹا ہے ایک بالشت چوڑی مینڈ پر تو تجھ سے چلا ہی نہ گیا بال سے باریک پلصراط پر تو تو ضرور چلتا ہوگا جا میں کھیت نہیں دیتا میں تو پلصراط کے بدلے دے دوں تھا اب کیوں دوں۔ جا میں اب نہیں دیتا کھیت کا کھیت بیچارے کے ہاتھ سے گیا۔ پانی میں جدا گرا اور اوپر سے لات بڑی سو الگ، تو جناب ان جاہلوں کو ایسے دوکانداروں نے یہ پٹی پڑھا رکھی ہے کہ تمہیں کچھ عمل کرنے کی ضرورت نہیں سب ہمیں کرلیں گے بس اب وہ سچے پیروں سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں۔ چنانچہ میرے پاس خطوط آتے ہیں کہ صاحب تہجد کے لئے آنکھ نہیں کھلتی دعا کردو کہ آنکھ کھلا کرے میں لکھ دیتا ہوں کہ اچھا میں اس شرط پر دعا کروں گا کہ آپ میرے لئے یہ دعا کردیجئے کہ میری ایسی ٹانگیں ہو جائیں کہ میں روز کلکتہ پہونچکر اور آپکا ہاتھ پکڑ کر آپ کو اٹھا دیا کروں، بیوقوف ہوئے ہو۔ آنکھ نہیں کھلتی تو میں کیا کروں، میاں اٹھو کسی طرح اور اگر کسی طرح نہیں اٹھا جاتا تو عشاء کے بعد ہی تہجد کی رکعتیں پڑھ لیا کرو۔ غرض ہر چیز کا علاج ہے۔ بعضے کہتے ہیں کہ وظیفہ پورا نہیں ہوتا کوئی ایسی توجہ دیجئے کہ وظیفہ پورا ہو جایا کرے بس سارے کام توجہ ہی سے چلانا چاہتے ہو لاؤ میں توجہ کی حقیقت ظاہر کردوں صاحبو کہیں دوسروں کی توجہ سے بھی کام چلتا ہے جب تک کہ خود توجہ نہ کرے اور ہمت سے کام نہ لے سارا کام

ہمت پر موقوف ہے بیوقوف یوں سمجھتے ہیں کہ بس سب کچھ پیروں کے ہاتھ میں ہے، پیر تو بیچارے کیا چیز ہیں خود جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابو طالب کے لئے بہت چاہا کہ مسلمان ہو جائیں مگر ہدایت نہ ہوئی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا آپ کو ارشاد ہوا انك لا تهدى من احببت یعنی آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں، لیجئے جب خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی اپنی توجہ سے ہدایت نہ کر سکے تو پیر بیچارے تو کیا کرتے دیکھا آپ نے۔ اب تو صاحبو آپ کو توجہ کی حقیقت معلوم ہو گئی۔ پھر ایک اور غضب یہ ہے کہ دین تو دین دنیا کے کام بھی پیر ہی کے سپرد کئے جاتے ہیں ایک صاحب نے مجھے خط لکھا کہ یہاں اتنے آدمی اب تک طاعون میں مر چکے ہیں خیر جو مر چکے وہ تو مر چکے اب جو زندہ ہیں ان کی خیریت چاہیئے۔ ایسی دعا کیجئے کہ وہ نہ مریں میں نے لکھا کہ حضور آپ کو تو ماشاء اللہ وہاں کی انسپکٹری مل گئی ہے جو وہاں کے انتظامات کی فکر ہے لیکن مجھے ابھی ٹھیکیداری نہیں ملی۔ تم تو انسپکٹر ہو گئے ہو مگر میں تو ٹھیکیدار نہیں ہوا۔ یہ درخواست تو ایسی ہے کہ گویا حوالات سے اتنے مجرم تو بھاگ گئے بقیہ کا میں پہرہ دوں سو مجھے اس چوکیداری سے معاف رکھئے۔ اس قسم کی حماقتیں کرتے ہیں نعوذ باللہ شرک میں مبتلا ہو گئے لوگ غرض یہاں تو جو کچھ حاصل ہوتا ہے کام کرنے سے حاصل ہوتا ہے اور تم چاہتے ہو کہ کچھ کرنا نہ پڑے، پیر کی توجہ ہی سے سب کام بن جائیں اور کمال حاصل ہو جائے۔ ارے بھائی جن سے یہ درخواست ہے پہلے ان سے تو تحقیق کر لو کہ انھیں جو کمال حاصل ہوا ہے وہ کاہے سے حاصل ہوا ہے حضرت چکی پیسنے سے پہلے چکی پیسی پھر آٹا نکل آیا پھر پانی ڈال کر آٹا گوندھا پھر روٹی بنا کر توے پر ڈالی پھر وہ پک گئی پھر کھالی۔ اب تم چاہتے ہو کہ کرنا تو کچھ نہ پڑے اور پیٹ بھر جائے۔ اس پر ایک حکایت یاد آئی، دو شخص ہم سفر تھے کسی مقام پر روٹی پکانے کے لئے ٹھہرے تو ایک نے دوسرے سے کہا کہ آٹا تو میں لے آؤں گا لکڑی تم لے آؤ۔ اس نے کہا بھائی مجھ سے تو نہیں اٹھا جاتا میں تو بہت تھک گیا ہوں تمہیں دونوں چیزیں لے آنا خیر وہ آٹا بھی لے آیا لکڑی بھی لے آیا۔ پھر اس نے کہا میں آگ جلا دُوں تم آٹا گوندھ لو۔ کہا اجی حضت معلوم نہیں بیتلا ہو جائے سخت ہو جائے پھر تم خفا ہونے لگو بس تم ہی گوندھ لو بیچارے نے آٹا بھی گوندھ لیا، پھر اس نے کہا تم توے پر روٹی ڈالتے جاؤ میں سینکتا جاؤں۔ کہا میں نے تو بھائی کبھی روٹی پکائی نہیں کچی رہ جاوے جل جائے تمہیں اچھی پکاؤ گے خیر اس نے روٹی بھی پکالی۔

جب سب ہو ہوا چکا اور روٹی پک پکا کر تیار ہو گئی تو اس نے ساتھی سے کہا کہ آؤ روٹی تیار ہے کھالو کہنے لگا بھائی تمہارے خلاف کرتے ہوئے بہت دیر ہو گئی اب کہاں تک خلاف کروں اور کب تک انکار کرتا رہوں شرم آتی ہے اچھا لاؤ کھالوں بسم اللہ الرحمن الرحیم بس احسان جتلا کر کھانے بیٹھ گئے خیر غنیمت ہے۔ ایک بات تو مانی۔ تو اب تم بھی چاہتے ہو کہ ایسا پیر ملے جو پکی پکائی کھلا دے لیکن ایسا نہ ہوگا۔ ع ایں خیال است و محال است و جنوں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو پکی پکائی کھلائی ہی نہیں اور کسی کی تو کیا ہستی ہے اور کیا مجال ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو غایت شفقت سے بہت چاہتے تھے کہ پکی پکائی ہی کھلا دیں مگر غیرت حق اور مصلحت دین کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت نہ دی تو بھائی خوب سمجھ لو کہ کام کرنے ہی سے کام چلے گا بس طریق یہی ہے کہ کام کرو محنت کرو خدا برکت دیگا۔ اگر کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو تو بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ کام کرو اور محنت کرو جیسا کہ یجاھدون فی سبیل اللہ سے میں ثابت کر چکا ہوں خلاصہ یہ کہ جو پیر ایسا کامل مکمل ہو اور جس میں مذکورہ علامتیں ہوں اس کی خدمت میں رجوع کرو لیکن بیعت پر اصرار نہ کرو درخواست پر اگر وہ کر لے اس کی عنایت ہے باقی تم اس کو دق نہ کرو پھر جو وہ کہے کرو۔ اگر محنت کراوے محنت کرو۔ ذکر و شغل کراوے ذکر شغل کرو غرض اس کی فکر میں لگ جاؤ کہ کسی کامل مکمل کی صحبت میسر آئے اب آخر میں یہ عرض ہے کہ مقصود میں کوتاہی کرنے والے دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جو عمل میں کوتاہی کرتے ہیں ان کو چاہیئے کہ اپنے قصد کو پختہ کریں اور ہمت سے کام لیں۔ دوسرے وہ ہیں جن میں محبت کی کمی ہے وہ اہل محبت کی صحبت اختیار کریں غرض یہ دونوں چیزیں لازم طریق ہیں ایک عمل دوسری محبت اول میں ہمت کی ضرورت ہے دوسری میں اہل اللہ کی صحبت اور ان کے اتباع کی اس سے ان صفات کی جامع اور ان ثمرات کے مستحق ہو جاؤ گے جو اس وقت بہ ضمن آیت قرآن بالتفصیل بیان کئے گئے۔ جو کچھ مجھے کہنا تھا میں کہہ چکا اب میں اس بیان کو ختم کرتا ہوں اور اس کا نام اس کی خصوصیات کے لحاظ سے جو کہ ظاہر ہیں "طریق القلندر" رکھتا ہوں۔ اس نام میں یہ بھی مصلحت ہے کہ قلندر کے متعلق چونکہ عموماً لوگ بہت غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں اس نام کو سن کر یا دیکھ کر بے اختیار ان کو اشتیاق ہوگا کہ لاؤ دیکھیں اس وعظ میں طریق قلندر کی کیا حقیقت بیان کی گئی ہے اور جب دیکھیں گے تو ساری عمر بھر کیلئے ساری غلط فہمیوں سے محفوظ ہو جائیں گے اور حضرت حافظ کے ان اشعار کی حقیقت کی تحقیق اور حقیقت کی تصدیق ہو جاوے گی ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند | نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

(یعنی جو شخص بھی چہرہ آراستہ کرے یہ لازم نہیں کہ دلبری جانتا ہو جیسے جو شخص آئینہ بناتا ہو یہ لازم نہیں کہ سکندری بھی جانتا ہو)

۵ ہزار نکتۂ باریکتر ز مو اینجا ست نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

(اس جگہ ہزاروں باریکیاں بال سے زیادہ باریک ہیں جو شخص بھی سر منڈائے ضروری نہیں کہ قلندری بھی جانتا ہو)

اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ فہم سلیم عطا فرمائیں اور قلندر کی جو صفت اس وقت کتاب و سنت اور اقوال مشائخ دائمہ طریق سے بیان کی گئی ہے اس کا پورا پورا مصداق بنائیں اور ہر قسم کی گمراہی اور کجی سے ہمیشہ محفوظ و مامون رکھیں چونکہ یہ بیان حضرت قلندر رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک کے قریب ہوا ہے جس میں حضرت کا روحانی فیض شامل ہونا بھی بعید نہیں اس لئے میں اس کا ثواب حضرت کی روح مبارک کو پہنچاتا ہوں (پھر سارے مجمع نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور بعد دعا حضرت نے فرمایا کہ مصافحہ سے معافی چاہتا ہوں مجھکو بھی تکلیف ہوگی اور سب کو تکلیف ہوگی گیارہ بج چکے ہیں رات زیادہ ہوگئی سب صاحب آرام فرمائیں فقط وعظ تمام شد۔ **اشرف علی**

جامع وعظ ہذا احقر عزیز الحسن عرض کرتا ہے کہ الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ یہ معرکۃ الآرا وعظ تقریباً چودہ برس بعد آج ۲۰ ذالحجہ ۱۳۵۰ھ یوم چہارشنبہ ٹھیک اذان مغرب کے وقت سہ دری حضرت حاجی صاحب میں بمقام خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر صاف ہو کر قابل اشاعت ہوا۔ اللہ تعالیٰ اسکو نافع اور مقبول فرمائے اور میرے لئے کفارۂ سیئات و ذخیرہ آخرت کرے۔ جو صاحب فائدہ اٹھائیں حضرت واعظ مدظلہم العالی کی طول حیات بایں فیوض و برکات کیلئے نیز جامع وعظ و ناشر وعظ کے لئے توفیق مرضیات و حسن خاتمہ کی دعا فرمائیں۔ جناب مولوی حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری کے لئے بھی دعا فرمائیں، جن کے مسودہ اجمالی سے مجکو مدد ملی اور تسوید تفصیلی میں بھی بہت سے مشکل مقامات اُن سے حل ہوئے۔ مکرمی حافظ صغیر احمد صاحب سے بھی بہت مدد ملی کیونکہ نقل و مقابلہ انھیں نے کیا اور اگر وہ رات دن محنت کر کے اس کام کو نہ کرتے تو سارے کام اتنی قلیل مدت میں ہرگز ختم نہ ہو سکتے تھے ان کیلئے بھی دعا کیجئے اب آخر میں یہ احقر بھی اس وعظ کی تبییض کا ثواب بہ تبعیت حضرت واعظ مدفیوضہم العالی حضرت قلندر رحمۃ اللہ علیہ کی روح پُر فتوح کو پہنچا کر ختم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

والسلام مع خیر الکلام الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات۔ ۲۷ ذی حجہ ۱۳۵۰ھ

ملنے کا پتہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء بندر روڈ (ایم اے جناح روڈ) کراچی

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلہ التبلیغ کا وعظ

مسمٰی بہ

آثار العبادۃ

(منجملہ ارشادات)

حکیم الامّت مجدّد الملّت حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی

(رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ)

ناشر: محمد عبد المنّان غُفِرلہٗ

مکتبۂ تھانوی — دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ ایم۔ اے جناح روڈ کراچی ۱

سلسلہ التبلیغ کا وعظ

مسمّٰی بہ

آثارالعبادہ

این	متی	کم	کیف	من ای شان	لم	ماذا	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	بیٹھ کر بیان	[illegible]	سبب وعظ	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
مدرسہ نظامیہ شبلی گنج حیدرآباد دکن	۲۶ ربیع الاول ۱۳۴۶ھ روز شنبہ بعد عشاء	۲ گھنٹے	کرسی پر بیٹھ کر	.	.	.	احمد عبدالحلیم کانپور لیدرورکس مٹن روڈ کانپور اور پھر حاجی محمد یوسف صاحب کے صرف سے احقر ظفر احمد عفا عنہ نے اس اور حیدرآباد کے دوسرے وعظ اسرار العبادہ پر نظر کرکے دونوں کو مرتبط کیا	۲۰۰	.

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دعاء خطبہ ماثورہ۔ تعوذ وتسمیہ۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَیۡنَہُمَا فَاعۡبُدۡہُ وَاصۡطَبِرۡ لِعِبَادَتِہٖ ھَلۡ تَعۡلَمُ لَہٗ سَمِیًّا (وہ رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو ان دونوں کے درمیان ہے سو تو عبادت کیا کر اور اس کی عبادت پر قائم رہ بھلا تو کسی کو اس کا ہم صفت جانتا ہے) یہ ایک آیت ہے سورۂ مریم جس کی تلاوت اس کے قبل ایک نہایت مختصر جلسہ بیان میں کی گئی تھی چونکہ مضمون نہایت ضروری تھا اس لئے اس کی شرح کو یہاں بھی کافی سمجھا گیا اور اسی کی تلاوت بھی کی گئی اور اس مضمون کا خلاصہ آیت کے سننے ہی سے معلوم

ہوگیا ہوگا اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ یہ کس قدر ضروری مضمون ہے اور ضرورت بھی ایسی ویسی معمولی نہیں بلکہ اس کا بڑا شدید درجہ ہے جس کے اعتبار سے اس کو اہم کہہ سکتے ہیں۔ اور جو مقصود ہے آیت سے اس کا مادہ خود آیت میں موجود ہے اس لئے مجھے اس کے تعیین کی ضرورت نہیں اور وہ مادہ کیا ہے وہ عبادۃ ہے جو فاعبدہ (پس اس کی عبادت کرو) میں مذکور ہے اور اس کا سیاق وسباق اسی کی تمہید کے لئے ہے یا تاکید کے لئے باقی مقصود صرف فاعبدہ ہے جس میں عبادت کا امر ہے جو عام طور پر اس کے سنتے ہی سے مسلمانوں کے ذہنوں میں آگیا ہوگا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی کو فاعبدہ کا صیغہ اور ترکیب نہ معلوم ہو مگر یہ تو سب ہی کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ اس میں عبادت کا ذکر ہے اور عبادت گو ایک شرعی اصطلاح ہے مگر خفی نہیں ہے۔ کون مسلمان ایسا ہے جو لفظ عبادت کا استعمال نہ کرتا ہو۔ متعدد موقعوں پر اس کا برابر استعمال کیا جاتا ہے اس لئے آیت کا مفہوم تو سب کے ذہنوں میں متعین ہوگیا ہوگا کہ اس آیت میں عبادت کا امر ہے اور یہی اس کا خلاصہ ہے۔ جب مقصود کی تعیین ہوگئی تو اس کا ضروری ہونا بھی معلوم ہوگیا کیونکہ حق تعالیٰ اس کا امر فرما رہے ہیں مگر غور طلب بات یہ ہے کہ عبادت کا مفہوم اس قدر تو سہل کہ روزمرہ کی بول چال میں آتا ہے اور اس قدر ضروری کہ ہر وقت انسان اس کا مکلّف ہے مگر پھر کیوں اس کی طرف توجہ نہیں اور یہ ایک عجیب رحمت حق ہے کہ جو چیز جتنی زیادہ عام ضرورت کی ہوتی ہے اسی قدر زیادہ سہل ہوتی ہے مگر غافلین کی بے قدری سے یہ کیفیت ہوتی ہے کہ چیز جس قدر سہل ہوتی ہے اسی قدر اس کی وقعت گھٹتی جاتی ہے۔ حالانکہ سہولت واقع میں وقعت گھٹنے کا سبب نہیں بلکہ اور زیادہ توجہ کا سبب ہے کیونکہ سہولت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے طبائع واذہان میں زیادہ مناسبت پیدا کر دی گئی ہے اور مناسبت عامہ اسی چیز سے پیدا کی جاتی ہے جو اہم ہو جو چیز جس قدر زیادہ اہم ہے اتنا ہی زیادہ عام ہے یہ ایک قدرتی انتظام ہے اور یہ انتظام بھی عام ہے۔ تکوین کو بھی تشریع کو بھی۔ چنانچہ سب جانتے ہیں کہ انسان کی زندگی کے لئے ہوا کی ہر وقت کس درجہ ضرورت ہے۔ چنانچہ سانس کی آمد و رفت ہی پر قوام عیش کا دارومدار ہے

چنانچہ اگر سانس بند کردی جاوے تو ہلاکت یقینی ہے اور اگر ہوا معدوم کردی جائے تو سانس بند ہونا یقینی ہے غرض ہوا کا عناصر اربعہ میں ضرورت میں سب سے اشد ہے مگر باوجود اس کے کتنی ارزاں اور کس قدر عام ہے کہ ہر جگہ ہے اور مفت ہے کہ کہیں بھی نہیں بکتی گو اس کے آلات بکتے ہوں۔ مگر وہ آلات ہوا پیدا کرنے کے لئے نہیں ہوتے صرف ساکن ہوا کو حرکت دینے کے لئے ہوتے ہیں مثلاً پنکھا کہ اس کے ذریعہ سے ہوا میں حرکت پیدا کی جاتی ہے جس سے راحت میں زیادتی ہو جاتی ہے مگر نفس راحت پنکھے پر منحصر نہیں وہ محض ہوا سے ہے۔ چنانچہ اگر پنکھا نہ ہو تو یہ اور بات ہے کہ گرمی کی تکلیف ہو مگر ہلاکت نہیں ہوسکتی بخلاف ہوا کے کہ اگر یہ نہ ہو تو انسان ہلاک ہی ہو جاوے۔ بہر حال ہوا چونکہ مدار زندگی ہے اس لئے قدرتی انتظام ہے کہ اس کا ایک کرہ ہے جو ہوا میں بھرا ہوا ہے جس کی نہ قیمت نہ تخصیص بلکہ بے حد تعمیم ہے۔ حالانکہ چاہیئے تو یہ تھا کہ جس قدر زیادہ ضرورت کی چیز ہو اسی قدر زیادہ مہنگی اور دشوار یاب ہو مگر نہیں قدرتی انتظام بالکل اس کے برعکس ہے کہ جو چیز جس قدر زیادہ ضرورت کی ہے اسی قدر زیادہ ارزاں ہے۔ چنانچہ ہوا کی کیفیت آپ نے دیکھ لی پھر ہوا کے بعد پانی کا درجہ ہے۔ سو چونکہ اس کا درجہ ہوا سے کم تھا، اس لئے کہیں کہیں، کبھی کبھی بکتا بھی ہے۔ پھر دیکھئے سب میں کم کام آنے والی چیز جواہرات اور موتی ہیں۔ چنانچہ ہزاروں آدمیوں نے شاید زندگی بھر بھی جواہرات دیکھے بھی نہ ہوں گے اور نہ استعمال کئے ہوں گے تو کسی کی ضرورت اس پر اٹکی نہیں۔ مگر باوجود اس کے دیکھ لیجئے کس قدر قیمتی ہیں اور جیسے تکوین میں آپ نے دیکھا کہ ضروری چیزیں ارزاں ہیں اور غیر ضروری گراں یہی انتظام حق تعالے نے تشریع میں بھی رکھا ہے۔ چنانچہ تشریع میں سب میں ضروری اور اہم اور سب سے بڑا ایمان ہے کہ کوئی وقت اور کوئی حالت ایسی نہیں جس میں یہ ساقط ہو جاوے اس لئے اس میں اس قدر تعمیم ہے کہ اگر زبان سے نہ ہوسکے تو قلب سے ہو اور ایک دفعہ زبان و قلب سے ہو جانے کے بعد اگر غفلت کی وجہ سے

قلب میں دوام استحضار نہ ہو تو مضر نہیں بلکہ ایک دفعہ کا استحضار بھی کافی ہے۔ ہاں شرط یہ ہے کہ اس کی ضد کا استحضار نہ ہو۔ چنانچہ کوئی شخص ایک مرتبہ ایمان کا اعتقاد کر کے سو گیا یا کسی دوسرے شغل میں منہمک ہو گیا تو ظاہر ہے اس وقت اس کو ایمان کا استحضار نہیں، کیونکہ قاعدہ ہے اَلنَّفْسُ لَاتَتَوَجَّهُ اِلٰى شَيْئَيْنِ فِىْ اٰنٍ وَّاحِدَةٍ عَادَةً (نفس آن واحد میں عادۃً دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا) اور عادۃً کی قید اس لئے لگائی کہ نفس کی توجہ آن واحد میں دو چیزوں کی طرف ہونے میں کوئی امتناع عقلی ثابت نہیں ہے بلکہ عقلاً ایسا ممکن ہے۔ یہ اور بات ہے کہ توجہ تام نہ ہو غیر تام ہو مگر توجہ دو طرف ہو سکتی ہے گو عادۃً ایسا کم ہوتا ہے اس لئے یہ قید بڑھائی۔ تو سو جانے کے بعد یا کسی اور ایسے کام میں مشغول ہو جانے کے بعد جس میں انہماک کی ضرورت ہو کہ اس کو انجام دیتے ہوئے اور کوئی بات ذہن میں نہ رہ سکتی ہو ایمان سے بجائے استحضار کے ذہول محض ہو جاتا ہے مگر یہ ذہول حکم بالایمان میں مضر نہیں تو حق تعالیٰ کی کیا رحمت ہے کہ ایمان کے استحضار دوامی کو فرض نہیں کیا، ورنہ اگر استحضار دوامًا فرض ہوتا تو نہ سونا جائز ہوتا، اور نہ کوئی ایسا کام کرنا جائز ہوتا جس میں شدید انہماک ہو اس لئے اس میں اس قدر وسعت کر دی کہ اگر کسی وقت کسی عذر کی وجہ سے تصدیق باللسان بھی نہ ہو سکے تو تصدیق بالجنان بھی کافی ہے اور اگر تصدیق بالجنان ایک دفعہ کر کے پھر ذہول ہو گیا تو یہ بھی کافی ہے کہ ضد تصدیق کا یعنی تکذیب کا استحضار نہ ہو بس یہ عدم استحضار ضد ہی استحضار ایمان سمجھا جائے گا، حالانکہ ان کی شان عظمت کا تو یہ حق تھا کہ ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی — شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

(ایک پلک مارنے کی مقدار اس محبوب حقیقی غافل مت ہو شاید وہ توجہ کرے اور تو آگاہ نہ ہو)

کیونکہ جتنے تعلقات یا کمالات موجب یادداشت ہو سکتے ہیں وہ سب یہاں بدرجہ اتم واکمل موجود ہیں مثلاً انعام و احسان، حسن و جمال، فضل و کمال، علم و غنا، جود و سخا و عدل و قدرت قہر وغیرہ یہ تمام اوصاف کمال علی وجہ الکمال حق تعالیٰ میں پائے

جاتے ہیں جب تمام اسباب موجب ذکران میں موجود ہیں تو عقل اس کو مقتضی ہے کہ ذکر بھی ہر وقت ہونا چاہیئے کیونکہ جب کمالات احسانات میں کسی آن انقطاع نہیں تو ذکرو توجہ میں انقطاع کیوں ہو اس میں بھی کسی آن انقطاع نہ ہونا چاہیئے یہاں ایک مسئلہ استطراداً بیان کئے دیتا ہوں وہ یہ کہ آجکل ہر بات میں عقل پرستی کا زور ہے ہر معاملہ میں اسی کو فیصلہ کے لئے حکم بنایا جاتا ہے حتیٰ کہ شرعیات میں بھی اور شرعیات سے معاد میں بھی۔ اور پھر عقل بھی کونسی وہ جو دنیا کے معاملات میں بھی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے تعجب ہے اس کو حکم بنایا گیا ہے ایسے عظیم فیصلہ کے واسطے۔ اور تمنا کی جاتی ہے کہ اگر عقل کے موافق احکام ہوتے تو خوب ہوتا لیکن میں دعوے سے کہتا ہوں کہ بڑی مصیبت ہوتی کیونکہ اگر غور کر کے دیکھا جاوے تو عقل ہماری اتنی خیر خواہ نہیں ہے جتنی شریعت خیرخواہ ہے دیکھئے اسی مقام پر عقل کا فتویٰ تو یہ ہے کہ استحضار تصدیق دوامً ضروری ہو ایک ساعت بھی غفلت جائز نہ ہو جیسا ایک بزرگ غلبہ میں کہتے ہیں ؂

ہر آں کہ غافل از حق یک زمان ست ۔ در آندم کافر اماں نہان است

(جو شخص اللہ تعالیٰ سے تھوڑے زمانہ میں بھی غافل ہے اس وقت مومن کامل نہیں ہے)

یہاں کافر سے کافر اصطلاحی مراد ہے یعنی مومن کامل کے مقابل اور کامل بھی کیسا جو اکملیت کے درجہ پر پہنچا ہوا ہو۔ کیونکہ کمال کے بھی درجات مختلف ہیں ایک درجہ کامل کا ہے اور ایک اکمل کا۔ اور پھر اکملیت کے بھی مختلف درجے ہیں خلاصہ یہ ہے کہ جو حق تعالیٰ کو ہر وقت یاد رکھے وہ مومن اکمل ہے اس کے مقابلہ میں جو شخص یاد میں غفلت کرے اُسے اضافۃً کافر کہدیا ہے اس سے حقیقی و فقہی کافر مراد نہیں غرض غلبہ حال کا جو اقتضا ہے کہ استحضار دواماً ہو عقل کا بھی وہی اقتضا ہے تو اگر شریعت مقدسہ نہ ہوتی اور محض عقل ہی حاکم ہوتی تو وہ تو سب کو عاصی قرار دیتی شریعت مقدسہ نے یہ رحمت فرمائی کہ آپ کو ذہول کی اجازت دے دی اور عدم تصدیق کو بھی

جب کہ تکذیب نہ ہو تصدیق کا قائم مقام کردیا۔ اب بتلایئے عقل زیادہ خیر خواہ ہوئی یا شریعت مقدسہ یہ تو ان عقل پرستوں کو خطاب تھا جن پر سائنس کا غلبہ ہے۔ اور عقل کو شرع پر ترجیح دیتے ہیں اسی طرح ایک اور جماعت ہے جو حقیقت کو شریعت پر ترجیح دیتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ شریعت اور ہے حقیقت اور ہے میں ان کو بھی بتلانا چاہتا ہوں کہ جس شریعت کی وہ جڑیں اکھاڑتے ہیں وہی ان کی خیر خواہ ہے چنانچہ دیکھ لیجئے کہ اگر حقیقت محضہ کو حکم بنایا جاوے تو زندگی تلخ اور زیست وبال اور حرام ہو جائے مثلاً آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ چیز میری ہے اور یہ زید کی اگر حقیقت کے اعتبار سے دیکھئے تو نہ آپ کی ہے نہ زید کی کیونکہ ؂

فی الحقیقت مالک ہر شئے خداست　　　ایں امانت چند روزہ نزد ماست

(حقیقت میں مالک ہر شے کے خدا ہیں یہ امانت چند دن کے لئے ہمارے پاس ہے)

زید و عمرو کی طرف محض مجازی نسبت ہے، مگر شریعت کے قربان جایئے کہ اس نے اس ملک مجازی کے ساتھ بھی معاملہ حقیقت کا سا کیا ہے اور اس کا بھی پورا اعتبار کیا ہے نہ کسی کی چیز غصب کرنا جائز۔ نہ بے اجازت استعمال کرنا جائز اور اگر حقیقت سے پوچھئے تو ہر چیز کا وہ حال ہوتا۔ جیسے مسجد کے لوٹے اور فرش جن کا کوئی مالک ہی نہیں نہ آپ نہ میں بلکہ ہر شخص کو ان کے استعمال کا حق ہے۔ گو یہ جائز نہ ہو کہ آپ اٹھا کر گھر میں رکھ لیں لیکن استعمال کا حق تو سب کو ہے۔ اسی طرح جو کپڑے آپ نے گٹھڑی میں باندھ کر گھر میں رکھے ہیں ان کا بھی یہی حال ہوتا کہ چونکہ وہ بھی آپ کے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے ہیں۔ اور خدا کی چیز میں ہر شخص کا حق مساوی ہے سو آپ نے جو انھیں باندھ کر گھر میں رکھا ہے اگر حقیقت ہی حکمراں ہوتی تو یہ آپ کا فعل کیسے جائز ہوتا اور اگر پھر بھی آپ ایسے ہی حقیقت پرست ہیں تو کوئی شخص آپ کی اچکن آپ کے بدن پر سے اتارنے لگے کہ اتنے دن تک آپ پہنے رہے اب میں پہنوں گا۔ تو آپ اُسے منع نہ کیجئے۔ واقعی اگر شریعت نہ ہوتی تو

دنیا میں لوٹ اور غارت کا بازار گرم ہو جاتا اور امن و چین رخصت ہو جاتا۔ مولانا رومی نے ایک ایسے ہی حقیقت پرست جبری کی حکایت لکھی ہے کہ وہ کسی کے باغ میں گھس گیا اور جا کے درختوں کے پھل توڑ توڑ کے کھانا شروع کر دیئے۔ مالک کو خبر ہوئی اسے منع کیا تو آپ کہتے ہیں کہ باغ بھی خدا کا اور درخت بھی خدا کا اور پھل بھی خدا کا اور میں بھی خدا کا۔ غرض آکل بھی خدا کا اور ماکول بھی خدا کا تو ہے کون منع کرنے والا او تیرا اس میں ہی کیا۔ مالک تھا حکیم اس نے نوکر سے ڈنڈا اور رسّا منگایا اور باندھ کے مارنا شروع کر دیا اب تو لگا غل مچانے۔ اس نے کہا کہ ڈنڈا بھی خدا کا اور رسّا بھی خدا کا تو بھی خدا کا میں بھی خدا کا غرض ضارب بھی خدا کا اور مضروب بھی خدا کا پھر تو کیوں غل مچاتا ہے پس پھر کیا تھا ؎

گفت توبہ کردم از جبر اے عیار　　　اختیار ست اختیار ست اختیار

(میں جبر سے توبہ کی اختیار ہے اختیار ہے اختیار)

ہوش درست ہو گئے۔ یہیں سے توحید وجودی خالی از شریعت کے اثر کا مسئلہ حل ہوتا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

سر پنہان ست اندر زیر و بم　　　فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

(یعنی عشاق اپنے کلمات عشقیہ کو اجمالاً کہہ رہے ہیں میں اگر اس کے راز کو اور حقیقت کو ظاہر اور مفصل کہہ دوں تو عالم تباہ ہوجائے)

اس کی تفسیر میں نے حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ سے پہ سنی ہے کہ سر پنہاں سے مراد توحید وجودی ہے مگر وہ نہیں جو ملحدین کی ہے بلکہ توحید وجودی حقیقی جو محققین کی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ چونکہ افہام صحیح نہیں ہے اس لئے میں اُسے اگر صاف بیان کر دوں تو اس کو غلط سمجھ کر لوگ عالم میں فساد مچا دیں۔ یہ نہیں کہ توحید وجودی کا مسئلہ مضر ہے بلکہ افہام ٹھیک نہیں ہیں ان میں اس کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے اس لئے اندیشہ ہے کہ اس کے اظہار سے ایک طوفان بے تمیزی عالم میں مچ جائے جس کو ابھی اوپر بیان کیا گیا ہے یہی معنے ہیں جہاں برہم زنم کے بطور اسناد الی السبب کے تو یہ شریعت کی رحمت ہے کہ اس نے ملک مجازی کے ساتھ بھی معاملہ ملک حقیقی کا

کا سا کیا ہے کہ مثلاً میراث کے ذریعہ سے جو چیز کسی کے پاس آوے وہ اس کی ملک ہے یا بیع کے یا ہبہ کے ذریعہ سے اس کے پاس آوے وہ بھی ملک ہے۔ رہے مباحات عامہ وہ کسی کی ملک نہیں مگر قبضہ کرنے کے بعد وہ بھی قابض کی ملک ہیں۔ مثلاً پانی یا خود رو گھاس یا جنگل کا جانور شکار اور مچھلیاں ان پر جو اول قبضہ کرے اسی کی ملک ہے۔ دیکھئے شریعت کی بدولت کس قدر انتظام درست ہے اگر یہ نہ ہو تو تمدن ہی درست نہ ہو۔ ایک غدر مچ جاوے اور ہر وقت وہ کیفیت رہے جیسے ڈاکہ پڑا کرتا ہے کہ آپ نے مجھ سے چھین لیا اور آپ سے اس نے چھین لیا غرض ہر وقت جنگ کا سامنا رہتا۔ اب بتلائیے حقیقت ہم پر زیادہ شفیق ہے یا شریعت مقدسہ خوب سمجھ لیجئے حق تعالیٰ کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ دنیا میں عقل پرست اور حقیقت پرست دونوں گروہ پیدا ہوں گے اور دونوں کے مقتضا پر عمل کرنے سے یہ تنگی ہوگی اس لئے شریعت کو نازل فرمایا جس نے ہر قسم کی تنگی کو دور کر دیا۔ اسی احسان کا اعلان فرماتے ہیں۔ يُرِيدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں اور تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی) کتنے بڑے دعوے کے لفظ ہیں۔ حضرت یہ دعوے آسان نہیں ہے۔ کیونکہ ہر جگہ ہر طبیعت کے لوگ موجود ہیں اور ہر زمانہ میں ہوتے آئے ہیں۔ اگر اس دعوے میں کچھ بھی خامی ہوتی تو اس شد و مد سے تاکید کے ساتھ نہ فرماتے۔ شاید اس مقام پر کسی کو شبہ ہو کہ ہم تو دین میں تنگی کا کھلا مشاہدہ کرتے ہیں۔ کیونکہ جو شخص شریعت پر عمل کرتا ہے اس کے ہر کام میں روڑے اٹکتے ہیں ہم اپنے معاملات کے لئے چند مسئلے پوچھنے گئے تھے تو مولانا نے جو جواب دیئے کہ فلاں کام جائز ہے اور فلاں ناجائز تو ان میں زیادہ جواب یہی ملا تھا کہ ناجائز ہے چنانچہ ہم قرض لیتے ہیں مگر سود کے بغیر نہیں ملتا اور بغیر قرض کے کام نہیں چلتا۔ اور شریعت سود کو حرام بتلاتی ہے۔ اب اس موقع پر عقل پرست تو یہ کہیگا کہ دین میں سخت حرج ہے بلکہ آجکل تو عقل پرستوں کا اجماع ہے کہ ساری خرابی شریعت ہی کی بدولت ہے۔ چنانچہ لکھنؤ کا ایک قصہ یاد آیا، ایک صاحب

میرے پاس روزانہ آتے تھے۔ وہ ایک روز ذرا دیر میں آئے میں نے تاخیر کا سبب پوچھا کہا کہ ایک جلسہ کی شرکت کی وجہ سے دیر ہوگئی جس میں مسلمانوں کے اسباب تنزل پر غور کیا جارہا تھا۔ میں نے پوچھا آخر کیا طے ہوا' انھوں نے کہا اخیر یہ طے ہوا تھا کہ نعوذ باللہ مسلمانوں کے تنزل کا سبب اسلام ہے۔ وجہ یہ کہ ہم ہر جگہ دیکھتے ہیں کہ اسلام کی وجہ سے ہر کام میں رکاوٹ ہے۔ چنانچہ جس نوکری کے فرائض بیان کر کے مسئلہ پوچھتے ہیں تو فتویٰ عدم جواز کا ملتا ہے۔ تجارت کے طریقوں کے متعلق پوچھنے پر کسی کو قمار بتایا جاتا ہے' کسی کو ربوا۔ جب ہر قدم پر لَا یُجَوَّزُ (جائز نہیں ہے) کا فتویٰ ہے تو اب بجز اس کے کہ بیکار بیٹھ رہیں اور کیا کریں۔ اب شبہ یہ ہے کہ جب ہر ہر قدم پر تنگی اور حرج ہے تو پھر قرآن میں حرج کی نفی کیسے کی گئی اب اس شبہ کا جواب سنئے کہ خدا تعالیٰ کو اس زمانہ کا بھی علم تھا اور باوجود اس کے پھر جو فرماتے ہیں وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (اور تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی) سو کوئی تو بات ہے جس پر اتنا بڑا دعوےٰ کیا گیا ہے' ورنہ نزول قرآن کے زمانہ سے آج تک کسی نے اس نفی پر کیوں نہ اعتراض کیا حالانکہ ہر زمانہ میں مخالفین بکثرت رہے ہیں۔ پھر نفی بھی معمولی نہیں۔ نکرہ ہے تحت میں نفی کے جس کے معنے یہ کہ ذرا سی اور چھوٹی سے چھوٹی تنگی بھی نہیں ہے۔ سو اُس کی حقیقت یہ ہے کہ آپ کو جو یہ پہاڑ کی برابر تنگی نظر آرہی ہے یہ تنگی واقع میں آپ میں ہے شریعت میں نہیں' جیسا مولانا فرماتے ہیں ؎

حملہ بر خود میکنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

(اے احمق اپنے ہی اوپر حملہ کرتا ہے جیسا کہ اس شیر نے اپنے اوپر حملہ کیا تھا)

حقیقت میں تنگی اُدھر سے ہے۔ اِدھر سے نہیں ہے۔ معترض نے تنگی کا محل نہیں دیکھا۔ اپنی تنگی کو شریعت کی تنگی سمجھ گیا۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ہماری بستی میں ایک واقعہ ہوا کہ ایک عورت بچہ کو پاخانہ پھرا رہی تھی۔ چاند دیکھنے کا وقت تھا۔ سب چاند دیکھنے لگے' وہ بھی چیتھڑے سے پاخانہ صاف کر کے چاند دیکھنے

کھڑی ہوئی۔ اتفاق سے کچھ پاخانہ اس کی انگلی میں لگا رہ گیا تھا۔ عورتوں کی عادت کے موافق ناک میں انگلی رکھی تو انگلی میں سے بو آئی۔ کہنے لگی اے ہے آج سڑا ہوا چاند کیوں نکلا۔ اب تمام عقلاء سمجھتے ہیں کہ چاند سڑا ہوا نہ تھا اس کی انگلی سڑی ہوئی تھی اور یہ اس کی حماقت تھی جو اسے اپنی انگلی کی گندگی کی خبر نہ ہوئی اور چاند کو سڑا ہوا کہنے لگی اسی طرح تنگی ہمارے اندر ہے شریعت میں نہیں ہے۔ اس کی ایک اور مثال لیجئے۔ ایک طبیب حاذق کے پاس ایک مریض گیا کسی کوردہ کا رہنے والا۔ جہاں نہ دوا ملتی ہے نہ پرہیزی غذا ملتی ہے تخم کاسنی اسطوخودوس بھی دستیاب نہیں ہوتا اب حکیم صاحب نے اُسے نسخہ لکھدیا۔ اس نے کہا حکیم صاحب کیا کھائیں۔ حکیم۔ بکری کا گوشت" مریض۔ یہ تو ہمارے یہاں نہیں ملتا" حکیم۔ اچھا تری کا سالن" مریض۔ یہ بھی نہیں ملتا حکیم اچھا کدو پالک کا ساگ۔ مریض یہ اجی یہ کچھ بھی نہیں ملتا۔ حکیم آخر پھر کیا ملتا ہے۔ مریض۔ کریلے ملتے ہیں۔ حکیم دیکھو کریلے نہ کھانا مریض بیگن ملتے ہیں۔ حکیم بیگن بھی نہ کھانا۔ اس نے کھا ارے صاحب اس کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں۔ اب یہ مریض صاحب بہت تنگ دل ہو کے اور ناک منہ چڑھا کے آئے اور لوگوں سے کہنے لگے کہ طب یونانی بہت تنگ ہے۔ حکیم صاحب سے جو کچھ بھی پوچھو اس کے کھانے کو منع کرتے ہیں۔ اہل عقل سمجھ سکتے ہیں کہ حکیم صاحب کا مطب تنگ ہے یا اس دیہاتی کا گاؤں تنگ ہے۔ اب سمجھئے کہ شریعت کی تنگی تو جب ثابت ہوتی کہ سب لوگ مل کر شریعت پر عمل کرتے پھر بھی نہ ہو سکتا بتلایئے یہ تنگی ہے کہ وسعت ہے۔ یقیناً اس کو کوئی تنگی نہیں کہہ سکتا۔ مثلاً بیع ہے کہ بعت واشتریت سے ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس کے کہے بغیر بھی ہو جاتی ہے جسے بیع تعاطی کہتے ہیں۔ تنگی تو جب ہوتی کہ ایسا ہوتا کہ جب تک ایک ہزار مرتبہ بائع بعت اور مشتری اشتریت نہ کہے اس وقت تک بیع نہ ہوگی۔ ریل پر بیٹھے ہیں سودا لیا ہے اس وظیفہ کے پورا ہونے تک ریل ٹھہرتی نہیں۔ تب واقعی مشکل ہوتی۔ اب کیا مشکل ہے۔ اور جس جگہ آپ کو اشکال نظر آتا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ آپ تنہا

شریعت کے موافق معاملہ کرنا چاہتے ہیں اور دوسرا شخص اس کی پروا نہیں کرتا۔ تو اس طرح تو ہر قانون تنگ ہو جائے گا۔ آپ کوئی قانون شریعت کا ایسا بتلا دیجئے کہ سب مل کر اس پر عمل کرنا چاہیں اور نہ ہو سکے۔ اس لئے نہایت قوت کے ساتھ فرماتے ہیں مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (اور تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی) بہرحال اتنا بڑا دعوےٰ عقل پرستی کے زمانہ میں اگر واقعی دین میں سہولت نہ ہوتی۔ تو ہو نہیں سکتا تھا۔ بحمداللہ شبہ کا جواب ہوگیا۔ اس سے پہلے یہ بیان ہورہا تھا کہ شریعت کی سہولت و رعایت اس قدر ہے کہ عدم اعتقاد ضد کو قائم مقام کردیا۔ اعتقاد توحید کا یہ تو شریعت کی شفقت ہے۔ اور عقل کا فتوےٰ یہ ہے کہ ہم اعتقاد توحید کا دواماً استحضار رکھیں۔ تو زیادہ خیر خواہ کون ہوا عقل کے ان ہی آثار کو دیکھ کر تو مولانا فرماتے ہیں ؎

آزمودم عقل دور اندیش را ۔۔۔ بعد ازاں دیوانہ سازم خویش را

(عقل دوراندیش کو بارہا آزمالیا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے آپ کو دیوانہ بنالیا)

اس کے یہ معنے نہیں کہ عقل کو پھینک ہی دیں کہ محض بیکار ہے۔ نہیں وہ بہت کارآمد ہے مگر ایک حد کے اندر اندر۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص پہاڑ پر چڑھنا چاہتا ہے اور اس پر اتنی چھوٹی اور ایسی اونچی سیڑھیاں ہیں کہ ان پر گھوڑا نہیں چڑھ سکتا ہاں دامن کوہ تک پہونچا سکتا ہے تو کیا پہاڑ پر کارآمد نہ ہونے سے گھوڑا بالکل بیکار ہوگیا۔ ہرگز نہیں کیونکہ دامن کوہ تک بھی بہت مسافت ہے جس میں گھوڑے سے مدد ملتی ہے۔ بس یہی حال عقل کا ہے کہ توحید و رسالت اور اصول اسلام کے سمجھنے میں بہت کارآمد ہے۔ اصول کو تو عقل سے سمجھ لیجئے، اس کے بعد اس کو بالکل چھوڑ دیجئے۔ ورنہ گھوڑے کی طرح گر رہے گی اور خوامخواہ آپ کی بھی ہڈیاں پسلیاں توڑے گی۔ جب خدا کا خدا ہونا۔ اور

رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا برحق اور مطاع ہونا عقل سے ثابت ہوگیا۔ بس اب اسے چھوڑ دیجئے۔ اور آگے عشق و محبت سے کام لیجئے اور اس طرح سے اپنے آپ کو سپرد کر دیجئے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں تو آپ پر فدا ہیں۔ جان آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں آپ سے راضی ہیں)

یعنی جب توحید و رسالت کو سمجھ لیا تو اس کے بعد اب ضرورت اس کی ہے کہ جو ارشاد ہو آمنا وصدقنا۔ نہ یہ کہ خوامخواہ اس میں شبہات پیدا کریں کہ صاحب پلصراط پر چلنا عقل کے خلاف ہے، عذاب قبر عقل کے خلاف ہے۔ جب مُردہ میں جان ہی نہیں ہے تو عذاب کس پر۔ اور اگر کہو جسم پر عذاب ہے تو ہم جسم کو بھی فنا کر دیں گے اور ہم نہ کریں تو چار دن میں وہ خود ہی فنا ہو جائے گا۔ پھر عذاب کیسے ہوگا جیسے کسی افیونی کی ناک پر مکھی بار بار بیٹھتی تھی اور وہ بار بار اڑا دیتا تھا آخرکار جھنجلا کے ناک ہی کاٹ ڈالی کہ لے اب اڑا ہی نہیں رہا۔ اب کہاں بیٹھے گی۔ اسی طرح جب وہاں قبر میں مردہ ہی گل سڑ کے ختم ہوگیا تو اب عذاب کس پر ہوگا۔ صاحبو ہمارے پاس جواب ہر شبہ کا ہے۔ بحمد اللہ علماء جواب سے قاصر نہیں ہیں مگر یہ غور کرو کہ آیا ان شبہات کا جواب دینا علماء کا فرض منصبی ہے بھی یا نہیں۔ اس کو بھی ایک مثال سے سمجھئے۔

آپ کا ایک مقدمہ ہے کسی جج کے اجلاس پر اس نے آپ کا مقدمہ ہرا دیا۔ اور دفعہ کا حوالہ بھی دے دیا۔ اب آپ جج کے پاس جاویں کہ صاحب فیصلہ تو قانون کے موافق ہے، مگر خود قانون میں سقم عقلی ہے اس لئے مجھے اس میں کلام ہے۔ تو جج کیا کرے گا وہ کہے گا کہ ہم اور کچھ نہیں جانتے بس جو قانون ہے ہم اسی کے پابند ہیں، اور تمام عقلاء جج کے اس

جواب کو معقول اور صحیح کہیں گے اور اس دفعہ پر جو اس شخص کے اعتراضات ہیں ان کا جواب دینا جج کے ذمہ نہ سمجھیں گے۔ تو تعجب کی بات ہے کہ جج کا یہ کہنا تو کافی سمجھا جائے گا اور علماء کا یہ کہنا کہ حکمِ الٰہی یہی ہے کافی نہ سمجھا جائے کیونکہ جس طرح حاکم بالقانون ہے واضع قانون نہیں ہے اسی طرح علماء بھی عالم بالقانون ہیں واضع قانون نہیں ہیں ان کے ذمہ قانون کا بتلا دینا ہے۔ لم اور وجہ کا بتلانا نہیں ہے گو وہ احکام کی لمیات کو بکثرت جانتے ہیں۔ لیکن جاننے کے بعد بتلا دینا اُن پر ضروری نہیں۔ بلکہ سوال عن العلل۔ (علتوں سے سوال) کے جواب میں ان کا یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز

ورنہ در مجلسِ رنداں خبرے نیست کہ نیست

(افشاء کرنا راز کا مصلحت نہیں ورنہ علماء کی مجلس کوئی خبر ایسی نہیں کہ نہ ہو)

پس علماء پر ضروری نہیں ہے اسرار کا ظاہر کرنا بلکہ صوفیہ کرام جو زیادہ غیور ہیں وہ تو اظہار کی ممانعت کرتے ہیں اور یہاں تک کہتے ہیں ؎

با مدعی گوئید اسرارِ عشق و مستی بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(مدعی اسرارِ عشق و مستی مت بیان کر اس کو تکبر و خود پرستی میں مرنے دو)

دیکھئے صوفیہ تو اظہار اسرار سے بالکل منع ہی کرتے ہیں اور علماء بیچارے تو کبھی کبھی بتا بھی دیتے ہیں مگر حیرت ہے کہ صوفیہ پر کچھ اعتراض نہیں کیا جاتا جو کچھ کمبختی ہے علماء ہی کی ہے کہ ان کی تو نماز بھی ناجائز اور صوفیہ کی گالیاں بھی جائز۔ بس جی اب تو علماء بھی صوفیہ بنیں تو کچھ کام چلے۔ مگر خدا کے لئے دوکان دار صوفی نہ بنیں بلکہ سچ مچ کے صوفی بنیں۔ تو جب علماء کا یہ اظہار علل فرض منصبی نہیں تو وہ کیوں ظاہر کریں بلکہ صرف ضابطہ کا جواب دے کر بات کو ختم کر دیں۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے درس میں ایک طالب علم تھے غبی۔ انھوں نے پوچھا کہ حضرت ایام حیض کے روزہ کی تو قضا ہے اور نماز کی

قضا نہیں ہے اس کی کیا وجہ ہے فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس کے خلاف کروگے تو اتنی جوتیاں لگیں گی کہ سر میں ایک بال نہ رہے گا۔ مولانا حکیم تھے۔ اسی باب میں ان کا ایک شعر ہے ؎

اَلْوَعْظُ یَنْفَعُ لَوْ بِالْعِلْمِ وَالْحِکَمِ وَالسَّیْفُ اَبْلَغُ وُعَّاظٌ عَلَی الْقِمَمِ

(نصیحت اگر علم و حکمت کے ساتھ ہو تو نفع پہنچاتی ہے اور تلوار سروں پر پڑنی نصیحت گروں میں سے سب سے بلیغ نصیحت گر ہے)

تو ضرورت ضابطہ کے جواب کی بھی ہے تاکہ لوگوں کو اپنی غلطی پر تنبیہ ہوتا رہے بہرحال ایمان لانے کے بعد ضرورت نہیں لم و کیف کی۔ بلکہ وہ مسلک رکھنا چاہیئے جیسا عارف گنجوری فرماتے ہیں ؎

زباں تازہ کردن باقرار تو نینگیختن علت از کارِ تو

(آپ کی ربوبیت کا اقرار کرنا آپ کے کاموں میں علتیں نکالنے کو مانع ہے)

غور سے سننے کی بات ہے کہ اگر کسی کو تعشق ہوجاوے کسی مردار کے ساتھ یا کسی بڑے مرد کے ساتھ یعنی امرد کے ساتھ کہ جس میں افعل التفضیل کا ہمزہ بھی لگا ہوا ہے۔ یا کسی بازاری عورت کے ساتھ اور وہ کہتی ہو کہ میں اس وقت ملوں گی کہ تم پہلے کرتہ ٹوپی اتار کے سات دفعہ بازار کے بیچ سے ننگے طواف کرتے ہوئے نکل جاؤ۔ اگر یہ واقعی محب ہے تو کبھی یہ نہیں پوچھے گا کہ مجھے اس طرح رسوا کرانے میں تیرا کیا نفع۔ بلکہ کہے گا کہ بہت اچھا اور پاجامہ بھی اتارنے کو تیار ہوجائے گا اور اگر کوئی ملامت بھی کرے گا تو اسے یہ جواب دے گا ؎

نہ سازد عشق را گنج سلامت خوشا رسوائی کوئے ملامت

(عشق کا گوشہ سلامتی کے موافق نہیں اس کے مناسب کوچۂ ملامت کی رسوائی بہت اچھی ہے)

اسی طرح وہ اگر پچاس چپت بھی لگا دے تو برا نہ مانے گا۔ بلکہ اگر قتل بھی کرے تو راضی رہے گا اور یہ کہے گا ؎

ناخوش تو خوش بود برجان من　　دل فدائے یار دل رنجان من

(تیرا ناخوش ہونا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے ایسے محبوب پر دل قربان ہے جو میرے دل کو رنجیدہ کرنے والا ہے)

تنویر میں ابن عطار نے ایک حکایت لکھی ہے کہ کوئی شخص کسی پر عاشق ہوا تھا اتفاق سے وہ پکڑا گیا اور اس کو سو کوڑوں کی سزا دی گئی۔ جب کوڑے مارے جارہے تھے تو وہ بالکل خاموش تھا یہاں تک کہ ننانوے کوڑے لگ چکے جب سواں کوڑا مارا گیا تو آہ کی۔ کسی نے پوچھا یہ کیا کہ ننانوے کا تو تحمل کر لیا اور ایک کا تحمل نہ کر سکا۔ کہا ننانوے تک محبوب دیکھ رہا تھا، اور جب سواں لگا تو وہ چلا گیا تھا ؎

بجرمِ عشق توام میکشند غوغائیست　　تو نیز برسر بام آکہ خوش تماشائیست

(تیری محبت کے جرم میں قتل کرتے ہیں اور اسی کا شوروغل ہے تو بھی بام پر آجا اچھا تماشائی تو بھی ہے)

محبوب کے سامنے تکلیف میں بھی مزہ ہے۔ یہی وہ مراقبہ ہے جس کی تعلیم حق تعالٰے نے اپنے محبوب کو دی ہے فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا۔ یعنی آپ صبر کیجئے (مخالفین کی باتوں پر اور یہ صبر اس لئے آسان ہو سکتا ہے کہ) آپ کی آنکھوں کے سامنے ہیں جو کچھ ہو رہا ہے ہمارے دیکھتے ہوئے ہو رہا ہے۔ تو کشتن کی تکلیف تو ہے مگر تو نیز برسرم بام آ کی راحت بھی ہے جس سے یہ کلفت سہل ہو جاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ معشوق کی امر و نہی بھی ناگوار نہیں ہوتی اس کی مار کوٹ بھی ناگوار نہیں ہوتی، یہ جو احکام تشریعیہ ہیں یہ تو محبوب کے اوامر و نواہی ہیں اور احکام تکوینیہ محبوب کی مار کوٹ ہے کہ آج بیمار ہیں۔ آج زخم ہے آج ذلیل ہے۔ اور جو اُن کا واقعی عاشق ہے اس کا ان دونوں میں یہ مسلک ہے ؎

خوشا وقت شوریدگانِ غمش　　کہ گر ریش بینند و گر مرہمش

گدایان از بادشاہی نفور　　بامیدش اندر گدائی صبور

(اس کے غم کے پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے اگر زخم دیکھتے ہیں اور اگر اس پر

ے تو بھی بام پر آ۔

مرہم رکھتے ہیں ایسے فقیر کہ بادشاہی سے نفرت کرنے والے اس کی امید پر فقیری میں قناعت کرنے والے ہیں)

؎ دمادم شراب الم درکشند وگر تلخ بینند دم درکشند

(ہردم رنج کی شراب پیتے ہیں اور جب اس میں رنج کی کڑواہٹ دیکھتے ہیں تو خاموش ہو رہتے ہیں)

تو بس بعد تحقیق اصول کے کہ وہ عقلی ہیں ایسی چیز کی ضرورت ہے جو آگے پہاڑ پر چڑھانے والی ہو۔ تو معلوم ہوگیا کہ عقل کی عملداری کہاں تک ہے اور عشق کی کہاں سے۔ اب لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جہاں ہوائی جہاز کی ضرورت ہے وہاں گھوڑے کو لے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ گھوڑے کو ماریں گے اور اپنی بھی ہڈی توڑیں گے اسی لئے تو کہتے ہیں ؎

آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازاں دیوانہ سازم خویش را

(عقل دور اندیش کو بارہا آزمالیا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے آپ کو دیوانہ بنالیا)

اب تو آپ کو عقل کی حد معلوم ہوگئی کہ یہ بیکار تو نہیں ہے مگر ایک خاص حد تک کارآمد ہوسکتی ہے اس سے آگے نہیں۔ اب یہ بھی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ عقل شریعت سے زیادہ شفیق نہیں ہے جیسا کہ اوپر اس کی دلیل بھی مذکور ہوئی ہے اور پھر مع شئے زائد ذکر کرتا ہوں کہ عقل کا مقتضا تو یہ تھا کہ کسی وقت بھی ذکر و توجہ سے غافل نہ ہو مگر شریعت مقدسہ نے عدم توجہ کی بھی اجازت دیدی ہے۔ پھر اجازت بھی مطلق نہیں بلکہ اس کا بھی بڑا درجہ۔ کیونکہ اجازت کے دو مرتبے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یوں کہا جائے کہ یہ حالت بے توجہی معصیت نہیں گو ناقص ہے۔ سو شریعت نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اس پر رنج کرنے سے بھی ممانعت فرمادی ہے۔ حالانکہ یہ شخص اکمل کے مقابلہ میں ناقص ہے مگر خود اسے ناقص سمجھنے کی بھی اجازت نہیں ہے یہ اجازت کا دوسرا مرتبہ ہے کہ معصیت کی

نفی کرکے اپنے کو ناقص سمجھنے سے بھی منع کردیا۔

چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ حضرت حنظلہ کی ملاقات ہوئی حضرت صدیق اکبرؓ سے، انھوں نے پوچھا اے حنظلہ کیسے ہو، جواب دیا نَافَقَ حَنْظَلَۃُ حَنْظَلَۃُ (یعنی میں) تو منافق ہوگیا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے پوچھا یہ کیسے۔ فرمایا کہ جب ہم حاضر ہوتے ہیں دربار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تو یہ حالت ہوتی ہے کہ گویا جنت و دوزخ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور جب وہاں سے آتے ہیں بال بچوں میں مشغول ہوکر سب بھول جاتے ہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے فرمایا اگر یہ نفاق ہے تو پھر میں بھی منافق ہوں۔ کیونکہ میں بھی اس میں مبتلا ہوں۔ آؤ چلو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس کا علاج پوچھیں۔ چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور سب حال بیان کیا، آپؐ نے فرمایا یاد رکھو لَوْ کُنْتُمْ کَمَا تَکُوْنُوْنَ عِنْدِیْ لَصَافَحَتْکُمُ الْمَلٰئِکَۃُ وَلٰکِنْ یَا حَنْظَلَۃُ سَاعَۃً (یعنی اگر ایسا نہ ہوتا بلکہ تمہاری ہر وقت وہی حالت رہتی جو میرے سامنے ہوتی ہے تو تم سے ملائکہ مصافحہ کیا کرتے مگر اے حنظلہ ایک ساعت کیسی اور ایک ساعت کیسی) اس حدیث کے سمجھنے میں علماء قشر پریشان ہوگئے اول تو ان کو نَافَقَ حَنْظَلَۃُ (حنظلہ منافق ہوگیا) پر اشکال ہوا کہ محض تفاوت حالت کو انھوں نے نفاق کیسے کہدیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب پر انھیں شبہ ہوا کہ اس جواب سے حضرت حنظلہ کا اشکال کیونکر حل ہوا۔ اس جواب کی شرح صوفیہ سمجھے اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ مقصود تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا حضرت حنظلہ کی تسلی کرنا ہے۔ مگر سوال یہ ہے اس جواب سے تسلی کیسے ہوگئی۔ اول تو یہ سمجھئے کہ یہاں نفاق سے

حقیقی نفاق مراد نہیں۔ کیونکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ و حضرت حنظلہ ضرور یہ بات جانتے تھے کہ نفاق نام ہے ابطان الکفر و اظہار الایمان کا۔ اور جب ہم جانتے ہیں تو کیا وہ نہیں جانتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ اس حالت میں ابطان الکفر نہ تھا۔ مگر مجازاً اُس کو نفاق کہدیا اور اس کا منشا یہ تھا کہ حالت حضور میں ایمان کامل معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت عالم غیب رائے العین ہوتا ہے تو تصدیق بھی کامل ہوتی ہے اور حالت غیبت میں تصدیق کی یہ شان نہیں ہوتی صرف عقلی تصدیق ہوتی ہے جو علم کا درجہ ہے معائنہ و مشاہدہ کی سی کیفیت نہیں ہوتی۔ اس تفاوت کی وجہ سے وہ یہ سمجھے کہ ہمارا ایمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اور طرح کا ہوتا ہے، پیچھے اور طرح کا ہوتا ہے گویا کبھی کامل ہے کبھی ناقص ہے اور مطلوب ایمان کامل ہے تو جب اس میں نقص ہوگا وہ نفاق کے مشابہ ہوگا گو حقیقی نفاق نہ ہو۔ یہ نَافَقَ حَنْظَلَۃُ کی تفسیر ہوئی۔ اب سوال یہ ہے کہ حضرت حنظلہ نے اپنی حالت ادنیٰ درجہ کی سمجھ کر اس پر تاسف کا اظہار کیا تھا تو جواب میں کوئی تسلی کا مضمون ہونا چاہیئے۔ اور جو جواب حدیث میں مذکور ہے بظاہر وہ تسلی کے لئے کافی نہیں۔ کیونکہ ساعۃٌ ساعۃٌ ہی پر تو انھیں تاسف ہے۔ پھر یہ جواب وجہ تسلی کیونکر ہو سکتا ہے۔

میرے استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے اس کی حقیقت بیان فرمائی تھی کہ حکمت حق اس کو مقتضی ہے کہ ملکوت سے ناسوت میں انسان کو آباد کیا جائے اور اگر ہر وقت وہی حالت رہتی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رہتی ہے تو انسان ناسوت میں نہ رہتا۔ بلکہ ملکوت میں پہنچا دیا جاتا۔ اس کی تفصیل کا یہ وقت نہیں ہے، اجمالاً اتنا بتائے دیتا ہوں کہ باہم دو شخصوں میں مصافحہ جب ہوتا ہے عادتاً ایک عالم میں ہوتا ہے اور جس عالم میں ہم ہیں یہ محسوس ہے اگر یہ مصافحہ یہاں ہو تو ملائکہ

جب تک محسوس نہ ہوں گے عادتاً مصافحہ نہ ہوگا اگر کوئی کہے کہ محسوس ہونے کی کیا ضرورت ہے یوں ہی مصافحہ کرتے تو سمجھو محسوس کے معنی مرئی یا مبصر کے نہیں ہیں لمس بھی تو حواس میں سے ہے تو مصافحہ کم از کم بغیر لمس کے نہیں ہوتا جو لوگ آنکھ سے معذور ہیں وہ بھی حواس کے حصہ دار ہیں گو لامسہ ہی سہی۔ بہر حال اس عالم میں مصافحہ ہونا عادتاً موقوف اس پر ہے کہ ملائکہ محسوس ہوں اور عادتاً ملائکہ صرف ملکوت میں محسوس ہوتے ہیں، ناسوت میں محسوس نہیں ہوتے تو وہ مصافحہ اس طرح ہوتا کہ ہم ملکوت میں منتقل کر دیئے جاتے۔ تو اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا حاصل یہ ہوا کہ اگر ایک ہی حالت پر قائم رہتے تو تم ملکوت میں منتقل کر دیئے جاتے اور ایسا ہوتا تو تمہارے ناسوت میں رہنے کی جو حکمت تھی اس کا ابطال لازم آتا تو اس غیبت پر تاسف وقلق کرنا گو اس ابطال حکمت کی تمنا کرنا ہے جو کہ غیر محمود ہے تو اس ذہول وغیبت کی اجازت کا بڑا درجہ اس سے ثابت ہو گیا۔ تو کتنی بڑی رحمت ہے شریعت کی بمقابلہ عقل کے اور صوفیہ نے اس حکمت کو اس تقریر سے بھی زیادہ واضح وسہل عنوان سے ظاہر کر دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

از دست ہجر یار شکایت نمی کنم گر نیست غیبتے نہ دہد لذتے حضور

(محبوب کی جدائی کی شکایت نہیں اگر جدائی نہ ہوتی تو وصل میں لطف ولذت نہ ہوتی)

یعنی جس طرح بدون پیاس کے پانی کی قدر نہیں اسی طرح غیبت ہی کی بدولت حضور کی لذت ہے گو حضور کی حالت فی نفسہ افضل واکمل ہے مگر حضور کی روح ولذت خود غیبت پر موقوف ہے اس لئے اس عارض پر نظر کر کے حالت اکمل واعلیٰ یہی ہے کہ کبھی غیبت ہو کبھی حضور ہو۔ اسی واسطے حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے اپنے ایک خادم کو جواب دیا تھا جنہوں نے یہ عرض کیا تھا کہ حضرت ذکر میں اب ویسا مزہ نہیں آتا جیسے پہلے آیا کرتا تھا

آپ نے فرمایا میاں تم کو خبر نہیں۔ پورانی جورو اماں ہو جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں پُرانی سے مراد بُڑھیا نہیں بلکہ جوان بھی رہے تب بھی ویسا شوق شوق باقی نہیں رہتا اور اگر کچھ دنوں کے لئے جُدائی ہو جاوے مثلاً کہیں سفر سے آویں تو اس وقت پھر ایک خاص کیفیت شوق کی عود کر آتی ہے سو یہ حکمت ہے اس انقطاع توجہ میں کہ غیبت ہی پر حضور کی لذت موقوف ہے اس کے علاوہ دوسری حکمت یہ ہے کہ انسان کا کمال یہ ہے کہ باوجود عدم تقاضا کے حق کی عبادت کرتا رہے۔ تیسرے یہ کہ حضور کے وقت معاصی کا تقاضا بھی نہیں ہوتا اس لئے اگر اس وقت معاصی سے بچے تو کیا کمال ہے وہ تو فرشتے بھی کرتے ہیں، انسان کا کمال یہی ہے کہ تقاضائے معصیت کے ساتھ معصیت سے بچے پس اگر حضور دائمی ہوتا تو انسان گویا فرشتہ ہو جاتا انسان نہ رہتا۔ اور جب آپ آپ نہ رہے تو آپ کا کمال ہی کیا ہوا۔

غرض یہ کہ اگر یہ حالت غیبت نہ ہوتی تو آپ بھی فرشتہ بن جاتے حکمت مقتضی تھی انسان کو بسانے کی اس لئے اس حکمت حق کا تقاضا دوسرے انسانوں کے بنانے کا ہوتا جو انسان بن کر کام کرتے تو آپ ہی کیوں نہ انسان رہیں اور خدا کو خبر کہ اس میں کیا کیا حکمتیں ہوں گی یہ تو وہ ہیں جو ہم جیسے ضعفا بھی سمجھ لیتے ہیں ورنہ حکمتیں تو غیر متناہی ہیں قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَن تَنفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا ط (آپ کہہ دیجئے کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لئے سمندر روشنائی ہو تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے اگرچہ اس سمندر کی مثل ایک دوسرا سمندر مدد کے لئے ہم لے آویں) سو حق تعالےٰ کے کلمات و اسرار و حکم کا کون احاطہ کر سکتا ہے۔ اگر تمام دنیا کے موجودات کاتب ہوں اور تمام روئے زمین کے سمندر روشنائی بن جائیں تو سب ختم ہو جائیں مگر وہ ختم نہ ہوں۔ مگر اہل اللہ کی عادت ہے کہ جو کچھ وہ سمجھتے ہیں اس میں سے کچھ ہم لوگوں کی قناعت کے لئے بیان بھی

کر دیتے۔ اب سمجھ میں آ گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب کیسا تسلی بخش جواب ہے کہ یہی حالت قرین حکمت ہے کہ کبھی کچھ ہو کبھی کچھ ہو اسی واسطے جو عارف ہیں وہ ایسے ذہول کو مضر نہیں سمجھتے مگر ان کا ذہول ہمارا سا ذہول نہیں کہ ہمیں بالکل کچھ پتہ ہی نہیں رہتا۔ اُن کا ذہول بس اتنا ہوتا ہے کہ استحضار کا غلبہ نہیں رہتا۔ جیسے عاشق کو معشوق کا ذہول کلی تو کبھی نہیں ہوتا مگر پھر بھی کبھی بے کلی ہوتی ہے اور کبھی کچھ سکون بھی ہو جاتا ہے بس وہی عارف کا ذہول ہے اور اسی کو ڈ فراق کہتے ہیں۔ ان میں جو محقق نہیں ہیں وہ اس حالت پر متاسف ہوتے ہیں اور محقق کو گو طبعاً قلق ہوتا ہے مگر وہ اُسے عقلاً دفع کرتا ہے۔ چنانچہ اسی غلبہ استحضار کا نام اصطلاح میں وصل اور ذہول کا نام فراق ہونے کی بنا پر عارف محقق کہنے لگتا ہے ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

(کیسا وصال اور کس کا فراق رضائے محبوب کی تمنا ہونی چاہیے اس سے غیر اس کی تمنا کے افسوس ہوگا)

یہ فراق حقیقی نہیں بلکہ فراق صوری مراد ہے۔ یعنی جب غلبہ استحضار کا نہ ہو بس وہ ان کی اصطلاح میں فراق ہے۔ اور جس فراق کی علی الاطلاق حافظ نے مذمت کی ہے وہ اصطلاحی فراق نہیں ہے بلکہ وہ لغوی فراق ہے یعنی ذہول محض چنانچہ کہتے ہیں ؎

شنیدہ ام سخن خوش کہ پیر کنعاں گفت
فراق یار نہ آں میکند کہ بتواں گفت
حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر
کنایتے است کہ از روزگار ہجراں گفت

(میں نے پیر مرشد سے ایک اچھی بات سُنی کہ فراق یار (یعنی عدم معرفت) وہ حالت پیدا کرتی ہے جو بیان سے باہر ہے۔ واعظ شہر روز قیامت کے ہول وخوف بیان کر کے ڈراتا ہے وہ میرے روزگار ہجر پر آفت کا ایک اشارہ ہے)

تو دونوں قولوں میں اب تعارض نہیں رہا ابتدائے عشق میں یہی اصطلاحی فراق قلق میں ڈالتا ہے اور انتہائے عشق میں رضا کا غلبہ تسلی دیتا ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ

عشق کے مقتضیات میں سے یہ بھی ہے کہ جو محبوب پسند کرے اسے یہ بھی پسند کرے مثلاً محبوب نے دو روپے دیئے کہ آم خرید لاؤ۔ تو جو محقق تھا وہ تو چلا گیا اور جو ہوسناک تھا وہ وہیں مچل گیا کہ ہائے میں دولت دیدار کو چھوڑکر بازار کیسے جاؤں یہ تو بُعد ہے وصل کے بعد فراق کو کیسے گوارا کروں اور محقق اس وقت یوں کہتا ہے ؎

اُرِیْدُ وِصَالَہٗ وَیُرِیْدُ ھِجْرِیْ فَاَتْرُکُ مَا اُرِیْدُ لِمَا یُرِیْدُ

یعنی میں پاس رہنا چاہتا ہوں اور محبوب دور رکھنا چاہتا ہے میں اپنی مراد کو اس کی مراد پر فدا کرتا ہوں اور جو اس کی تجویز ہے وہی مناسب ہے اسی کا ترجمہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے ؎

میل من سوئے وصال ومیل اوسوے فراق

ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

(میری خواہش وصال کی ہے اور محبوب ہجر کا خواہشمند ہے میں نے اپنی خواہش کو ترک کر دیا تاکہ محبوب کی خواہش پوری ہو جائے)

تو محقق عاشق اس فراق ہی کو ترجیح دے گا گو اس میں بے کلی ہی ہو ہوا کرے کیونکہ محبوب تو خوش ہے اور محققین نے اسی اصل پر جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تفسیر کی ہے کہ اِنَّہٗ لَیُغَانُ عَلٰی قَلْبِیْ وَاِنِّیْ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ فِیْ کُلِّ یَوْمٍ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے قلب پر بھی ایک پردہ سا پڑتا ہے جس کیلئے میں استغفار کرتا ہوں دن میں سو مرتبہ یا ستر مرتبہ۔ علماء تو یہاں گھبرا گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر پردہ کیسا مگر صوفیہ نے اس کی شرح کی ہے اس عین یا غیم کی پوری حقیقت تو وہی بیان کر سکتا ہے۔ جس کو وہ مقام حاصل ہو مگر مَا لَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ۔ (اگر کل نہ پا سکے تو کل ہی ترک نہ کر دے) کچھ کچھ نمونہ کے طور پر بیان کرنے میں مضائقہ

بھی نہیں سو صوفیہ کہتے ہیں کہ آپ کا جو درجہ علیا ہے اس کے اعتبار سے بھی ایک مرتبہ ذکر کا اور ایک مرتبہ ذہول کا تھا گو واقع میں وہ ذہول نہ تھا۔ کیونکہ آپ کی شان تو یہ تھی کَانَ یَذۡکُرُ اللّٰہَ فِیۡ کُلِّ اَحۡیَانِہٖ۔ آپ ہر وقت ذکر کرتے تھے مگر ذکر بھی دو قسم کا ہے ایک ذکر بواسطہ ایک ذکر بلا واسطہ جیسے محبوب کا مشاہدہ کہ ایک بواسطہ ایک بلا واسطہ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک مشاہدہ تو یہ ہے کہ چہرہ پر نگاہ اٹھا کر دیکھ لیا اور ایک یہ ہے کہ محبوب کہتا ہے کہ اس وقت ہماری طرف نگاہ مت کرو۔ آئینہ میں جو ہمارا چہرہ نظر آتا ہے اُسے دیکھو۔ ہے تو یہ بھی مشاہدہ ہی مگر دونوں درجوں میں بڑا فرق ہے اور عاشق کو طبعًا یہ واسطہ گراں ہوتا ہے۔ گو عقلاً گراں نہ ہو مگر طبیعت یہ چاہتی ہے کہ بلا واسطہ مشاہدہ ہو وہ تو وسائط کے ارتفاع کی تمنا میں یہ کہتے ہیں ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن نہ وہم
گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ وہم

(مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کا چہرۂ انور نہ دیکھنے دوں
اور کانوں کو بھی اس کی باتیں نہ سننے دوں)

سو گو عاشق طبعًا اس واسطہ کو بھی گراں سمجھتا ہے مگر حکم ہے محبوب کا ہمیں اس وقت آئینہ ہی میں دیکھو اس لئے عقلاً اس سے راضی ہوتا ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا مقدمہ یہ کہ اہل اللہ نے ثابت کر دیا ہے کہ مخلوقات مراۃ جمال الٰہی ہیں کہ ان میں غور کرنے سے حق تعالےٰ کے وجود اور اس کے کمالات کا پتہ چلتا ہے پھر مراتب میں بھی مختلف درجے ہیں عوام کے لئے اور ہے خواص کے لئے اور۔ چنانچہ ارشاد ہے اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ (بلا شبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات دن کے آنے میں البتہ دلائل ہیں عقل والوں کے لئے)

(باقی آئندہ ان شاء اللہ تعالیٰ)

اس میں اُلی الالباب کی قید سے فرق مراتب کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اور اسی آیت سے مخلوقات کا مرأۃ ہونا بھی معلوم ہوتا ہے۔ جب یہ دونوں مقدمے سمجھ میں آگئے تو اب یہ سمجھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مامور ہیں اصلاح امت کے اور یہ کام ہو نہیں سکتا تاوقتیکہ شفقت نہ ہو۔ اور شفقت کے لئے ضروری ہے توجہ الی المخلوق۔ گو اس وقت بھی توجہ الی الخالق ہوتی تھی مگر تھوڑی سی توجہ مخلوق کی طرف بھی کرنا پڑتی تھی اور اس وقت مشاہدہ حق بواسطہ مرأۃ کے ہوتا تھا اسی توجہ الی المخلوق کو آپ غین یا غیم (پردہ) سے تعبیر فرماتے ہیں۔ اور چونکہ اس پر آپ کو طبعاً قلق ہوتا تھا اس لئے استغفار کی کثرت فرماتے تھے تاکہ اس کا تدارک ہو جاوے تو جس کیفیت کا نام حضور کے درجہ کے اعتبار سے ذہول رکھا تھا وہ توجہ الی الحق بواسطہ تھی۔ یہ حالت اگر نقص کی ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نہ تجویز ہوتی اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی کمال ہے اور انسان کے لئے اس حالت کا ہونا حکمت ہے۔ بہرحال دواماً استحضار ذکر لو کیا واجب ہوتا جو کہ فی ذاتہ مستحب ہی ہے استحضار تصدیق بھی دواماً واجب نہیں جو کہ فی ذاتہ واجب ہے۔ چنانچہ اسی لئے شریعت نے اس حالت میں فتویٰ دیا ہے کہ مومن جاگنے میں بھی مومن ہے اور سونے میں بھی مومن اور حقیقت اور عقل کا فتویٰ یہ تھا کہ جاگنے میں تو مومن ہے اور سونے میں کافر۔ اب دیکھی آپ نے شریعت کی رحمت (ہائے لوگ ایسی شریعت سے بھاگتے ہیں) اور آپ کو تحقیق ہو گیا کہ مثل تکوینات کے تشریعات میں بھی قدرت نے اس کی رعایت کی ہے کہ جو چیز جس قدر بھی زیادہ ضروری اور نافع ہوتی ہے اسی قدر اس میں سہولت فرمادیتے ہیں۔ اور سہولت کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ عبادت کی حقیقت سب کے ذہن میں ہے جیسا مفصلاً بالکل شروع تمہید میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سے

ضروری اطلاع :- گذارش ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت خریداری نمبر ضرور تحریر فرمایا کریں۔

معلوم ہوا کہ عبادت کوئی بڑا ہی امر مہم ہے۔ پس فَاعْبُدْهُ (سواس کی عبادت کرتے رہو) میں اسی بڑی مہم چیز کا ذکر ہے اور اصل مقصود یہی حصہ ہے۔ باقی سیاق و سباق اسی کی تاکید و تمہید کے واسطے ہیں اور اسی آیت کے متعلق ہیں۔

اس سے پہلے بھی ایک مختصر جلسہ میں بیان کر چکا ہوں جس سے آج کی تقریر گو ایک گونہ تکریر تو ہوئی مگر ہر تکریر موجب ملال نہیں ہے۔ دیکھئے دونوں ہاتھوں میں سے اگر ایک پر فالج گر جاتا ہے تو علاج کیوں کرتے ہو۔ اگر محبوب کی دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ پھوٹ گئی ہو تو کیوں کہتے ہو کہ حسن کم ہو گیا تو اسی طرح تکرار تلاوت یا بیان بھی موجب ملال نہ ہونا چاہیئے۔ پھر تکرار بھی من کل الوجوہ نہیں کیونکہ گو آیت تو وہی تلاوت کی ہے مگر آج کے بیان میں مضامین کی جدت ضرور ہے۔ چنانچہ اس بیان سابق میں عبادت کی حقیقت اجمالاً بیان کی تھی۔ مگر تفریعات رہ گئی تھیں اس لئے آج پھر وہی آیت اختیار کی تاکہ جو مضمون اس کے متعلق رہ گیا ہے اسے بھی بیان کر دیا جائے۔ سو عرض کرتا ہوں۔

ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ حق تعالےٰ جل علیٰ شانہ تربیت کرنے والے ہیں آسمانوں کے اور زمین کے اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان میں ہے۔ جب یہ شان ہے کہ وہ سب کے مربی و محسن ہیں اور مَا بَيْنَهُمَا (جو چیزیں ان دونوں کے درمیان ہیں) میں وہ تمام چیزیں آ گئیں جن سے تمہیں بھی منافع پہونچ رہے ہیں۔ تو وہ مربی ہیں تمہارے بواسطہ بھی اور بلا واسطہ بھی۔ کیونکہ جو اسباب تمہارے حدوث و بقا کے ہیں وہ ان کے بھی مربی ہیں تو وہ اعلیٰ درجہ کے محسن ہوئے تو اس شان کا مقتضا یہ ہے کہ ان کا حق ادا کرو یعنی فَاعْبُدْهُ ان کی عبادت کرو۔ عبادت کے معنے ہیں عبد شدن مگر بعضے محاورات جو کثیر الاستعمال ہے ان کے مفصل معنی کا ذہن سے اکثر ذہول (بندہ ہونا) ہو جاتا ہے اور وہ لفظ بھی خود

اپنے معنے کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ لفظ عبادت بھی ایسا ہی ہے کہ اس کے مفصل معنے عبد شدن (بندہ ہونا) ہیں مگر بجائے اس معنے کے اب خود لفظ عبادت ہی ذہن میں آکر رہ جاتا ہے۔ کلام لفظی کے درجہ میں بھی دونوں درجوں میں صرف عبادت ہی آتا ہے اور اس کا دوسرا عنوان اتنا مستعمل نہیں اس لئے وہ ذہن میں نہیں آتا۔ یعنی عبد شدن غلام ہو جانا۔ اسی عارض کے سبب حقیقت عبادت کی بہت لوگوں پر مخفی ہو گئی تو اب فَاعْبُدْهُ کے معنے یہ ہوئے کہ غلام ہو جاؤ۔ یہ حاصل ہوا اس آیت کا اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ امر اس درجہ تو ضروری ہے کہ حق تعالےٰ نہایت تمہید و تاکید کے ساتھ اس کا حکم فرما رہے ہیں مگر ہماری حالت کیا ہے۔ کہ اس کی ذرا قدر نہیں اور قدر اس لئے نہیں کہ توجہ نہیں۔ شاید کوئی کہے کہ ہم تو عبادت کو ضروری سمجھتے ہیں میں کہتا ہوں محض اعتقاد و تلفظ کافی نہیں۔ کیونکہ جو غایت ہے ضروری سمجھنے کی جب وہ حاصل نہ ہوئی تو کیونکر معلوم ہو کہ آپ نے اس کو ضروری سمجھا مسلم ہے کہ اَلشَّئُ اِذَا خَلَا عَنْ فَائِدَۃٍ لغَا۔ جب کوئی شئے اپنے فائدہ سے خالی سمجھی جاتی ہے تو وہ منتفی و معدوم ہو جاتی ہے۔ ضروری سمجھنا تو ایسا ہوتا ہے جس طرح تم دوا کو ضروری اور مفید سمجھتے ہو اور استعمال کرتے ہو اور قاعدہ کے موافق نسخہ بناتے ہو حکیم کے کہنے پر چلتے ہو، پرہیز بھی کرتے ہو اور جب اس کی ضرورت نہیں سمجھتے تو استعمال بھی نہیں کرتے اسی طرح عبادت ہے کہ جو ضروری سمجھے گا وہ اس کو پابندی سے ادا کرے گا اور قاعدہ کے موافق ادا کرے گا اور جو اس کے ساتھ پرہیز ہیں ان کو بھی لازم سمجھے گا اگر ایسا نہ کیا تو وہ ضروری سمجھنا معتبر نہ ہوا اس پر شاید آپ اپنے دل میں خوش ہوں گے کہ ہم تو پانچوں وقت نماز پڑھتے ہیں اس لئے ہم تو عبادت کرتے ہیں۔ ہاں لغۃً بیشک آپ پر مصلی صادق آگیا مگر میں کہتا ہوں کہ جو لوگ صرف عید بقرعید کی نماز پڑھ لیتے ہیں لغت کے اعتبار سے

تو مصلی وہ بھی ہیں مگر انھیں آپ بھی نمازی نہ کہیں گے کیونکہ محاورہ میں نمازی اس کو کہتے ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہوں اگر کسی نے ایک دن باپ کی اطاعت کی اور حاکم کی تعظیم کی اور ایک دن نہ کی تو کیا اسے مودب و مہذب کہیں گے۔ لغۃً تو کہیں گے مگر محاورہ میں نہیں کہیں گے کیونکہ اس محاورہ میں لغت سے کچھ اضافہ ہے۔ ادب کرنے والا محاورہ میں اس کو نہیں کہیں گے جو ایک دن کرے اور ایک دن نہ کرے۔

اسی طرح قرآن وحدیث بھی محاورات میں ہے۔ تو شرعًا عابد اسی کو کہیں گے جو دوام کرے۔ غلامی پر دیکھئے اگر کوئی غلام ایسا کرے کہ کھانا تو آقا کے سامنے لاکر رکھدے اور پانی مانگنے کے وقت انکار کردے کہ پانی تو میں نہیں لاؤں گا، اسے آپ فرمانبردار کہیں گے یا سرکش۔ یقینًا سرکش کہیں گے اسی طرح ننانوے حکم آقا کے مانے اور صرف ایک نہ مانے تب بھی وہ سرکش ہی کہلائے گا۔ چہ جائے کہ ہماری طرح ایک مانے اور ننانوے نہ مانے اگر کوئی کہے کہ ہم تو خدا کے احکام مانتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ آپ تمام اوامر ونواہی میں اپنی حالت جانچ لیں کہ کل کو مانتے ہیں یا نہیں۔ جانچنے کے بعد معلوم ہوجائیگا کہ واقع میں تم اپنے کو محض زبان سے غلام بتاتے ہو مگر حقیقت بھی غلامی کی نہیں سمجھتے بس وہی حالت ہے کہ ہیجے تو کریں گے تے بے نہ بر تب اور بے تے زبرت اور رواں کہیں گے بطخ کہ ہیجے میں تو ہم غلام بنتے ہیں۔ اور جب غلامی کرنے کا وقت آتا ہے تو بطخ بن جاتے ہیں ارے بھائی یہ تو تبت ہوا تھا بطخ کہاں سے ہوا۔ یاد رکھو غلام تو وہی ہے کہ جو بغیر اگر مگر کے ہر امر میں آقا کی اطاعت کرے اس معیار کو سمجھ کر دیکھئے کیا آپ واقعی غلام ہیں تو بہت سے تو ایسے نکلیں گے جو عبادت کرتے ہی نہیں اور بعضے کرتے ہیں تو پابندی سے نہیں کرتے ہیں اور جو پابندی بھی کرتے ہیں وہ قاعدہ سے نہیں کرتے ہیں یوں ہی بے ڈھنگی ادا کرتے ہیں اور بعضے وہ ہیں جو احکام الٰہیۃ میں شبہات نکالتے ہیں۔

صاحبو کیا اسی کا نام غلامی ہے ہرگز نہیں یہ تو غلامی کا دعویٰ ہے حقیقت غلامی نہیں۔ اور ضرورت اس کی ہے اور گو اس کا اہتمام فرداً فرداً ہر شخص پر فرض ہے مگر اس کے اہتمام و انتظام میں جن جماعتوں کا زیادہ دخل ہے وہ دو گروہ ہیں جو مخلوق کو خدا کا حقیقی غلام بنا کے اطاعت کرا سکتے ہیں اس میں ایک تو علماء کا گروہ ہے ان کا بڑا اثر ہوتا ہے اگر یہ خدانخواستہ گمراہ ہوں تو سارے عالم کو گمراہ کر سکتے ہیں۔ زَلَّۃُ الْعَالِمِ زَلَّۃُ الْعَالَمِ (عالِم کی لغزش جہان کی لغزش ہے) اور دوسرا امراء کا ہے علماء کا عوام پر دینی اثر ہے اور امراء کا دنیوی۔ علماء کا دینی اثر تو یہ ہے کہ ان کی اعتقادی وجاہت ہے اور ان کے احکام کی قلب میں قدر و وقعت ہے۔ وہ عوام کو وعظ و نصیحت کرتے ہیں تو اس سے کچھ آخرت کے اجر کی طمع اور کچھ وہاں کے عذاب کا خوف پیدا ہوتا ہے اور امراء کے احکام کا اثر ان کے دنیوی اقتدار کے خوف یا طمع سے ہوتا ہے۔ بہرحال دونوں جگہ خوف بھی ہے اور طمع بھی۔ ایک جگہ آخرت کا ایک جگہ دنیا کا۔ پس یہ دو گروہ تھے جو خود غلام بن کے اپنا نمونہ پیش کرتے تو پھر عوام بھی ان کے ساتھ ہوتے اور اب تو ایک تیسرا فرقہ خوامخواہ پیدا ہو گیا ہے۔ اور وہ فرقہ کون ہے وہ صوفیہ کرام کا گروہ ہے۔ حالانکہ یہ کوئی نیا گروہ نہیں تھا۔ بلکہ حقیقت میں یہ وہی علماء ہیں مگر علماء نے ایک کام چھوڑ دیا اس وجہ سے یہ تیسرا گروہ پیدا ہو گیا۔ وہ کام کیا ہے۔ مجاہدہ و ریاضت کیونکہ ذرا یہ کام ہے مشکل، کہ کھانا چھوڑ دو۔ لوگوں سے ملو جلو نہیں، اچھا کپڑا مت پہنو۔ ٹھنڈا پانی مت پیو۔ اور چند روز سے صوفیت کی یہی تعریف رہ گئی ہے تو جن لوگوں نے اس کو اختیار کر لیا وہ صوفی کہلانے لگے خواہ ان کو نہ علم ہو نہ عمل تو اس طرح سے یہ تیسرا فرقہ ہو گیا حالانکہ صوفیت واقع میں اور ہی چیز ہے جسے ان باتوں سے کچھ بھی تعلق نہیں اور یہ بھی تصوف کی تعریف کچھ دنوں پہلے تک تھی اور اب تو اس سے بھی سہل صوفیت نکلی ہے کہ کپڑے رنگ لئے

بال بڑھا لئے تسبیح پڑھ لی تھوڑا سا ذکر کر لیا۔ بس لوگ معتقد ہو گئے۔ اور وہ گناہ بھی کریں تو بھی بزرگی نہیں ڈھلتی۔ بس ہیں یہ بڑے مزہ میں نہ بولے تو چپ شاہ اور اگر بولے اور بے ڈھنگی بولے تو صاحب رموز ہیں۔ اور ڈھنگ کی بولے تو عارف ہیں۔ خرابی تو بیچارے مولوی کی ہے کہ کہیں ایک بھی مسئلہ غلط کہا تو قلعی کھل گئی اور صوفی صاحب کیسی ہی غلطیاں کریں مگر وہ صاحب رموز ہیں پھر اوپر سے معتقدین کا ہر بات میں حضور حضور کرنا طرہ بر دستار ہو گیا یہ انہیں اور زیادہ خراب کرتے ہیں۔

جیسے ایک امیر تھے وہ جھوٹ بہت بولا کرتے تھے اور ان کا ایک مصاحب ان کے جھوٹ کی توجیہ کیا کرتا تھا چنانچہ ایک مرتبہ انھوں نے بیان کیا کہ میں شکار کو گیا ایک ہرن پر جو گولی چلائی تو سم کو توڑ کے ماتھے کو پھوڑ کر نکل گئی۔ لوگ اس پر ہنسنے لگے کہ کہاں سم کہاں ماتھا۔ مصاحب نے فوراً توجیہ کی کہ ہاں حضور اس وقت وہ کھجلا رہا تھا۔ امراء کے یہاں تو رات دن ایسے خوشامدی مصاحب رہتے ہی ہیں۔ مگر مشائخ کے یہاں بھی اب ایسے ہی معتقد رہ گئے ہیں کہ خواہ مخواہ رات دن ان کی کرامتوں کا تذکرہ کیا کرتے ہیں اور ان کے عیب کو ہنر بتلاتے ہیں تو بہر حال علماء میں سے ایک شاخ نکل کر فقراء بن گئی۔ مگر واقع میں صوفیہ علماء ہی ہیں۔ اور جو جاہل ہو وہ صوفی ہی نہیں۔ اور احادیث میں جن علماء کی فضیلت آئی ہے وہ واقع میں وہی علماء ہیں جو صوفی بھی ہیں۔ خود جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَ اِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ یعنی جسم انسانی میں ایک پارہ گوشت ہے جب وہ درست ہوتا ہے تو سارا بدن درست رہتا ہے اور جب وہ بگڑتا ہے تو سارا بدن بگڑ جاتا ہے خبردار رہو وہ قلب ہے تو جس نے اپنے قلب کی اصلاح نہ کی ہو اور اس لئے اس کی تمام عملی حالت تباہ ہو وہ کیونکر عالم مورد فضائل دارده کہلائے گا مستحق ہو سکتا ہے۔ بہرحال علماء وہی

ہیں جو صوفیہ ہیں اور جن علمار کے فضائل نصوص میں وارد ہیں وہی علمار ہیں جو درویش بھی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ ط یعنی خوف وخشیت خدا سے صرف علمار ہی کو حاصل ہے۔ اس سے خود معلوم ہوتا ہے کہ صوفیہ مراد ہیں کیونکہ خشیت کاملہ ان ہی میں ہے۔ اسی طرح علمار کو ورثۃ الانبیار کہا گیا ہے اس بنا پر کہ انبیار نے نہ دینار چھوڑا نہ درہم نہ زراعت نہ تجارت انھوں نے صرف علم چھوڑا تو جن کے پاس یہ علم موروث انبیار ہوگا وہی لقب عالم کا مستحق ہوگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ انبیار کا علم یہ علم رسمی نہ تھا علم حقیقی وقلبی تھا جس کی شان یہ ہے ؎

علم چوں برتن زنی مارے شود علم چوں بردل زنی یارے شود

(علم کا جب قلب پر اثر ہوگا تو وہ وصول الی اللہ معین ہوگا اور اگر تن پر اثر ہوا تو نرا بوجھ اور وبال ہوگا)

دوسرے محقق کہتے ہیں ؎

علم رسمی سربسر قیل ست وقال نے از و کیفیتے حاصل نہ حال
علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت زنگ گمراہی زدال بزدایدت
ایں ہوسہا از سرت بیروں کند خوف وخشیت دردلت افزوں کند

(رسمی علم محض قیل وقال ہے نہ اس سے کوئی کیفیت حاصل ہو نہ حال علم وہی ہے کہ تم کو خدا کا راستہ دکھلادے اور دل سے گمراہی کا زنگ دور کردے حرص وہوا سے چھڑا کر دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف وخشیت پیدا کردے)

اور ہماری حالت کیا ہے اسے بھی بیان کرتے ہیں ؎

تو ندانی جز یجوز و لا یجوز خود ندانی کہ تو حوری یا عجوز
اَیُّھَا الْقَوْمُ الَّذِیْ فِی الْمَدْرَسَہ کُلُّمَا حَصَّلْتُمُوْہُ وَسْوَسَہ
علم نبود غیر علم عاشقی مابقی تلبیس ابلیس شقی

(تم کو یجوز (یہ چیز جائز ہے) اور لایجوز (یہ چیز ناجائز) کے سوا کہ تم خود (بقول) ہو یا عجوز (مردود) جو کچھ مدرسہ میں علم لفظی حاصل کیا وہ وسوسہ تھا علم عاشقی کے علاوہ جو علم بھی ہے وہ ابلیس شقی کی تلبیس ہے۔)

توحضرت وہ علم جو انبیاء نے چھوڑا وہ یہ ہے کہ جس کے خواص آپ نے سُنے اور جو اُس علم کے عامل ہیں وہ ہیں نائب رسول اور ورثۃ الانبیاء تو حقیقت میں درویش بھی علماء ہوئے۔ غرض دو طبقے ایسے ثابت ہوئے جن کی اصلاح سب سے مقدم ہے کیونکہ ان کا اثر سب سے زیادہ ہے اس لئے اگر یہ گمراہ ہوں گے تو سب کو گمراہ کریں گے۔ سو افسوس یہ ہے کہ عبادت کے متعلق یہ طبقے بھی غلطیوں میں مبتلا ہیں تو عوام کیونکر غلطیوں سے بچتے۔ چنانچہ منجملہ ان غلطیوں کے ایک یہ بھی ہے کہ وہ عبادت کے معنے صحیح نہیں سمجھے۔ عوام کی تو غلطی یہ تھی کہ وہ عبادت کے معنے غلط سمجھتے ہیں کہ صرف نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ خاص اعمال میں منحصر سمجھتے ہیں اس لئے دوسرے اعمال میں کوتاہی کرنا عجیب نہیں کہ وہ ان کو عبادت ہی نہیں سمجھتے۔ مگر لکھے پڑھوں کی غلطی نہایت سخت ہے کہ وہ عبادت کے معنے بھی جانتے ہیں کہ اطاعت مطلقہ ہیں پھر اس میں غلطی کرتے ہیں کہ اس کے محل سے ناواقف ہیں یا بے پروا ہیں اور یہی مراد ہے صحیح معنے نہ سمجھنے سے۔ یعنی معنی تو سمجھے مگر صحیح نہیں سمجھے۔ اس لئے ضرورت سمجھی گئی کہ اس جلسہ میں زیادہ تر طلبہ موجود ہیں عرض کر دوں کہ اطاعت مطلقہ کے محل کیا کیا ہیں سو سنئے کہ سب سے اول محل تو عقائد ہیں یعنی جس طرح شریعت نے عقائد سکھلائے ہیں اسی کے موافق اعتقاد رکھیں۔ دوسرا محل اعمال دیانات ہیں۔ نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ انھیں بھی شریعت کے موافق پابندی سے صحیح طور پر ادا کریں۔ تیسرا محل معاملات ہیں بیع و شراء وغیرہ کہ ان کو بھی احکام شرع کے مطابق کریں اور یہ معلوم کریں کہ کونسی بیع فاسد ہے اور کونسی باطل، کونسا معاملہ صحیح ہے اور کونسا فاسد۔ کس معاملہ میں ربوا لازم آتا ہے اور کس میں قمار یہ سب شریعت سے معلوم کر کے اسی کے موافق کیا کریں۔ چوتھا محل معاشرت ہے کہ اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا، ملنا جلنا اس کو معلوم کریں کہ اس کے شریعت میں کیا آداب ہیں۔ پانچواں محل اخلاق ہیں۔ اخلاق کے یہ معنے

نہیں کہ نرمی سے بول لئے یا تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے یا ادب سے سلام کرلیا۔ یہ تو آثار ہیں اخلاق کے۔ خود اخلاق نہیں۔ اخلاق یہ ہیں تواضع۔ صبر شکر۔ زہد و قناعت شوق و رضا وغیرہ یہ ہیں اخلاق یعنے اعمال باطنی ان کے مقابلہ میں ان کے اضداد ہیں۔ کبر بے صبری۔ ناشکری۔ طمع وحرص حسد بغض۔ کینہ۔ یہ اخلاق ذمیمہ ہیں۔ تو اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ عبادت کیا ہے۔

عبادت ان تمام شعبوں کی تکمیل کا نام ہے۔ اب اس میں غلطی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ بعضے یہی نہیں جانتے کہ ان پانچ میں اصل کیا ہے۔ اسی لئے بعض لوگ تصحیح عقائد کی فکر نہیں کرتے گو کسی قدر اعمال کا اہتمام کرتے ہیں۔ اور بعضے یہ تو جانتے ہیں کہ ان میں اصل عقیدہ ہے۔ یہی راس العبادات اور اساس العبادات ہے۔ کہ بغیر اس کے کچھ بھی صحیح نہیں مگر ان سے یہ غلطی ہوتی ہے کہ جب اسے بڑا سمجھ لیا تو ان کے نفس نے یہ کہا کہ بڑے کے سامنے چھوٹے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ننانوے کے ہوتے ہوئے ایک کی کمی چنداں مضر نہیں۔ تو ان کی نظر سے اعمال کا اہتمام جاتا رہا۔ چنانچہ بہت لوگ جو عقائد حقہ رکھنے والے ہیں اور ان کے اعمال بھی درست ہیں۔ وہ اگر کسی کے عقائد درست دیکھتے ہیں۔ گو اعمال درست نہ ہوں تو تسامح کرتے ہیں اور اس سے نفرت نہیں کرتے یعنے اتنی نفرت بھی نہیں کرتے جتنی شرعاً کرنی چاہیئے بلکہ تعریف کے طور پر کہدیتے ہیں کہ فلانے کے عقائد بہت اچھے ہیں گو وہ رشوت بھی لیتا ہو ظلم بھی کرتا ہو بے نماز بھی ہو مگر عقائد صحیح ہونے کی وجہ سے اس کی کسی بات سے نفرت نہیں۔ مثلاً کوئی نماز نہ پڑھے تو اس سے انھیں نفرت نہیں حالانکہ مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ (جس نے قصداً نماز ترک کردی مثل کافر کے ہوگیا) میں فَقَدْ كَفَرَ نفرت ہی کی تو دلیل ہے کہ شریعت نے تارک الصلوٰۃ کو مثل کافر کے اسی لئے تو فرمایا تاکہ مصلین ترک صلوٰۃ نہ کریں۔ اور تارک صلوٰۃ نمازی بن جاوے۔ اور تارک صلوٰۃ کو بھی اپنی حالت سے نفرت ہو اور نماز شروع کردے مصلی اس سے نفرت

ظاہر کرے تعلق قطع کرے اور خلا ملا نہ رکھے مگر ساتھ ہی اپنے کو مقدس اور اس کو حقیر نہ سمجھے۔ یہاں تو قدم قدم پر لغزشیں اور رہزن موجود ہیں۔ یا تو بے نمازی سے نفرت نہ کریں گے یا کریں گے تو اپنے کو مقدس سمجھیں گے جو کہ کبر ہے جو کہ ترک نماز سے بھی قبیح ہے۔

چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ بے نمازی کو سلام کرنا کیسا ہے۔ اور سوال کیا تحقیر کے لہجہ میں مجھے لب ولہجہ سے معلوم ہوگیا کہ منشار اس سوال کا کبر ہے اگر مجھ سے پوچھتے کہ اس کی دلیل کیا تو یہ میں نہیں بتا سکتا تھا۔ اس کی ایسی مثال ہے۔ جیسے نبض دیکھ کر طبیب کہتا ہے کہ تم کو پرانا بخار ہے اب تم عطائی ہو وہ تمہیں کیونکر سمجھائے اسی طرح میں دلیل نہیں بتا سکتا۔ لیکن ہاں حق تعالےٰ کی یہ ایک نعمت ہے کہ مجھے لب ولہجہ سے اکثر قلبی حالت کا پتہ چل جاتا ہے اور یہ فیض ہے محبت سنت کا حق تعالےٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں فرماتے ہیں وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ (اور آپ ان کو ان کے طرز کلام سے ضرور پہچان لیں گے) حب سنت سے ایسا فہم حاصل ہو جاتا ہے اس کا کوئی قاعدہ کلیہ بیان نہیں ہوسکتا اگر اس کے لئے کوئی دلیل بیان کی جائے گی تو اس کی وہ گت ہوگی۔ جیسے ایک طبیب کے صاحبزادے تھے اناڑی ان کے باپ کسی مریض کو دیکھنے گئے۔ انھیں بھی ساتھ لے گئے جا کے مریض کی نبض دیکھی تو نبض سے اتنا معلوم ہوا کہ کوئی بد پرہیزی ہوئی ہے۔ اتفاق سے وہاں چارپائی کے نیچے نارنگی کے چھلکے بھی پڑے تھے تو طبیب نے کہا معلوم ہوتا ہے تم نے نارنگی کھائی ہے۔ واقعی مریض نے نارنگی کھائی تھی۔ اب صاحبزادے نے ایک قاعدہ کلیہ اخذ کیا کہ جو چیز چارپائی کے نیچے پڑی ہو وہ ضرور مریض کی کھائی ہوئی ہوتی ہے۔ اتفاق سے وہ طبیب مرگئے۔ اب صاحبزادے ان کے قائم مقام ہوئے۔ ایک مریض کو دیکھنے گئے اس کی چارپائی کے

نیچے نمدہ پڑا تھا کہنے لگے معلوم ہوتا ہے آپ نے نمدہ کھایا ہے۔ اس نے کہا وہ صاحب کہیں نمدہ بھی کھایا جاتا ہے۔ کہنے لگے صاحب نبض سے تو یہی پتہ چلتا ہے۔ مریض نے کہا نکالو اس کو اس کی دم میں نمدہ تو جس طرح بخار پہچاننے کے لئے محض سرعت نبض کافی نہیں۔ بلکہ ایک ذوق کی ضرورت ہے جس سے طبیب کو پتہ چل جاتا ہے۔ اسی طرح لب ولہجہ سے پہچان لینا یہ بھی ذوقی امر ہے۔ اور یہ کوئی بزرگی کی دلیل نہیں ہے۔ یہ تو مناسبت سے حاصل ہو جاتا ہے جو خدمت خلائق کے کام کرنے والے کو حق تعالیٰ عطا فرما دیتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ اس سوال کا سبب کبر ہے اس لئے میں نے کہا کہ تمہارے واسطے تو یہی ضروری ہے کہ فاسق کو ابتداءً سلام کیا کرو۔ غرض نفرت کی بھی قسمیں ہیں۔ یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ کبھی متکبرین کو سند مل جائے۔ چنانچہ جنھیں تقویٰ کا ہیضہ ہوتا ہے وہ خدا جانے مسلمانوں کو کیا سمجھتے ہیں۔ یاد رکھو اہل معاصی سے نفرت کا یہ مطلب نہیں کہ اپنے کو بڑا سمجھے اور تکبر کرے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اپنے کو تو سب سے کم سمجھے اور پھر شریعت کے حکم کی وجہ سے نفرت کرے اور یہاں بڑا زبردست اشکال ہے وہ یہ کہ تواضع کا اقتضا یہ ہے کہ کسی سے بھی نفرت نہ کرے اور بغض فی اللہ کا مقتضا یہ ہے کہ عاصی سے نفرت کرے اور نفرت جب کرے گا تو ضرور اسے کمتر سمجھے گا۔ اور جب اسے معصیت کے سبب کمتر سمجھے گا تو پھر اپنے کو کہ معصیت سے محفوظ ہے اس سے کیسے کمتر سمجھے گا۔ اسی واسطے کسی غیر محقق نے تنگ ہو کر کہدیا ہے ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہٴ　　　بازمیگوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

(گہرے دریا میں تختہ میں باندھ کر ڈالدیا پھر کہتے ہو خبردار رہ کہ دامن تر نہ ہو)

مگر محقق دونوں کو جمع کرکے دکھلا دیتا ہے کہ دریا میں بھی جائے اور خشک دامن بھی رہے اس کو ایسا تیرنا آتا ہے کہ کھڑے ہو کر تیرتا ہے اس کی حقیقت نہایت ہی آسان ہے محققین نے اس کو بھی حل کر دیا ہے۔ ایک مثال اس کے لئے کافی ہے کہ مثلاً بادشاہ نے جلاد کو حکم دیا کہ شہزادے نے فلاں جرم کیا ہے اس کو

ایک درجن بید لگاؤ۔ اب یہاں دو حکم ہیں ایک تو یہ کہ یہ شہزادہ ہے اسے عظیم الشان سمجھو اور دوسرا یہ کہ اس نے ایک قصور کیا ہے اس لئے مجرم بھی سمجھو۔ اب وہ بھنگی جانتا ہے کہ یہ سزا کے قابل ہے اور میں سزا کے قابل نہیں۔ اس حیثیت سے میں افضل ہوں مگر باوجود اس کے یہ بھی جانتا ہے کہ یہ شہزادہ ہے اور میں بھنگی ہوں اس لئے باوجود مجرم ہونے کے بھی یہ مجھ سے بدرجہا افضل ہے۔ دیکھئے دونوں امر کس طرح جمع ہو گئے اور بھنگی بادشاہ کے امتثال کے لئے تو مارتا ہے اور اپنے اعتقاد سے تعظیم کرتا ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب یہ سمجھو کہ جب تم کسی مسلمان سے معصیت کی وجہ سے نفرت کرو تو اس کے ساتھ یہ بھی سمجھو کہ ممکن ہے کہ عند اللہ اس کا رتبہ مجھ سے اس لئے بڑھا ہوا ہو کہ اس میں کوئی دوسرا کمال ایسا ہو جو مجھ میں نہ ہو مگر اس حیثیت سے کہ یہ بے نمازی ہے حکم شاہی ہے کہ بے نمازی کو سلام نہ کرو۔ اس واسطے میں سلام نہیں کرتا۔ باقی میں اس سے افضل نہیں ہوں۔ ممکن ہے کہ کسی خفی عمل کی بدولت یہ عند اللہ مجھ سے افضل ہو کیونکہ اعمال کا انحصار نماز ہی میں نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ توحید اس کی اتنی خالص ہو کہ بلا محاسبہ بخشا جائے تو آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ عند اللہ بھی میں اس سے افضل ہوں اور وہ تو پھر مسلمان ہے۔ محققین تو کفار کے بارہ میں بھی یہ خیال رکھتے ہیں ؎

ہیچ کافر را بخواری منگرید　　　　کہ مسلماں بودنش باشد امید

(کسی کافر کو حقارت سے نہ دیکھو اس لئے کہ اسکے مسلمان ہونے کی امید ہے)

ممکن ہے کہ وہ مسلمان ہو کر مرے۔ تو پھر کیا خبر ہے کہ وہ افضل ہو گا یا آپ۔ ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ یزید پر لعنت کرنا کیسا ہے میں نے کہا اس شخص کو جائز ہے جسے یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارا خاتمہ یزید سے اچھا ہو گا۔ ارے اپنے کام میں لگو لعنت کا وظیفہ پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔

حضرت رابعہ سے کسی نے پوچھا تم ابلیس پر لعنت نہیں کرتیں، کہنے لگیں جتنی دیر میں اس پر لعنت کروں میں اپنے محبوب کی یاد ہی نہ کروں۔ لعنت کے باب میں بعضوں کا دوسرا مذاق بھی ہے۔ ایک شخص تھا وہ روزانہ ایک ہزار

مرتب شیطان پر لعنت کیا کرتا تھا۔ ایک دن اس دشمن نے بھی کیسا بدلا لیا کہ دیوار کے نیچے سو رہا تھا۔ اس نے آکر جگا دیا کہ اٹھو اٹھو بھاگو یہ جیسے ہی وہاں ہٹا دیوار گر پڑی یہ بہت خوش ہوا کہ یہ تو کوئی بڑا خیر خواہ ہے۔ پوچھا تم کون ہو کہا نام نہ پوچھو نام سنکر تم خوش نہ ہوگے۔ کہا صاحب بتلاؤ بھی۔ کہا میں وہی شیطان ہوں جس پر تم ہزار مرتبہ روزانہ لعنت بھیجا کرتے ہو۔ کیا تم تو میرے بڑے خیر خواہ نکلے۔ اس نے کہا کہ میں نے خیر خواہی سے تہیں بچایا بلکہ اس خیال سے بچایا کہ دیوار کے نیچے دب کے مروگے تو شہید ہو جاؤگے اور بے حساب بخشے جاؤگے۔ تو مجھے فکر ہوئی کہ کسی طرح اتنے بڑے ثواب سے محروم کردوں دوسرے اگر جیتا رہیگا تو تجھ پر خوب مشق کیا کروں گا۔ ابھی بہت دن نچاؤں گا جیسے بندر ریچھ کہ اگر مر جاوے تو بندر والا پھر کہاں سے کمائیگا۔ بہر حال کسی پر لعنت کرنا فضول حرکت ہے۔ جب کہ اپنے ہی حال کی خبر نہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

گہ رشک برو فرشتہ بر پاکئی ما ۔۔۔ گہ خندہ زند دیو ز بر ناپاکئی ما

ایماں چو سلامت بہ لب گور بریم ۔۔۔ احسنت بریں چستی و چالاکئی ما

(کبھی ہماری پاکی پر فرشتہ رشک کرتا ہے کبھی ہماری ناپاکی پر شیطان ہنستا ہے۔ ایمان اگر قبر میں سالم لے جائیں اس وقت ہماری چستی و چالاکی پر آفریں ہے)

جب خاتمہ ہوگا اس وقت معلوم ہوگا کہ کس حالت میں گئے بس تو پھر کیا منہ لے کے کسی کو کہیں۔ جس پر پھانسی کا مقدمہ قائم ہو وہ میونسپلٹی کے چار آنہ آٹھ آنہ والے جرمانہ کے مجرم پر ہنسے تو کیا یہ حماقت ہی نہیں۔ اور جب یزید و ابلیس پر بھی لعنت کرنا فضول یا خطرناک ہے تو مسلمان کی غیبت کیا کچھ ہوگی اور آجکل تو اس سے بڑھ کر یہ تماشا ہے کہ غیبت کے لئے بھی صلحاء و اتقیاء ہی تجویز کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ مشائخ کی مجلسوں میں اکثر دوسرے مشائخ و علماء کی ہی غیبتیں ہوا کرتی ہیں جہاں فساق کی بھی پردہ دری جائز نہیں تھی۔ غرض کسی کو حقیر مت سمجھو۔ ابھی خود تمہاری ہی کشتی منجدھار

یں ہے۔ البتہ جہاں شریعت اجازت دے وہ مواقع مستثنیٰ ہیں باقی جہاں اجازت نہیں وہاں غیبت کرنا خصوص سب کام چھوڑ کے اسی کا شغل کرلینا یں اس کو منع کررہا ہوں بالخصوص جبکہ نہ اپنا انجام معلوم ہو نہ اس کا جس کی غیبت کررہے ہو اسی پر کسی نے متنبہ کیا ہے ؎

غافل مرو کہ مرکب میدان مرد را　　　در سنگلاخ بادیہ پیما بریدہ اند

(غافل مت چل اس لئے کہ مرد میدان نے سخت جنگلوں میں گھوڑا دوڑایا ہے)

نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش　　　ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(ناامید بھی مت ہو کہ رند شرابی لوگ ایک نالہ میں منزل مقصود پر پہنچ گئے ہیں)

تو جن کے لئے ترک سلام کا حکم ہے وہاں دو حیثیتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ترک اس حیثیت سے کہ ہم اس سے افضل ہیں یہ تو ممنوع ہے۔ اور ایک اس حیثیت سے کہ یہ حکم شرع ہے۔ یہ مطلوب و مامور بہ ہے اور وہ بھی وہاں جہاں ترک میں مصلحت ہو ورنہ جہاں مفسد کا احتمال ہو وہاں جائز نہیں مثلاً یہ اندیشہ ہو کہ اس سے اور ضد بڑھ جاوےگی اور اس شخص کا دین اور تباہ ہوگا۔ اسی واسطے تو دین میں ہر جگہ حکیم کی ضرورت ہے۔ ہر کام میں کسی محقق کو اپنا رہبر بناؤ اور اس سے ایک ایک جزئی پوچھو البتہ اس کے انتخاب میں بڑے غور و خوض کی ضرورت ہوگی۔ اب اول تو انتخاب ہی میں غلطی ہوتی ہے۔ اور اگر انتخاب بھی صحیح ہوا تو اتخاذ شیخ اس واسطے کرتے ہیں کہ ان سے مقدمات میں دعا کرایا کریں گے۔ تعویذ گنڈے کرایا کریں گے۔ گویا شیخ ان کے نوکر ہیں ششماہی نذرانہ تنخواہ میں پاتے ہیں اور اگر زیادہ خوش اعتقاد ہوئے تو اس خیال سے پیر بناتے ہیں کہ بس وہ خدا کے ہاں بخشا لیں گے، چاہے وہ خود بھی نہ بخشے جائیں۔ حضرت شیخ ان کاموں کے لئے نہیں ہے، وہ تو طبیب ہے ان کے سامنے اپنے امراض ظاہر کرو اور ان سے اپنی حالت کا فیصلہ کراؤ اور جو وہ علاج بتلائیں اس پر عمل کرو۔ جب ایسا انتظام ہوگا تو حضرت اس بارہ میں بھی شیخ ہی کے مشورہ پر عمل ہوگا۔ کہ کہاں سلام نہ کریں اور کہاں کریں۔ کہاں مصلحت ہے اور کہاں مفسدہ ؎

یار باید راہ را تنہا مرو　　　بے قلاؤز اندریں صحرا مرو

(ساتھی ضرور چاہیئے تنہا راستہ مت چل خصوصاً اس طریق میں بلا رہبر کے قدم مت رکھ)
اور اگر کسی کے پاس رہبر محقق نہیں ہے تو وہ اگر دین پر عمل کرنا چاہے گا تو صورت دین پر عمل کرنا آجائے گا۔ مگر حقیقت دین پر عمل کرنا مشکل ہوگا کیونکہ صورت میں بہت چیزیں متشابہ ہیں جو واقع میں اضداد ہیں ؎

گہ چنیں بنماید وگہ ضد ایں
جز کہ حیرانی نباشد کار دیں

(کبھی یہ دکھلاتے ہیں کبھی اس کی ضد سوائے حیرانی کے کار دین میں نہیں ہے)

یہ سب کلام اس پر چلا تھا کہ معاصی پر گرانی ہونا ضروری ہے لیکن حدود و قیود کی رعایت سے مگر اب تو یہ حالت ہے کہ اہلِ حق نے اعمال کو عقائد پر اکتفاء کرکے اتنا ترک کردیا ہے کہ کسی کے ترک اعمال سے گرانی بھی نہیں ہوتی۔ اور جو مبتلا ہے وہ تو کیوں گراں سمجھتا۔ بس یہ حالت ہے کہ جو جس میں مبتلا ہے۔ اُسے گراں نہیں سمجھتا بے نمازی نماز پڑھنے کو گراں نہیں سمجھتا اور جو نمازی مگر دوسری آفتوں میں مبتلا ہے وہ انھیں گراں نہیں سمجھتا۔ مثلاً امارد و نساء پر نظر کیا کرتا ہے اور اُسے بُرا نہیں سمجھتا۔ اور یہ گناہ گو ہے تو صغیرہ مگر بعض اوقات صغیرہ میں اتنے مفاسد ہوتے ہیں کہ وہ ان مفاسد میں کبیرہ سے بھی بڑھ جاتا ہے اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ گناہ میں دو درجے ہوتے ہیں۔ ایک امتداد اور ایک اشتداد سو کبیرہ میں جو سختی ہے وہ اشتداد کی وجہ سے ہے اور جس گناہ میں اشتداد کم ہے وہ صغیرہ ہے۔ مگر گناہ میں ایک درجہ ہے امتداد کا۔ اور یہ اکثر صغیرہ ہی میں زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اشتداد کا تدارک اکثر اس لئے آسان ہے کہ اس کا معصیت ہونا بین ہے اس لئے ڈر کر ایک مرتبہ دل سے اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ (اے اللہ مجھ کو بخش دے) کہہ لیا گویا پہاڑ کو پارہ پارہ کر دیا۔ لیکن امتداد کا تدارک اس لئے مشکل ہے کہ اس کو سرسری سمجھ کر کرتا رہتا ہے اور اس عادت کے سبب اس کا اثر راسخ ہوتا رہتا ہے پھر توبہ کا عزم سست ہو جاتا ہے، مثلاً بدنگاہی ہی کو لیجئے کہ اس میں گو اشتداد نہیں مگر امتداد کبیرہ سے بڑھ کر ہے سرسری سمجھنے سے بھی اور خود اس کی خصوصیت

سے بھی۔ چنانچہ مشاہدہ کہ نماز نہ پڑھنے سے کوئی ایسا اثر قلب میں نہیں ہوتا جس سے نجات نہ ہو سکے مگر نگاہ بد کے اثر سے بعض اوقات عمر بھر بھی نجات مشکل ہو جاتی ہے اس کی تو وہ شان ہو جاتی ہے ؎

درون سینۂ من زخم بے نشاں زدۂ بحیرتم کہ عجب تیر بے کماں زدۂ

(تونے میرے سینہ کے اندر زخم بےنشان کیا ہے حیرت میں ہوں کہ عجیب تیر کمان سے مارا ہے)

چنانچہ ہزاروں قصے ہیں کہ بس ایک دفعہ نگاہ پڑ گئی اور عمر بھر کو بے چینی لگ گئی کیونکہ محبوب کے نہ محلہ کی خبر نہ کچھ پتہ۔ اب فکر ہے کہ دوبارہ کہاں دیکھ لیں اب گھل رہے ہیں۔ یا مثلاً پردہ دار ہے اور وہ فوراً چھپ گئی تو اُسے پھر کیونکر دیکھیں۔ اب اس نے اس پر ایک اور غضب یہ کیا کہ اس خیال کو اپنے دل میں پالا اُسے جمایا کہ بت پرست کی طرح سوچتا رہا کہ ہائے اس کا ایسا رخسارہ ہے اور ایسی ادا اور ایسی زلف جب وہ اچھی طرح دل میں جم گیا تو پھر یہ حالت ہوتی ہے کہ نہ ملامت نافع ہے نہ خوف نہ حیا نہ شرم۔ کما قیل ؎

عَذْلُ الْعَوَاذِلِ حَوْلَ قَلْبِيَ التَّائِهِ وَهَوَى الْأَحِبَّةِ مِنْهُ فِي سُوْدَائِهِ

(ملامت کرنے والوں کی ملامت قلب کے اردگرد ہے دوستوں کی محبت سودائے قلب میں یعنی دل کے اندر ہے)

اب مرض بڑھا کہ نہ نماز میں جی لگتا ہے نہ روزہ میں۔ نہ اللہ یاد رہا نہ رسول بس ہر وقت وہی مردار ہے حتیٰ کہ اب نماز روزہ بھی ترک ہونے لگا۔ اعمال پر اثر پڑا پھر صحت پر اثر پڑا اور بیمار پڑ گیا اور بیماری بھی اتنی بڑھی کہ حالت مایوسی کی ہو گئی۔ غرض ایمان اور جان سب اسی کی نذر ہو گیا یہ سب خرابی اسی نگاہ بد منحوس کی بدولت ہوئی مگر اس میں اسے وہ لذت ہے کہ ترک کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا، جیسے خارش والے کو کھجلانے سے خارش بڑھتی ہے مگر اس میں وہ مزہ ہے جیسے شاعر نے کہا ہے ؎

لڈو میں نہ برفی میں نہ پیڑے میں مزہ ہے جو حضرت کھجلی کے کھجانے میں مزہ ہے

مگر کسی مبتلا کو اب بھی مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہ مرض بھی گو سخت ہے مگر لاعلاج نہیں مَا جَعَلَ اللّٰهُ دَاءً إِلَّا وَقَدْ جَعَلَ لَهُ دَوَاءً خدا نے کوئی مرض ایسا نہیں بنایا جس کا

علاج نہ ہو۔ چنانچہ اس عشق مجازی کی بھی دوا ہے اگر کوئی کرنا ہی نہ چاہے تو اور بات ہے۔ جیسے مجنوں کہ وہ اپنی محبت کو خود زائل کرنا نہیں چاہتا تھا چنانچہ اس کے باپ نے اس سے کہا کہ خانہ کعبہ کا غلاف پکڑ کر دعا کرو۔ اَللّٰھُمَّ اَزِلْ عَنِّیْ حُبَّ لَیْلٰی (اے اللہ مجھ سے لیلیٰ کی محبت دور کر دے) تو آپ فرماتے ہیں اَللّٰھُمَّ زِدْنِیْ حُبَّ لَیْلٰی (اے اللہ مجھ میں لیلیٰ کی محبت بڑھا دے) اور فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ؎

الٰھی تبتُ من کُلِّ المَعَاصِیْ وَلٰکِنْ حُبَّ لَیْلٰی لَا اَتُوْبُ

(یعنی اے اللہ میں سب گناہوں سے توبہ کرتا ہوں مگر لیلیٰ کی محبت سے توبہ نہیں کرتا) گو وہ فاسق نہ تھا پاک عاشق تھا اور اپنے عشق میں اتنا کامل ہو گیا تھا کہ اُسے بجائے محبوب کے خود محبت ہی مقصود ہو گئی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ لیلیٰ خود اس کے پاس پہنچ گئی تھی پوچھا مَنْ اَنْتَ تو کون۔ اس نے کہا اَنَا لَیْلٰی۔ میں لیلیٰ ہوں۔ کہا اِلَیْكَ عَنِّیْ فَاِنَّ حُبَّكَ شَغَلَنِیْ مِنْكَ ہٹ مجھے تیری محبت نے تجھ سے بے نیاز کر دیا تو یہ عشق تھا۔ اور اب تو سراسر فسق ہوتا ہے ؎

ایں نہ عشق است آنکہ در مردم بود ایں فساد خوردن گندم بود

(یہ عشق جو عام لوگوں میں ہوتا ہے یہ عشق نہیں ہے بلکہ گندم کھانے کا فساد ہے)

سو مجنوں نے علاج نہ چاہا مبتلائے معصیت رہا لیکن وہ فاسق نہ تھا اس لئے علاج نہ کرنا صرف اس کی جان ہی تک مضر رہا۔ اور اب تو فسق کے سبب ایمان کی بھی خیر نہیں اس لئے علاج کی سخت ضرورت ہے ورنہ یاد رکھو کہ اگر یہ عشق ختم نہ ہوا تو عجب نہیں اعمال و ایمان ہی ختم ہو جائیں۔ چنانچہ کانپور میں ایک بوڑھے آدمی تھے وہ ایک بہو دن پر عاشق ہوئے۔ میں ان کے بڑھاپے کی وجہ سے ان کا ادب باپ کا سا کرتا تھا اور وہ طالب علم سمجھ کر میرا ادب کرتے تھے مگر اس حیا سوز عشق میں یہاں تک نوبت پہونچی کہ وہ سب ادب و حیا کو بالائے طاق رکھ کر ایک دن

مجھ سے کہنے لگے کہ اگر وہ یہود ن ہے تو میں یہودی ہوں۔ اگر وہ عیسائی ہے تو میں عیسائی ہوں۔ نعوذ باللہ وہ تھے تہجد گذار مگر دیکھئے ایک بدنگاہی سے سب ختم ہو گیا۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ اس سے بہت بچنا چاہیئے۔ ابن القیم نے دوا، الکافی میں ایک حکایت لکھی ہے ایک نہایت حسین عورت نے ایک آدمی سے حمام منجانب کا راستہ پوچھا کچھ نظر اور کچھ اس کی باتوں سے اور کچھ اس کی صورت سے یہ گرویدہ ہو گیا۔ اور اسے دھوکہ دیا کہ اپنے ہی مکان کو حمام منجانب بتا دیا جب وہ مکان میں گئی یہ بھی اندر گھس گیا۔ وہ تھی عفیفہ اس کی بدنیتی کو سمجھ گئی۔ اس نے کہا کہ میں تو خود تجھ پر فریفتہ ہوں مگر اس وقت میں بہت بھوکی ہوں۔ پہلے میرے لئے کچھ کھانے کو لاؤ۔ آپ بازار میں گئے۔ جب اس نے گھر اکیلا پایا تو چپکے نکل کر چلدی۔ اب جو کھانا لے کر آیا اور اسے نہ پایا تو مارے غم کے بیمار پڑ گیا اور یہاں تک کہ وقت اخیر آ گیا لوگوں نے کہا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہو تو یہ بجائے اس کے یہ کہتا ہے ؎

یَا رَبِّ سَائِلَۃٌ یَوْمًا وَقَدْ تَعِبَتْ ۔۔۔ اَیْنَ الطَّرِیْقُ اِلٰی حَمَّامِ مِنْجَابٍ

(اے رب حمام منجانب کے راستہ کو پوچھنے والی کہاں ہے)

اور اسی پر خاتمہ ہو گیا۔ انھوں نے ایک اور حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص ایک لڑکے پر عاشق تھا اس کے فراق میں بیمار ہو گیا۔ کسی نے اس لڑکے کو سمجھایا کہ تمہارے سامنے چلے جانے سے اُسے افاقہ ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ راضی ہو گیا۔ اس کو بھی کسی نے خبر دیدی کہ وہ لڑکا آ رہا ہے یہ مارے خوشی کے اُٹھ بیٹھا۔ پھر وہ راستہ ہی سے لوٹ گیا کہ جانے میں رسوائی ہے اس کی بھی اُسے کسی نے خبر دیدی وہ پھر گر پڑا اور یہ شعر پڑھنے لگا ؎

رِضَاكَ اَشْهٰی اِلٰی فُؤَادِیْ ۔۔۔ مِنْ رَحْمَۃِ الْخَالِقِ الْجَلِیْلِ

(تیری خوشنودی میرے دل کی زیادہ خواہش مند ہے خالق جلیل کی رحمت سے)

بس اسی پر دم نکل گیا۔ ایک اور حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص شہوات و معاصی میں

منہمک تھا اس سے اخیر وقت میں کلمہ پڑھنے کو کہا گیا تو کہتا ہے کہ اتنے معاصی کے ہوتے ہوئے کلمہ ہی سے کیا ہوگا اور اسی پر دم نکل گیا۔ کمبخت معاصی میں بھی خاصیت ہے کہ رحمت خداوندی سے مایوس کر دیتی ہے۔ تب ہی تو کلمہ سے انکار کیا اور اس کو بیکار سمجھا۔ اسی کے مناسب ایک واقعہ یاد آیا۔ ہمارے یہاں قریب کے ایک قصبہ میں ایک خون ہو گیا تھا۔ اس میں دو آدمی ماخوذ ہوئے اور دونوں کو پھانسی کا حکم ہو گیا۔ حکم کے بعد پوچھا گیا تم کچھ چاہتے ہو تو ایک نے تو کہا کہ میرے بھائی کو بلا دو اور مجھے غسل و نماز کی اجازت دو۔ چنانچہ اجازت ہو گئی اس نے اپنے بھائی کو چند وصیتیں کیں اور کہا کہ میاں آج میرا وقت پورا ہو چکا تھا اگر پھانسی نہ ہوتی تو میں اور کسی طرح مرتا۔ پھر اس نے دو رکعت نماز پڑھی اور کلمہ پڑھ کے پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ اور دوسرے نے اپنے عزیزوں سے اس قسم کی خرافات وصیتیں کیں کہ مثلاً میرا پیسہ کبھی کسی مسجد میں لگنے نہ پائے اس سے کہا گیا کہ کلمہ پڑھ تو کہتا ہے عمر بھر پڑھا تو کیا ہوا اور اب پڑھوں گا تو کیا ہوگا' اسی کے بعد پھانسی ہو گئی نعوذ باللہ۔ تو بہر حال بڑی ضرورت ہے ایسی چیزوں سے بچنے کی جن میں یہ آثار ہوں اور سب ہی معاصی ایسے ہیں خصوص یہ عشق نفسانی اور اس میں ایک اور بڑی آفت ہے وہ یہ کہ اگر کسی نے جوانی میں احتیاط اور توبہ نہ کی ہو تو یہ مرض بڑھاپے میں اور بڑھ جاتا ہے۔ اس پر ایک تفریع فقہی کرتا ہوں وہ یہ کہ بوڑھے آدمی سے اپنے سیانے لڑکے اور سیانی لڑکی کو زیادہ بچانا چاہیئے۔ وجہ یہ کہ جوانی میں اگر شہوت زیادہ ہوتی ہے تو قوت ضبط بھی زیادہ ہوتی ہے اور اس قوت ضبط ہی سے قوت شہوت میں لذت ہوتی ہے۔ تو اگر کوئی خوف حق سے ابھی ضبط نہ کرے گا تو لذت ہی کے لئے ضبط کرے گا۔ اور یہ لذت معین ہو جاوے گی ادامت ضبط پر اور اس سے رفتہ رفتہ وہ اس ضبط میں خوف حق کی نیت کر کے متقی بن جائے گا اور بوڑھے میں گو قوت شہوت کم ہے مگر قوت ضبط بھی کم ہے۔ کیونکہ شہوت اور ضبط کا دارو مدار حرارت غریزیہ پر ہے اور وہ بڑھاپے میں کم ہو جاتی ہے اس لئے اس میں ضبط کم ہوگا۔ پس وہ زیادہ احتیاط کے قابل ہے گو وہ بزرگ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اب تو یہ غضب ہے

کہ لوگ اپنی بہو بیٹیوں کو پیروں سے تو بالکل پردہ نہیں کراتے پیر خواہ جوان ہوں یا بوڑھے عورتیں ان کے ہاتھ پیر دباتے ہیں۔ اے اللہ کہاں گئی شریعت اور کہاں گئی شرم و غیرت۔ ہم نے مانا کہ پیر صاحب ایسے پیر اور ایسے متقی ہیں کہ ان سے خطرہ نہیں ہے مگر دوسروں کو اپنی بے حیائی کے لئے سند تو ہو جاوے گی۔ بہرحال یہ مرض نظر بد عشق نفسانی سخت مرض ہے مگر علاج اس کا بھی ہے البتہ ذرا داروئے تلخ ہے مگر اس تلخی کے ساتھ اس میں دین کی لذت بھی ہے سو اس کی لذت کے لئے تلخی کو تو گوارا کر لو۔ شاید کوئی کہے کہ تلخی میں لذت کہاں میں کہتا ہوں کہ کیا تم مرچ نہیں کھاتے کہ منہ سے بھی نہر جاری ہے اور ناک سے بھی اور آنکھ سے بھی مگر چھوڑتے نہیں تو دیکھئے تلخ ہے اور مزہ دار کسی کو مرچ کی عادت نہ ہو تو تمباکو لے لیجئے اس میں جتنی زیادہ تلخی ہو اتنا ہی زیادہ مزیدار ہوتا ہے۔ میں نے کبھی پیا نہیں مگر کھانے والے پینے والوں کے قصے سنے ہیں اس لئے تقلیداً کہتا ہوں۔ ہائے افسوس لذت کے سبب مرچوں کی تلخی مطلوب اور تمباکو کی تلخی مطلوب مگر دین کی لذت کے لئے علاج کی تکلیف سے نفرت کیا دین کی تمباکو اور مرچوں کی برابر بھی وقعت نہیں۔ اب وہ علاج بتلاتا ہوں جس سے اس مرض عشق نفسانی سے شفا ہو جائے اور وہ علاج صرف یہ ہے کہ اس کی طرف بالکل توجہ نہ کرے، اور توجہ کی بھی قسمیں ہیں۔ توجہ بالقلب۔ توجہ باللسان۔ توجہ بالبصر۔ توجہ بالید۔ توجہ بالرجل۔ تو ان سب کو ترک کرے یعنی نہ تو اس کا تصوّر کرے نہ تذکرہ کرے نہ اس کی طرف دیکھے نہ اسے ہاتھ سے چھوئے نہ پیروں سے چل کے اس تک جائے۔ خلاصہ یہ کہ جتنا اس سے بُعد ہوگا اتنا ہی نفع ہوگا۔ اس میں مجھ کو ایک احتمال پیدا ہوتا ہے کہ شاید کوئی یہ علاج شروع کر کے اگلے ہی دن کہنے بیٹھ جائے کہ علاج تو کیا مگر اب تک وہی حال ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایسا تو امراض حسیہ میں بھی بہت ہوتا ہے کہ ایک مسہل میں درد نہیں جاتا بلکہ بعض دفعہ اکیس اکیس مسہل ہوتے ہیں تب کہیں مادہ خارج ہوتا ہے کوئی علاج نہیں چھوڑ دیتا

تو اس میں بھی جلدی نہ کرو علاج کرتے رہو ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور نفع ہوگا۔ ایک اشکال اور رہ گیا وہ یہ کہ اور سب باتیں تو آسان ہیں مثلاً ہاتھ پاؤں، زبان، آنکھ سب قابو میں ہیں مگر دل کو کیا کریں کہ خیال آتا ہی ہے میں کہتا ہوں اَلنَّفْسُ لَا تَتَوَجَّهُ اِلٰی شَیْئَیْنِ فِیْ اٰنٍ وَّاحِدٍ (نفس ایک آن میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا) یہ قضیۂ لازمہ عادیہ ہے۔ اب تم یہ کرو کہ کسی دوسری شئے کا تصوّر کیا کرو اور اس کی طرف قصداً توجہ نہ کرو۔ قصداً دوسری طرف توجہ رکھو۔ اس سے وہ آپ دفع ہو جاوے گا۔ بلکہ یہ بھی نہ کرو کہ اس کو قصداً دفع کرو کیونکہ اس سے تو پھر ادھر توجہ ہو گئی۔ غرض رفع کے قصد سے بھی ادھر متوجہ نہ ہو اس کی مثال تار بجلی جیسی ہے کہ اگر ہٹانے کے لئے ہاتھ لگا دیا جب بھی لپیٹے گا اور کھینچنے کے لئے لگایا تب بھی لپٹے گا۔ اس کا علاج یہی ہے کہ ہاتھ ہی مت لگاؤ نہ ہٹانے کے قصد سے نہ لانے کے قصد سے اور یہی علاج ہے بعینہٖ وساوس کا کہ ادھر توجہ نہ کی جاوے اس سے خود دفع ہو جاویں گے۔ اس میں بھی بعضے ایسے ہی غلطی کرتے ہیں کہ قصداً انھیں ہٹاتے ہیں حالانکہ اس کا یہ علاج نہیں یہ لوگ علاج ہی میں غلطی کرتے ہیں۔ بقول مولانا ؎

گفت ہر داروکہ ایشاں کردہ اند　　آں عمارت نیست ویراں کردہ اند
بے خبر بودند از حال دروں　　استعیذ اللہ مما یفترون

(اس نے کہا انھوں نے جو کچھ علاج و معالجہ کیا سب بیکار ثابت ہوا اندرونی حال سے وہ بے خبر تھے اللہ سے اس بات کی پناہ جس کو وہ اظہار افترا کرتے ہیں وہ یہی ہے کہ مرض کچھ تھا اور بتلا دیا کچھ)

مولانا نے یہاں ایک حکیم کی حکایت لکھی ہے کہ اس نے ایک مریض کو دیکھ کر کہا تھا کہ جتنا لوگوں نے علاج کیا ہے سب الٹا ہی کیا اسی طرح غیر محقق کے علاج کو محقق کہتا ہے۔ تصوف واقعی حکمت ہے اس میں بڑے ماہر محقق کی ضرورت ہے۔ پس وسوسہ کا صحیح علاج یہ ہے کہ اس کو قصداً دفع نہ کرو بلکہ دوسری طرف توجہ کر لو۔ اب ایک اشکال اور رہ گیا وہ یہ کہ ہم نے یہ بھی کر کے دیکھ لیا ہے

کہ جب وساوس آتے ہیں تو الفاظ قرآنیہ کی طرف توجہ منصرف کردیتے ہیں مگر اس وقت بھی سامنے وساوس ہوتے ہیں اس کے جواب کی حقیقت سمجھنے کے لئے اول ایک مثال سمجھئے اور وہ بھی مسئلہ فلسفہ ہی کا ہے وہ یہ کہ علم مناظرہ کا مسئلہ ہے کہ کسی چیز کے نظر آنے کی حقیقت یہ ہے کہ آنکھ سے شعاعیں نکلکر مرئی کو محیط ہوجاتی ہیں مگر جو چیزیں مرئی کے گرد و پیش ہیں وہ بھی کچھ نہ کچھ نظر آتی رہتی ہیں۔ مثلاً ایک نقطہ ہے آپ ٹکٹکی باندھ کر اسی کو دیکھ رہے ہیں مگر اس کے آس پاس کے دوسرے نقطے بھی بلا قصد نظر آتے ہیں اگر کوئی استاد حکم دے کہ اور نقطہ کو مت دیکھو تو مطلب یہ ہے کہ بالقصد مت دیکھو کیونکہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) اسی طرح نفس کی حالت ہے کہ جب قصداً تم مثلاً الفاظ قرآنیہ کو ذہن سے دیکھ رہے ہو تو علاج پر عمل ہوگیا۔ گو اور چیزیں جو متخیلہ میں جمع ہیں وہ بھی ذہن کے سامنے آجاویں پس ان کا خیال آنا منع نہیں ہے ہاں لانا منع ہے۔ اب اس پر کوئی کہے کہ جب وساوس آگئے خواہ لانے سے یا بے لائے تو پھر علاج کا فائدہ کیا ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ چند روز تک تو وہ آتے ہیں اور اس کے بعد پھر خود بخود غائب ہوجاتے ہیں اور یہی فرق ہے بصیرت و بصارت میں کہ بصر سے تو وہ گرد پیش کی چیزیں غائب نہیں ہوتیں مگر بصیرت سے غائب ہوجاتی ہیں پھر اس وقت یہ حالت نصیب ہوجاتی ہے ؎

دل آرامے کہ داری دل درو بند　　　دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس محبوب سے تم نے دل لگا لیا ہے تو پھر تمام جہان سے آنکھیں بند کرلو)

اسی طرح تم وساوس کے ہجوم کے وقت کسی دوسری چیز کی طرف توجہ منعطف کرلیا کرو چاہے وہ دوسری چیز کلام ہو چاہے ڈھیلا مٹی اور چاہے تصور شیخ ہو۔ اس اثر میں سب برابر ہیں اور یہاں سے مسئلہ تصور شیخ کی تحقیق بھی ہوگئی کہ وہ کوئی مستقل شغل نہیں ہے بلکہ اس کا تصور اس لئے دل میں لاتے ہیں تاکہ خطرات دفع ہوجاویں اور گو یہ غرض دوسرے تصورات سے بھی حاصل ہوسکتی ہے۔

مگر شیخ محبوب ہے اور محبوب کے تصور کو اس غرض میں زیادہ دخل ہے اس لئے اہلِ طریق نے اس کو اختیار کیا، پھر جب خطرات دفع ہو گئے جس کی ضرورت سے تصور شیخ کیا تھا، اب شیخ کو بھی رخصت کرو اور خالص ذاتِ الٰہی کی طرف توجہ کرو۔ جیسے دولھا اور دلہن کے بیچ میں مشاطہ اور نائن ہوتی ہے مگر جب خلوت کا وقت آتا ہے تو صرف دولھا اور دلہن رہ جاتے ہیں اور نائن باہر کر دی جاتی ہے تو تصور شیخ مشاطہ تھا توجہ بحق کے وقت یہ بھی رخصت بقول مولانا ؎

جلوہ بیند شاہ و غیر شاہ نیز | وقت خلوت نیست جز شاہ عزیز

(جلوہ دیکھتا ہے بادشاہ اور غیر بادشاہ بھی خلوت کے وقت بادشاہ کے سوا کوئی عزیز)

اور یہاں سے یہ بھی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ پیر کا حق اس کو رہبر بنانا ہے پرستش نہیں کیونکہ معبود کبھی علٰحدہ نہیں کیا جاتا اسی طرح عشقِ نفسانی میں جب محبوب کا خیال بلا قصد آئے تو اس وقت دوسرے کسی مباح التصور امر کا تصور کرلے تو اس سے محبوب مجازی کی صورت آہستہ آہستہ اکھڑ کر جاتی رہتی ہے اور یہ امر بھی قابل تنبیہ ہے کہ جاتے رہنے کی بھی یہ صورت ہوتی ہے کہ اول بتدریج میلان میں کمی ہوگی پھر چند روز کے بعد میلان بالکل نہیں رہے گا۔ مگر اس کے بعد کچھ کچھ محبت معلوم ہوا کرے گی مگر ادنیٰ اہتمام سے وہ مضمحل ہو جاوے گی۔ اس میں بھی بعضوں کو غلطی ہوتی ہے کہ جب دوبارہ پھر میلان ہوا تو وہ سمجھا کہ میرا مرض پھر عود کر آیا۔ مگر نہیں وہ مطمئن رہے کہ مرض نے عود نہیں کیا ورنہ ادنٰے اہتمام سے دفع نہ ہوتا ازالہ رذائل کے معنے یہی ہیں کہ غلبہ جاتا رہے۔ باقی جڑ باقی رہتی ہے اور اس قدر اصل کا باقی رہنا بھی حکمت الٰہیہ ہے۔ کیونکہ اگر رذائل کی اصل ہی نہ رہے تو پھر مقاومت کا اجر کیسے ملے۔ اسی کو مولانا

فرماتے ہیں ؎

شہوت دنیا مثال گلخن است — کہ از و حمام تقویٰ روشن است

(دنیا کی طلب اور خواہش مثل انگیٹھی کے ہے کیونکہ اس سے تقویٰ کا حمام روشن ہے)

گوبر کے اُپلے اور کنڈے نجس تو ہیں مگر یہ نہ ہو تو حمام کا پانی گرم نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح تقوے کا نور بھی شہوت ہی سے ہے بشرطیکہ اس کو جلاتے رہو، جمع کر کے دل میں نہ رکھو۔ الحمد للہ ہر پہلو سے یہ مسئلہ صاف ہو گیا۔ اور عشق نفسانی کا علاج معلوم ہو گیا۔ یعنی اس طرف التفات نہ کرو اس سے محبت مغلوب ہو جاوے گی۔ اور مطلق میلان نہ ہونا مطلوب نہیں اگر اتنا میلان بھی نہ ہو تو بے حسی ہے جیسے گلاب میں سے کسی کو خوشبو کے بجائے بدبو آنے لگے تو معلوم ہوا۔ اس کی قوت شامہ خراب ہو گئی ہے کیونکہ اچھی چیز تو اچھی ہی لگنی چاہیے۔ اگر ایسا ہو تو یہ شخص سلیم الحواس نہیں۔ پس میلان سے تو نہ گھبراؤ۔ ہاں اس کے مقتضا پر عمل نہ کرو۔ یعنی میلان کے بعد اس کو دیکھنے میں مشغول نہ ہو کہ خدا تعالیٰ سے تعلق رکھ کر قصداً دوسری طرف مشغول ہونا بڑی بے غیرتی کی بات ہے۔ اگر خود غیرت نہیں رہی تو غیرت حق کو سوچو اور دیکھو کہ اگر کسی کو بادشاہ کا قرب میسر ہو جاوے اور اس کو محل میں جانے کی اجازت ہو جاوے اور وہ وہاں جا کے لونڈیوں کو دیکھنے لگے تو بادشاہ کیا کہے گا۔ اسی طرح خدا کی بھی غیرت آتی ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے لوگ فواحش میں مبتلا ہوں۔ حقیقت میں خدا کے ہوتے ہوئے کسی اور پر نظر کرنا بڑی سخت بات ہے۔

اختتام مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک خوبصورت عورت جا رہی تھی ایک شخص اس کے پیچھے ہولیا وہ سمجھ گئی۔ اس نے کہا کہ مجھے کیا دیکھتا ہے میرے پیچھے میری دوسری بہن آ رہی ہے وہ مجھ سے بہت زیادہ حسین ہے۔ یہ اس کے دیکھنے کے لئے پلٹا۔ اس نے ایک دھول رسید کیا اور کہا کہ ؎

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی　　در بیان دعوئے خود صادقی

پس چرا بر غیر افگندی نظر　　این بود دعویٔ عشق اے بے ہنر

(اس نے کہا اگر تو عاشق ہے اور اپنے دعوے کے بیان میں سچا ہے تو پھر تونے غیر کی طرف کیوں نظر ڈالی بے غیرت کیا یہی عشق کا دعویٰ تھا)

جب اس عورت کو غیر پر نظر کرنے سے اتنا غیظ ہوا تو کیا حق تعالےٰ کو غیظ نہ ہوگا۔ غرض یہ مرض بڑا شدید ہے۔ ابتدا میں تو صغیر ہے مگر اثر میں اور انتہا میں شدید و مدید ہے۔ اصل میں یہ گفتگو اس پر تھی کہ ایک شخص بے نمازی کو تو بُرا سمجھتا ہے مگر اپنی بدنگاہی سے نفرت نہیں کرتا جس کے اتنے مفاسد ہیں۔ تو بعضے ایسے لوگ جن کے عقائد تو درست ہیں اور یہ غلطی بکثرت اہل علم کو یا انکی صحبت والوں کو ہوتی ہے یعنی اگر وہ کسی کی نسبت مثلاً یہ سُن لیں کہ یہ شخص بدعات سے مجتنب ہے گو اس کے تمام اعمال تباہ ہوں۔ بس پھر اُسے اس اہل بدعت پر بھی ترجیح دینے لگتے ہیں۔ جہاں منشا بدعت کا محض خطائے اجتہادی ہی ہو یہ غلو فی الدین نہیں تو کیا ہے۔ انھوں نے عبادت کے درجات کو چھوڑ کر عقائد کو اساس قرار دے کر فروع کو بے وقعت سمجھ لیا ہے جیسے کوئی درختوں کی شاخیں کاٹ دیا کرے اور صرف تنہ دیکھ کر خوش ہوا کرے کہ باغ لگا ہوا ہے حالانکہ اس باغ دین کی تو یہ شان ہے ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود　　گر ز باغِ دل خلالے کم بود

(عارف کے دل پر ہزاروں غم ٹوٹ پڑتے ہیں اگر اس کے باغ دل سے ایک تنکا بھی کم ہوجاتا ہے)

کہاں تو یہ حالت کہ ایک تنکا بھی کم ہوتا گوارا نہیں اور کہاں یہ کہ تمام شاخیں کاٹ کے بھی خوش ہیں کہ جڑیں تو ہیں۔ ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص بنیاد بھر کر خوش ہو کہ میں نے مکان بنا لیا ہے۔ اگر کسی نے بنیادیں بھر دیں اور مکان بنایا نہیں تو برسات آنے دو۔ اب پانی برسا تو کپڑے بہے بہے پھرتے ہیں

سب سامان بھیگ رہا ہے۔ اب سمجھ میں آیا کہ میں نے بڑی غلطی کی جو بنیا دکو کافی سمجھا۔ کام تو دیواروں اور چھت سے پڑے گا گو بقار ان کا بیشک بنیاد سے ہے۔ میں نے بڑی نادانی کی کہ پہلے ہی بنیاد کے ساتھ دیواریں نہ بنالیں ہاں البتہ اس سے اتنا فائدہ توضرور ہوگا جس کی بنیادیں بھری ہوئی ہیں اس کی عمارت جب بنے گی جلدی تیار ہو گی۔ اور مضبوط بنے گی اور جس کی جڑ ہی کھوکھلی ہوگی اس کو مشکل ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ اہم الاجزار عقائد بیشک ہیں مگران کے بعد دوسرا درجہ اعمال کا بھی تو آخر کچھ ہے ایک غلطی اس کے برعکس ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ بعض لوگ تصحیح عقائد کو ضروری نہیں سمجھتے تسبیح، نماز، روزہ تو کرتے ہیں مگر عقائد کی تصحیح کی فکر نہیں کرتے اور اکثر اس میں ان کا زیادہ قصور نہیں ہے۔ قصور ان کا ہے جو بیعت کرکے کچھ وظائف بتلا کے خالی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کی فکر ہی نہیں کہ عقائد اس شخص کے کیسے ہیں جن کی یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ ایک درویش صاحب نے مجھ سے پوچھا تصور شیخ جائز ہے یا ناجائز۔ میں نے کہا پہلے آپ اس کے معنے بتایئے تو کہتے کیا ہیں کہ خدا کو پیر کی شکل میں سمجھنا۔ نعوذ باللہ۔ وہ تو حضرت پابند صوم و صلوٰۃ بھی تھے اور تہجد و ذکر والے بھی تھے اور عقیدہ یہ۔ اور پھر مزہ یہ کہ اس بدعقیدگی کو مضر نہیں سمجھتے۔ ایک شخص نے مجھے خط لکھا کہ جب نماز تنہا پڑھتا ہوں تو وساوس نہیں آتے۔ اور جماعت سے پڑھتا ہوں تو وساوس بہت آتے ہیں تو جی چاہتا ہے جماعت چھوڑ دوں۔ تو یہ بزرگ خلاف سنت کو سنت سے افضل سمجھ رہے تھے۔ درحقیقت یہ طریق بہت نازک ہے۔ عارف شیرازی نے خوب کہا ہے ؎

درراہِ عشق وسوسۂ اہرمن بسے است ہشدار گوش را بہ پیام سروش دار

(راہِ سلوک میں شیطان کے وسواس بہت ہوتے ہیں ہوشیار رہو اور وحی کی طرف کان لگائے رہو)

یعنی ہر قدم پر وسوسہ ہے شیطان کا بس وحی کا اتباع کرو دیکھئے کتنے بڑے دھوکے میں مبتلا کیا شیطان نے کہ حضورِ قلب نماز کی روح ہے اور ہر شے میں مقصود روح ہوتی ہے تو نماز میں بھی زیادہ مقصود حضورِ قلب ہی ہے اس کے بعد دیکھا کہ جماعت میں یہ روح ملتی نہیں اور قاعدہ ہے کہ اَلشَّیْءُ اِذَا خَلَا عَنْ فَائِدَۃٍ اِنْتَفٰی۔ یعنی جو شے مقصود سے خالی ہو گی وہ منتفی ہو جائے گی۔ بس یہ نتیجہ نکال کے گمراہ ہوا کہ جماعت ہی سے نماز نہ پڑھے۔ اس کا جواب قاطع بحث تو یہ ہے کہ ترکِ جماعت جب شریعت کے خلاف ہو تو اس میں ہزار مصالح ہوں سب لغو ہیں یہ تو سُنار کی سو کھٹ کھٹ کے مقابلہ میں لوہار کی ایک ہے۔ خیر میں کھٹ کھٹ کا ہی جواب دیتا ہوں کہ حقیقت میں یہ بناء الفاسد علی الفاسد ہے۔ اول تو مجھے اسی میں کلام ہے کہ حضورِ قلب کے یہی معنی ہیں جو سائل نے سمجھے۔ یعنی وساوس کا نہ آنا لفظ حضورِ قلب تو ایک تعبیر ہے اور حقیقت اس کی احضار القلب ہے اہل علم تو اتنے ہی سے سمجھ گئے ہوں گے مگر میں سب کے سمجھنے کے لئے تفصیل بھی کئے دیتا ہوں یعنی ایک تو ہے وساوس کی آمد اور ایک ہے آورد۔ سو آورد مضر ہے آمد مضر نہیں تو مقصود نماز میں صرف قلب کو اپنے قصد سے حاضر کرنا ہے پھر خواہ حاضر ہو یا نہ ہو اور یہ احضار خواہ ذکر کی طرف توجہ کرنے سے ہو خواہ مذکور کی طرف توجہ کرنے سے ہو یعنی اس کے دو طریقے ہیں۔ مبتدی کے لئے تو یہ ہے کہ ذکر کی طرف توجہ کرے اس کا طریقہ نہایت سہل۔ ہمارے استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے بتایا کہ نماز کے ہر جزو کو اپنے قصد سے ادا کرو۔ صرف یاد سے مت پڑھو۔ یعنی اب تو یہ عادت ہے کہ گھڑی کی کوک کی طرح اللہ اکبر کہہ لیا کہ یہ تو نماز کی کوک ہے اور الحمد اور انا اعطینا اور قل ہو اللہ یہ سب ہی کو ازبر ہے۔ بس شروع سے آخر تک سب خود بخود نکلتا چلا گیا۔ تو ایسا مت کرو بلکہ اللہ اکبر کہو تو سوچ کے اور ارادہ سے کہو کہ میں اللہ اکبر کہہ رہا ہوں۔ اس کے

بعد سبحانک اللہم پڑھو تو اس طرح پڑھو کہ ایک ایک لفظ کو مستقل ارادہ سے کہو پھر اسی طرح الحمد پڑھو۔ پھر اسی طرح سورت ملاؤ۔ غرض ہر ہر لفظ ارادہ سے ادا کرو۔ یہ تو مبتدی کا طریقہ تھا۔ اور منتہیٰ کا یہ ہے کہ بلا واسطہ حضرت حق کی طرف توجہ کو قائم کردے اور یہ حالت جب ہی حاصل ہوگی جبکہ اول مبتدی کی طرح عمل کرو گے۔ بس تم اول ذکر پر توجہ کرو پھر شدہ شدہ مذکور کی طرف توجہ حاصل ہوگی۔ اور اس سے ایک نکتہ اول سمجھ میں آیا ہوگا کہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ؕ (اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے قطع کر کے اسی کی طرف متوجہ رہو) تو یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ وذکر ربک کیوں نہیں فرمایا اسم کیوں بڑھایا۔ اس کے جواب میں بعض نے کہا ہے کہ اسم زائد ہے مگر میں کہتا ہوں کہ اسم کو زائد کہنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس میں مبتدی کا درجہ بتایا ہے کہ وہ اسم ہی کی طرف توجہ کرے تو کافی ہے پھر اسی سے مسمیٰ تک پہونچ جاوے اور وتبتل الیہ میں منتہی کا کیونکہ ابھی بلا واسطہ ذکر رب پر قدرت نہیں اس لئے اس کو ذکر اسم رب کافی ہے اور منتہی کو اس پر قدرت ہے۔ اس لئے اس کو حضرت حق کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ مگر یہ تفسیر نہیں نکتہ ہے لیکن اس پر میرا استدلال موقوف بھی نہیں۔ بہر حال احضار قلب کے دو طریقے ہیں ایک بواسطہ توجہ الی الذکر کے اور ایک بواسطہ توجہ الی المذکور کے تو روح نماز کی یہ احضار قلب ہے اگر اس احضار کے بعد وسوسے آدیں تو یہ حضور قلب کے منافی نہیں ہے تو جماعت کی نمازیں جب احضار کر لیا گو حضور نہ ہو تو یہ کہنا سراسر غلط ہو گیا کہ جماعت میں حضور قلب نہیں ہوتا تو دیکھئے کتنی بڑی دولت سے شیطان نے محروم کرنا چاہا تھا۔ حدیث شریف میں ہے۔ جماعت کی ایک نماز میں پچیس نماز کا ثواب ملتا ہے اس لئے کسی بات میں اپنی رائے پر عمل نہیں کرنا چاہیئے بلکہ شریعت پر چلتے رہو عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست | بر صراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

(شریعت میں جو حالت بھی سالک کو پیش آئے اس کے لئے بہتر ہے اے دل صراط مستقیم پر کوئی شخص گمراہ نہیں ہے)

صراط مستقیم سے مراد شریعت ہے مطلب یہ ہے کہ جب حالت شریعت کے موافق ہو تو پھر جو حالت بھی بلا اختیار پیش آوے جیسے لفظ آیداس پر دال ہے وہ سب خیر ہی ہے خواہ وساوس ہوں یا اس سے بڑھ کر کچھ ہو۔ اسی طرح دعا میں بھی شیطان بہکاتا ہے کہ ہماری دعا ہی کیا جب حضور قلب نہ ہو۔ ایک شخص میرے پاس آئے کہ میں بہت مقروض ہوگیا ہوں میرے لئے ادار قرض کی دعا کردو۔ میں نے کہا میں بھی کرتا ہوں تم بھی کرو کہنے لگے اجی ہماری دعا ہی کیا۔ میں نے کہا کلمہ طیبہ جس سے آدمی مسلمان ہوتا ہے افضل ہے یا دعا کہنے لگے کلمہ طیبہ۔ میں نے کہا بس یہی کہہ کے اسے بھی چھوڑ دو کہ ہمارا اسلام ہی کیا۔ میں کہتا ہوں جو کچھ ہے اسی کو غنیمت سمجھو۔ بلا بودے اگر این ہم نہ بودے۔ (مصیبت ہوتی اگر یہ بھی نہ ہوتا) غرض ایسے ہی جہل سے لوگوں کے عقائد خراب ہورہے ہیں اور جب عقائد خراب ہوئے تو عبادت بھی ناقص ہوگی کیونکہ عبادت کے معنے عبد شدن ہے۔ اور اس میں عقائد و اعمال سب داخل ہیں جب ایک جزو بھی ناقص ہوا تو مجموعہ ضرور ناقص ہوگا۔ یہ پہلی اور دوسری غلطی تو عقائد و اعمال کے متعلق تھی۔ تیسری غلطی یہ ہے کہ بعض نے معاملات کو ضروری نہیں سمجھا چنانچہ اجارات و تجارات میں بیع و شرار میں باستثنار شاذ و نادر کوئی جانتا تک بھی نہیں کہ اس کے متعلق شریعت میں کچھ احکام بھی ہیں۔ ریل میں بے ٹکٹ سفر کرنے کو حرج نہیں سمجھتے۔ اور جو ٹکٹ لیتے ہیں تو قانون سے زائد اسباب لے جانیکو برا نہیں سمجھتے۔ حالانکہ ریل حق العبد ہے۔ جب ہم نے اس کو استعمال کیا ہے تو ہمیں اس کا حق معہودہ کرایہ بھی دینا چاہیئے اسی طرح مدارس اور انجمنوں کے چندے بھی حق العبد ہیں اس کی تحصیل میں جبر کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ بلکہ قصداً زیادہ دباؤ ڈالتے ہیں تاکہ زیادہ چندہ وصول ہو۔ اسی طرح کل معاملات میں سخت بے پروائی ہے۔ چنانچہ اس کی کھلی دلیل ہے کہ جس طرح نماز روزہ میں علمار سے پوچھتے ہیں معاملات میں کبھی نہیں پوچھتے۔ رہن نامہ۔ بیعنامہ کی دستاویز لکھ کر وکیل کو تو دکھلائیں گے کہ قانون حکومت کے خلاف تو نہیں مگر کسی عالم کو کبھی نہیں دکھائیں گے

کہ قانون شرعی کے تو خلاف نہیں اسی طرح مقدمہ میں جھوٹ بولنا کہ اس میں علماء سے بالکل نہیں پوچھیں گے کیونکہ یہ عام طور پر معلوم ہے لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ (اللہ کی جھوٹوں پر لعنت ہے) اس سے وہ سمجھتے ہیں کہ پوچھنے پر یہی فتویٰ ملے گا تو پوچھکر خود کیوں لعنت سُنی۔ اپنے فعل پر لعنت سننے سے عرب کے ایک معلم کا قصہ یاد آیا۔ کہ ایک لڑکا استاد سے قرآن کا سبق لے رہا تھا اور استاد کی طرف منہ کرکے اس آیت کا تکرار کر رہا تھا وَاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ط۔ وَاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ (قیامت تک تجھ پر اللہ کی لعنت ہے) استاد اس ہیئت خطاب سے جھنجھلا گیا اور کہا اِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ وَعَلٰى وَالِدَيْكَ (تجھ پر لعنت ہو اور تیرے ماں باپ پر بھی) لڑکا سمجھا کہ آیت یونہی ہوگی اس نے یوں ہی کہنا شروع کر دیا اِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ وَعَلٰى وَالِدَيْكَ (تجھ پر لعنت ہو اور تیرے ماں باپ پر بھی) غرض جھوٹ بولنے کی نسبت علماء سے نہیں پوچھیں گے میں کہتا ہوں کہ پوچھا تو ہوتا شاید اجازت ہی مل جاتی اور گو بات تو کہنے کی نہ تھی مگر کیا کروں اس کے کہنے کی بھی ضرورت ہے کہ بعض جگہ جھوٹ بولنا بھی جائز ہے۔ تم پوچھ کے تو دیکھو معلوم ہوگا کہ کہاں کہاں جھوٹ بولنا جائز ہے۔ اس کی تفصیل میں اس وقت نہیں بتا سکتا کیونکہ میں اس وقت فقہ کی کتاب تھوڑا ہی لکھ رہا ہوں۔ مگر اس اجمال کے بعد اتنا ضرور کہوں گا کہ علماء سے وحشت مت کرو اور یہ بدگمانی مت کرو کہ وہ ہر جھوٹ کو حرام ہی کہیں گے اسی سے تو لوگ درویشوں کو اچھا سمجھتے ہیں کہ کسی کو روکتے ٹوکتے نہیں شفقت سے کسی کو بچہ کہدیا اور کسی کو باوا بنا دیا۔ مگر بشارت دیتا ہوں کہ آجکل نو نو عمر مولوی بھی اسی طرح کا برتاؤ کرنے لگے ہیں۔ کہ باوجودیکہ وہ آپ کی سب بیہودہ حالت سمجھتے ہیں مگر کچھ نہیں کہتے۔ مثلاً میں کسی کی ڈاڑھی مونڈی ہوئی دیکھتا ہوں مگر کہنا دل شکنی سمجھتا ہوں۔ تو آپ اس زمانہ کے نو عمر تہذیب دیدہ مولویوں کے پاس جائیے اور نو عمر کے یہ معنے نہیں کہ وہ آپ سے بھی زیادہ نو عمر ہوں۔ اس وصف میں تو آپ ہی بڑھے ہوئے ہیں۔ جیسے نوشیرواں سے کسی نے شکایت کی کہ فلاں شخص نے مجھ پر ظلم کیا

تو نوشیرواں نے کہا کہ تو کوتاہ قامت یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی شخص کوتہ قامت پر ظلم کر سکے وہ خود متقنی ہوتا ہے اس نے کہا اجی جس نے مجھ پر ظلم کیا وہ مجھ سے زیادہ کوتہ قامت ہے۔ چنانچہ تحقیقات سے ایسا ہی نکلا۔ بلکہ نوعمر کا مطلب یہ ہے کہ بہت پرانے مولویوں کے سامنے جو نوعمر ہوں گے وہ تسامح کریں گے تو اغلاقاً وہ بھی درویش ہی ہیں وہ آپ کی بہت خاطر کریں گے۔ تہذیب کے ساتھ پیش آویں گے یہاں تک کہ آپ کے دل میں ان کی محبت پیدا ہوگی تو آپ خود ڈاڑھی رکھ لیں گے کیونکہ ان کے اخلاق دیکھ کر پھر آپ منڈواتے ہوئے خود شرمائیں گے مگر ان کو سن کر ڈر مت جانا کہ بس جی اگر مولویوں سے ملنے میں یہ خاصیت ہے کہ خود بخود ڈاڑھی رکھ لیتا ہے تو ہم ملیں ہی گے نہیں۔ جیسے کسی نے کہا تھا کہ چاند دیکھ کے روزہ فرض ہوجاتا ہے۔ دوسرے نے کہا میں دیکھوں ہی گا نہیں جو فرض ہو۔ مگر صاحب جب مولوی آپ سے ڈاڑھی کی بات کچھ نہ کہیں بلکہ آپ بدون کہے خود ہی رکھ لیں تو اس میں آپ کا کیا حرج ہے۔ جبکہ آپ بلا کلفت ڈاڑھی رکھ لیں پھر ڈرنے کی کیا بات ہے۔ بہرحال آپ علماء سے ضرور ملئے اور ہر بات کو ضرور پوچھئے بلکہ میں تو علی سبیل الترقی کہتا ہوں کہ اگر عمل نہ بھی کرنا ہو تب بھی پوچھئے کیونکہ اگر مسئلہ بھی نہ معلوم ہوا تو ایک تو ترک علم کا گناہ ہوا اور ایک ترک عمل کا تو اس میں ایک یہی فائدہ ہوگا کہ تحصیل علم کا فرض تو ادا ہوجائے گا۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اگر کبھی توفیق عمل کی ہوگئی تو علم اپنے پاس ہوگا جیسے کسی کو خارش ہو اور وہ نسخہ کا ایک جزو گندھک سُن لے اور بدبودار سمجھ کے نسخہ ہی نہ سُنے یہ اس کی غلطی ہے کم از کم نسخہ تو معلوم کرلے کہ اگر کبھی علاج کو جی چاہے تو اس وقت طبیب کو تو ڈھونڈنا نہ پڑے گا۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ علم کی خاصیت خشیت ہے۔ امام غزالی نے ایک بزرگ کا مقولہ لکھا ہے کہ ہم نے علم اور اغراض سے سیکھا تھا کہ تحصیل علم کے بعد قاضی بنیں گے مفتی بنیں گے مگر علم نے ہمیں چھوڑا نہیں اور وہ ہمیں اللہ ہی کا بنا کے رہا تو علم کی خاصیت ہے کہ کبھی نہ کبھی خشیت پیدا ہو ہی جاتی ہے تو علماء سے احکام ضرور پوچھ لیا کرو اور ہر امر کے متعلق پوچھا کرو مثلاً مقدمہ عدالت میں

لے جانا ہو تو بھی علماء سے پوچھ لیں۔ جب آپ ہر بات کو پوچھیں گے اس وقت آپ کا یہ گمان کہ علماء سے صرف لَا یُجُوز (یہ جائز نہیں) کا سبق پڑھا ہے غلط ثابت ہو گا۔ بہرحال معاملات سے آجکل اتنی بےفکری ہے کہ اکثر لوگ معاملات کو دین میں داخل ہی نہیں سمجھتے۔ اور اگر کوئی پوچھنے کو کہے بھی تو کہتے ہیں کہ مولویوں کو اس سے کیا بحث، ان کا کام نماز روزہ کا بتلانا ہے۔ یاد رکھو کہ یہ خیال بالکل ہی غلط ہے۔ قرآن و حدیث و فقہ میں سب چیزوں کی تعلیم موجود ہے۔ معاملات کی بھی، معاشرت کی بھی لیکن معاشرت کو معاملات سے بھی زیادہ دین سے الگ سمجھتے ہیں۔ کہ لباس پہنے گے دوسری اقوام کا سا۔ باتیں کریں گے تو انھیں کی زبان یا انھیں کے لب و لہجہ میں حتیٰ کہ کمرہ بھی سجائیں گے تو اسی طرح جن کے معنے یہ ہوئے کہ ہم معاشرت میں دریوزہ گر ہیں دوسری قوموں کے اور گویا اس کا اقرار ہے اور نہایت گندہ اقرار ہے کہ ہمیں اس کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہیں دی۔ حالانکہ ان قوموں نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تعلیم سے معاشرت کا طریقہ سیکھا ہے۔ مگر آپ کی تو وہ حالت ہے ؎

یک سبد پر ناں ترا بر فرق سر — تو ہمی جوئی لب ناں در بدر
تا بزانوئے میاں قعر آب — از عطش وز جوع گشتی خراب

(تیرے سر پر روٹیوں کا ایک ٹوکرا رکھا ہے تو ایک روٹی کے ٹکڑے کو دربدر مارا پھرتا ہے۔ تو زانو تک نہر میں کھڑا ہوا ہے اور پیاس اور بھوک سے خراب ہو رہا ہے)

یعنی سر پر ٹوکرا روٹیوں کا اور پیروں کے نیچے اتنا پانی کہ تو سارے شہر کو سیراب کر دے مگر عادت تو پڑ گئی ہے بھیک مانگنے کی۔ اس لئے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں۔ جیسے ایک چلتی پھرتی عورت کی حکایت ہے کہ بھیک مانگتی پھرتی تھی مگر تھی حسین بادشاہ کو پسند آگئی۔ اپنے ساتھ لے گیا مگر تھوڑے دنوں میں دُبلی ہو گئی بادشاہ کو تعجب ہوا کہ اس عیش و عشرت میں دُبلا ہونے کے کیا معنے اس سے بھی پوچھا کہنے لگی میں آپ کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتی مجھے کھانا الگ دے دیا کیجئے

(باقی آئندہ ان شاء اللہ تعالیٰ)

خیر بادشاہ نے ایسا ہی کیا تو تروتازہ ہونا شروع ہوئی۔ بادشاہ نے ماماؤں سے کہا کہ یہ کیا کھاتی ہے انھوں نے کہا ہمارے سامنے تو کھاتی نہیں کھانا رکھوا کر ہم کو رخصت کر دیتی ہے اور کمرہ بند کر لیتی ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ روشندان میں سے دیکھو کہ کیا کرتی رہے۔ جب ماما کھانا رکھ کر چلی گئی تو اس نے حسب معمول دروازہ بند کر لیا۔ اب روشن دان میں سے جھانک کے دیکھا تو اس نے یہ کیا کہ روٹی تو ایک طاق میں رکھی اور پیالہ دوسرے طاق میں اور رکابی تیسرے طاق میں۔ اور ایک طاق کے پاس گئی اور کہا کہ اللہ کے واسطے ایک ٹکڑا دے دے۔ بس ایک لقمہ کھا لیا۔ پھر دوسرے طاق کے پاس گئی اور اسی طرح کہا پھر ایک لقمہ کھا لیا بس اسی طرح سارا کھانا کھا لیا، بادشاہ کو یہ حال معلوم ہوا تو فوراً اُسے نکالا کہ کمبخت اب بھی بھیک کی عادت نہ گئی۔

واللہ مجھے بہت افسوس ہے کہ یہی حالت ہماری ہے کہ اپنے یہاں کی دولتیں ناپسند اور دوسروں کے یہاں کی مانگی ہوئی بھیک پسند۔ کوئی کام ہندو کرنے لگیں یہ بھی ان کی دیکھا دیکھی کھڑے ہو جائیں گے عیسائیوں کو کچھ کرتے دیکھیں گے ان کی حرص میں یہ بھی کرنے لگیں گے۔ اور پھر تقلید بھی کریں گے تو کورانہ۔ بے سمجھے بوجھے پھر اس میں بھی استقلال نہیں کہ چار دن میں بیٹھ رہیں گے۔ حالانکہ دوسری قومیں جو کام کرتی ہیں نباہ کر کرتی ہیں۔

غرض معاشرت بھی جزو دین ہے اس کو بھی اپنے ہی گھر سے سیکھو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی ایسی اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی ہے کہ دنیا کا کوئی مذہب کوئی رواج ایسا نمونہ پیش نہیں کر سکتا میں بطور

مثال کے ایک چھوٹا سا نمونہ پیش کرتا ہوں کہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم فرمایا ہے کہ اگر تین آدمی ہوں دو آدمیوں کو تیسرے سے جدا ہوکے سرگوشی کی اجازت نہیں۔ سلف کا دستور یہ تھا کہ ایسے موقع پر جب چوتھا آدمی آجاتا تب ان میں سے دو اٹھ کے سرگوشی کر لیتے تاکہ تیسرے کی دل شکنی نہ ہو۔ میں کہتا ہوں کسی مذہب میں بھی ایسا قانون ہے۔ بھلا کوئی اس کی نظیر دکھلا تو دے۔ آج کسی تمدن میں بھی ایسے قانون کا پتہ نہیں واقعی جو اصول اسلام نے سکھلائے ہیں وہ کسی قوم میں بھی نہیں۔ میں تو دوسری اقوام کے سامنے اپنے بزرگان دین کو پیش کرکے یہ کہوں گا ؎

أُولَئِكَ آبَائِي فَجِئْنِي بِمِثْلِهِمْ   إِذَا جَمَعَتْنَا يَا جَرِيرُ الْمَجَامِعُ

(یہ ہیں ہمارے آباء (بزرگ) تو اے جریر ان کی مثل تو ہمارے پاس لا
جبکہ ہم مجمعوں کو جمع کریں)

بھلا کوئی لا سکتا ہے ایسے اصول بس ہیں تو وہی معاشرت چاہیئے جس کی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی اور گو وہ ظاہر میں شان دار نہ ہو تو نہ ہو مگر واللہ ہیبت اصلی اسی میں ہے۔ بقول مولانا ؎

ہیبت حق است ایں از خلق نیست   ہیبتے از صاحب ایں دلق نیست

یہ شعر حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے قصے میں ہے کہ اون کو سفیر روم نے اینٹ پر سر رکھ کر سوتے دیکھا تھا اور اسی حالت میں جب چہرۂ مبارک پر نظر پڑی تو مارے رعب کے کانپ اٹھا۔ اس پر سخت متعجب ہوا اور یہ فیصلہ کیا کہ بے شک یہ شخص حق پر ہے اور یہ حق ہی کی ہیبت ہے ؎

ہیبت حق است ایں از خلق نیست   ہیبتے از صاحب ایں دلق نیست

(یہ ہیبت حق کی ہے خلق کی نہیں ہے کچھ ہیبت صاحب دلق کی نہیں ہے)

اب بھی دیکھ لیجئے کہ جس شخص کو اللہ سے جتنا تعلق ہوتا ہے قلوب میں اتنی ہی ہیبت زیادہ ہوتی ہے کہ بادشاہ سے بھی نہیں ہوتی اور اس ہیبت کے ساتھ ہی اس کی محبت بھی بے حد ہوتی ہے۔ بہرحال یہ تو ہماری روزمرہ کی معاشرت کا حال ہے۔ پھر شادی بیاہ میں اور غمی کی رسموں میں تو شریعت سے استفتار کون کرے یہ تو گویا ہماری قومی باتیں ہیں، شریعت کو ان سے کیا غرض نعوذ باللہ۔ اسی لئے ان رسموں میں وہ روپیہ اڑتا ہے کہ خدا کی پناہ۔

ہمارے اطراف میں کیرانہ ایک قصبہ ہے وہاں کا قصہ ہے کہ ایک گوجر بیمار ہوا۔ اس کا بیٹا حکیم کے پاس آیا اور کہنے لگا اجی حکیم جی جس طرح ہو اب کے تو میرے باپ کو اچھا ہی کردو۔ کیونکہ چاول بہت مہنگے ہیں، برادری کو کہاں سے کھلاؤں گا۔ مجھ کو باپ کے مرنے کا تو غم نہیں ہے صرف برادری کو کھلانے کی فکر ہے۔ کس قدر معاشرت بگڑی ہے۔ اسی طرح خود ہمارے قصبہ کا واقعہ ہے کہ ایک ساس مرگئی تو بہو بیٹھی رو رہی تھی کہ کفن دفن تو کسی طرح چندہ خیرات سے ہو ہی جائے گا مگر آٹھ آنے کے پان برادری کیلئے کہاں سے لاؤں، جب میں نے سُنا تو اپنے گھر میں کہا کہ گو ایسے موقع پر رسماً جانا جائز نہیں اور تم کہیں آتی جاتی بھی نہیں ہو۔ مگر خدا کے لئے جس کے گھر میّت ہو وہاں ضرور جایا کرو اور جا کے پان دان پر قبضہ کرلیا کرو۔ اور کسی کو پان نہ کھانے دو۔ یہ کہاں کی مصیبت ہے۔ چنانچہ انھوں نے جب سے ایسا کیا۔ الحمد للہ ہمارے یہاں سے تو یہ رواج اُٹھ گیا۔ کیوں صاحب یہی معنی ہیں دین کے کہ اس طرح پرایا مال کھا جایا کرو۔

اس وقت بہت وقت ہو گیا ہے اس لئے میں پانچواں جزء (یعنی اخلاق کے بیان پر ختم کردوں گا۔ اوّل یہ سمجھئے کہ اخلاق کیا چیز ہیں اس کی حقیقت ہے اپنے نفس کی اصلاح کرنا، اس کا تو کہیں نام و نشان بھی نہیں رہا۔ بس

مرید ہو گئے اور عقیدہ پکا لیا کہ پیر اللہ میاں کے یہاں بخشوائیں گے۔ ادھر پیر روٹیوں سے مطمئن ہو گئے کہ اب سلسلہ میں تو آہی گیا پھر کیا غم گویا ایک خاندانی رسم ورواج بن گیا ہے۔ چنانچہ بعض اطراف میں یہ قاعدہ ہو گیا ہے کہ اگر ایک خاندان میں کا ایک شخص کسی کا مرید ہو گیا تو اب سارے خاندان کو اسی کا مرید ہونا ضروری ہے۔ پھر ان کی اولاد کو اس پیر کی اولاد کا مرید ہونا ضروری ہے گو اہلیت کا نام ونشان بھی نہ ہو تو بجز گمراہ کرنے کے اس مشیخت کا کیا نتیجہ ہے۔ ایک ایسے ہی گمراہ کن پیر جی کا قصہ یاد آگیا کہ مریدوں کے گھر گوجروں کے کسی گاؤں میں پہونچے کچھ دُبلے ہو رہے تھے ایک گوجر مرید نے پوچھا پیر جی دُبلے کیوں ہو رہے ہو۔ انھوں نے کہا کہ کمبختو تم لوگ نہ نماز پڑھتے ہو نہ روزہ رکھتے ہو تمہارے بدلہ مجھ ہی کو روزہ نماز کرنا پڑتا ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ بھی فکر کہ تم سب کے بدلے مجھ ہی کو پل صراط پر چلنا پڑتا ہے پھر بتلاؤ دبلا ہوں یا نہ ہوں۔ مرید بڑا خوش ہوا کہ واقعی پیر جی ہماری طرف سے بڑی محنت کرتے ہیں۔ خوش ہو کے کہنے لگا کہ جا فلانا کھیت وہاں کا تم کو دے دیا۔ پیر جی تھے ہوشیار کہا چل کے قبضہ کرادے۔ اب یہ بڑے خوش کہ اچھا احمق پھنسا دھانوں کے کھیت میں پانی تو بہت ہوتا ہے اور مینڈ ذرا پتلی ہوتی ہے جس کو عادت نہ ہو وہ اس پر سے نہیں گذر سکتا۔ پیر جی اس پر سے چلے تو پیر لڑ کھڑایا اور کھیت میں جا رہے۔ مرید نے جو پیر جی کو گرتے دیکھا تو اوپر سے ایک لات دی کہ تو بڑا جھوٹا ہے جب اتنے چوڑے راستہ پر نہیں چل سکا تو پلصراط پر کیا چلے گا جو بال سے بھی زیادہ باریک ہے جا ہم کھیت نہیں دیتے۔ اب پیر جی کو کچھ تو گرنے کا کھسیان پن اور کچھ لات کی چوٹ اور کچھ کھیت نہ ملنے کا غم بیچارے کا بہت ہی بُرا حال ہوا۔ غضب تو یہ ہے کہ ایسے

جھوٹوں نے سچوں کو بھی بدنام کر رکھا ہے تو اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ بڑا خوش قسمت ہے وہ شخص جسے رہبر محقق مل جائے وہ رہبر کسی کے بتانے سے نہ بناؤ بلکہ علامات سے خود منتخب کرو اور چند علامتیں ہیں بس انھیں سمجھ لے اس کے بعد انتخاب آسان ہو جائے گا۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھو کہ اُسے علم دین ہے یا نہیں۔ اور یہ ضرور نہیں کہ وہ عربی ہی جانتا ہو۔ چاہے اردو فارسی ہی جانتا ہو یا یہ بھی نہ جانتا ہو۔ مگر بقدر حاجت دین کے احکام سے واقف ہو مگر یہ اس کا مطلب بھی نہیں کہ صرف راہ نجات ہر نی کے قصہ ہی کا عالم ہو۔ بلکہ عقائد و دیانات۔ معاملات۔ معاشرات۔ اخلاق سب شعبوں کو اچھی طرح جانتا ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ وہ ان چیزوں کو جانتا ہے یا نہیں۔ سو اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ چند روز اس کے پاس رہ کر دیکھو کہ ہر امر میں اپنی معلومات سے مریدوں کی اصلاح کرتا ہے یا نہیں۔ اور اگر پاس نہ رہ سکو تو وقتاً فوقتاً خط و کتابت سے پوچھتے رہو اگر اسے ضروری مسائل بھی معلوم نہ ہوں تو اس کو تو چھوڑو دوسرے کی تلاش کرو۔ اور دوسری علامت یہ ہے کہ وہ خود بھی شریعت پر عامل ہو۔ تیسری علامت یہ ہے کہ اُسے عادت ہو طالبین کو امر و نہی کرنے کی سختی سے یا نرمی سے چوتھی یہ کہ اس کی صحبت میں رہ نہ بروز حق تعالیٰ کی محبت بڑھتی ہو اور دنیا کی محبت گھٹتی ہو۔ پانچویں علامت یہ ہے کہ بزرگوں سے سنی ہے کہ اس کی طرف عوام و اہل دنیا کا رجحان کم ہو اور اہل علم و اہل فہم و صلحا کا رجحان زیادہ ہو۔ اور جس کی طرف عوام اور دنیا داروں کا رجحان زیادہ ہو وہ کامل نہیں ہے۔

پس جس میں یہ پانچوں علامتیں مل جاویں اُسے غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ اس کا اتباع مطلق کرنا چاہیئے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُس کے حکم کا منتظر رہے۔

بلکہ خود بھی پوچھتا رہے۔ مثلاً یہ دیکھے کہ میرے اندر تکبر ہے اس کا علاج پوچھے کینہ ہے علاج پوچھے۔ غصہ ہے، غیبت کی عادت ہے ان کا علاج پوچھے یا مال کی محبت ہے کہ فقیر کو دیتے ہوئے دم نکلتا ہے اس کا علاج پوچھے کیونکہ باطنی بیماری ایسی نہیں جس کا علاج نہ ہو اس لئے رب کو پوچھنا چاہیئے اور جو نہیں پوچھتا وہ گویا اپنے کو بیمار نہیں سمجھتا۔ یہ علامتیں اس لئے میں نے بتا دیں کہ بہت سے پیر بھی ایسے ہیں کہ ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل — و اندروں قہر خدائے عز و جل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید — و ز درونت ننگ میدارد یزید

(باہر سے کافر کی قبر کی طرح مزین اور اندر خدائے عز و جل کا عذاب ہو رہا ہے۔ باہر سے تو بایزید بسطامیؒ جیسے پر طعنہ زنی کرتا ہے اور تیری اندرونی حالت سے یزید بھی شرماتا ہے۔)

اور ان امراض کے علاج سے جیسا مریدوں کو بے فکر نہ ہونا چاہیئے شیوخ بھی بے فکر نہ رہیں اس لئے کہ جس طرح ہم بیمار ہیں اسی طرح بعض اوقات شیوخ بھی بیمار ہو جاتے ہیں اور اس میں تعجب ہی کیا ہے کیا حکیم بیمار نہیں ہوتے بلکہ یہ تو ایسے بیمار ہوتے ہیں کہ بعض دفعہ ان کی زندگی بھی خطرہ میں پڑ جاتی ہے وجہ یہ ہے کہ یہ اپنی طب کے گھمنڈ پر بد پرہیزی بہت کرتے ہیں۔ اسی طرح شیوخ ہیں کہ ان کی بیماری عوام سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ ان کے واسطے علاج کی صرف یہ صورت ہے کہ یہ بزرگوں کی کتابیں دیکھیں اور ان سے اپنا علاج کریں۔ اور یہ کتابیں مبتدی کو تو کافی نہیں ہوتیں مگر منتہی کو کافی ہو جاتی ہیں کیونکہ وہ فن جانتا ہے۔ اور ایک طریقہ یہ ہے کہ اپنے معاصرین میں سے جسے اہل دیکھے اس سے رجوع کرے۔ ایک علامت شیخ کامل کی یہ بھی ہے کہ یہ دیکھے کہ اس کے پاس بیٹھنے والوں میں اکثر کی حالت

روز بروز بہتر ہوتی جاتی ہے یا نہیں ۔ اگر اکثر کی حالت بہتر ہو تو وہ شیخ کامل ہے گو سب کی نہ ہو کیونکہ لِلْاَکْثَرِ حُکْمُ الْکُلِّ (اکثر کے لئے کل کا حکم ہے) اور اکثر کی خراب ہو اور ایک آدھ کی اچھی ہو تو وہ شیخ کامل نہیں اس سے ہرگز رجوع نہ کرے ورنہ یہ بھی ناقص ہی رہے گا کیونکہ جب پیر میں کمال نہیں اس میں کہاں سے آجائے گا۔ ایسا ہی ہوگا۔ جیسے ایک مرید نے کہا تھا۔ ہمارے اطراف میں ایک قصبہ ہے رامپور وہاں کا ایک شخص کسی پیر کا مرید ہوگیا۔ اس سے کسی نے پوچھا میاں کچھ ملا بھی۔ تو اس نے کہا کہ میاں جب سقاوہ ہی میں کچھ نہ ہو تو بدھنی میں کہاں سے آوے اور واقعی جب پیر ہی کی حالت درست نہیں ہے تو بیچارے مرید کی کب اصلاح ہوگی۔ غرض جس کے مریدوں میں اکثر کی حالت درست ہو وہ کامل ہے یہ علامت دیکھ کر تب اس سے اصلاح کا تعلق کرے اور اس کے متعلق ایک اور ضروری تنبیہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر اس میں سب علامات ہیں اور اس کی تعلیم وصحبت سے اکثر کی حالت درست بھی ہے مگر خود اس مرید کی حالت درست نہیں ہوتی تو اس سے یہ تو نہ سمجھے کہ شیخ کامل نہیں ہے لیکن شیخ سے اپنی حالت کا ذکر کرتا رہے۔ اور جب ایک معتدبہ مدت گذرنے پر بھی حالت درست نہ ہو تو بدگمانی تو جب بھی نہ کرے لیکن اس وقت یہ سمجھے کہ مجھے اس سے مناسبت نہیں ہے پھر کوئی اور مناسبت کی جگہ تلاش کرے اور شیخ سے بھی کہدے۔ اگر شیخ محقق ہے تو وہ فوراً دوسرے سے رجوع کرنے کی اجازت دیدے گا۔ اور اگر دوکاندار ہے تو مکدر ہوگا۔ تو اس حالت میں وہ واجب الاتباع بھی نہیں۔ دوکانداروں کی تو یہ حالت ہے کہ چاہے طالب کی کتنی ہی پریشانی وناکامی بڑھ جاوے مگر یوں کبھی نہ کہیں گے کہ میں تمہارے لئے کافی نہیں اور سے رجوع کرو۔ جیسے مدعی طماع طبیب کہ چاہے مریض مر ہی جاوے مگر اپنے علاج کے قاصر ہونے

سا کبھی اقرار نہ کریں گے۔ جیسے ایک جاہل حکیم کا قصہ ہے کہ اس نے کسی مریض کو بڑا سخت مسہل دیدیا تھا۔ تیمار دار نے خبر دی کہ حکیم جی دست بہت آرہے ہیں کہا آنے دو مادہ بہت ہے اچھا ہے نکل جاوے۔ جب اور زیادتی ہوئی پھر اطلاع کی گئی۔ پھر یہی جواب ملا۔ غرض بار بار اطلاع ہوتی رہی اور حکیم جی یہی کہتے رہے کہ مادہ سخت ہے نکلنے دو۔ یہاں تک کہ ضعف کے مارے مریض کا دم نکل گیا۔ اس کی بھی اطلاع ہوئی تو حکیم جی کیا کہتے ہیں اللہ رے مادے جس کے نکلنے سے مرگیا خدا جانے رہتا تو کیا ہوتا۔ ارے منحوس مرنے کے بعد اور کیا ہوتا شاید دوزخی بنا دیتا۔ تو حضرت ایسے ہی بعضے طبیب روحانی بھی ہوتے ہیں محض اناڑی۔

جیسے دہلی میں کسی پیر نے ایک مرید کو حبس دم بتایا تھا۔ اب اُسے تکلیف ہوئی اس نے اطلاع کی کہا کئے جا مجاہدہ میں تو تکلیف ہوتی ہی ہے یہاں تک کہ اس غریب کا دم نکل گیا تو کہا چلو شہید ہوا۔ میں کہتا ہوں بیشک۔ مگر خبر بھی ہے کہ شہید وہ ہوتا ہے جسے کوئی ظالم قتل کرے تو یہ پیر ظالم ہوا۔ اسی لئے اس طریق میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے جلدی سے کسی کو پیر نہ بنانا چاہیئے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست   پس بہر دستے نباید داد دست

(آدمیوں کی صورت میں بہت سے شیطان بھی ہیں یعنی دھوکہ باز پیر پس ہر شخص کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دینا چاہیئے یعنی مرید نہ ہونا چاہیئے)

اور ایک جگہ علامات کے اسباب میں فرماتے ہیں ؎

کار مرداں روشنی و گرمی ست   کار دوناں حیلہ و بے شرمی ست

(مردان حق کا کام روشنی و گرمی یعنی محبت اور معرفت ہے۔ کمینوں یعنی دھوکہ باز پیروں کا کام حیلہ اور بے شرمی ہے)

روشنی سے مراد معرفت اور گرمی سے مراد محبت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس میں معرفت اور محبت کامل ہو اُس کو شیخ بناؤ۔ اور معرفت کے لوازم میں سے ایک یہ امر بھی ہوگا کہ اگر کسی عارض کے سبب اس سے نفع نہ ہو مرید کو دوسری جگہ جانے کو فوراً کہدے گا ورنہ بیچارہ مرید ہی میں دس کھوٹ نکالکر حیلہ بہانہ کر دے گا۔

ایک شیخ کامل محقق کا واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ہمارے دادا پیر حضرت میانجی صاحب سے کاندھلہ کے ایک عالم بیعت ہوئے جو پہلے مخالف تھے پھر موافق ہو گئے تھے۔ اور مخالفت کے زمانہ میں حضرت میانجی صاحب کی شان میں گستاخی کیا کرتے تھے۔ میانجی صاحب نے بیعت تو کرلیا اور طریق کی تعلیم بھی شروع کی۔ مگر چند روز کے بعد خود ہی فرمادیا کہ مولانا اس طریق کی بنا محض صدق وخلوص پر ہے اس لئے میں بے تکلف کہتا ہوں کہ آپ کو مجھ سے نفع نہ ہوگا۔ جس وقت میں آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اسی وقت آپ کے وہ پچھلے کلمات دیوار آہنی بن کر سامنے آجاتے ہیں۔ آپ کسی دوسرے سے رجوع فرمادیں اور میں دعا کرتا ہوں۔ آج کل خود تو کیا کسی دوسرے کے پاس بھیجیں گے۔ اگر کوئی خود سے بھی چلا جائے تو اس قدر ناراض ہوتے ہیں کہ گویا مرتد ہوگیا۔ تو شیخ محقق کی یہ شان ہوتی ہے۔ غرض جب شیخ کا انتخاب کر چکے جس کی یہ علامات ہیں جو مذکور ہوئیں تو اب اس کا کامل اتباع کرے کہ جو وہ کہے وہ کرے اور جو مرض وہ بتائے اس کا علاج کرے اور خود سے بھی اپنے امراض کا اظہار کرتا رہے اس بھروسہ پر نہ رہے کہ شیخ کو خود کشف سے معلوم ہوگیا ہوگا۔ اول تو یہ ضروری نہیں دوسرے جب طبیب سے مزید اطمینان کے لئے نبض وقارورہ دکھا دینے کے بعد بھی حال بیان کرتے ہیں تو یہاں بھی ایسا ہی کرو یہ بھی تو طبیب روحانی ہے

تیسرے مانا کہ بغیر کہے پیر کو انکشاف ہی ہو گیا ہو مگر بغیر کہے اُسے آپ کی طلب کیسے معلوم ہو گی۔ بغیر طلب کے تو حق تعالےٰ بھی متوجہ نہیں ہوتے اَنُلْزِمُكُمُوهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كَارِهُوْنَ ط (کیا اس کو تمہارے گلے منڈھ دیں اور تم اس سے نفرت کئے جاؤ) یعنی اگر تم ایک مرتبہ ہماری رحمت سے بھاگتے ہو تو جاؤ ہم ہزار دفعہ مستغنی ہیں اور طالب کے لئے یہ وعدہ ہے۔ مَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْهِ ذِرَاعًا وَمَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْهِ بَاعًا (جو شخص میری طرف ایک بالشت آتا ہے میں اس کی طرف ایک گز آتا ہوں اور جو شخص میری طرف ایک گز آتا ہے میں اس کی طرف ایک باع (دونوں ہاتھ) آتا ہوں) تو طالب کی طرف خود اس قدر متوجہ ہوتے ہیں کہ اس کی ذراسی حرکت پر وہ خود برسوں کی مسافت طے کر دیتے ہیں۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست تا بجو شد آبت از بالا و پست
تشنگاں گر آب جویند از جہاں آب ہم جوید بعالم تشنگاں

(پانی کو کم تلاش کرو پیاس پیدا کرو تا کہ تمہارے لئے پانی بلندی اور پستی سے جوش مارے پیاسے اگر پانی تلاش کرتے ہیں جہان میں پانی بھی ڈھونڈھتا ہے پیاسوں کو دنیا میں)

حضرت فرید الدین عطار فرماتے ہیں ؎

گر تو ہستی طالب حق مرد راہ درد خواہ و درد خواہ و درد خواہ

(اگر تو طالب مرد سالک ہے تو درد عشق طلب کر درد عشق طلب کر)

پھر مولانا فرماتے ہیں ؎

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود ہر کجا مشکل جواب آنجا رود
ہر کجا دردے دوا آنجا رود ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

(جہاں پستی ہوتی ہے پانی وہیں جاتا ہے جس جگہ مشکل ہوتی ہے جواب وہیں دیا جاتا ہے جہاں مرض ہوتا ہے وہیں شفا پہنچتی ہے۔ جہاں بیماری ہوتی ہے وہیں دوا دی جاتی ہے)

اور فرماتے ہیں ؎

سالہا تو سنگ بودی دلخراش آزموں را یک زمانے خاک باش

(برسوں تک تو دل خراش پتھر تم بنے رہے آزمائش کے لئے ایک زمانہ خاک بن کر دیکھو)

ان سب میں طلب ہی کی ترغیب ہے کہ تم خود بھی تو طلب ظاہر کرو۔ ایک شخص کے متعلق حاکم چاہتا ہے کہ اُسے تحصیلدار کردے۔ مگر چاہتا یہ ہے کہ یہ بھی تو منہ سے کہے۔ وجہ یہ کہ اگر یوں ہی مل جائے گی تو قدر نہیں کرے گا ؎

ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد گوہرے طفلے بقرص ناں دہد

تو اگر شیخ صاحب کو کشف بھی ہو تب بھی آپ کی طرف سے بھی تو طلب ہو۔ جب طلب ہوگی تب ہی عنایت ہوگی۔ یہی اصلاح اخلاق فقیری ہے۔ طریق حق جس کے لئے لوگوں نے ایک الگ جماعت تجویز کر رکھی ہے اور جس کی تعریف یہ گھڑ رکھی ہے کہ دنیا کے کسی کام سے تعلق نہ ہو حالانکہ اس فقیری کی یہ تعریف ہے۔ اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ یعنی اللہ سے ایسا ڈرو جیسا ڈرنے کا حق ہے حَقَّ تُقَاتِہٖ کی تفسیر یہ لکھی ہے کہ یُطَاعُ وَلَا یُعْصٰی۔ یُطَاعُ کے معنی ہیں اطاعت کیا جاوے یہ طوع سے ماخوذ ہے اور طوع کہتے ہیں رغبت اور خوشی کو تو اطاعت خوشی سے کہنا ماننا ہوا۔ اب سچ کہو کہ کیا کسل کے وقت نماز رغبت سے پڑھی جاتی ہے۔ بخل کے وقت زکوٰۃ خوشی سے دی جاتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ بس اسی کی کسر ہے ہماری غلامی میں۔ تو معلوم ہوا کہ کوئی ایسا بھی درجہ ہے جس میں اعمال شرعیہ طبیعت ثانیہ بن جاویں کہ بے تکلف خوشی سے ادا ہونے لگیں۔ اور یہ ہے وہ درجہ جو کنز و ہدایہ میں نہ ملے گا۔ بلکہ وہ اِس طرح ملے گا ؎

قال را بگذار و مرد حال شو　　　پیش مردے کاملے پا مال شو

(قال کو چھوڑ و حال کو پیدا کرو یہ اس وقت ہوگا جب کسی اہل اللہ کے قدموں میں جاکر پڑجاؤ)

گر تو سنگ خارہ مرمر شوی　　　چوں بصاحبدل رسی گوہر شوی

(اگر تو سخت پتھر مرمر بھی ہو جب کسی اہل دل کے پاس پہونچے گوہر ہوجائے)

یہ انھیں اہل دل کی صحبت کا اثر ہے کہ پتھر کو گوہر بنادیتے ہیں۔ اس دولت کی تحصیل کے لئے ان کا اتباع ضروری ہے وہی دل کی اصلاح کرتے ہیں جس کے متعلق ارشاد ہے اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ (جب وہ درست ہو تو تمام جسم درست ہوجاتا ہے) الحدیث۔ اور جب اصلاح قلب پر تمامتر اصلاح موقوف ہے۔ تو اس کا ضروری ہونا بھی ظاہر ہوگیا۔ کیا یہ حدیث اس حکم کے افادہ کے لئے کافی نہیں ہے۔ یقیناً کافی ہے۔ تو اب یہ کہنا کہ اس طریق کی پیروی کرنا سب کے ذمہ فرض و واجب نہیں۔ جیساکہ اس شعبہ کو اکثر لوگوں نے دین میں غیر ضروری قرار دے رکھا ہے۔ بالکل غلط ٹھہرا۔ لیکن اس میں دنیا کے چھوڑنے اور بیوی بچوں سے منہ موڑنے کی ضرورت نہیں۔ اور اسی سے تو لوگوں کو توحش ہوا ہے۔ اور اسی سے اس کو دین سے علیحدہ سمجھا ہے۔ سو ایسا نہیں بلکہ اسی عیش و راحت کی حالت میں طریق طے ہوسکتا ہے ؎

چو فقر اندر لباس شاہی آمد　　　بہ تدبیر عبید اللّٰہی آمد

(جب فقر لباس شاہی میں آیا تو اللہ کے بندہ کی تدبیر سے آیا)

محققین شاہانہ لباس کے ساتھ بھی تم کو درویش بنادیں گے اور بعضوں نے جو اچھا لباس چھوڑ دیا وہ اُن کا غلبۂ حال تھا۔ جیسے بعض لوگوں کی بیوی مرجاتی ہے تو بچوں کی محبت میں دوسری بیوی نہیں کرتے اور جن پر ایسا غلبہ نہیں ہوتا وہ بوڑھے ہوکر بھی نکاح کرتے ہیں گو لوگ ان کو ہنستے بھی ہوں مگر اُن کا کیا ضرر ہے آرام تو ملیگا

ہنسنے پر ایک بڑے میاں کا قصہ یاد آیا۔ ایک نوے سال کے بوڑھے نے جوان کنواری بچی سے نکاح کیا تھا۔ رات کو ماما صاحبہ آئیں کہ لڑکے کو گھر میں بلاتی ہیں۔ ماشاءاللہ کیسے اچھے لڑکے ہیں۔ جن کی ڈاڑھی سفید کالا ہو چکی ہے کچھ دانت بھی گر چکے ہیں۔ اور ساس جن کے ابھی بال بھی سفید نہیں ہوئے وہ بڑے میاں سے کہتی ہیں۔ بیٹا میں تمہیں لونڈی دیتی ہوں۔ بیٹا کیا کہتے ہیں کہ اجی اماں جان آپ یہ کیا کہتی ہیں۔ لونڈی نہیں میں تو بجائے بیٹی کے رکھوں گا۔ تو غرض جس طرح بعضے نکاح کرتے ہیں بعضے نہیں کرتے بس اسی طرح بعضے بزرگوں نے دیکھا کہ ہم خالق و مخلوق دونوں کے حقوق کو جمع نہ کر سکیں گے۔ انھوں نے تعلقات خلق کو چھوڑ دیا۔ ورنہ اس طریق میں فی نفسہٖ یہ مانع نہیں ہے۔ بس ہر شخص کے لئے ضرورت ثابت ہوئی کہ اپنے باطن کی درستی کرے اور اس کے لئے کچھ بیعت ہی کی ضرورت نہیں بلکہ اس میں تو بعض دفعہ مضرت ہو جاتی ہے کہ اگر کہیں پھنس گئے تو بس بعد تک بھر رہے ہیں کہ اب تو جو ہو گیا سو ہو گیا اور ایسے بہت کم ہیں۔ جو متنبہ ہو کر اپنے کو اس ورطہ میں نکال لیں بلکہ خود پیر کو بھی متنبہ کر دیں جیسے ایک دیندار مرید نے ایسی جرأت کی مگر لطافت کے ساتھ وہ دھوکہ میں آکر ایک دنیا دار پیر کے ہاتھ میں پھنس گیا۔ اس نے چاہا کہ پیر کی حالت پیر کے کان میں ڈالے۔ چنانچہ ایک بار پیر صاحب سے کہا آج میں نے ایک خواب دیکھا ہے، کہ میری انگلیاں گوہ میں بھری ہوئی ہیں اور آپ کی شہد میں۔ پیر نے کہا کیوں نہ ہو تم دنیا کے کتے ہو خباثت میں بھرے ہو۔ اور ہم بحمداللہ پاک وصاف شیریں ہیں کہا حضور ابھی خواب کا ایک جزو باقی ہے۔ وہ یہ کہ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ میں آپ کی انگلیاں چاٹ رہا ہوں اور آپ میری۔ اصل میں اس نے

لطافت سے یہ بات پیر کے کان میں ڈالی کہ آپ مجھ سے دنیا حاصل کر رہے ہیں اور میں آپ سے دین۔

تو بعض وقت اس طرح پھنس جاتے ہیں اس لئے بیعت میں جلدی نہیں چاہیئے پہلے خوب پیر کو اچھی طرح جانچ لے اور جانچنے کی صورت قابل اطمینان یہی ہے کہ چندے پاس رہے بلکہ اس میں بھی اچھی صورت یہ ہے کہ اس کے وطن میں جاکر رہے۔ اور اگر پاس رہنے کی گنجائش نہ ہو تو کم از کم برس دو برس خط و کتابت ہی کرے اور اس میں اپنے امراض لکھے اور ان کا علاج پوچھے جب اچھی طرح اطمینان ہو جاوے کہ نفع ہوگا تب بیعت کا بھی مضائقہ نہیں۔

یہ ہے بیان شعبۂ اخلاق کا اور اسی پر اپنے بیان کو ختم کرتا ہوں۔ اور مختصر الفاظ میں تمام بیان کا خلاصہ عرض کئے دیتا ہوں وہ خلاصہ یہ ہے کہ عبادت کے معنے ہیں عبد شدن یعنی غلام ہوجانا اور غلام اسی کو کہتے ہیں جو اپنے آقا کی تمام اوامر و نواہی میں اطاعت کرے۔ اور وہ اوامر و نواہی یہ ہیں کہ اپنے عقائد درست کیجئے، اعمال درست کیجئے۔ معاملات اور معاشرت درست کیجئے۔ اخلاق کی اصلاح کیجئے اور یہ موقوف اس پر ہے کہ علم دین کی کتابیں دیکھا کیجئے۔ خود بھی دیکھئے اور اپنے بچوں کو بھی پڑھایئے۔ اور اپنے دیکھنے میں جہاں سمجھ میں نہ آوے کسی عالم سے تحقیق کیجئے اور کسی زندہ اہل اللہ سے تعلق رکھئے اور اس سے اپنے امراض کا علاج پوچھتے رہیئے۔ اور عمل کرتے رہئے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اس طور پر بہت جلد کمال دینی حاصل ہوجائے گا۔ اور اس وقت آپ عبد کہلانے کے مستحق ہوں گے۔ بس اب میں ختم کرچکا حق تعالیٰ سے علم و عمل اور فہم و توفیق کی دعا کیجئے۔ فقط دعا۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلہ التبلیغ کا وعظ

— مسمّٰی بہ —

اسرار العبادۃ

— منجملہ ارشادات —

حکیم الاُمّت مجدّد الملّت حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی

(رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ)

ناشر:- محمّد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

ایم-اے جناح روڈ

سلسلہ التبلیغ کا واعظ مسمّٰی بہ

اسرار العبادۃ

اینَ	متیٰ	کم	کیف	لِمَ	من ای شان	ماذا	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	ہیئت بیان	سبب وعظ	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	.
در مدرسہ انوار العلوم [illegible]	۱۴ محرم ۱۳۴۲ھ شنبہ بعد فجر	۳ ½ گھنٹہ	کرسی پر بیٹھ کر	.	.	.	احقر عبدالکریم عفی عنہ	۳۰۰	.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعاء۔ الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ ط وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ط بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا فَاعْبُدْہُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِہٖ ھَلْ تَعْلَمُ لَہٗ سَمِیًّا ط (وہ رب ہے

آسمانوں اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں سو تو اس کی عبادت کیا کر اور اس کی عبادت میں قائم رہ بھلا تو کسی کو اس کا ہم صفات جانتا ہے)

یہ وہی آیت ہے جو اس کے قبل کے جلسۂ وعظ میں تلاوت کی گئی تھی اور اس جلسہ میں یہ بھی اطلاع دی گئی تھی کہ اس کے قبل بھی اسی کی تلاوت ہو چکی ہے گویا آج تیسری بار اس کی تلاوت کی گئی ہے، وجہ یہ ہے کہ ان دونوں جلسوں میں اس کے متعلق بیان مکمل نہ ہوا تھا اس واسطے حاجت اعادہ کی ہوئی تاکہ اس مضمون کی کسی قدر تکمیل ہو جاوے۔ اور کسی قدر اس لئے کہا کہ پوری تکمیل کے لئے تو مدت دراز چاہیئے۔ حتیٰ کہ تکمیل عرفی کے لئے بھی باقی تکمیل حقیقی کیلئے تو تمام عمر بھی کافی نہیں مگر خیر مَالَا يُدْرَكُ كُلُّهٗ لَا يُتْرَكُ كُلُّهٗ (تو کل نہ پا سکے تو کل کو بھی مت چھوڑ) کے قاعدہ پر جتنی تکمیل بھی اس مختصر وقت میں ہو سکتی ہو وہ تو کر دینا چاہیئے۔ بس ایسی حالت میں یہ تکمیل گویا بقدر ضرورت ہی ہو گی یعنی جن امور مہمہ کی طرف توجہ نہیں رہی ان کی طرف متوجہ کر دیا جاوے گا۔ کیونکہ اصل ہمارے تمام امراض کی بے توجہی ہی ہے کہ ہم کو تکمیل دین کی طرف توجہ نہیں اور چونکہ بحمد اللہ عقائد تو ان لوگوں کے جو شہروں میں رہتے ہیں یا جو تعلیم یافتہ ہیں اور ان کو صلحا کی صحبت میسر ہے کافی درجہ میں صحیح ہیں اس لئے عقیدہ کے متعلق تو کسی جدید تعلیم کی ضرورت نہیں ہے البتہ وہ مستحضر نہیں ہیں مگر ضرورت کے موقع پر ان کا استحضار بھی ہو جاتا ہے چنانچہ اگر کوئی ان سے پوچھے کہ تمہارا پروردگار کون ہے اور تم کس کی عبادت کرتے ہو تو وہی جواب میں کہیں گے جو حاصل ہے اس آیت کا اس سے ثابت ہوا کہ وہ عقائد ذہن میں حاضر تو ہیں مگر دوسری چیزیں ذہن میں اس قدر غالب ہو گئی ہیں کہ وہ حاضر بھی مثل غائب کے ہو گیا شاید کسی کو اس تقریر سے یہ خلجان ہوا ہو کہ اس کا کیا مطلب ہے کہ وہ حاضر بھی ہیں اور پھر مثل غائب کے ہیں۔ تو میں اس شبہ کے رفع کرنے کیلئے

ایک مثال بیان کرتا ہوں مثلاً موٹی سی بات ہے کہ خط لکھنے بیٹھئے تو کاغذ کا نظر آنا قلم کا نظر آنا روشنائی کا نظر آنا ضروری ہے مگر ان سب کے نظر آنے کے واسطے ضیا کی ضرورت ہے دن کو بھی اور رات کو بھی دن کو آفتاب کی روشنی کی مدد سے ہر چیز نظر آتی ہے اور رات کو لالٹین وغیرہ کی روشنی سے غرض نورانیت کی ضرورت ہر حال میں ہے کہ بغیر اس کی استعانت کے خط نہیں لکھ سکتے اور لکھتے وقت جب کاغذ پر اور حروف پر نظر پڑتی ہے تو اس ضیاء پر بھی ضرور پڑتی ہے۔ بلکہ اول روشنی ہی پر نظر پڑتی ہے۔ مگر سچ بتایئے کہ کبھی لکھنے کے وقت کسی کو بھی اس طرف توجہ ہوتی ہے کہ اول ہماری نظر ضیا پر پڑتی ہے عموماً کسی کو بھی اس پر التفات نہیں ہوتا لیکن اگر کوئی لکھتے ہوئے آپ سے پوچھے کہ کیا اس وقت آفتاب نکل رہا ہے تو آپ بلیساختہ کہیں گے کہ ہاں نکل رہا ہے اور اس جواب میں ذرا بھی تامل نہ کریں گے مگر باوجود اس کے پھر بھی دوسری طرف کی توجہ نے اس توجہ الی الضیاء کو مستور ہی نہیں بلکہ معدوم کر دیا ہے اب اس مثال سے آپ آسانی سے سمجھ گئے ہوں گے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک چیز ذہن میں موجود ہو اور پھر مثل غائب کے ہو بس اسی طرح عقائد کے دو درجے ہیں ایک تو مرتبہ تحقیق ورسوخ کا ہے اور ایک مرتبہ استحضار وتوجہ کا ہے جس کو دوسری عبارت میں یوں کہئے کہ ایک مرتبہ علم کا ہے اور دوسرا مرتبہ حال کا ہے تو بحمد اللہ مرتبہ تحقیق ورسوخ میں تو کمی نہیں ہے البتہ توجہ واستحضار میں کمی ہے حالانکہ اس کی بھی سخت ضرورت ہے اس لئے میں آج توجہ کے متعلق بیان کرتا ہوں اور اس کا محل متعدد امور ہیں جن میں سے بعض کا بیان تو کر چکا ہوں اور بعض باقی ہیں اور وہ بعض باقی کلیات کے درجہ میں بیان کئے جا سکتے ہیں جزئیات میں ان سے خود کام لے لیا جائے گا اس لئے ان کلیات کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہے یہ ہے مبہم تمہید اور مفسر یہ ہے کہ اس آیت کا حاصل امر بہ عبادت ہے اور یہی روح ہے اس آیت کی اور اس کے قبل اسی کی تمہید ہے اور اس کے بعد اسی کی تاکید ہے چنانچہ بقدر ضرورت عرض

کرتا ہوں وہ روح یہ ہے فَاعْبُدُوْہُ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ عبادت کیجئے۔ عبادت کا لفظ ہر مسلمان کے کان میں برابر پڑتا رہتا ہے اور اکثر اطلاق سے معنی بھی اس کے قریب قریب سب کو معلوم ہیں جس سے اس کے معنی و مفہوم کے متعلق بیان کرنا تو کوئی نئی بات نہ ہوگی البتہ کمی یہ ہے کہ عبادت کی حقیقت ہمارے ذہن میں نہیں آتی اور اسی لئے اس کے حقوق کی طرف بھی توجہ نہیں چنانچہ جب ہم اپنی حالت کا موازنہ کرتے ہیں تو بہت شرم آتی ہے کہ قرآن میں تو عبادت کے متعلق امر کا صیغہ ہے کہ جس کے معنی یہ ہیں کہ عبادت ضروری ہے اور یہاں اس کا پتہ بھی نہیں تو اگر حقیقت عبادت کی معلوم ہو تو ادھر توجہ بھی ہو اس لئے اس کو بتلاتا ہوں اور بہت سہل عنوان سے بتلاتا ہوں سو عبادت کا وہ سہل عنوان ہے عبد شدن یعنی غلام ہو جانا تو فَاعْبُدُوْہُ کے یہ معنی ہوئے کہ غلام بن جاؤ اب اس عنوان ہی پر نظر کر کے اب آپ اپنی حالت کو دیکھ لیجئے کہ آیا ہم نے غلامی اختیار کی ہے یا نہیں اور اختیار کی قید میں نے اس لئے لگائی کہ غلامی کی دو قسمیں ہیں ایک تو اضطراری وہ یہ کہ جس نے خریدا وہ مالک ہو گیا اور خرید شدہ غلام ہو گیا جس میں غلام کے اختیار کو اصلا دخل نہیں سو اس قسم کی غلامی تو غلام کا کوئی کمال نہیں یہ تو ایجاب و قبول کے بعد بلا اس کے اختیار کے ہو ہی جائے گا جیسے عورت پر طلاق کہ ادائے صیغ طلاق سے فوراً ہو جاوے گی چاہے عورت چاہے یا نہ چاہے یا کوئی مر جاوے تو متروکہ وارث کی ملک میں ہو جاوے گا خواہ وہ ارادہ کرے یا نہ کرے۔ اور ایک غلامی اختیاری ہے کہ اپنے قصد سے کسی کا منقاد و مطیع ہو جاوے اسی کا نص میں امر ہے اور یہی کمال مطلوب ہے یہ وجہ اختیار کے قید لگانے کی اور اضطراری غلامی تو تمام مخلوق کو حق تعالےٰ کے ساتھ حاصل ہے جس سے نکلنا محال ہے اور اوپر جو اضطراری غلامی کو وقوع طلاق و ثبوت ملک وارث کے ساتھ تشبیہ دی گئی اس پر کچھ مضمون ضروری اس اطلاق و میراث کے متعلق یاد آگیا وہ بھی استطراداً عرض کئے دیتا ہوں طلاق کے متعلق میرے پاس ایک استفتاء آیا تھا کہ ایک شخص نے

اپنی عورت کو طلاق دی۔ عورت نے کہا میں تو نہیں لیتی۔ سائل نے پوچھا تھا کہ اس صورت میں طلاق ہوئی یا نہیں یہاں سے جواب گیا کہ طلاق ہوگئی عورت کے نہ لینے سے کچھ نہیں ہوسکتا اس کو تو جھک مار کے لینا پڑے گی اور وہ نہ لے جب بھی پڑ جائے گی۔ ع گر نہ ستانی بستم میرسد (اگر نہیں لیتی تو زبردستی پہونچے گی)۔

اب اگر کوئی عورت کہے کہ میری لیاقت اور شائستگی تھی کہ میں نے تمہاری خاطر سے طلاق کو قبول کر لیا۔ تو کوئی عقلمند اس کا احسان مانے گا ہرگز نہیں بلکہ ہر شخص اس کی بات پر ہنسے گا کہ سبحان اللہ یہ بڑا کمال کیا آپ نے بھلا اس کے نہ قبول کرنے سے ہوتا کیا ہے ذرا قبول نہ کر کے تو دیکھ لیجئے۔ مثلاً طلاق وانقضائے عدت کے بعد کے متعلق اگر عدالت میں نالش کرے اپنے نان ونفقہ کی تو عدالت خواہ رسمی ہو خواہ قانونی خواہ عرفی ہو خواہ شرعی یہی حکم کرے گی کہ چونکہ طلاق واقع ہوگئی اس لئے نان ونفقہ واجب نہیں رہا جب نہ قبول کرنے کا کچھ اثر نہیں تو قبول میں کچھ کمال بھی نہیں قبول کرنا اسی چیز کا کمال ہے جو نہ قبول کرنے سے رد ہوسکے۔ اسی طرح ملک اضطراری بھی کوئی کمال نہیں چنانچہ میراث میں بھی یہی ہے کہ ملک اضطراراً ثابت ہوجاتی ہے جو رد سے بھی رد نہیں ہوتی۔ اگر ایک وارث یوں کہتا رہے کہ میں وارث نہیں بنتا۔ جب بھی وہ وارث ہوتا ہے۔ یہاں اس مثال پر ایک تفریع بھی ہے جس کے متعلق بعض اہل علم بھی ایک غلطی میں مبتلا ہیں وہ یہ کہ بعض دفعہ کوئی خاص وارث اپنا حق نہیں لینا چاہتا مثلاً بہن عام طور پر اپنا حق نہیں لیتی اور اس کی بناء ابتداءً تو ظلم سے ہوئی ہے مگر اب رسم عام ہوگئی کہ میراث میں سے حصہ لینا عورت کے لئے عیوب میں داخل سمجھا جاتا ہے اس واسطے وہ حصہ نہیں لیتی بلکہ یہ کہدیتی ہے کہ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ میرا حصہ بھائی لے لے۔ تو اس کے اس کہنے سے بھائی اس بہن کے حصہ کا مالک نہیں ہوتا کیونکہ اول تو جب اس رسم ورواج کی بناء ظلم پر ہے تو بہن نے طیب قلب سے اپنا حصہ نہیں چھوڑا اور بدون طیب قلب کے کسی کا مال دوسرے کے لئے حلال نہیں۔ دوسرے اگر فرض کیجئے کہ اس کہنے کی بناء ظلم بھی نہ ہو بلکہ طیب خاطر سے بھی کہدے تب بھی بوجہ اس کے

اضطراراً مالک ہوجانے کے وہ حصہ اس کی ملک ہوگیا اور ملک ہوجانے کے بعد کوئی عقد انتقال ملک کا پایا نہیں گیا اس لئے وہ حصہ اس کی ملک سے خارج نہیں ہوا بلکہ وہ ترکہ میں سے اپنے حصہ کی بدستور مالک ہے۔ اب اس مسئلہ کے چند فروع ہیں ایک یہ کہ اگر اس نے اپنی زندگی میں نہ لیا تو مرنے کے بعد بہن کی اولاد اس کا حصہ پاوے گی وہ اگر ماموں سے لینا چاہیں تو شرعاً مطالبہ کرسکتے ہیں اس میں غلطی کی بناء یہ ہوئی ہے کہ بہن کے اس کہنے کو کہ میں اپنا حصہ لینا نہیں چاہتی کافی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ کافی نہیں اس پر شاید یہ سوال ہو کہ اچھا پھر کیا کہیں کیا یوں کہدے کہ میں اپنے حصہ سے دست بردار ہوتی ہوں سو یہ بھی کافی نہیں کیونکہ ابراء دیون سے ہوتا ہے اعیان سے نہیں ہوتا یعنی اگر کسی کے ذمہ میرے دس روپے آتے تھے اور میں نے کہا کہ میں نے یہ روپیہ معاف کردیئے تو میرے اس کہنے سے قرض اس کے ذمہ سے ساقط ہوگیا یہ تو ہے برارت عن الدین اور اگر میرا قلمدان رکھا ہے میں نے کہا جاؤ میں نے تمہیں یہ قلمدان معاف کردیا تو اس کہنے سے نہ وہ میرے ملک سے خارج ہوا نہ آپ کی ملک میں داخل ہوا وہاں وَهَبْتُ نَحَلْتُ اَعْطَيْتُ (میں نے ہبہ کیا یا بخشش کیا یا عطا کیا) یا اور انہیں کے ہم معنی الفاظ کی ضرورت ہوگی۔ اسی طرح تمام شرائط ہبہ کا پایا جانا ضروری ہوگا۔ اس واسطے بہن کے معاف کردینے سے وہ حق وراثت معاف نہیں ہوا۔ اور نہ بھائی کی ملک میں داخل ہوا کیونکہ وہ حصہ حصہ عین ہے دین نہیں ہے اگر اس کے واقعی دینے ہی کی ہو تو اس کو الفاظ ہبہ کے ساتھ ہبہ کرنا چاہیئے یا بیع کرنا چاہیئے اور جو کچھ کرے اس کے شرائط پورے ادا کرنا چاہیئے مثلاً اگر ہبہ کرے تو مسئلہ یہ ہے کہ قبل تقسیم کے ہبہ صحیح نہیں مثلاً ایک جائداد قابل تقسیم ہے اور اس میں بہن کا حصہ ہے اور بہن نے تقسیم سے پہلے ہبہ کیا تو یہ ہبہ جائز نہیں اور اگر تقسیم کے بعد ہبہ ہوا ہے تو بشرط قبض صحیح ہے۔ غرض ہبہ صرف کاغذی نہیں ہونا چاہیئے حسی و حقیقی ہونا چاہیئے کاغذ تو محض تکمیل ہبہ کی سند اور حکایت ہے جس سے پہلے محکی عنہ کا وجود ضروری ہے محض کاغذی کارروائی پر ایک

حکایت یاد آئی۔ ایک مہاجن تھا نہایت محاسب مگر عقل سے کورا وہ اپنے کنبہ کو ساتھ لیکر بہلی میں سوار ہو کر کہیں سفر کو نکلا راستہ میں ایک ندی پڑی بہلبان سے کہا ٹھہر جاؤ میں ذرا حساب لگالوں کہ پانی کتنا ہے بانس لے کے پانی میں اترا اور جا بجا پانی کو بانس سے ناپ لیا کہ یہاں ایک ہاتھ ہے آگے دو ہاتھ ہے آگے چوتھائی بانس ہے اس سے آگے آدھا اور پھر ایک بانس ہے سو بعض جگہ ڈوباؤ کی مقدار بھی تھا مگر اس نے اس سرے سے اس سرے تک سب ناپ کر حساب کر کے اوسط نکالا کہ کمر تک ہے تو بہلی کیوں ڈوبنے لگی بہلی بان سے کہا چل وہ چلا آگے جا کے بہلی لگی ڈوبنے تو آپ لگے پھر اپنا حساب جانچنا کہ کہیں غلطی تو نہیں ہوگئی۔ حساب بالکل ٹھیک تھا تو آپ کہتے ہیں لیکھا جوں کا توں پھر کنبہ ڈوبا کیوں۔ میں نے اس واسطے یہ قصہ سنایا کہ خود قانون داں بھی اس کاغذی تقسیم کو حقیقی تقسیم سمجھتے ہیں حالانکہ شرعاً جو تقسیم مطلوب ہے وہ کاغذی نہیں کہ سہام قائم کر دیئے حسی حد بندی ہونا چاہیئے یہ تو ہبہ کے لئے قضاءً شرط ہے ایک شرط دیانتاً بھی ہے وہ یہ کہ خوش دلی اور طیب خاطر سے ہونا چاہیئے اگر خوش دلی نہیں ہے تو ہبہ سے ملک تو ہو جاوے گی مگر ملک خبیث رہے گی۔ فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا ط (یاں اگر وہ بیویاں خوش دلی سے چھوڑ دیں تم کو ان مہر میں کا کوئی جزء، تو تم اس کو کھاؤ خوشگوار سمجھ کر) اس کی صریح دلیل ہے یہ آیت زوجین کے بارہ میں ہے اور ظاہر ہے کہ میاں بی بی میں جتنی بے تکلفی ہوتی ہے اتنی بھائی بہن میں نہیں ہوتی مگر دیکھئے کہ میاں بی بی کے بارہ میں بھی یہ ارشاد ہے کہ اگر وہ مہر معاف کر دیں طیب خاطر سے تو کھاؤ ورنہ نہیں بس جہاں اتنی بے تکلفی بھی نہیں وہاں کیونکر طیب خاطر کا لحاظ ضروری نہ ہوگا نیز حدیث شریف میں ہے لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِطِيبِ نَفْسٍ مِّنْهُ (کسی مسلمان کا مال بدون اس کی خوش دلی کے حلال نہیں ہوتا) اور اب ہم دیکھتے ہیں کہ بہن جو دیتی ہے وہ طیب خاطر سے نہیں دیتی بلکہ بدنامی کے خوف سے

دیتی ہے اس لئے یہ ہبہ عنداللہ صحیح نہیں ہوا باقی یہ کہ خوشدلی کیونکر معلوم ہو تو اس کی صورت یہ ہے کہ جائیداد تقسیم کر کے بہن کو اس کے حصے پر قبضہ کرادو اور دو تین سال تک اُسے جائداد کی آمدنی سے منتفع ہونے دو کہ اُسے جائداد کا حظ تو آجائے اور معلوم ہو جائے کہ زمینداری کیسا چیز ہے اس کے بعد دیکھئے کتنی بہنیں اپنی حصہ دیتی ہیں۔ اس طیب خاطر پر ایک اور فرع بھی متفرع ہوتی ہے وہ یہ کہ آجکل چندہ کی عام رسم ہے اور اس کی کچھ پرواہ نہیں کی جاتی کہ دینے والا جبر و کراہت سے دیتا ہے یا کہ طوع و رغبت سے عام حالت یہ ہے کہ قصداً جبر و کراہت کے ساتھ وصول کیا جاتا ہے اسی لئے کسی صاحب اثر اور ذی وجاہت کو چندہ وصول کرنے کے لئے کھڑا کیا جاتا ہے خواہ وجاہت دینیہ ہو جیسے علماء و مشائخ اور خواہ دنیویہ جیسے عہدہ دار یا امراء۔ اب غور کرنے کی بات ہے کہ یہ چندہ حلال بھی ہوا یا نہیں اس کے لئے خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا فتویٰ کافی ہے لَایَحِلُّ مَالُ امْرَاءٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِیْبِ نَفْسٍ مِّنْہُ یعنی کسی شخص کا مال اس وقت تک حلال نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی خوش دلی نہ ہو اس کے متعلق وہ عذر کئے جاتے ہیں ایک تو یہ کہ صاحب ہم نے جبر کہاں کیا کوئی تلوار تھوڑا ہی اس کے گلے پر رکھی تھی کہ ہمیں زبردستی دو۔ ہم نے تو سب سے یہ بھی کہدیا تھا کہ خوشی ہو دو ورنہ مت دو۔ مگر میں کہتا ہوں کہ آپ کا یہ کہنا تو ایسا ہی ہوا جیسا کہ آپ کہیں دعوت میں جہاں صرف آپ کو بلایا گیا تھا اپنے بچوں کو بھی ہمراہ لے جائیں اور وہاں پہونچکر صاحب خانہ سے کہیں کہ صاحب خوشی ہو تو یہ بھی دستر خوان پر بیٹھیں ورنہ نہیں۔ اب بتلایئے وہ کیا کہے گا۔ زبان سے تو بیشک کہدے گا کہ اس پوچھنے کی کیا ضرورت ہے لیکن دل میں وہ کیا کہتا ہوگا اس کو خود سوچ لیجئے اگر کوئی آپ کے یہاں ایسا کرے تو آپ دل میں خود کہیں گے کہ یا اللہ یہ فوج کی فوج کہاں سے آگئی مگر زبان سے یہی کہیں گے کہ ہاں صاحب ضرور بیٹھیں تشریف

لائیے سب آپ ہی کا تو ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ یہ خوشی ہے یا صرف الفاظ ہیں خوشی کے یقیناً خوشی سے نہیں کہا جاتا مگر زبردستی کوئی سر پر آپڑے تو غریب کیا کرے کیا تہذیب کو چھوڑ کر صاف کہدے کہ یہ نہ بیٹھیں ایسی ہمت ہر ایک کو نہیں ہوتی ہاں بعضے صاف بھی کہدیتے ہیں۔ جیسے ایک شخص نے نماز کی نیت میں صفائی کی تھی ساڈھورے میں ایک واعظ آئے تھے وہ لوگوں کو لٹھ مار مار کے نماز پڑھاتے تھے۔ ایک بوڑھے شخص کو زبردستی مسجد میں نماز کے لئے لائے۔ وہ بیچارہ کھڑا ہوا اور نماز کی نیت کہلوائی تو آپ نے اس طرح نیت کی کہ نیت کرتا ہوں میں چار رکعت عصر کی منہ میرا طرف کعبہ شریف کے پیچھے اس امام کے ظلم اس مولوی صاحب کا اللہ اکبر۔ بیچارہ صاف دل تھا خدا کو دھوکا نہیں دیا اگرچہ ظلم ہی سے پڑھی مگر پڑھی تو اور پھر صاف کہہ بھی دیا کہ ظلم اس مولوی صاحب کا اس کو چھپایا نہیں اس شعر کا عامل تھا ؎

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند　　حق را بسجودے و نبی را بدرودے

(تم ان لوگوں میں سے ہرگز مت ہو جو اللہ تعالیٰ کو ایک سجدہ سے اور نبی (صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک درود سے دھوکہ دیتے ہیں)

اس بیچارہ نے جیسی پڑھی تھی زبان سے بھی صاف کہدیا کہ اس کی نماز ہماری ریا کی نماز سے تو اچھی تھی کہ ہم ظاہر میں تو خدا کے لئے نماز پڑھتے ہیں اور نیت دوسروں کو دکھانے کی ہے اور پھر اس کو چھپاتے ہیں اسی کی نسبت فرماتے ہیں ؎

بہ قمار خانہ رفتم ہمہ پاکباز دیدم　　چو بصومعہ رسیدم ہمہ یافتم ریائی

(قمار خانہ میں جاکر میں تمام لوگوں کو اصول کا پابند پایا، عبادت خانہ میں پہنچا تو ان کو اصول کا پابند نہ پایا)

حقیقت میں اس تقدس ریائی سے تو رندی اچھی لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ رندوں کو تقدس کی ضرورت نہیں بلکہ یہ معنی ہیں کہ اہل تقدس کو ریا سے بچنے کی ضرورت ہے اور رندوں کو تقدس کی ضرورت نہ یہ کہ عابد تو عبادت چھوڑدے

اور رندر رندی پر قائم رہے بلکہ گفتگو صرف یہ ہے کہ ان دونوں میں کون اچھا ہے تو وہی اچھا جس سے لوگوں کو دھوکا نہ ہو ؎

گناہ آمرز رندانِ قدح خوار   بہ طاعت گیر پیرانِ ریا کار

(خدا شرابی رندوں کے گناہ بخشنے والا ریاکار عبادت گذاروں کو پکڑنے والا ہے)

تو جب اس غریب نے زبان سے کہدیا کہ ظلم اس مولوی صاحب کا اور واقع میں تھا بھی ایسا ہی تو اس نے دھوکا تو نہیں دیا مگر ایسے صاف گو اب کہاں جو چندہ میں زبان سے کہدیں کہ تمہارے ظلم سے دے رہا ہوں بلکہ غالب یہ ہے کہ زبان سے خوشی ظاہر کرتے ہیں اور دل میں کراہت ہوتی ہے تو یہ چندہ بھی حلال نہیں ہوگا اور اب تو دعوتوں میں بھی ایک کی جگہ دو کے آنے سے گرانی ہوتی ہے کیونکہ اب پہلے کی سی ارزانی نہیں رہی اور ممکن ہے کہ یہاں پر کسی کو گرانی نہ ہوتا ہو کیونکہ حق تعالیٰ نے یہاں لوگوں کو ثروت دی ہے مگر جب ثروت سے زیادہ بار ہونے لگے تو سب ہی کو گرانی ہوگی مثلاً بجائے اس آدمی کی دعوت کی تھی اور دو سو آ گئے تو داعی میں ثروت تو ہے کہ بازار سے منگا کر کھلا دیں گے مگر لوگوں کی نظر میں کرکری تو ہو جاوے گی کہ ان کے گھر میں کھانا نہیں تھا تو اس سے بار ہو سکتا ہے اس لئے اپنے ساتھ بچوں کو لیجا کر صاحب خانہ سے پوچھنا کافی نہیں بلکہ لے جانا ہی نہ چاہیئے اس مقام پر شاید کوئی اس پوچھنے کی کفایت پر اس حدیث سے استدلال کرنے لگے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی تھی اور ایک شخص راستہ سے آپ کے ساتھ ہو گیا جب آپ وہاں پہونچے تو آپ نے صاحب خانہ سے پوچھا کہ تمہاری خوشی ہو تو یہ شخص آوے ورنہ نہیں۔ صاحب خانہ نے کہا کہ خوشی ہے کہ آوے۔ میں کہتا ہوں بس آپ نے ایک حدیث پر نظر کی دوسری حدیث پر نظر نہیں کی وہ یہ کہ ایک شخص فارس کا رہنے والا شوربا اچھا پکاتا تھا۔ ایک روز اس کا جی چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کھلاوے۔ چنانچہ حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے چلئے تھوڑا شوربا نوش فرمالیجئے آپؐ نے فرمایا کہ عائشہؓ بھی

چلیں گی اس وقت تک حجاب نازل نہ ہوا تھا۔ اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ ہماری کوئی دعوت کرے اور ہم قبول دعوت میں کوئی شرط لگالیں تو اس بنا پر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بھئی ہمارا ایک مہمان بھی ہے اور جیسے ہم کو شرط لگانے کا اختیار ہے اسی طرح داعی کو بھی اختیار ہے کہ خواہ وہ ہماری شرط کو منظور کرے یا نہ کرے اس صورت میں جبر نہیں ہے اس لئے یہ جائز ہے تو آپ نے فرمایا عائشہ بھی۔ گو اس شخص کا پہلے سے حضرت عائشہؓ کی دعوت کا ارادہ نہ تھا مگر اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے سے وہ ارادہ کر سکتا تھا۔ مگر اس نے اپنے ارادہ کو چھپایا نہیں، صاف کہدیا کہ نہیں حضرت عائشہ کی دعوت نہیں اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا اندازہ کیجئے کہ آپ کے یہاں آزادی کی تعلیم اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں عائشہ بھی اور وہ کہتا ہے نہیں عائشہ نہیں۔ آپ نے صحابہ کو اتنا آزاد بنایا تھا کہ وہ جان دینے کو ہر وقت تیار مگر کھانا دینے کو ہر وقت تیار نہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہ کی جان نثاری کی تو یہ حالت تھی جیسا کہ ایک صحابی فرماتے ہیں ؎

فَاِنَّ اَبِیْ وَوَالِدَتِیْ وَعِرْضِیْ لِعِرْضِ مُحَمَّدٍ مِّنْکُمْ وِقَاءٌ

میرا باپ اور میری ماں اور میری آبرو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آبرو کے لئے وقایہ ہیں)

مگر اس کے ساتھ ہی وہ امور اختیاریہ میں بے تکلف بھی اس درجہ تھے کہ آپ حضرت عائشہ کی دعوت کو شرط بناتے ہیں وہ نہیں مانتا آخر آپ نے فرمایا کہ عائشہ نہیں تو ہم بھی نہیں اس نے کہا نہ سہی اور چلدیا۔ آج تو کوئی مرید اپنے پیر کے ساتھ ایسا کرلے دیکھئے پھر کیا ہوتا ہے بجائے مرید کے اس کا لقب مرتد ہو جائے گا مگر اس سے تو اس کی اور ترقی ہوگئی کہ نیچے کے دو نقطے اوپر آگئے اور پھر دال بھی مشدّد ہے کیونکہ دو دال ہیں ایک کا دوسرے میں ادغام ہوگیا مرید کے تو چار ہی حرف تھے اور یہاں پانچ حرف ہوگئے گو حساب ابجد میں پانچ حرف نہیں مانے جائیں گے کیونکہ اس کا قاعدہ اور ہے وہاں حرف ملفوظی کو نہیں دیکھا

جاتا بلکہ مکتوبی کو دیکھا جاتا ہے غرض یہ تو اور احسان ہوا پیر کا کہ مرید کی ترقی کر دی مگر میں مرشد کو مشورہ دیتا ہوں کہ ایسے مرید کو مرتد تو نہ کہو بلکہ ایسا ہی غصہ نکالنا چاہو تو مُریدہی کہہ لو بفتح المیم کہ پہلے تو میم کو رفع تھا جو رفعت کی علامت تھی اور اب نصب ہو گیا مشقّت کے معنے میں ہے غرض آجکل کوئی ایسا معاملہ کرے تو مرشد صاحب اس کو گستاخی اور بے ادبی پر محمول کریں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کس کا حق ہوگا ہمیں تو اپنے واسطے آپ کو نمونہ بنانا چاہیئے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ شخص پھر لوٹا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑا سا شوربا نوش فرمالیجئے آپ نے فرمایا کہ اور عائشہؓ بھی اس نے پھر یہی کہا کہ نہیں عائشہ نہیں۔ حقیقت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے غلاموں کو کس قدر بے تکلف بنادیا تھا میں مرشدوں اور استادوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ اپنے مریدوں اور شاگردوں کو ایسا ہی بے تکلف رکھو مگر نوکروں کو نہیں کیونکہ اگر اسے گستاخ کر لیا تو وہ آقا کو پریشان کرے گا مگر اتنا ذلیل بھی نہیں کرنا چاہیئے جیسا آجکل کیا جاتا ہے کہ بارہ پہر باہر رہو جب گھنٹی بجادیں تب آؤ یہ صاف کبر ہے اور نہایت بری بات ہے ممکن ہے کہ کسی وقت وہ ہماری جگہ ہو جاوے تو سوچ لیجئے کہ اگر آپ کی ساتھ یہ معاملہ کیا جائے تو آپ کو کس قدر ناگوار ہو شاید تم یہ کہو کہ ایسا ہونا تو بعید ہے اجی اتنا سا انقلاب خدا کو کیا مشکل ہے جب سلطنتیں بدل جاتی ہیں تو ایک غریب کا امیر ہو جانا اور ایک امیر کا غریب ہو جانا کیا بعید ہے۔ چنانچہ اس قسم کی بہت حکایتیں ہیں۔ ان میں سے ایک حکایت بہت مشہور ہے کہ جو بوستان میں لکھی ہے۔ ایک تونگر کے یہاں ایک فقیر آیا اس نے سوال کیا اُسے نکال دیا۔ پھر اتفاق سے تونگر پر افلاس آگیا اور ایسی مصیبت پڑی کہ بیوی تک کو طلاق دینا پڑی اور اب بھیک کی نوبت پہونچ گئی۔ اتفاق سے یہ کسی جگہ پہونچا وہاں جاکر سوال کیا صاحب خانہ نے اپنی عورت سے کہا کہ سائل کو کچھ دے آؤ عورت نے جو سائل کو دیکھا تو زار زار رونے لگی اس نے رونے کا سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ یہ میرا پہلا شوہر

تھا ایک مرتبہ ہم میاں بی بی بیٹھے تھے کہ ایک سائل آیا اس کو اس نے بہت سختی سے جھڑک دیا اسی کے وبال میں یہ گرفتار ہوا۔ اس نے کہا وہ سائل میں ہی تھا۔ دیکھئے کیسا انقلاب ہوا کہ سائل مسئول ہو گیا اور مسئول سائل اور پھر دولت تو دولت بیوی تک اس کے قبضے میں پہنچ گئی۔ خدا کی قدرت ہے اور اگر دنیا میں ایسا نہ بھی ہوا تو کیا آخرت میں بھی کچھ نہ ہوگا۔ غرض نوکر کی نہ اتنی تحقیر کرو جو خدا کو بری لگے اور نہ اس سے اتنی بے تکلفی کرو کہ گستاخ ہو جائے بہرحال گستاخ تو نہ کیجئے مگر شفقت کے ساتھ رکھئے غرض اعتدال کی رعایت ضروری ہے۔ میرے ایک دوست ڈپٹی کلکٹر تھے وہ اپنے نوکر کھانا تک ساتھ کھلاتے تھے میں نے انھیں اس سے منع کیا انھوں نے نہ مانا آخر میں اس کی گستاخی اتنی بڑھ گئی کہ انھیں علیحدہ کرنا پڑا۔ اسی طرح مرید اور شاگرد کو پیر اور استاد تو مثل اولاد کے سمجھے اور مرید اور شاگرد اپنے کو غلام سمجھے۔ بہرحال ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سبق لینا چاہیئے۔ وہ شخص پھر تیسری بار آیا کہ چل کے تھوڑا سا شوربا نوش فرمالیجئے، آپؐ نے پھر فرمایا کہ عائشہؓ بھی اس نے کہا اچھا عائشہؓ بھی۔ پھر دونوں حضرات تشریف لے گئے اور شاید اس پر کسی کو شبہ جبر کا ہو کہ حضرت عائشہؓ نے تو اس شخص کے یہاں بلا طیب خاطر کھایا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اب اس کی رائے بدل گئی پہلے یہ خیال تھا کہ شوربا ہے ایک آدمی بھر کا اور اس کا یہ جی چاہتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سیر ہو کر کھا دیں مگر اس نے جب دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی آدھا پیٹ کھانا چاہتے ہیں تو میرا کیا بگڑتا ہے تو اب اس میں حضرت عائشہ کے لئے کراہت نہیں رہی۔ پس اس حدیث کو پہلی حدیث کے ساتھ ملا کر دیکھئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو گھر پر جا کر صحابی سے پوچھا کہ اگر اجازت دو تو یہ آئے ورنہ نہیں یہ کس صورت اور کس حالت میں تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت پوچھا تھا جبکہ آپ نے صحابہ کو اپنے ساتھ اتنا بے تکلف بنا دیا تھا کہ اجنبی تو اجنبی وہ تو حضرت عائشہؓ کے باب میں

بھی صاف صاف عرض کر سکتے تھے۔ اب بتلایئے کہ آپ نے بھی اپنے دوستوں کو اتنا بے تکلف کیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اتنا بے تکلف کر رکھا تھا کہ میزبان کو یقین تھا کہ اگر وہ اجازت بھی نہ دے گا تب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ویسے ہی بشاش رہیں گے۔ جیسے اجازت کے بعد ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اتنی رعایت فرماتے تھے کہ کسی کو تنگدلی نہ ہو تو ہم کو کیا حق ہے کہ ہم کسی پر جبر کر کے چندہ لیں چاہے اس کا دل چاہے یا نہ چاہے۔ محققین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی سائل قرائن سے جانتا کہ اگر کسی سے مجمع میں سوال کرے گا تو وہ ایک روپیہ دے گا اور اگر یہی سائل تنہائی میں سوال کرتا تو وہ آٹھ آنے دیتا اس صورت میں سائل کو آٹھ آنہ سے زیادہ حلال نہیں۔ بات یہ ہے کہ مجمع کا لحاظ ہوتا ہے اور شرم ہوتی ہے اس لئے ایسی حالت میں مجمع میں مانگنا بھی جائز نہیں۔ تو حضرت جبر تلوار دکھانے کو نہیں کہتے۔ امام غزالی نے لکھا ہے کہ جسم کو اذیت پہنچا کر لینا حرام ہے اسی طرح قلب کو اذیت پہنچا کر اور بوجھ ڈال کر لینا بھی حرام ہے بلکہ دل تو بدن سے بھی زیادہ نازک ہے۔ اس واسطے چندوں میں اہل وجاہت کو درمیان میں نہ ڈالیں بلکہ خود تحریک کریں اور تحریک بھی عام کرنا چاہیئے۔ یہ نہیں کہ فہرست لے کے اس کے پاس پہونچ گئے اس نے دس روپے لکھے تو اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ آپ کی شان تو پچاس روپے کے قابل ہے۔ اس نے شرما شرمی بیس روپے کر دیئے ایک عذر کا جواب تو یہ تھا جو خوشی ہو دو نہ ہو نہ دو اس تقریر سے اس کی حقیقت معلوم ہوگئی۔ دوسرا عذر یہ کیا جاتا ہے کہ ہم کچھ اپنے واسطے تھوڑا ہی کرتے ہیں ہم تو اللہ کے واسطے کرتے ہیں تو اگر جبر بھی ہو تو کیا ہے یہ عجیب عذر ہے اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے واسطے جبر جائز ہے تو بتلایئے کہ اللہ تعالےٰ نے کہاں کہا ہے کہ میرے لئے ڈکیتی کرو۔ اگر یہی مسئلہ ہے تو آج تو یوں چندہ وصول کیا کل کل چوری بھی کرو گے اور کہدو گے کہ اپنے واسطے تھوڑا ہی کی ہے ہم نے تو مسجد کے لئے کی ہے۔ اور عدالت میں بھی جا کر یہی عذر کر دینا دیکھیں عدالت کیسے چھوڑ دے گی۔

اسی طرح عدالت عالیہ کو سمجھے بلکہ غور کیا جاوے تو اس میں ایک اور باریک بات ہے وہ یہ کہ اگر اپنے نفس کے واسطے جبر کرتے تو اتنا برا نہ ہوتا جتنا اللہ کے واسطے کرنا برا ہے کیونکہ قاعدہ ہے کہ جس کام کی غرض نہ حاصل ہو وہ بے کار ہوتا ہے اب سوچو کہ اگر نفس کے واسطے کسی سے وصول کرتے اور غرض یہ ہوتی کہ تم کو دنیا کا نفع ہو تو جبر کی صورت میں یہ مقصود تو حاصل ہو جاتا اور اگر خدا کے واسطے جبر کیا جس میں غرض یہ ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ خوش ہوں تو اس میں تو وہ مقصود بھی حاصل نہیں ہوا بلکہ جبر سے الٹا گناہ ہوا تو اور زیادہ بُرا ہوا۔ غرض اپنے نفس کے لئے جبر کرتے تو کچھ فائدہ تو حاصل ہوتا کہ روپیہ جیب میں آتا اور خدا کے واسطے ناجائز طریقہ سے روپیہ حاصل کیا تو خدا تعالیٰ بھی ناراض ہوئے اور کیا تھا خوش کرنے کو اب تو یہ فعل محض لغو اور بیہودہ ہوا تو یہ دوسرا عذر تو بالکل عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہو گیا یہ تو ایسا ہی ہو گیا جیسے ایک شخص نے ایک آدمی کو طمانچہ لگایا وہ ناراض ہوا تو آپ کہتے ہیں معاف کیجئے میں آپ کے ابا جان کو سمجھا تھا سبحان اللہ یہ عذر بڑا اچھا ہوا تو یہ کہنا کہ ہم دین کے واسطے کام کرتے ہیں اپنے واسطے نہیں کرتے ایسا ہی عذر گناہ بدتر از گناہ ہوا تو خدا کے واسطے کام کرنے میں تو اور زیادہ احتیاط چاہیئے۔ بہرحال ایسے ہی جبر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ (کسی مسلمان کا مال بدون اس کی خوش دلی کے حلال نہیں ہو سکتا) اور یہاں ایک شبہہ نئے مجتہدوں کی طرف سے اور بھی ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مسلم کی قید لگائی ہے تو کافر کا مال جبراً لینے میں کیا حرج ہے کیونکہ آجکل مجتہد کثرت سے ہونے لگے ہیں پہلے تو جب کوئی علوم میں امام ابو حنیفہؒ کے درجہ پر پہونچتا تھا جب مجتہد ہوتا تھا اور آجکل بس ترجمہ قرآن دیکھ لیا اور مجتہد ہو گئے اور پھر غضب تو یہ ہے کہ کافر بھی ہمارے مذہب میں اجتہاد کرنے لگے۔ چنانچہ میں ایک مقام پر ایک صاحب کے یہاں دعوت کی تقریب سے بلایا ہوا گیا وہ ملے نہیں نوکر سے پوچھا کہاں گئے ہیں کہا کھیلنے گئے ہیں میں حیران ہوا کہ وہ کیا بچے ہیں جو کھیلنے گئے ہیں

ارے ظالمو اس کا نام تفریح ہی رکھدیا ہوتا کیونکہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے الفاظ کی بھی شائستگی سکھلائی ہے۔ چنانچہ جی متلانے کے معنے میں اہل عرب خَبُثَتْ کہا کرتے تھے جس کا ترجمہ میرا جی میلا ہو رہا ہے یا خراب ہو رہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ نہ کہو بلکہ یوں کہو لَقِسَتْ نَفْسِیْ جس کا ترجمہ ہے میرا جی متلاتا ہے کیونکہ خَبُثَتْ نَفْسِیْ میں خبث کی اسناد ہے اپنی نفس کی طرف جو سننے سے بُرا معلوم ہوتا ہے۔ اس واسطے ہم تو اس کھیل کے لفظ پر بھی ضرور مواخذہ کریں گے جس سے آپ بچپن میں داخل ہوتا چاہتے ہیں حالانکہ پہنچ چکے ہیں بچپن میں۔ میں ان کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ وہاں ایک انگریز بھی ان سے ملنے آیا تھا وہ بھی اسی جلسہ میں بیٹھ گیا اس نے لوگوں سے باتیں کرنا شروع کیں۔ کہنے لگا کہ کرآن (قرآن) میں آیا ہے کہ طاعون ایک سے دوسرے کو لگتا ہے۔ میں سوچتا رہا کہ اے اللہ قرآن کی کونسی آیت میں یہ مضمون ہے۔ اتنے میں آپ نے خود ہی تفسیر کی کہ دیکھو کرآن (قرآن) میں آیا ہے کہ جہاں طاعون ہو وہاں بھی مت جاؤ اور وہاں سے بھی مت جاؤ۔ اول تو اس ظالم نے حدیث کو قرآن بتایا پھر اس میں اپنا اجتہاد ٹھونسا اور دوسرے جزو سے اس طرح استدلال کیا کہ جہاں طاعون ہو وہاں سے دوسری جگہ جانے کو اس لئے منع فرمایا ہے کہ دوسری جگہ جاکے طاعون پھیلاؤ گے۔ سبحان اللہ اس کو نص کا مدلول بتلاتے ہیں۔ غرض اجتہاد اتنا عام ہو گیا ہے کہ کافر بھی ہمارے دین میں اجتہاد کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ آجکل گاندھی بھی مسلمانوں کے مذہب میں مجتہد سمجھے گئے ہیں اور یہ ایسے مجتہد مصیب مطلق ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ سے تو اجتہاد میں غلطی بھی ہوتی تھی چنانچہ اسی بنا پر بعض مسائل میں ان سے رجوع ثابت ہے یا خود علماء احناف نے ان کے بعض فتوں کو چھوڑ کر صاحبین کے قول پر عمل کر لیا ہے۔ مگر گاندھی کی زبان سے کوئی غلط بات نکلتی ہی نہیں بس جو بات اس کے منہ سے نکلی نعوذ باللہ گویا قرآن و حدیث ہاتھ باندھے اس کی تائید کو کھڑے ہیں کہ مولویوں نے فوراً اسکو شریعت سے ثابت کر دیا خدا خیر کرے ؎ اِذَا كَانَ الْغُرَابُ دَلِيْلَ قَوْمٍ ؛ سَيَهْدِيْهِمْ طَرِيْقَ الْهَالِكِيْنَا

(جب نا اہل کسی قوم کا سربراہ ہو تو گمراہوں کے ہی راستہ پر لیجائیگا)

اگر ایسے ہی مجتہد ہوئے تو وہ ضرور قوم کو تباہ کریں گے اور کر ہی دیا۔ خلاصہ یہ کہ آجکل اجتہاد کا زور ہے حتیٰ کہ کافر بھی مجتہد ہونے لگے ہیں خواہ وہ یورپ کا ہو یا ہندوستان کا تو شاید کوئی ایسا ہی مجتہد یوں کہنے لگے کہ حدیث میں تو مسلم کی قید ہے تو مسلمان کا مال تو بدون طیب قلب کے حلال نہیں ہوگا لیکن کافر کا تو ضرور حلال ہے اور پھر شاید اس استدلال سے منتفع ہو کر ریل میں بے ٹکٹ سفر کرتے ہوں کہ وہ مسلمانوں کی نہیں ہے اور غیر مسلم اس کے مالک ہیں خواہ ان کے پاس ٹھیکہ ہے اور بعض لوگ اسے سرکاری سمجھ کر یہ تاویل کرتے ہیں کہ ہم گورنمنٹ سے اپنا حق وصول کرتے ہیں یہ مسئلہ بھی بجائے خود قابل بحث ہے کہ غیر جنس سے حق وصول کرنا جائز ہے یا نہیں مگر بہت لوگ اس جگہ مسلم کی قید دیکھ کر یوں سمجھے ہوں گے کہ کافروں کا مال لینے میں مطلقاً کچھ حرج نہیں خواہ اس پر ہمارا حق ہو یا نہ ہو کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مسلم کا مال جبراً لینے کو منع فرمایا ہے اس کا ایک جواب ظاہر تو یہ ہے کہ یہ قید اتفاقی ہے کہ عادتاً مسلمانوں کو سابقہ مسلمان ہی سے پڑتا ہے ورنہ نصوص عامہ کی وجہ سے اس طرح کسی کا بھی مال حلال نہیں چنانچہ بعض احادیث وعید میں اَلرَّجُلُ يَقْطَعُ مَالَ الرَّجُلِ آیا ہے۔ رواہ الترغیب عن الحاکم وَقَالَ صَحِيحٌ عَلٰى شَرْطِهِمَا (آدمی آدمی کا مال قطع کرتا ہے اس کو ترغیب ترہیب میں حاکم سے روایت کیا ہے اور یہ صحیح شرط بخاری مسلم پر ہے) اور دوسرا جواب یہ ہے کہ کافر ذمی اور کافر مسلم حقوق ظاہرہ اور معاملات میں شرعاً مثل مسلمان کے ہے لَهُمْ مَا لَنَا وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَيْنَا (ان کے لئے وہ ہے جو ہمارے لئے ہے اور جو ان پر ہے وہ ہم پر بھی ہے) البتہ کافر محارب کا مال مباح ہے مگر وہاں بھی فریب اور غدر جائز نہیں۔ اور مولانا محمد قاسم صاحب نے اس کے متعلق ایک عجیب بات فرمائی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کا مال لینا مسلمان کے مال لینے سے بھی زیادہ بُرا ہے۔ چنانچہ مولانا نے فرمایا کہ بھائی اگر کسی کا حق ہی رکھنا ہو تو مسلمان کا رکھ لے کافر کا نہ رکھے کیونکہ قیامت میں ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دی جاویں تو اگر کسی مسلمان پر ظلم کیا تو نماز روزہ ظالم کا اس کے بھائی ہی کو ملے گا۔ خیر اگر ظاہر میں ظلم کیا تو باطن میں قومی ہمدردی بھی تو کی کہ اپنی نیکیاں اس کو دیدیں اور اگر کافر کا حق رکھا تو ایک تو اپنی نیکیاں پرائے گھر پھر اس صورت میں نہ تمہارا بھلا نہ اس کا بھلا کیونکہ وہ تو پھر بھی جہنم ہی میں گیا اگر کوئی کہے کہ اُسے نفع کیا ہوا جب نیکیاں اس کے کارآمد نہ ہوئیں۔ جواب یہ ہے کہ نفع تو ہوگا مگر اتنا

کم ہوگا کہ اسے محسوس نہ ہوگا جیسے اگر کسی کے پاس من بھر سونے کا ایک ڈھیر ہے اور اس میں سے کسی نے ایک رتی بھر سونا چرالیا واقع میں تو کمی ہوئی مگر محسوس نہ ہوگی لیکن اس سے کوئی عادل اور کوئی عاقل اس کی اجازت نہ دے گا کہ اتنا سا چرالیا کرو مثلاً کسی سلطنت میں دودھ کے اندر پانی ملانے کی اجازت نہ ہو اور کوئی یہ کہہ کے ملادے کہ ایک من میں ایک لوٹا کیا معلوم ہوگا تو کیا یہ جرم نہیں یقیناً جرم ہے اگر اطلاع ہوجائے تو ضرور سزا ہوگی مگر اکثر اطلاع نہیں ہوتی کیونکہ اس کا احساس کم ہوتا ہے مگر عدم احساس سے بطلان شے تو لازم نہیں آتا اسی طرح اگر کسی کو اپنے نفع کا احساس نہ ہو مگر سزا میں کچھ تخفیف ہوگئی ہو تو اس سے نفع کا بطلان لازم نہیں آتا اسی طرح کافر کے عذاب میں بھی تخفیف ہوگی گو اسے خفت کا احساس نہ ہو۔ اگر کوئی کہے کہ قرآن میں تو ہے لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ کہ ان کے عذاب میں تخفیف نہیں کی جائے گی اور تم کہتے ہو کہ نیکیاں ملنے سے عذاب میں خفت ہوگی یہ تعارض ہوا۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ایسی تخفیف نہ ہوگی جس سے راحت محسوس ہو باقی یہ مطلب اس آیت کا نہیں ہے کہ سب کفار کو برابر عذاب ہوگا اور کسی کا عذاب کسی سے کم نہ ہوگا کیونکہ جس طرح معذبین کے اعمال مراتب میں متفاوت ہیں کہ بعضے کافر کفر میں اشد اور اخلاق میں سخت ہیں اور بعضے ایسے نہیں اسی طرح عذاب کے بھی درجات مختلف ہیں یہ نہیں کہ فرعون اور شداد و نمرود کی برابر اس کافر کو بھی عذاب ہو جو غریب مسکین مظلوم تھا تو جیسے کفر کے مراتب اور کفار کے درجات ہیں اسی فرق مراتب کے اعتبار سے عذاب میں بھی فرق ہوگا کہ ایک کو جتنا عذاب ہوگا کسی کو اسکا ضعف ہوگا اور کسی کو ضعفین (چارگنا) اور یہ سب قرآن میں آیا ہے البتہ جس کے لئے جتنا عذاب دخول جہنم کے وقت تجویز ہوجائیگا پھر اس سے کمی نہ ہوگی۔ اور یہ دوسرا جواب ہے یعنی مطلق خفت کی نفی نہیں ہے بلکہ عذاب مجوز میں خفت کی نفی ہے بہرحال مولانا کی تقریر سے معلوم ہوا کہ کافر کا مال لینا مسلمان کے مال لینے سے بھی زیادہ برا ہے اب تیسرا جواب سنئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی عادل امت سے یہ احتمال ہی نہ تھا کہ

کوئی مسلمان کسی کافر کو نقصان پہونچائے گا اگر کرے گا تو اپنے بھائی ہی کی گلو تراشی کریگا کیونکہ عام طور پر اس وقت لوگوں کا خیال یہ تھا کہ خانہ دوستاں بروب و در دشمناں مکوب (دوستوں کا گھر جھاڑ دشمنوں کا دروازہ مت کھٹکھٹا) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی روک دیا جس سے اب خانہ دوستاں بروب (دوستوں کے گھر جھاڑنے) کی بھی گنجائش نہ رہی۔ اس کی اس لئے تصریح کر دی کہ شاید اس قول کے ظاہر پر عمل کرنے لگے مگر ایسے شخص کو یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ اگر وہ دوست بھی اس پر عمل کرے اور جو کچھ آپ اس کے گھر سے لائے ہیں وہ بھی اور جو آپ کے گھر کا ہے وہ بھی سب لے جائے تو کیا آپ کو گوارا کرنا پڑے گا۔ اگر گوارا نہیں تو ایسا ہی دوسرے کو بھی سمجھ لیجیے اور شیخ کے کلام میں روفتن (جھاڑنا) کا وہ درجہ مراد ہے جس کو گوارا کیا جا سکے جیسے بعضی صورتیں دوستوں میں بے تکلفی کی ہوتی ہیں۔ غرض اس پر کلام بڑھ گیا تھا کہ بدون طیب خاطر کے کسی کا مال حلال نہیں ہوتا۔ اسی طرح بہنوں کا حصہ بھی حلال نہیں کیونکہ عموماً طیب خاطر سے وہ نہیں دیتیں محض رسم ورواج سے دیتی ہیں اس میں صحت ہبہ کے لئے دیانت کا بھی حکم ہے کہ ان کے قبضے میں رقم اور جائداد آنے کے بعد اور اس کی آمدنی وصول کرنے اور خرچ کرنے کے بعد اگر وہ دیں تو یہ ہبہ صحیح ہے ورنہ نہیں اور قضا کا حکم یہ ہے کہ وہ ہبہ کر دے حسب شرائط یا بیع کر دے محض معاف کر دینے یا دست بردار ہونے سے اس کی ملک زائل نہیں ہوتی بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ زبانی بیع کرا لیجئے اور اختیار رہے کہ اگر دس لاکھ کا بھی حصہ ہے اور وہ دس روپیہ میں بیچ دے تو معاملہ درست ہو جائے گا۔ اور پھر کہہ دے کہ میں نے زرثمن معاف کر دیا کیونکہ بیع میں غیر مشاع ہونا ضروری نہیں یہ سب کلام ملک اضطراری پر چلا تھا اور اصل مضمون یہ تھا کہ ایک درجہ تو ہماری غلامی کا یہ ہے کہ ہم بطور ملک اضطراری کے خدا کے غلام ہیں سو یہ تو ہماری کوئی خوبی نہیں۔ خوبی یہ ہے کہ ہم اختیاری غلام بنیں۔ جیسے آسمان و زمین سے کہا گیا تھا فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ کَرْهًا اور انہوں نے عرض کیا قَالَتَآ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ یعنی حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے زمین و آسمان سے کہا کہ ہماری اطاعت میں داخل ہو جاؤ

خواہ خوشی سے یا ناخوشی سے انھوں نے کہا کہ ہم خوشی سے اطاعت قبول کرتے ہیں۔ قہری اطاعت، تو یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ آج آسمانوں کو توڑنا چاہیں یا زمین کو شق کرنا چاہیں اور وہ نہ چاہیں تو وہ کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ اور جو حکم ہوگا لامحالہ وہ واقع ہوجاوے گا یہ تو اطاعت قہریہ ہے مگر آسمان وزمین نے کہا کہ ہم خوشی سے حاضر ہوتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ وہ تسبیح وتقدیس واعتقاد الوہیت کو اختیار کئے ہوئے ہیں اگر کوئی کہے کہ ان میں جان تھوڑا ہی ہے جو انھوں نے یہ باتیں کیں میں کہتا ہوں آپ کو یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ ان میں جان نہیں ہے۔ کیوں نہیں جب قرآن میں ان کے متعلق طلوع رغبت ثابت ہے تو اس کے لوازم بھی ضرور ثابت ہیں حاصل یہ کہ معترض کے نزدیک اگر طلوع ورغبت روح ہونے پر موقوف ہے تو ان میں بھی روح ہے مگر آپ کی سی روح ہونا ضروری نہیں ہے اگر زیادہ نہیں تو اتنی ضرور ہے کہ ان کو شعور ہے اور وہ قصد کرتے ہیں ذکر واطاعت کا۔ اور صوفیہ نے تو صاف صاف کہا ہے کہ ان میں روح ہے۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں ۔

خاک وباد وآب وآتش بندہ اند ۔۔۔ بامن وتو مردہ باحق زندہ اند

(خاک، ہوا، پانی، آگ، یہ چار عنصر حق تعالیٰ کے بندے ہیں۔ ہمارے تمہارے روبرو گو مردہ ہیں مگر حق تعالیٰ کے روبرو زندہ ہیں)

مولانا نے ایک حکایت کے ضمن میں اس کو فرمایا ہے۔ حکایت یہ ہے کہ ایک بادشاہ کافر بت پرست تھا وہ اپنی رعایا کو بت پرستی پر مجبور کرتا تھا اور انکار پر آگ میں ڈالدیتا تھا چنانچہ ایک عورت سے بھی کہا گیا جس کی گود میں ایک شیر خوار بچہ تھا وہ سجدہ بت پر راضی نہ ہوئی تو اس کے بچہ کو چھین کے دہکتی ہوئی آگ کے حوض میں ڈالدیا۔ اور کہا گیا کہ تیرا بھی یہی حشر ہوگا وہ بیچاری گھبرا گئی ۔

خواست تا او سجدہ آرد پیش بت ۔۔۔ بانگ برزد طفل کانی لم امت

(اس عورت نے چاہا کہ بت کے روبرو سجدہ کرلوں۔ فوراً لڑکے نے پکارا میں مرا نہیں ہوں) قریب تھا کہ وہ بادشاہ کے خوف سے بت کے روبرو سجدہ میں گر پڑے مگر لڑکے نے آگ

ہی میں سے پکاراکہ گھبراتا نہیں میں زندہ ہوں اور مزید برآں یہ کہنا شروع کیا ؎

اندر آما درکہ من اینجا خوشم — گرچہ درصورت میاں آتشم

(اے ماں اندر چلی آ میں اس جگہ خوش ہوں اگرچہ ظاہر میں آگ کے اندر ہوں)

اندر آمادر ببیں برھان حق — تا بہ بینی عشرت خاصان حق

اندر آ اسرار ابراہیم بیں — کہ در آتش یافت وردو یاسمیں

اندر آمادر حق ما دری — بیں کہ ایں آذر ندارد آذری

اندر آمادر کہ اقبال آمدست — اندر آمادر بدہ دولت زدست

(اے ماں اندر چلی آ برہان حق کا ملاحظ کرتا کہ دیکھ لے تو خاصان حق کے عیش و عشرت کو اے ماں تو اندر چلی آ اور دیکھ تو یہ آگ نہیں گلزار ابراہیمی ہے اندر چلی آ مادری حق کے طفیل میں دیکھ تو کہ یہ آذر آذری نہیں رکھتا اے ماں اندر آ کر اقبال جاگا اندر چلی آ اور دولت اسلام کو ہاتھ سے نہ کھو)

اور پھر ترقی کر کے اوروں کو بلانا شروع کیا ؎

اندر آئید اے ہمہ پروانہ وار — اندریں آتش کہ وارد صد بہار

اندر آئید اے مسلمانان ہمہ — غیر عذب دیں عذابست آں ہمہ

(اے تمام مسلمانو پروانہ کی طرح اندر چلے آؤ اور آگ کے اندر سیکڑوں بہاریں دیکھو اے تمام مسلمانوں اندر چلے آؤ دین شیریں کے علاوہ سب عذاب ہے)

ماں سنتے ہی فوراً آگ میں کود پڑی اور اس نے بھی وہی کہنا شروع کیا۔ پھر تو تمام لوگ لگے آگ میں گرنے حتیٰ کہ بادشاہ کو پولیس کے ذریعے سے لوگوں کو آگ میں گرنے سے روکنا پڑا کہ اگر یہی حال رہا تو بادشاہ کے مذہب کا بطلان شائع ہو جائے گا۔ پھر بادشاہ نے دیکھا کہ ان لوگوں کو آگ سے کوئی گزند نہیں پہونچتا تو اس حالت کو دیکھ کے بادشاہ بہت جھنجلایا اور غصہ میں فرضی خطاب کے طور پر کہا کہ اری آگ آج تجھے کیا ہو گیا تو جلاتی کیوں نہیں کہاں گئی تیری وہ تیزی اور گرمی اور کہاں گئی تیری قوت محرقہ کیا تو آگ نہیں رہی۔ حق تعالیٰ نے آگ کو زبان دی اور

اس نے جواب دیا کہ ؎

گفت آتش من ہمانم آتشم	اندر آ تو تا بہ بینی تابشم

یعنی میں تو وہی آگ ہوں تو ذرا اندر آ تو تجھے معلوم ہو کہ میں آگ ہی ہوں ؎

طبع من دیگر نہ گشت و عنصرم	تیغ حقم ہم بدستوری برم

یعنی میری خاصیت نہیں بدلی لیکن میں خدا کی تلوار ہوں اس کی اجازت سے کاٹ سکتی ہوں تیری خواہش سے نہیں کاٹ سکتی جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈالا گیا تو آگ کو حکم ہوا کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلَامًا (ہو جا ٹھنڈی سلامتی کے ساتھ) وہ ٹھنڈی ہو گئی۔ اسی طرح جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبح کرنے کا حکم ہوا تو حضرت ابراہیم نے اپنا کام شروع کر دیا کہ کاٹ رہے ہیں اور چھری خوب تیز ہے مگر چھری کاٹتی نہیں یہاں تک کہ حضرت ابراہیمؑ نے غضبناک ہو کر کہا اری چھری تجھے کیا ہوا تو کاٹتی نہیں۔ تو وہ کہتی ہے مجھے آپ کیا فرماتے ہیں آپ کو حکم ہوا ہے کاٹنے کا۔ اور مجھے حکم ہوا ہے نہ کاٹنے کا۔ آپ اپنا کام کریں میں اپنا کام کروں گی جو کچھ کہنا ہو حق تعالےٰ سے کہئے۔ اگر وہ اجازت دیدیں گے تو کاٹ دوں گی۔ غرض کہ حکم الٰہی سے آگ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بے کار رہی، چھری حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بیکار رہی۔ اس مقام پر مفسرین نے ایک علمی لطیفہ لکھا ہے کہ اگر بَرْدًا کے ساتھ سَلَامًا نہ ہوتا تو آگ اس قدر سرد ہو جاتی کہ پھر ٹھنڈک سے تکلیف ہونے لگتی اس لئے حق تعالےٰ نے صرف بردًا نہیں فرمایا بلکہ سلامًا بھی فرمایا۔ تو مولانا نے اس حکایت پر متفرع کر کے فرمایا ہے ؎

بادہ خاک و آب و آتش بندہ اند	با من و تو مردہ با حق زندہ اند

(ہوا، خاک، پانی، آگ چاروں عنصر حق تعالےٰ کے بندے ہیں گو ہمارے تمہارے روبرو مردہ ہیں مگر حق تعالےٰ کے روبرو زندہ ہیں)

یہ تو حکایت تاریخی سے استدلال تھا۔ آگے قصہ منصوصہ سے استدلال فرماتے ہیں ؎

گر نبودے واقف از حق جان باد	فرق چوں کردے میان قوم عاد

(اگر جان ہوا حق تعالےٰ سے واقف نہ ہوتی تو قوم عاد میں فرق نہ کرتی)

تو حضرت یہ سب چیزیں جاندار ہیں۔ اور لیجئے ارشاد ہے۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَکَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ط

(اے مخاطب کیا تجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ کے سامنے سجدہ کرتے ہیں جو کہ آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے آدمی بھی)

یعنی یہ سب سجدہ میں مشغول ہیں وجہ استدلال یہ ہے کہ یہاں حق تعالیٰ نے سب مخلوقات کی فہرست بتلا کر کسی میں کوئی قید نہیں لگائی مگر ہمارے متعلق فرمایا وَکَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ط (اور بہت سے آدمی بھی) کہ بہت سے آدمی بھی سجدہ کرتے ہیں۔ ہمیں پھسڈی نکلے کہ سوائے ہمارے اور تو سب سجدے میں ہیں اور جب ہمارا نمبر آیا تو کَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ کی قید سے فرمایا آگے دوسرے مقابل کی نسبت فرماتے ہیں وَکَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْہِ الْعَذَابُ ط اور بہت سے ایسے ہیں جن پر عذاب ثابت ہو گیا) اور یہ ظاہر ہے کہ عبادت وسجدہ قسریہ سے کفار بھی خالی نہیں اگر یہاں عبادت قسریہ مراد ہوتی تو انسان کے ساتھ کثیر کی قید نہ ہوتی اس سے معلوم ہوا کہ یہاں عبادت اختیاریہ مراد ہے۔ پس اور مخلوقات تو سب کی سب خوشی سے عبادت میں مشغول ہیں بجز انسان کے کہ ان میں بہت سے تو خوشی سے عبادت کرتے ہیں اور بہت سے کافر ہیں جو عبادت اختیاریہ سے محروم ہیں اور جب آسمان وزمین شجر ودواب نجوم وغیرہ خوشی سے عبادت کرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ آسمان وزمین وغیرہ میں اتنا ادراک ہے جس سے وہ حق تعالیٰ کو پہچانتے ہیں اور یہ ادراک ان کا قیامت کے قریب سب پر ظاہر ہوگا چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ جب یہودیوں کو قتل کیا جاوے گا اور وہ چھپتے پھریں گے تو اگر وہ کسی پتھر کے پیچھے چھپے گا تو پتھر بھی کہدے گا کہ اے مسلم میرے پیچھے یہودی ہے اور پھر قیامت میں تو سب ہی بولیں گے چنانچہ ارشاد ہے وَقَالُوْا لِجُلُوْدِھِمْ لِمَ شَھِدْتُّمْ عَلَیْنَا قَالُوْا اَنْطَقَنَا اللّٰہُ الَّذِیْ اَنْطَقَ کُلَّ

شَيْئٍ (یہ لوگ اپنے اعضا سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی وہ جواب دیں گے کہ ہم کو اس نے گویائی دی جس نے ہر چیز کو گویائی دی) اور ارشاد ہے یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا۔ یعنی جس دن زمین سب اپنے پترے کھولدے گی۔ اور دہریوں نے جو اس کا انکار کیا ہے میں کہتا ہوں اُن کے پاس دلیل کیا ہے امتناع کی کچھ بھی نہیں پھر الٹا ہم سے پوچھتے ہیں کہ تم اس کا ثبوت لاؤ اور ثبوت بھی دلائل عقلیہ سے نہیں وہ تو ہم پیش کر چکے کہ اس کا امتناع ثابت نہیں تو امکان ثابت اور جس ممکن کے وقوع کی مخبر صادق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خبر دے اس کا وقوع ثابت بس اس ممکن کا وقوع ثابت ہو گیا تو پھر ہم سے ثبوت کیا مانگتے کہتے ہیں نظیر لاؤ تاکہ اسے دیکھ کر استبعاد رفع کریں۔ آجکل یہ بھی ایک جہل ہے کہ نظیر بتلانے کا نام ثبوت رکھا ہے حالانکہ ثبوت نام ہے دلیل عقلی یا نقلی کا اور نظیر سے تو دلیل کی توضیح مقصود ہوتی ہے نظیر سے اثبات مدعا نہیں ہوا کرتا مگر آجکل یہ الٹی منطق ہے کہ نظیر کو دلیل سمجھتے۔ چنانچہ ایک شخص رامپور میں معراج جسمانی کا انکار کرتے تھے۔ میں نے کہا معراج جسمانی ہی تھی روحانی نہ تھی تو کہا ثبوت لاؤ یعنی نظیر لاؤ کہ کسی اور کو بھی ہوئی۔ میں کہتا ہوں کہ نظیر اثباتِ مدعا کے لئے نہیں ہوتی بلکہ توضیح دلائل کے لئے ہوتی ہے مگر اس کو وہ سمجھتے ہی نہیں۔ سوال تو کردیا اور جواب سمجھنے کی صلاحیت نہیں اب ہم پر الزام ہے کہ علماء جواب نہیں دے سکتے میں کہتا ہوں کہ تم جواب سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ورنہ جواب سے ہم کب عاجز ہیں۔ اسی واسطے بعض دفعہ اُن سے خطاب کرنے کو دل نہیں چاہتا بقول عارف شیرازی کے

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز	ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(راز کا فاش کرنا مصلحت کے خلاف ہے ورنہ مجلس عارفین کوئی چیز ایسی نہیں کہ نہو)

غرض وہ تو بار بار یہی کہتے جاتے ہیں کہ ثبوت لاؤ یعنی نظیر لاؤ اس کا ایک اور بھی جواب ہے وہ یہ کہ اگر ہر واقعہ کے ثبوت کے لئے نظیر کی ضرورت ہے تو نظیر بھی ایک واقعہ ہے تو اس کے لئے بھی نظیر کی ضرورت ہے یا نہیں اگر نہیں ہے تو کلیہ ٹوٹ گیا اور اگر ہے تو پھر اس کے لئے بھی اسی طرح نظیر کی ضرورت ہوگی تو پھر اس میں بھی یہی کلام ہے۔ غرض اگر یہ سلسلہ

ختم ہوگیا تو کلیہ ٹوٹ گیا اور اگر ختم نہیں ہوا تو تسلسل لازم آئے گا جو محال ہے اور جو مستلزم محال ہے وہ بھی محال ہے مگر وہ ایسے بھی نہیں سمجھتے۔ اب ثبوت میں صرف اس کی کسر رہ گئی کہ چھوٹ پھٹ جائے اور میں او چک کران کے سامنے اڑ جاؤں کہ لو صاحب معراج ہوگئی ایک صاحب اس پر الجھے تھے کہ اگر معراج جسمانی ہوئی تو ہوا کے کرہ کے بعد آگ کا کرہ ہے یا یوں کہئے کہ ہوا نہیں ہے جہاں بغیر سانس لئے کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں نے کہا کہ اس دعوے کی کہ بغیر سانس لئے ہوئے زندہ نہیں رہ سکتا دلیل کیا ہے تو قاعدہ سے تو اتنا ہی جواب میرے ذمہ تھا۔ مگر ایک بات دفعہ استبعاد کے لئے بعد میں سمجھ میں آئی کہ سیر کی دو قسمیں ہیں۔ سیر سریع اور سیر بطئی یعنی ایک جلدی گذرنا اور ایک ٹھہر ٹھہر کے گذرنا سو جلدی گذرنے میں استبعاد بھی نہیں کیونکہ سرعت کے ساتھ آگ سے نکل جائے تو جل نہیں سکتا۔ جیسے ایک شعلہ ہوا اس کے اندر سے جلدی جلدی انگلی کو یا ہاتھ کو نکالو تو رونگٹا بھی نہیں جلیگا بس اگر اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی معراج میں اس سرعت کے ساتھ پہونچا دیئے گئے کہ یہ چیزیں اثر نہ کرسکیں تو استبعاد بھی نہیں رہا۔ اسی طرح ان چیزوں کے بولنے میں امتناع عقلی تو نہیں ہے صرف استبعادی ہے اور اب تو استبعادی بھی نہیں کیونکہ روزانہ نئی ایجادیں نکلتی ہیں جن سے بہت سے مستبعدات کا مشاہدہ ہونے لگا یہ اللہ کی رحمت ہے کہ ایسے لوگوں سے تائید دین کا کام لیا ہے جو کافر ہیں کہ وہ نئی نئی ایجادیں کردیں جن سے بہت سے شبہات حل ہوگئے چنانچہ لوگوں کو شبہ تھا کہ زمین کیسے بولے گی کیونکہ وہ تو جمادات میں سے ہے خدا نے اس کی نظیر گراموفون ایجاد کرادیا کہ یہ نہ انسان ہے نہ حیوان اور نہ نباتات اور پھر بولتا ہے اب اس کو کس قسم میں داخل کروگے جو اس کے لئے نطق کو جائز رکھوگے۔ اس سوال پر کہ کس قسم میں داخل کروگے ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک انسپکٹر تھے تعلیمات کے وہ جہاں جاتے تھے لڑکوں سے پوچھا کرتے تھے کہ موجودات کی کتنی قسمیں ہیں بتلاؤ۔ وہ کہتے کہ تین قسمیں جمادات نباتات حیوانات پھر پوچھتے کہ بتلاؤ میز کس قسم میں ہے اگر لڑکے نے اس کو نباتات کہدیا تو وہ

کہتے کہ اس میں نمو کہاں ہے اور اگر جمادات سے کہدیا تو کہا یہ تو لکڑی ہے اور لکڑی درخت کی ہے اور درخت نباتات میں سے ہے غرض بچوں کو بہت دق کرتے تھے۔ ایک لڑکا تھا بہت ذہین اس نے کہا کہ موجودات کی چار قسمیں ہیں۔ حیوانات، نباتات، جمادات اور متفرقات۔ بس جو چیز ان تین قسموں میں داخل نہ معلوم ہوئی کہدیا کہ یہ متفرقات میں سے ہے۔ بس اس کے بعد ان کا سوال ختم ہو گیا کہ وہ تو ان کا بھی استاذ نکلا۔ بس اسی طرح میں بھی کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے موجودات میں سے کچھ چیزیں ایسی پیدا کی ہیں جن کو تم متفرقات میں داخل کرو گے مثلاً گراموفون کہ اس پر شبہ ہوتا ہے کہ اگر یہ جمادات میں سے ہے تو بولتا کیوں ہے اور اگر حیوانات میں سے ہے تو کبھی مرتا کیوں نہیں حالانکہ یہ جن کی آواز کی حکایت کرتا ہے وہ تو مر کے ختم بھی ہو گئے مگر یہ نہیں ختم ہوتا۔ خیر یہ تو لطیفہ تھا۔ ظاہر ہے کہ جمادات میں سے ہے تو جمادات کے بولنے کا استبعاد بھی ختم ہو گیا۔ البتہ اب تک یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں مخارج کہاں ہیں اور حروف کیسے ادا ہوتے ہیں اور یہ حیرت بھی اس لئے ہے کہ ہم اس کی حقیقت نہیں جانتے۔ ورنہ موجدوں کو کچھ بھی حیرت نہیں اسی سے سمجھ لیجئے کہ جس نے اس کے موجد کو ایجاد کیا وہ کیسا ہو گا ع

چہ باشد آں نگار خود کہ بندد ایں نگارہا (وہ نگار کیسا ہو گا جس نے یہ نگار ایجاد کئے ہیں)

اور در اصل تو گراموفون کو بھی موجد حقیقی نے ہی ایجاد کیا ہے گو ظاہر میں ایک انسان موجد نظر آتا ہے کیونکہ یہ ایجاد نتیجہ ہے فعل دماغ کا اور موجد کا کام صرف سوچنا تھا پھر سوچنے کے بعد ایجاد کا ذہن میں آجانا اس کے اختیار میں نہیں چنانچہ ظاہر ہے کہ یہ بات اس کے اختیار میں نہیں کہ ایجاد کی صورت چار دن میں ذہن میں آجائے۔ یا برس روز میں اگر ایجاد کا ذہن میں آنا اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ فوراً ہی کیوں نہ سمجھ لیتا سالہا سال تک ادھیڑ بن میں کیوں لگے رہتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ کوئی اور موجد ہے اور یہ محض واسطہ ہے ؎

عشق من پیدا و معشوقم نہاں ۔۔۔ یار بیروں فتنۂ او در جہاں

(یار تو جہاں سے باہر ہے مگر اس کا تصرف جہان کے اندر ہے اور وہ خود نظر نہیں آتا)

کام کوئی کرتا ہے اور نام کسی کا ہے ؎

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں　　کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

اور یہ ستمگاری معنی مجازی پر محمول ہے مگر اہل ادب اس مجاز سے بچتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ایک مرتبہ ایک مضمون لکھا تھا اور اس میں یہ شعر بھی لکھا تھا تو میرے ایک بزرگ نے اس شعر کو ادب کی بنا پر کاٹ کے اس کے بجائے دوسرا شعر لکھ دیا کہ ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل　　نسیم صبح تیری مہربانی

اور میں نے ایک شعر دوسرا لکھا تھا اسے باقی رکھا کہ ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں　　مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

(مشک افشانی محبوب کے زلف کا کام ہے مگر عشاق نے مصلحت کی وجہ سے چین کے ہرنوں کے سر منڈھ دی ہے)

یعنی مشک کے بارہ میں چینی ہرن کا نام لگا دیا ہے ورنہ یہ سب آپ ہی کی زلف کی خوشبو ہے درحقیقت صوفیہ کرام نے اسی کو سمجھ کر کہا ہے کہ مخلوقات مظہر صفات الٰہیہ اور محض واسطہ ہیں اور فاعل حقیقی حق تعالیٰ ہی ہیں۔ مقصود تو اتنا ہی تھا باقی جوش میں بعض سے ایسے الفاظ بھی نکل گئے ہیں کہ کم فہموں کے ایمان کی صفائی ہوگئی جس سے وہ ہر شئے کو خدا سمجھنے لگے۔ مثلاً ؎

ز دریا موج گوناگوں برآمد　　زبیچوں برنگ چوں برآمد
گہے در کسوت لیلےٰ فروشد　　گہے در صورت مجنوں برآمد

(دریا سے رنگ برنگ کی موج اٹھتی ہے بے مثل برنگ مثل ظاہر ہوا کبھی لیلیٰ کے لباس میں اتر آیا کبھی مجنوں کی صورت میں ظاہر ہوا)

تو یہ سب غلبۂ حال میں نکلا ہے کہ خدا تعالیٰ کو کبھی لیلی کہہ دیا اور کبھی مجنوں خوب سمجھ لو اور وحدۃ الوجود اور ہمہ اوست اسی مسئلہ کا نام ہے اور ان تعبیرات مجازی کی ایسی مثال ہے کہ مثلاً کسی بڑے حاکم کے پاس ایک مظلوم پہونچا اور جا کر کسی کے ظلم

کی فریاد کی حاکم کہتا ہے کہ پہلے پولیس میں رپورٹ لکھواؤ پھر ابتدائی عدالت میں باقاعدہ چارہ جوئی کرو وہاں تمہارے مفید نہ ہو تو درمیانی عدالت میں جاؤ وہاں بھی نہ ہو تو پھر ہائی کورٹ یا عدالت العالیہ میں رجوع کرو اور جب وہاں بھی نہ ہو تب میرے پاس لاؤ۔ ابھی سے خلاف ضابطہ میرے پاس کیسے آگئے۔ تو وہ کہتا ہے حضور میں نہیں جانتا پولیس و عدالت میرے تو حضور ہی پولیس ہیں اور حضور ہی عدالت ابتدائی۔ اور حضور ہی عدالت انتہائی۔ اب میں پوچھتا ہوں یہ کلام صحیح ہے یا غلط بالکل صحیح ہے۔ اب ایک کم فہم جاہل نے بھی وہاں دربار میں یہ کلام سنا اور یہ سمجھا کہ اچھا یہ بادشاہ صاحب کانسٹبل بھی ہیں، تھانہ دار بھی ہیں اور اب جو دربار میں گیا تو جاکے بادشاہ سے کہا کانسٹیل صاحب السلام علیکم اس پر اس کے اتنے جوتے لگیں گے کہ یاد کرے گا کیونکہ یہ کلام بالکل غلط ہے بس یہی فیصلہ ہے وحدۃ الوجود کا یہی حاصل ہے عارفین کے ان اشعار کا مثلاً ؎

یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو
ہر چہ بینم در جہاں غیر تو نیست

(مطلب یہ ہے کہ تمام عالم آپ کے صفات کا مظہر ہے ہر چیز کو آپ سے تعلق ہے غیر کا وجود ہی نہیں بلکہ ہر جگہ آپ کا ظہور ہے)

اور مثلاً عارف جامیؒ کا شعر جس میں اس کی بنا بھی بتلادی ؎

ہر چہ پیدا می شود از دور پندارم توئی
بسکہ در جان فگار و چشم بیدارم توئی

یعنی چونکہ آپ میری جان و دل میں ہر وقت حاضر ہیں اس لئے میں ہر چیز کو یوں سمجھتا ہوں کہ آپ ہی ہیں۔ پندارم سے معلوم ہوگیا کہ اس کا منشا غلبہ خیال ہے۔ یہ نہیں کہ واقع میں ہر چیز۔ معاذ اللہ خدا ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ آدمی جب کسی کے انتظار میں ہوتا ہے تو جب کوئی سامنے سے آتا ہے تو یوں ہی سمجھتا ہے کہ وہی آگیا۔ اس پر ایک لطیفہ یاد آیا کہ جب مولانا یہ شعر پڑھ رہے تھے ایک منکر تصوف نے کہا مولانا اگر خر پیدا شود۔ تو آپ نے فی البدیہ جواب دیا۔ پندارم توئی یعنی میں سمجھوں گا کہ تو ہے۔ سبحان اللہ جواب میں بھی اس کلیہ سے نہیں نکلے اور جواب

ایسا دیا کہ مخاطب پر چسپاں ہو گیا کیا ذہانت ہے۔ اس احمق نے مولانا کے ذوق کو بھی برباد کیا۔ غرض یہ ہے وحدۃ الوجود کی حقیقت اور ہمہ اوست کا عنوان ایسا ہے جیسا اس مظلوم کا بادشاہ سے کہنا کہ حضور ہمارے تو پولیس بھی آپ ہی ہیں۔ مجسٹریٹ بھی آپ ہی اور عدالت العالیہ بھی آپ ہی ہیں۔ تو یہ قول اس کا صحیح ہے یا غلط اگر مجاز نہ لیا جائے تو غلط ہے ورنہ صحیح ہے اس قول کے معنے یہ ہیں کہ حقیقی حاکم آپ ہیں اور سب واسط اور برائے نام حاکم ہیں اور وہ سب آپ کے مقابلہ میں ضعیف ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ اقوی ہیں اور اقویٰ کے سامنے اضعف کچھ بھی نہیں۔ یہی مطلب وحدۃ الوجود کا ہے کہ موجود حقیقی حق تعالےٰ ہیں۔ باقی سب برائے نام موجود ہیں۔ اسے سعدیؒ نے خوب واضح کیا ہے ؎

یکے قطرہ از ابر نیساں چکید
خجل شد چو دریائے پہنا پدید

ایک قطرہ پانی کا ابر سے یہ دعویٰ کرتا چلا انا مدور۔ انا منور۔ انا مطہر کہ میں ایک کرہ کی طرح گول ہوں اور آئینہ کی طرح پاک وصاف ہوں مگر جوں ہی دریا کے قریب پہونچا تو اپنے دعووں سے شرمندہ ہو کر بے ساختہ کہتا ہے ؎

کہ جائیکہ دریاست من کیستم
گر او ہست حقا کہ من نیستم

جہاں دریا ہے میں کیا چیز ہوں اس سے تو مجھکو یہ نسبت ہے کہ اگر وہ ہست ہے تو میں نیست ہوں واقع میں تو نیست نہیں مگر اس کے مقابلہ میں گویا نیست ہوں یہ کلام تشبیہی ہے جیسے بہادری کے اظہار میں کمال مبالغہ منظور ہوتا ہے تو کہدیتے ہیں زید اسد زید شیر ہے۔ اب کسی احمق نے بھی یہ سُنا وہ زید کے پیچھے جاکے بیٹھا ارے یہ کیا۔ کہاں میں دُم دیکھتا ہوں کیونکہ تم نے کہا بھی تھا

کہ زید شیر ہے۔ احمق کہیں کا ارے یہ تو تشبیہ کے واسطے کہہ دیا تھا سچ مچ وہ شیر تھوڑا ہی ہے۔ تو حضرت اگر ان عنوانات کا مدلول ایسا ہی اتحاد ہے تو پھر سارے محاورات ہی بے کار ہو جائیں گے۔ اسی محاورہ کے موافق من نیستم یہاں بھی کہا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ میری ہستی اتنی کمتر ہے کہ دریا کے سامنے مثل نیستی کے ہے۔ آگے مقصود کی تصریح ہے ؎

ہمہ ہرچہ ہستند ازاں کمتر اند
کہ باہستیش نام ہستی برند

یعنی مخلوقات ہست تو ہیں مگر ایسے ہست ہیں کہ اس کے سامنے ان کو ہست کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ جیسے کوئی بڑا حاکم بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو اور بادشاہ پوچھے کہ آپ حاکم ہیں تو وہ شرما کر کہیگا کہ حضور میں حضور کے سامنے کیسے کہوں کہ حاکم ہوں۔ اگر حقیقت کے اعتبار سے کہے کہ میں حاکم نہیں تو ناشکری کی اور اگر کہے کہ ہاں حضور میں حاکم ہوں تو ادب کے خلاف دعوے اور گستاخی ہے کہ بادشاہ کے سامنے دعوےٰ حکومت کرتا ہے وہاں یہی کہنا چاہیئے کہ حضور کے سامنے کیسے کہوں حقیقت کا انکار بھی نہ کرے اور ادب کو بھی نہ چھوڑے کیونکہ جیسے دعوےٰ مذموم ہے اسی طرح انکار حقیقت بھی قبیح ہے اور اگر ایسا ہی حقیقت سے انکار ہے تو بس پھر اگر کوئی یہ کہے تم آدمی ہو تو یوں کہا کرو کہ نہیں ہم تو گدھے ہیں مگر یہ ایسی تواضع ہوگی جیسے میں ایک مرتبہ الہ آباد سے کانپور کا سفر کر رہا تھا جس گاڑی میں میں بیٹھا تھا اس میں چند جنٹلمین مل گئے۔ وہ سب مسلمان تھے صرف ایک شخص دوسرے مذہب کا جو منصف بھی تھا کہیں سے ان میں ملگیا وہ بے فکرے تو تھے ہی آپس میں شعر اشعار کی چھیڑ چھاڑ کرتے جاتے تھے اتفاقاً ان میں سے کسی نے ایک شعر جو پڑھا تو منصف کے منہ سے نکل گیا جناب پھر تو فرمایئے۔ بس کم بختی آگئی۔ ایک نے کہا آہا آپ شاعر بھی ہیں

اس نے کہا نہیں صاحب دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ ضرور شاعر ہیں یہ آپ کی تواضع ہے ورنہ شعر کا اعادہ نہ کراتے۔ تیسرے نے کہا جناب مسکین آپ کا تخلص ہے تو ایک، کہتا ہے آہا تو یہ شعر بھی آپ ہی کا ہے کہ ؎

مسکین خر اگرچہ بے تمیز است

چوں بار ہمیں برد عزیز است

(مسکین گدھا اگرچہ بے تمیز ہے جب بوجھ لے جاتا ہے پیارا ہے)

یہ سب تمسخر کر رہے تھے اور مجھ سے بار بار کہتے جاتے تھے کہ معاف فرمائیے آپ کو بہت تکلیف ہوتی ہوگی اگرچہ مجھے جانتے نہ تھے میں نے اپنے دل میں کہا کہ حضور آپ کی یہی بڑی عنایت ہے کہ مجھ پر مشق نہیں ہوئی رہی ہے۔ غرض اس کے ساتھ ان لوگوں نے بڑی شرارت کی۔ پھر کھانا لے کے بیٹھے تو اس سے کہا منصف صاحب آئیے کچھ گوہ موت آپ بھی کھا لیجئے۔ ان میں سے ایک بولا گوہ موت کیسا تم کھانے کی بے ادبی کرتے ہو۔ اس نے جواب دیا یہ تواضع ہے اپنے کھانے کو کھانا کہنا کبر ہے اس لئے اپنے کھانے کو تحقیر ہی کے ساتھ ذکر کرنا چاہیئے تو کیا آپ اس کو بھی تواضع کہیں گے یہ تو صریح ناشکری ہے۔ اگر بادشاہ نے کہا کیا تم حاکم ہو تو یہاں دو شخصوں کی دو حالتیں ہیں۔ ایک شخص تو اس قدر مرعوب ہے اور اس پر اس قدر اثر ہے سلطان کی عظمت کا کہ فانی فی السلطان ہے وہ اگر کہدے کہ میں حاکم نہیں تو کچھ حرج نہیں اور ایک ایسا مغلوب نہیں ہے اور پھر وہ کہتا ہے کہ میں حاکم نہیں ہوں تو اس کہنے کا یہ اثر ہوگا کہ اس کو حکومت سے الگ کر دے گا کہ یہ بڑا ناشکرا ہے کہ ہم نے تو اسے عنایت کر کے حاکم بنایا اور یہ ہماری عنایت کو مٹاتا ہے۔ اسی طرح وحدۃ الوجود میں سمجھئے کہ اگر اس پر غلبہ ہے موجود مطلق کا اور اس وقت یہ کہتا ہے کہ

ہمارا وجود نہیں تو مقبول ہے ورنہ مردود غرض حال مقبول اور قال خض غیر مقبول اسی کو کہا گیا ہے ؎

مغرور سخن مشو کہ توحید خدائے
واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

(مغرور سخن نہ ہو اس لئے توحید خدا کو واحد دیکھنا ہے نہ واحد کہنا)

تو جن صوفیہ پر غلبہ تھا حال کا انھوں نے سب کی نفی کر دی وہ یوں بھی کہہ سکیں گے کہ گراموفون وغیرہ کو اس مشہور موجد نے ایجاد نہیں کیا بلکہ اس نے ایجاد کیا جس نے پہلے دماغ میں ڈالا پھر اس کے بیان کرنے کے لئے زبان میں حرکت دی پھر اس کے بنانے کے لئے ہاتھ میں حرکت دی جس کے سامنے موجد کی یہ حالت ہے ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

(محبوب حقیقی نے یہ حرکات پیدا کر دیئے ہیں جس طرف چاہتے ہیں متحرک کر دیتے ہیں)

تو جس کی حقیقت پر نظر پہونچ گئی اُسے تو یہ کہتے ہوئے شرم ہی آوے گی کہ یہ کام میں نے کیا اگر نفی کر دے تو معذور ہے۔ اب یہاں ایک سخت اشکال ہے کہ اگر حقیقت کے اعتبار سے افعال عبد کی بالکل نفی کر دیں تو عام لوگوں پر مفسدہ کا اندیشہ ہے کہ وہ گناہ کر کے بھی اپنے کو بے خطا سمجھیں گے اور اگر ہر فعل کو اپنی طرف منسوب کرنے کی اجازت دیں تو چونکہ ہر شخص اس درجہ کا ہے نہیں جس درجہ کے عارفین ہیں۔ تو اس اجازت میں مفسدہ ہے۔ خود بینی کا کہ اتنے بڑے قادر کے سامنے یوں کہیں کہ ہم نے یہ کام کیا جس میں اپنے کاموں پر صریح ناز ہے۔ اس اشکال کا حل جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے حق تعالےٰ نے ایسی ترکیب سے فرمایا ہے جس کے بعد

اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہٗ
باز می گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

(دریا میں تختہ میں باندھ کر ڈال دیا ہے۔ پھر کہتے ہو کہ خبردار دامن تر نہ ہو)
اور وہ ترکیب یہ ہے کہ ارشاد فرمایا۔ وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَیْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ﷲ جس کا حاصل یہ ہوا کہ یوں کہو کہ کام تو ہم نے کیا مگر خدا کے چاہنے سے کیا اب دونوں شقوں کے مفاسد برطرف ہوگئے۔ سبحان اللہ کتنا لطیف جمع ہے دونوں شقوں کا کہ نہ تو دعوےٰ ہے اور نہ اپنا تبریہ پس اشکال بھی رفع ہوگیا یہ سب کلام اس پر چلا تھا کہ آسمان وزمین نے بھی اختیاری غلامی اختیار کی تھی۔ اسی مسئلہ میں دوسرے مضامین آگئے تھے۔ اب میں اسی مضمون کی طرف عود کرتا ہوں کہ اوپر یہ شبہہ تھا کہ کیا آسمان وزمین میں ادراک بھی ہے اس کا جواب یہ دیا تھا کہ ہاں ادراک ہے۔ چنانچہ قَالَتَآ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ (انھوں نے کہا کہ ہم خوشی سے اطاعت قبول کرتے ہیں) سے تو استدلال گذر چکا ہے اور لیجئے ارشاد ہے۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ط ۔ ترجمہ۔ ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا سب نے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔ وہ انسان بہت ظلوم جہول ہے اگر ان میں ادراک نہ تھا تو عذر کیسے کیا اور پھر ڈرے کیسے۔ ڈر تو فعل قلب کا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حالت کے مناسب قلب بھی ہے اور زبان بھی ہے کیونکہ وہ چیز جس سے بولتے ہیں وہ زبان ہے اور وہ چیز جس سے ڈرتے ہیں وہ قلب ہے باقی وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط (انسان نے اس کو اٹھالیا) کی کیا وجہ بھی وہ وجہ یہ تھی کہ ان حضرت کو عقل بھی زیادہ تھی اور ان میں مادہ محبت کا بھی زیادہ تھا بلکہ اگر غور سے دیکھا جاوے تو اصل مابہ الامتیاز انسان میں یہ محبت ہی ہے۔ چنانچہ جب میں کانپور میں پڑھتا تھا

تو معقولات بھی پڑھاتا تھا اس وقت میں نے کہا تھا کہ اہل معقول انسان کی حقیقت حیوان ناطق بتلاتے ہیں لیکن میرے نزدیک حیوان عاشق کہنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ فصل ایسا ہونا چاہیئے جو دوسری انواع سے ممیز ہو تو نطق تو انسان کے لئے اتنا ممیز نہیں جتنا عاشق کیونکہ یہ تو ملائکہ اور جنات میں بھی مشترک ہے اور عشق کا مادہ بجز انسان کے کسی میں نہیں یہ مادۂ عشق ہی تو تھا جس سے امانت پیش ہونے کے واسطے جو اس سے خطاب کیا گیا۔ اس خطاب میں ایسا خاص حظ اور کچھ ایسی عجیب لذت ہوئی کہ فوراً لینے کے لئے مستعد ہو گیا کیونکہ اس میں عشق بھی تھا اور عقل بھی۔ عشق سے تو لذت خطاب کا ادراک ہوا اور یہ سوچا کہ ایک بار کے کلام میں جب ایسا حظ ہوا تو حمل امانت سے تو بار بار کے کلام کا موقع ملے گا اس میں کتنا حظ ہو گا۔ بس امانت یعنی احکام شرعیہ کی تکلیف کو قبول کر لیا گو اس کا انجام یہ بھی ہوا کہ لِیُعَذِّبَ اللّٰہُ الْمُنٰفِقِیْنَ (تاکہ اللہ تعالٰی منافقوں کو عذاب دیں) الیٰ آخرہ مگر عشق کی وجہ سے اس کی پروا نہ کی کہ عذاب بھی بھگتنا پڑے گا اس کو لے ہی لیا۔ حافظ شیرازیؒ کے کلام میں اسی علّت کی طرف اشارہ بھی ہے ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

(آسمان بار امانت نہ اٹھا سکا قرعۂ فال مجھ دیوانہ کے نام نکل آیا)

اس شعر میں یہی واقعہ مذکور ہے اور دیوانہ کے لفظ میں اسی طرف اشارہ ہے کہ امانت لینے کا سبب عشق ہوا یہ مضمون حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط (انسان نے اس کو اٹھا لیا) کا استطراداً آ گیا۔ اصل مضمون یہ تھا کہ سمٰوٰت و ارض و جبال نے جو امانت لینے سے عذر کیا اور ڈر گئے اس سے ان کا بھی ذی شعور و ذی روح وغیرہ ہونا معلوم ہوتا ہے پس سوال جو ان کے ادراک کے استبعاد پر ہوا تھا وہ حل ہو گیا اور اَتَیْنَا طَائِعِیْنَ ط (ہم خوشی سے اطاعت قبول کرتے ہیں)

سے انکار اختیاری غلامی کو اختیار کرنا ثابت ہو گیا اور ان کا خطاب میں جو طوعاً اور کرہاً واقع ہے اس میں اسی عبدیت اختیاری و عبدیت اضطراری کی طرف اشارہ ہے جس کو میں نے اوپر بیان کیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ایک غلامی تو اضطراری ہے جیسے موت بیماری وغیرہ کہ اس میں اگر اطاعت کی تو کیا کمال کیا اگر نہ کرتے کیا کر لیتے۔ کمال تو اس بندگی میں ہے جو آپ کے اختیار سے ہو اور یہ غلامی اختیاری ہے اور انسان اسی کا مکلّف ہے سو صورت کے درجہ میں تو ہم لوگ اس عبادت اختیاریہ کو ضروری سمجھتے ہیں مگر حقیقت کے درجہ میں ہمیں اس کی طرف مطلق توجہ نہیں ہے۔ اسلئے میں اس عبادت یعنی غلامی کی حقیقت بتلاتا ہوں اس کے بعد معلوم ہو سکے گا کہ آیا ہم اس درجہ کی غلامی کر بھی رہے ہیں یا نہیں سو اس کی سہل نظیر سمجھنے کے لئے یہ ہے۔ کہ آپ کا کوئی نوکر ہو اور وہ آپ کے ساتھ وہ برتاؤ کرے جو آپ نے خدا کے ساتھ کر رکھا ہے تو اس وقت آپ کی کیا حالت ہو گی بس اسی پر فیصلہ ہے۔ اب بتلایئے کیا آپ کو معلوم نہیں کہ خدا کا حکم ہے اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ نماز پڑھو اگر نوکر سے کہیں کھانا لاؤ اور وہ نہ لاوے تو آپ کو کتنا غصہ آوے گا یقیناً اسی دن نوکری سے الگ کر دو گے حق تعالٰی کو تو اپنے بندوں کی نافرمانی پر اتنا غصہ آتا بھی نہیں جتنا ہم کو نوکروں پر آتا ہے کیونکہ انھیں محبت بھی ہے اس لئے وہ بہت سے گناہوں پر انتقام نہیں لیتے اور کبھی لیتے بھی ہیں تو بہت مہلت دیکر مگر انھیں حق تو ہے فوراً انتقام لینے کا۔ پھر آپ کے نوکر نے آپ کی نافرمانی کی تو بتلایئے اس نے آپ کا کیا حق ضائع کیا کچھ بھی نہیں کیونکہ عقد اجارہ کی حقیقت یہ ہے کہ ایک جانب منافع ہوتے ہیں اور ایک جانب روپیہ نوکر اپنے منافع آپ کے ہاتھ بیچتا ہے۔ منافع یہ کہ کھانا پکانا، بازار جانا سودا لانا۔ تو نوکر رکھنے کے معنے یہ ہوئے کہ آپ نے اس کے منافع خریدے۔ اب آپ کے غصہ کی حقیقت یہ ہے کہ اس نے اپنے منافع ہم کو نہیں دیئے اس کا بدلہ یہ ہے کہ آپ اس منفعت کی برابر اس کو

تنخواہ نہ دیجئے مگر نہیں اس پر بس نہیں کرتے سزا بھی دیتے ہیں ذلت کے ساتھ نکال بھی دیتے ہیں اور پھر وہ منافع مملوک بھی کیسے ہیں کہ جب چاہے وہ نوکری چھوڑ دے بس آپ کی ملک ختم اور یہاں تو منافع بھی خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور ہاتھ پیر بھی انھیں کے دیئے ہوئے۔ ہائے افسوس ہم انھیں کی چیزوں سے انھیں کی معصیت کرتے ہیں۔ اسی طرح آنکھیں بھی خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں جن کو معصیت کا آلہ بنایا جاتا ہے۔ اسی طرح ان کا نور بھی۔ کیونکہ دماغ میں ایک مجمع النور ہے جو ایک نور کی نہر ہے اور ہر وقت جاری ہے اور اس میں اس قدر نور پیدا ہوتا ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتا اور وہ برابر آنکھوں میں آتا رہتا ہے اور جوں جوں آپ نگاہ کرتے اور دیکھتے ہیں وہ ختم ہوتا جاتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ آتا رہتا ہے۔ جیسے پانی کی نہر یا بجلی کی روشنی کہ برابر بجلی آتی رہتی ہے۔ اسی طرح نور بھی کہ اگر کسی دن دماغ سے نہ آوے تو آنکھیں پٹ ہوجاویں اس پر ایک ملحد کو متنبہ کیا گیا تھا۔ قصہ یہ ہے کہ قرآن میں حق تعالےٰ نے فرمایا ہے۔ قُلْ اَرَاَیْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَاۤؤُکُمْ غَوْرًا فَمَنْ یَّاْتِیْکُمْ بِمَآءٍ مَّعِیْنٍ ؕ بتلاؤ اگر پانی نیچے اتر جاوے تو کون ہے جو اسے لا سکتا ہے۔ ایک ملحد نے جب یہ آیت سُنی تو آپ نے قافیہ ملایا۔ اگرچہ پھر آپ ہی کا قافیہ تنگ ہوگیا کہ نَاْتِیْ بِھَا بِالْمَعْوُلِ وَالْمُعِیْنِ اگر پانی اتر جاوے تو ہم کدال اور مزدور کی مدد سے پھر نکال لیں۔ تو گویا آپ نے یہ جواب دیا اللہ میاں کو اور وہاں تو عادت یہ ہے کہ اگرچہ دیر گیر وسخت گیرد (اگرچہ دیر سے پکڑے سخت پکڑے) کیونکہ وہ کوئی بے تاب تو ہوتے نہیں کہ فوراً بدلہ لے لیں۔ خیر رات ہوئی اب یہ سویا خواب میں ایک فرشتہ آیا اور اس نے منہ پر ایک تھپڑ لگایا اور کہا ذَھَبْنَا بِمَا عَیْنَیْکَ فَاْتِ بِھَا بِالْمَعْوُلِ وَالْمَعِیْنِ ؕ جیسے ہم نے تیری دونوں آنکھوں کا پانی زائل کر دیا اسے بھی مزدور لگا کے پیدا کر لے صبح اٹھا تو پٹ تھا۔

مولانا اس مقام پر فرماتے ہیں. اگر توبہ کر لیتا تو اس پر بھی معاف کر دیا جاتا۔ اور آنکھوں کی روشنی بحال ہو جاتی مگر قساوت کب اجازت دیتی ہے۔ چنانچہ اس قبول توبہ کی تائید میں ایک اور قصہ ہے کہ قارون نے جب ایک فاحشہ کو بہکایا کہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ تہمت لگانا حق تعالیٰ نے اس کو توفیق دی کہ مجمع عام میں سچ کہہ دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو غصہ آیا اور زمین سے فرمایا کہ یَا اَرْضُ خُذِیْہِ کہ اے زمین پکڑ اس قارون کو۔ چنانچہ وہ دھنسنا شروع ہوا۔ اس نے پکارا اے موسیٰ مجھے چھوڑ دو۔ آپ نے جوش میں پھر فرمایا یَا اَرْضُ خُذِیْہِ (اے زمین اس کو پکڑ) وہ چلاتا تھا اور آپ برابر یَا اَرْضُ خُذِیْہِ (اے زمین تو اس کو پکڑ) یہاں تک کہ بالکل دھنس گیا۔ بعد میں حق تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ آپ اس وقت بہت غصہ میں تھے اس لئے ہم نے بھی کچھ نہیں کہا لیکن اگر وہ بجائے آپ کے ہم کو پکارتا تو ہم تو چھوڑ دیتے کیا انتہا ہے اس رحمت کا کہ ؎

اگر خشم گیرد بکردار زشت
چو باز آمدی ماجرا در نوشت

(اگر غصہ پکڑے برے کام پر جب واپس آئے یعنی توبہ کرے ماجرا لپیٹے)

اس کے متعلق ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک دفعہ جب میں کانپور رہی میں تھا تو ایک آقا اور نوکر میں کچھ بے لطفی ہو گئی۔ نوکر میرے پاس آیا کہ میری سفارش کر دو۔ آقا بولے کہ اگر تم کہو تو معاف کر دوں میں نے کہا میں زور نہیں دیتا۔ مگر ایک قصہ سن لیجئے۔ پھر یہ قصہ بیان کر دیا اور یہ کہا کہ آپ کے سامنے موسیٰ علیہ السلام کی بھی سنت ہے اور اللہ تعالیٰ کی بھی۔ اب آپ کو اختیار ہے جس پر چاہیں عمل کریں میں سفارش نہیں کرتا۔ بھلا خدا کی سنت کے ہوتے ہوئے موسیٰ کی سنت پر کب عمل کر سکتے تھے۔ تو حق تعالیٰ کی ایسی رحمت تھی کہ اگر وہ ملحد

اپنی گستاخی سے توبہ کرتا تو ضرور معاف کر دیتے اور اس کی آنکھیں پھر منور کر دیتے۔ غرض آیت میں حق تعالیٰ نے جو یہ دعویٰ کیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ اسباب عادیہ کو ہم اگر معطل کر دیں کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اسی واسطے عارفین مشاہدہ سے کہتے ہیں ؎

عقل در اسباب میدارد نظر عشق میگوید مسبب را نگر

(عقل کی نظر اسباب پر ہے عشق مسبب کو دیکھتا ہے)

تو یہ جس قدر اسباب ہیں یہ سب انھیں کے عطا کئے ہوئے ہیں مگر نام ہمارا کر دیا جیسے ہم اپنے بچوں کے واسطے بعض چیزیں ان کے خوش کرنے کے لئے نام زد کر دیتے ہیں کہ مثلاً یہ کھٹولی تمہاری ہے اور یہ چوکی اس کی ہے اسی طرح سب چیزیں حق تعالیٰ کی ہیں۔ اور محض ہمارے خوش کرنے کو ہماری طرف ان کی اسناد مجازی کر دی ہے تو اس صورت میں بڑی شرم کی بات ہے کہ ان ہی چیزوں سے ان ہی کا مقابلہ کریں۔ اس پر اگر کوئی کہے کہ جب سب چیزیں حق تعالےٰ کی ہیں تو ہماری ملک کیسے ہو سکتی ہیں۔ صاحبو اُس ملک کی حقیقت صرف یہ ہے کہ بعض اسباب کے وجود پر قانون مقرر کر دیا کہ اس میں فلاں شخص کو تصرف کی اجازت ہے دوسروں کو بدون اس کے اذن کے نہیں۔ پس یہ ہے حقیقت اس ملک کی اور اس سے ہمارے اس دعوے میں کوئی قدح نہیں ہوا۔ اگر کوئی کہے کہ اس اسناد مجازی میں حکمت کیا ہے اگر اتنی نسبت بھی نہ ہوتی تو شاید یہ معصیت پر معصیت نہ کرتا تو میں حکمت بتلاتا ہوں اور اس سے ان لوگوں کی غلطی بھی ظاہر ہو جاوے گی جنھوں نے شریعت پر حقیقت کو ترجیح دی ہے میں مناقشہ تو کرتا نہیں لیکن یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ حقیقت کو اگر ترجیح ہوتی شریعت پر تو بڑا لطف ہوتا کہ ہر شخص حقیقت پر عمل کر کے ایک دوسرے کی چیز لے کر بھاگ جایا کرتا کہ یہ تو اللہ میاں کی ہے تیری کہاں سے آئی اور اس کا جو انجام ہوتا ظاہر ہے اس لئے حق تعالےٰ نے اتنی نسبت لگا دی کہ جو چیز

اسباب شرعیہ کے موافق کسی کو مل جائے وہ اسی کی ملک ہے سو اس نسبت کے لگا دینے میں تو کہ فلاں چیز فلاں کی ہے ایک ہی خطرہ ہے کہ بس اپنی ملک کا ناز ہی ہے جس کا علاج بھی آسان ہے اور وہاں حقیقت پر عمل کرنے میں قتل و خونریزی ہے۔ مثلاً آپ کے پاس ایک گھوڑا ہے اور آپ اسے اپنی ملک سمجھتے ہیں ایک دوسرا آدمی جو آپ سے زبردست ہو وہ کہے آپ کی ملک کدھر سے ہے کہ ؎

فی الحقیقت مالک ہر شے خداست

ایں امانت چند روزہ نزد ماست

(درحقیقت ہر چیز کے مالک خدا تعالیٰ ہیں یہ ہمارے پاس چند دن کیلئے امانت ہے)

حقیقت کا فتویٰ تو یہ ہے نہیں کہ گھوڑا آپ کا ہے یہ تو شریعت کا فتویٰ ہے اور تم شریعت کو مانتے نہیں پھر یہ آپ کی زیادتی ہے کہ آپ دو برس سے غیر مملوک چیز پر قبضہ کئے ہوئے ہیں اب لایئے میرا حق ہے آخر میں بھی خدا کا بندہ ہوں اس کے بعد پھر نوبت پہونچتی بچوں کی اور بیوی کی تو نتیجہ یہ ہوتا کہ عالم ایک رزم گاہ ہوتا ہر وقت قتل و خونریزی کا بازار گرم رہا کرتا۔ اس وقت ہم یہ کہتے حضرت یہ سب آپ کی انکار شریعت کی بدولت ہو رہا ہے۔ غرض اس سے تو انکار نہیں کہ عالم میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کا مملوک و غلام ہے مگر یہ کہنا کہ یہ فلاں کا ہے اور یہ فلاں کا یہ بھی خدا ہی کا حکم و کلام ہے اگر اس کا کوئی اثر نہیں تو کیا خدا کا یہ کہنا بیکار ہے۔ یہ راز شریعت کی عینک نے دکھلایا ہے۔ اگر شریعت نہ ہوتی تو عالم میں ایک فساد برپا ہو جاتا۔ مولانا رومی نے مثنوی میں ایک جبری کا قصہ لکھا ہے کہ وہ کسی کے باغ میں گھس گیا اور پھل توڑ کے کھانے لگا مالک باغ نے منع کیا تو کہا تو کون ہوتا ہے باغ بھی خدا کا پھل بھی خدا کا اور میں بھی خدا کا سو تو کون ہے منع کرنے والا اس نے کہا اچھا اور اپنے نوکر سے کہا کہ لا تو رسا اور خنکا۔ پھر رسے سے باندھ کے خوب ہی ڈنڈے

لگائے اب تو لگا چلانے اس لئے کہا چلاتا کیوں ہے۔ ارے میں بھی خدا کا تو بھی خدا کا رسا بھی خدا کا اور تختہ بھی خدا کا غرض سب خدا کا اب سمجھ میں آیا تو کہتا ہے ؎

گفت توبہ کردم از جبر اے عیار
اختیار ست اختیار ست اختیار

(میں نے جبر سے توبہ کی اب تو اختیار ہی اختیار رہے)

ہاں بھئی اب تو اختیار ہی اختیار ہے تو حضرت اگر شریعت نہ ہوتی سارے عالم میں ایسا ہی ہڑبونگ مچ جاتا یہ تو شریعت ہی کی عنایت ہے کہ اس نے مِلک مجازی کو بھی ان احکام میں مثل ملک حقیقی ہی کے قرار دیا ہے ورنہ پھر تو بڑا مزہ ہوتا کہ کوئی کسی کو قتل کر دیتا تو قصاص بھی نہ ہوتا۔ اور وہ کہتا کہ قاتل تو حقیقت میں اللہ میاں ہیں پھر میرا کیا دخل۔ حضرت سچ یہ ہے کہ شریعت آپ کی آپ سے زیادہ خیرخواہ ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو آپ سب حقیقت بھول جاتے مگر افسوس ہے اس پر بھی شریعت کی قدر نہیں کرتے۔ غرض حق تعالیٰ نے براہ عنایت بعض اشیاء کو ہمارے نام زد کر دیا ہے۔ مگر اس کے آثار یہ نہ ہونا چاہیئے۔ کہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں ان کو اپنی کہنے لگو۔ ہاں دوسرے کے مقابلہ میں اس کہنے کی اجازت ہے۔ پس اگر خدا پوچھے کہ یہ انگرکھا کس کا ہے تو کہئے آپ کا۔ اور اگر کوئی آدمی پوچھے کہ کس کا ہے تو کہئے ہمارا۔ کیونکہ اگر آپ اس آدمی سے بھی یہی کہیں گے کہ آپ کا ہے تو وہ اتار لے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب سب انہیں کا ہے تو انہیں کے آلات لے کر انھیں کی نافرمانی کرنا بڑے غضب کی بات ہے دیکھئے اگر کوئی نوکر بچہ سا اور کمزور اور بیمار ہمارے پاس آیا ہو اور ہم نے اُسے کھلا پلا کے اور علاج کرا کے تندرست اور توانا اور بڑا کیا اور پھر تلوار بندوق بھی دی۔ اب وہ اسی تلوار بندوق سے ہمارا مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاوے تو اس سے یہی کہا جاوے گا کہ میاں ہماری تلوار بندوق رکھدو اور اپنے گھر سے ہتیار لاؤ مقابلہ کے لئے اسی طرح اگر خدا کی نافرمانی کرنا ہے

توخدا کی چیزیں واپس کردو اور اپنے گھر سے لاؤ مگر جب لانا چاہو گے اس وقت یہی کہنا پڑے گا ؎

نیاوردم از خانہ چیزے نخست
تو دادی ہمہ چیز من چیز تست

(میں اپنے گھر سے کوئی چیز نہیں لایا یہ سب آپ کا دیا ہوا ہے میری کیا حقیقت ہے)

توجس طرح آپ کو اس نوکر کی نافرمانی ناگوار ہے اسی طرح خدا کو آپ کی نافرمانی ناگوار ہے۔ بڑے غضب کی بات ہے کہ جس کا کھاویں اُسی پر غرّاویں۔ اس تقریر سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ غلامی حقیقت جو سمجھے گا پھر ممکن نہیں کہ اس کے حقوق ادا نہ کرے۔ اور حقیقت اس کی اوپر معلوم ہوچکی ہے تو اس کے حقوق بھی ادا کرنا لازم ہوگا اور ادائے حقوق کے لئے علم حقوق شرط ہے اس لئے ضرورت ہوگی حقوق معلوم کرنے کی اب ان کو اجمالاً عرض کرتا ہوں تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ تین حق ہیں ان میں سے ایک تو اطاعت ہے مگر اطاعت کے وہ معنے نہیں جو محض اہل قشر ظاہر پرست سمجھتے ہیں۔ یعنی محض ضابطہ کی اطاعت بلکہ حقیقی اطاعت ہونا چاہیئے اسے اس طرح سمجھئے کہ نوکر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو یورپین مذاق کا ہے کہ کھانا پکا دیا اور چلدیا۔ اگر آقا نے کبھی کہا بھی کہ بھی ذرا پنکھا جھلدو کہا صاحب میرے فرائض میں نہیں ہے۔ اور ایک نوکر ایشیائی مذاق کا ہے کہ کھانا بھی پکا دیا اور کھلا بھی دیا۔ اور پنکھا بھی جھل رہا ہے اور اس سے فارغ ہو کے بیٹھ گیا۔ آقا کے پاؤں دابنے لگا۔ آپ کہتے بھی ہیں کہ بس بھائی جاؤ یہ کام تمہارے ذمہ نہیں ہے۔ مگر وہ کہتا ہے نہیں گو ذمہ نہ ہو مگر مجھے تو آپ کی خدمت سے راحت ہوتی ہے۔ آپ خود دیکھ لیجئے کہ آپ زیادہ کس نوکر کی قدر کریں گے۔ اسی طرح خدا کے بندے بھی دو قسم کے ہیں ایک وہ جنھوں نے وقت پر اطاعت کر لی پھر کچھ بھی مطلب نہیں رہا نہ خدا سے محبت ہے نہ ادب ہے کوئی گناہ صغیرہ

ہو گیا تو کہتے ہیں یہ تو صغیرہ ہے اور نماز و روزہ کے بعد چلتے پھرتے نظر آئے نہ خدا کی یاد ہے نہ اشتیاق ہے یہ ویسی اطاعت ہے جیسے یورپین مذاق کے نوکر آپ کی خدمت کیا کرتے ہیں آپ اس نوکر سے منقبض کیوں ہوتے ہیں جو کھانا پکا کر چل دیتا اور تھوڑی دیر پنکھا بھی نہیں جھلتا اسی لئے تو کہ اتنے احسانات کے بعد بھی تجھے قلبی تعلق نہیں ہوا کہ ٹکا سا جواب دیدیا تو معلوم ہوا کہ آپ اپنے نوکر سے دو حقوق کے طالب ہیں ایک خدمت دوسرا تعلق قلبی تو کیا خدا کا حق اتنا بھی آپ پر نہیں جتنا آپ اپنا حق نوکر پر سمجھتے ہیں مجھے اس پر ایک نوکر کی حکایت یاد آئی کہ ایک ضابطہ کا نوکر تھا کہ آقا نے جو کہدیا کر دیا اور جو نہ کہا نہ کیا بلکہ اس میں بھی تاویل کر کے تخفیف نکال لیتا تھا۔ اس سے آقا نے ایک بار پوچھا کہ کیا بارش ہو رہی ہے کہنے لگا ہو رہی ہے لیٹے ہی لیٹے جواب دیدیا اٹھا تک نہیں پوچھا کیسے معلوم ہوا۔ کہا ایک بلی میری چارپائی کے نیچے آئی تھی۔ میں نے اس پر ہاتھ رکھا تو وہ بھیگی ہوئی تھی پھر کہا میاں چراغ تو گل کر دے۔ کہا چادر سے منہ ڈھانک لیجئے بس اندھیرا ہو جاوے گا کہا اچھا ذرا دروازہ ہی بند کر دے۔ تھا ہوشیار اس میں کوئی تاویل نہیں کی۔ سمجھا کہ اس میں تاویل کر لے سے چوری ہو جانے کا اندیشہ ہے تو کیا کہتا ہے جناب دو کام میں نے کئے ایک آپ کر لیجئے آخر میرا بھی تو حق ہے۔ ایک اور ضابطہ ہی کا نوکر تھا جو کام تو سب کرتا تھا مگر صرف وہی جو بتلا دیا۔ اور وہ بھی بالکل بے فکری سے اس لئے اکثر کام رہ بھی جاتے تھے۔ ایک بار مالک زیادہ ناخوش ہوا کہ تو نے یہ نہیں کیا وہ نہیں وہ نہیں کیا تو اس نے کہا صاحب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کون کون کام میرے ذمہ ہیں آپ مجھے سب کاموں کی ایک فہرست لکھ کر دیدیجئے۔ چنانچہ آقا نے فہرست لکھ کے حوالہ کر دی۔ اتفاق سے کہیں سفر کا موقع ہوا آقا گھوڑے پر سوار آگے آگے تھا اور نوکر صاحب پیچھے پیچھے چلے جا رہے تھے آقا کے کندھے پر سے دوشالہ کھسک کر زمین پر جا گرا۔ تھوڑی دور کے بعد جو دیکھا تو ندارد نوکر سے پوچھا ارے تو نے تو نہیں دیکھا۔ اس نے کہا وہ تو بہت دور پیچھے گر گیا۔ کہا اٹھایا کیوں نہیں۔ کہا دیکھئے

فہرست میں کہاں لکھا ہے کہ دوشالہ گرے تو اٹھالینا۔ آقا نے کہا اچھا لا اب لکھ دوں۔ اب یہ سوچے کہ جس چیز کا نام لکھدوں گا یہ وہی اٹھائے گا اور اس کے علاوہ اگر کچھ اور گرے گا تو نہیں اٹھائے گا۔ اس لئے فہرست میں یہ لکھدیا کہ اگر کوئی چیز گر جاوے اُسے اٹھالیا کرو۔ اب جو منزل پر پہونچے تو نوکر صاحب نے ایک پوٹ کا پوٹ لا کے سامنے رکھدیا۔ پوچھا یہ کیا کہنے لگا دیکھ لیجئے۔ کھولا تو لید۔ ارے یہ کیا حرکت ہے کہنے لگا آپ ہی نے تو حکم دیا تھا کہ جو چیز گر جائے اٹھالینا سو میں نے اس کو بھی اٹھالیا تو ضابطہ کے نوکر ایسے ہوتے ہیں یہی معاملہ ہمارا ہے خدا کے ساتھ تو کیا خدا کے ساتھ ہمارا بس ایسا ہی تعلق ہے۔ جیسے ایک ڈپٹی کلکٹر جو بخل میں مشہور تھے کہتے تھے کہ جب خدا نے حقوق مالیہ کی فہرست بتادی ہے تو یہ غلو ہے کہ اس سے زیادہ کا اہتمام کریں۔ اس لئے وہ زکوٰۃ سے ایک پیسہ زیادہ نہ دیتے تھے۔ حالانکہ ایسے ذہین لوگوں کا انتظام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرمادیا ہے کہ اِنَّ فِی الْمَالِ لَحَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ ثُمَّ تَلیٰ۔ لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ (تمہارے مال میں سوائے زکوٰۃ اور بھی حق ہے اور آپ نے اس کی دلیل میں یہ آیت پڑھی لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ یعنی نیکی نہیں کہ تم اپنے چہروں کو قبلہ کی طرف پھیر لو الخ) حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس آیت سے استدلال کیا کیونکہ اس میں اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسَاکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ط (اور مال دیا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے میں) اول فرمایا ہے اس کے بعد اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ط (نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو) یعنی اتفاق کا ایک مرتبہ تو یہ فرمایا کہ مال دیا قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوال کرنے والوں کو۔ پھر دوسرا عمل یہ فرمایا کہ زکوٰۃ دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مال دینے سے اور مراد ہے۔ اور زکوٰۃ دینے سے اور اسی کو سمجھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ فِی الْمَالِ لَحَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ (مال میں سوائے زکوٰۃ کے اور بھی حق ہے) اس لئے ہمیں یہ حقوق سمجھ کر فرائض کے

علاوہ اور بھی کچھ کرنا چاہیئے۔ چہ جائیکہ جن کاموں کو ضابطہ میں اور فہرست میں لکھدیا ہوان کو تو سب سے پہلے کرنا چاہیئے۔ چنانچہ حق تعالیٰ سے محبت کرنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنا یہ تو ضابطہ ہی میں ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو یہاں تک فرماتے ہیں لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ مَّالِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ہ اور فرماتے ہیں مَنْ کَانَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِمَّا سِوَاھُمَا یعنی جب تک میں ہر ایک کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں مال سے بھی اور اولاد سے بھی اور تمام لوگوں سے بھی اس وقت تک تم میں کوئی مومن نہ ہوگا۔ اور ایسا ہی درجہ محبت کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی ہو۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی۔ تو نری محبت بھی کافی نہ ہوئی بلکہ سب محبتوں سے بڑھ کر محبت فرض ہوئی۔ اب بتلائیے محبت فرض ہوگئی یا نہیں یہ دوسرا حق ہے منجملہ تین حقوق کے اور تیسرا حق ادب اور تعظیم ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے اپنی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کو بھی فرض فرمایا ہے لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُعَزِّرُوْہُ وَتُوَقِّرُوْہُ (تاکہ تم لوگ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو اور اس کی تعظیم کرو) مرجع ان ضمائر کا واحد ہے۔ الغرض خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کا یہ بھی ایک حق فرض ہوا یعنی ادب و تعظیم اور اس مضمون سے تمام حدیثیں بھری ہوئی ہیں۔ بلکہ اگر غور کیجئے تو خود اسی آیت میں بھی ان حقوق کا ذکر ہے کیونکہ اطاعت تو اس کا مرادف ہی ہے اب اس کی حقیقت دیکھو کیا ہے سو اطاعت ماخوذ ہے طوع سے اور طوع کے معنے ہیں خوشی سو اطاعت کے معنے ہوئے خوشی سے کہنا ماننا اور یہ بالکل یقینی ہے کہ خوشی سے کہنا ماننا بدون محبت وعظمت کے عادتاً ممکن نہیں۔ پس اطاعت کی فرضیت کے ضمن میں محبت اور عظمت بھی فرض ہوگئی اب یہاں معنے اطاعت کے متعلق ایک سوال ہے۔ وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ کہ وضو کو پورا کرنا باوجود ناگواری کے اعمال فاضلہ میں سے ہے۔ تو جب ناگواری کے ساتھ کیا گیا تو اطاعت نہ ہوئی۔ پھر فضیلت کیسی اسی طرح حدیث ہے حُفَّتِ الْجَنَّۃُ

بِالمَکَارِہِ (یعنی جنت گھیر دی گئی ہے ناگوار چیزوں میں) اعمال شاقہ کو مکارہ فرمایا تو ان میں رغبت نہ ہوئی اور جب رغبت نہ ہوئی تو اطاعت نہ ہوئی اور اطاعت نہ ہوئی تو جنت کی بشارت کیسے ممکن ہے تو اہل قشر اس میں اشکال کو حل نہ کر سکیں گے۔ مگر صوفیہ کرام ان باتوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ لیکن کون سے صوفی جو صافی ہیں اور کا ہے سے صافی رذائل باطنہ سے اور صوفیت یہی ہے۔ کیونکہ تصوف کی تعریف ہے تعمیر الظاہر والباطن۔ یعنی آباد کرنا ظاہر کا اعمال سے اور باطن کا احوال سے اور یہ محض دعوے سے نہیں ہوتا اس کا طریقہ تو یہ ہے ؎

صوفی نہ شود صافی تا درنہ کشد جامے بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

(صوفی جب تک بہت سے مجاہدے نہ کرے خام ہی رہتا ہے پختگی مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے)

سفر سے مراد مریدوں کے گھر کا سفر نہیں کہ کبھی پونا کبھی بمبئی کبھی سورت کبھی ہندوستان پہنچ گئے۔ پختہ خبر مقدم ہے اور شود افعال ناقصہ میں سے ہے اور خامے اس کا اسم موخر ہے یعنی جو خام ہے اس کے پختہ ہونے کے لئے بہت سفر کی ضرورت ہے اور بمبئی اور پونا کے سفر میں تو اس کے برعکس ہوگا کہ پختگی کی جگہ اور خامی ہو جائے گی تو سفر سے مراد سفر سلوک ہے جس میں مختلف درجات و مراتب طے کرنا پڑتے ہیں تب کہیں وہ صوفی صافی بنتا ہے اس کی تعبیر ایک دوسرے عنوان سے حافظؒ نے فرمائی ہے ؎

شنیدم رہروے در سرزمینے ہمیں گفت ایں معما با قرینے

کہ اے صوفی شراب آنگہ شود صاف کہ در شیشہ بماند اربعینے

(اپنے ہم نشین سے کوئی سالک یہ معمہ کہہ رہا تھا کہ شراب تو اس وقت صاف ہوگی جب چالیس دن شیشہ میں رہے)

اربعین سے مراد چلہ ہے یہ ادنیٰ مقدار ہے سلوک کی۔ اس وقت بہت کم لوگ ایسے ہونگے جو اتنی مدت بھی خالص اس کے لئے صرف کرتے ہوں۔ اب تو تصوف بہت سستا ہو گیا ہے کہ دو پیسے میں آتا ہے۔ ایک پیسہ کی تسبیح لے لی اور ایک کا گیرو منگا کے کپڑے

رنگ لئے بس صوفی بن گئے اور صوفی بھی رجسٹری شدہ کہ کسی حال میں ان کے کمال میں شبہ نہیں ہوتا۔ اگر خاموش رہے تو چپ شاہ کہلائے اور اگر اینڈی بینڈی بولے تو اہل اسرار واہل رموز کہلائے۔ اور اگر ٹھکانے کی کہدی تو اہل حقائق اہل معارف بن گئے غرض ہر حال میں انھیں کی جیت ہے۔ ایک ہندو کا قول ہے کہ مسلمان بڑے اچھے گھٹ گئے تو فقیر، بڑھ گئے تو امیر۔ مر گئے تو پیر۔ تو صوفی سے مراد ایسا صوفی نہیں۔ بلکہ محقق صوفی اور قرآن و حدیث کا متبع۔ ہمارے حضرت اس قدر قرآن و حدیث کے متبع تھے کہ باوجود امام فن ہونے کے اپنے خدام علماء سے فرمایا کرتے تھے کہ میں جو کہوں اگر وہ قرآن و حدیث پر منطبق ہو تو ماننا ورنہ مجھکو خود مطلع کرنا۔ اور اگر یہ قید نہ ہو تو یوں تو بہت نکتے بیان کئے جا سکتے ہیں کیا وہ سب تصوف ہو جائیں گے۔ جیسے ایک جاہل صوفی نے تفسیر کی تھی وَالضُّحٰی وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی اے نفس تیری یہی سجا (سزا) شاید اس کا ماخذ یہ ہو کہ لیل بھی کالی ہوتی ہے اور نفس بھی کالا ہے اس مناسبت سے لیل کے معنے نفس کے لئے اور اذا میں ہمزہ زائد آ گیا ہوگا اور ذا کے معنی یہی کیونکہ اسم اشارہ ہے اور سجا معرب سزا کا۔ ایسے ہی ایک بانوا فقیر کی حکایت ہے کہ اس نے کسی سے پوچھا کہ بتلا رزق بڑا یا محمد بڑے۔ اس شخص نے کہا کہ محمد ہی بڑے ہیں کہ وہ اشرف المخلوقات ہیں۔ اور رزق مخلوق ہے۔ کہنے لگا کہ واہ تو بے پیرا ہے ارے رزق بڑا ہے دیکھ کہ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ میں اَن پہلے آیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیچھے آئے۔ اَن کہتے ہیں ہندی میں اناج کو خیر یہ تو محض جاہلوں کے قصے ہیں۔ بعضے وہ نکتے ہیں کہ ظاہر میں علمی ہیں مگر شریعت کے خلاف ہونے سے سرمایہ ضلال ہیں۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

ظالم آں قومیکہ چشما دوختند   از سخنہا عالمے را سوختند

(بڑے ظالم تھے جنھوں نے آنکھیں بند کر کے ایسی باتوں سے ایک عالم کو ویران کر دیا)

ہاں تو صوفیہ محققین نے اس اشکال منافاۃ کراہت و اطاعت کو حل کر دیا ہے اور دونوں کی صحیح تفسیر کر دی ہے اور کیا ہی اچھا فیصلہ کیا ہے کہ کراہت دو قسم کی ہے۔ ایک کراہت

طبعی ایک کراہت عقلی تو اطاعت کے خلاف مطلق کراہت نہیں ہے بلکہ صرف کراہت عقلی ہے اور وضو میں جو ناگواری ہے وہ طبعی ہے اور وہ مضر نہیں کیونکہ شریعت کو رغبت وطوع مطلوب ہے جو وسع میں ہوا اور وہ عقلی ہے اور کراہت طبعیہ بوجہ غیر مقدور ہونے کے شریعت کو مطلوب ہی نہیں تو اس کا فقدان یعنی کراہت طبعی مضر بھی نہیں اسے ایک مثال سے سمجھئے مثلاً کسی کے دنبل نکل آیا وہ ڈاکٹر کے پاس گیا کہ آپریشن کردو اور بیہوشی کی دوا سنگھانے سے منع کر دیا کہ اس سے دماغ کمزور ہوتا ہے اس نے نشتر دیا اب یہ بڑے زور سے چلایا اس نے خوب زور سے دبا دیا کے مواد نکال کے مرہم لگا کے پٹی باندھ دی اب یہ سنبھل کے بیٹھے اور پچاس روپے اسے انعام دیا۔ اب یہاں سوال ہوتا ہے کہ اگر نشتر سے ناگواری نہ تھی تو آہ کیوں کی تھی اور اگر ناگواری تھی تو انعام کیوں دیا اس کا جواب یہی ہے کہ ناگواری تو طبعی تھی اور رغبت عقلی تھی۔ تو اسی طرح حضرات صوفیہ نے بھی اس مسئلہ کو حل کیا ہے کہ کراہت طبعیہ اور رغبت عقلیہ دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم کے انتقال پر روئے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے پوچھا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ بھی روتے ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ رحمت کا اثر ہے جو شخص بندوں پر رحمت نہیں کرتا خدا اس پر رحمت نہیں کرتا البتہ زبان سے کچھ کہنا نہیں چاہیئے۔ اور بعضے اولیا متوسطین کے واقعات اس کے خلاف ہیں کہ ان کو لڑکے کے مرنے کی خبر ملی تو وہ ہنس دیئے۔ اب اگر کسی سے دونوں واقعے بیان کر دیئے جائیں اور یہ نہ بتایا جائے کہ کون کس کا واقعہ ہے اور پوچھا جائے کہ دونوں واقعے والوں میں کون افضل ہے تو وہ تو یہی کہیگا کہ جو نہیں رویا وہ افضل ہے حالانکہ بالکل غلط۔ باقی یہ کہ اس کا کیا سبب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس واقعہ کا اثر ہوا۔ اور اس متوسط ولی پر نہیں ہوا۔ سو اسے بھی ایک مثال سے سمجھئے۔ آپریشن دو آدمیوں کا ہوا ایک کو دارو ئے بیہوشی سنگھائی گئی اور ایک کو نہیں سنگھائی گئی کیونکہ جس کا دل زیادہ مضبوط ہوتا ہے اور وہ قوی وتوانا ہوتا ہے اسے بیہوشی کی دوا نہیں سنگھاتے تو اب جس کو دارو ئے بیہوشی نہیں سنگھائی گئی تھی اس نے تو اپریشن کے وقت زور سے آہ کی اور جو بیہوش تھا وہ خاموش رہا اسی طرح متوسطین دارو ئے بیہوشی سونگھے ہوئے ہوتے ہیں

اور وہ دار و مغلوب الحال ہوتا ہے اور انبیا اور اولیا کاملین کو نہیں سنگھائی جاتی تو اب جس نے لڑکے کے مرنے کی خبر سنی اور وہ نہیں رویا وہ حال میں اتنا مغلوب ہے کہ اسے حس ہی نہیں الم کی۔ تو اس کا نہ رونا کچھ بھی کمال نہیں جیسے کوئی اندھا کہے کہ میں بڑا متقی ہوں کہ کیسی ہی حسین عورت میرے سامنے سے گذر جائے مگر میں اسے نہیں دیکھتا تو اس کا نہ دیکھنا کیا کمال ہے کمال اس کا ہے جس کی آنکھیں بھی روشن ہیں اور دوربین عینک بھی لگی ہوئی ہے اور اس کے سامنے سے حسین عورت گذرتی ہے اور وہ پرواہ بھی نہیں کرتا۔ ہاں حسن کا اثر بلا اختیار طبعاً اس پر اتنا ہوتا ہے کہ بعض اوقات دل دھڑکنے لگتا ہے۔ اور جو اندھا ہے اس کا دل نہیں دھڑکتا تو اندھا بڑا کامل نہیں ہے کیونکہ اس نے تو دیکھا ہی نہیں کمال اس کا ہے کہ دل دھڑک رہا ہے اور علاج سکون کا یہی ہے کہ پھر دیکھ لے مگر خدا کے خوف سے نہیں دیکھتا اور کہتا ہے دیکھوں گا تو غیرت خداوندی جوش میں آوے گی اور کہا جاویگا ؎

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی ۔۔۔ در بیان دعوئے خود صادقی

پس چرا بر غیر افگندی نظر ۔۔۔ ایں بود دعوی عشق اے بے ہنر

(کہا اے بیوقوف اگر تو عاشق ہے اور اپنے دعوی عشق میں سچا ہے تو پھر غیر کی طرف کیوں نظر ڈالی بیہودہ! یہی دعوئ عشق کا ہوتا ہے)

یہاں ایک استطرادی سوال و جواب ہے وہ یہ کہ شاید تم کہو کہ دعویٰ عشق ہم نے کب کیا ہے وہ کونسا دعویٰ ہے تو سنئے وہ دعوے یہ ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ اگر کوئی کہے کہ ہم نے کلمہ تو بیشک پڑھا ہے مگر ہم نے یہ تو نہیں کہا کہ ہم عاشق بھی ہیں۔ خبر بھی ہے کہ یہ وہی کہنا دعوٰے ہے عشق کا کیونکہ اس کلمہ سے تم مومن ہو گئے اور مومن کے لوازم میں سے ہے عشق جس کی دلیل یہ ہے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ط (اور جو مومن ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ سخت قوی محبت ہے)

تو کلمہ کی ایسی مثال ہوئی کہ کسی نے نکاح کیا۔ اب بیوی نے کہا کہ اناج لاؤ تو کھانا پکے اس نے کہا کہ میں یہ جھگڑا کیا جانوں میں نے تو قَبِلْتُ سے تجھ کو قبول کیا تھا اس بکھیڑے کا نہ وہاں ذکر تھا اور نہ میں نے قبول کیا تھا۔ اب لڑائی شروع ہو گئی اور محلہ والے جمع ہو گئے تو وہ یہ فیصلہ کرتے ہیں ارے قَبِلْتُ (میں نے قبول کیا) میں سب کچھ آ گیا۔ تو بس حضور اسی طرح لا الٰہ الا اللہ میں سب کچھ آ گیا جیسا ابھی مذکور ہوا کہ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ط (اور جو مومن ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ سخت قوی محبت ہے)

لوازم ایمان سے ہے اور اشد حبًا کے معنے یہی عاشق کے ہیں کیونکہ شدت حب ہی تو عشق ہے گو خود عشق کا مادہ قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ مگر ایک جاہل صوفی نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ عشق کا مادہ بھی قرآن میں ہے۔ پوچھا گیا کہاں ہے۔ کہا قرآن میں ہے نہیں حٰمٓ عٓسٓقٓ یہ مادہ عشق ہی کی تعبیر ہے باقی یہ کہ اس میں تو سین ہے اور عشق میں شین ہے تو آپ کہتے ہیں اصل میں تو شین ہی مراد ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ پڑھے ہوئے تھے نہیں اور اس لئے (نعوذ باللہ) آپ سے شین ادا نہ ہو سکتا تھا اس لئے آپکی رعایت سے سین نازل کیا گیا۔ کمبخت سے کوئی پوچھے کہ اگر ایسا ہوتا تو سارے قرآن میں کہیں بھی شین نہ ہوتا۔ بہرحال یہ دعویٰ تو لغو اور بیہودہ ہے کہ عشق کا ذکر قرآن میں ہے محدثین تو احادیث میں بھی اس کے ذکر سے منکر ہیں اور حدیث مَنْ عَشِقَ فَعَفَّ (جو عشق میں مبتلا ہو گیا پھر پاک دامن رہا) کے ثبوت میں کلام کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت عشق قرآن سے ضرور ثابت ہے۔ چنانچہ اَشَدُّ حُبًّا کی تفسیر سے اوپر ثابت کیا گیا ہے۔ پس تو جب آپ عاشق ہو گئے تو اب آپ سے یہ ضرور پوچھا جائے گا اگر غیر کی طرف التفات کرو گے ؎

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی — در بیان دعوئے خود صادقی
پس چرا بر غیر افگندی نظر — ایں بود دعوئ عشق اے بے ہنر

(کہا بیوقوف اگر تو عاشق ہے اور اپنے عشق کے دعوی کے بیان میں سچا ہے تو پھر محبوب کے علاوہ دوسرے کی طرف کیوں نظر کی بے ہودہ کیا یہی عشق کا دعویٰ ہے)

آپ اس کا کیا جواب دیں گے اگر کسی کی بیوی کسی غیر مرد کو تکنے لگے تو یہ دل چاہے گا کہ تلوار مار دے۔ حالانکہ یہاں تو یہ عذر بھی ممکن ہے کہ شاید یہ شخص زشت منظر (بدصورت) ہو اور وہ جس کو تکتی ہو وہ حسین ہو۔ مگر یہاں تو یہ عذر بھی نہیں چل سکتا کیونکہ خدا سے زیادہ کون حسین ہوگا۔ اگر کوئی کہے کیا معلوم دیکھا تو ہے ہی نہیں۔ صاحبو! گو خدا تعالیٰ کو دیکھا نہیں مگر سنا تو ہے۔ اور عشق کا مدار کچھ دیکھنے ہی پر نہیں ہے ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد — بسا کیں دولت از گفتار خیزد

(محض دیکھنے ہی سے عشق پیدا نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات یہ دولت گفتار سے پیدا ہوتی ہے)

اس پر بھی اگر کوئی کہے کہ نہیں ہم تو دیکھیں گے تب ہی عاشق ہوں گے ہمارے اندر سننے کا اثر نہیں ہوتا

([illegible])

اچھا بھئی دیکھو مگر کیا دیکھنا آنکھ ہی پر منحصر ہے ہرگز نہیں۔ اگر کوئی معاملہ پیچیدہ ہو تو لوگ کہتے ہیں کہ اس کام کو خوب دیکھ بھال کے کرو۔ آپ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ میں نے خوب دیکھ بھال لیا میرے نزدیک بالکل مناسب ہے۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں آپ نے اس معاملہ کو کیونکر دیکھ لیا کیا آنکھ سے دیکھ لیا تو ذرا ہمیں بھی تو آنکھوں سے دکھا دو۔ اس وقت آپ کہیں گے کہ ہر شے کا دیکھنا جدا ہے کسی کو آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اور کسی کو دل سے بس اسی طرح خدا بھی دل سے دکھائی دیتا ہے آنکھ سے نہیں دکھائی دے سکتا اگر کوئی کہے اچھا دل ہی سے دکھا دو سو بیشک تم دل سے دیکھ سکتے ہو مگر دل پر جو پردہ پڑا ہوا ہے پہلے اُسے ہٹا دو پھر حق تعالیٰ سامنے ہی تو ہیں ہمارے ماموں صاحب کا شعر ہے ؎

کر غور ذرا دل میں کچھ جلوہ گری ہو گی یہ شیشہ نہیں خالی دیکھا اسمیں پری ہو گی

ان سے چھوٹے ایک ماموں صاحب کا شعر ہے ؎

شد ہفت پردہ بر چشم ایں ہفت پردہ چشم بے پردہ ورنہ ماہے چوں آفتاب دارم

(اس آنکھ کے سات پردے آنکھ پر سات پردہ ہو گے ورنہ میں ایک چاند مثل آفتاب کے رکھتا ہوں)

اور اس پردہ کے اٹھانے کا طریقہ کیا ہے۔ اس کو عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست تو خود حجاب خودی حافظا از میاں برخیز

(عاشق و معشوق کے درمیان کوئی حائل نہیں تیری خودی خود حجاب ہو رہی ہے حافظ خودی کو درمیان سے اٹھا دے)

بتلا دیا کہ خودی اور انانیت یعنی تکبر یہ حجاب ہے اس کو دور کر دو پھر وصال ہی وصال ہے (شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

تعلق حجاب است و بیحاصلی چو پیوندہا بگسلی واصلی

(تعلقات غیر اللہ حجاب اور لاحاصل ہیں جب ان تعلقات کو قطع کر لو گے تو تم واصل ہو گے) ۱۲ جامع) بس موانع کو اٹھا دو خدا سامنے ہی ہے باقی اس پردہ کے اٹھانے کا طریقہ

کیا ہے سو میں ان طرق کو نہیں چھپاتا جن کو صوفیہ چھپاتے ہیں۔ مجھے علی الاعلان کہنے کی بزرگوں سے اجازت ہے اس لئے میں طرق رفع حجب کو ممبر پر بیٹھ کر کہتا ہوں وہ رفع حجاب کا طریق یہ ہے کہ توجہ الیٰ غیر اللہ (غیر اللہ کی طرف نظر کرنے) کو چھوڑ دو۔ اگر ابتداء میں آپ کی بھی نظر حق تعالیٰ پر نہ پڑی تو ان کی تو تم پر پڑے گی بقول کسی عاشق کے

؎ یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

(ایک پلک مارنے کی مقدور بھی محبوب حقیقی سے غافل مت ہو شاید تم پر لطف کی نگاہ کریں اور تم آگاہ نہ ہو)

اصل میں تو شاہ کی جگہ لفظ ماہ تھا مگر میں نے ادب کی وجہ سے شاہ کر دیا۔ پھر آپ کی توجہ اور ان کی نظر سے آپ کے قلب کو خدا تعالیٰ سے ایک خاص تعلق ہو گا بس وہی تعلق دل سے دیکھنا ہے اور یہ کرنے کی بات ہے الفاظ سے سمجھنے کی نہیں ہے۔ دیکھو اگر کوئی کابلی پوچھے کہ آم کیسا ہوتا ہے اور آپ کہیں میٹھا ہوتا ہے وہ کہے گا کیسا میٹھا جیسے گڑ؟ آپ کہیں گے نہیں وہ کہیگا جیسے انگور، انار، سیب آپ ہر ایک کی نفی کریں گے وہ کہیگا پھر تعیین کے ساتھ بتلاؤ کیسا میٹھا ہوتا ہے آپ کہیں گے کہ الفاظ سے اس کا مٹھاس بیان نہیں ہو سکتا چکھ کر دیکھ لو۔ اور اگر آپ ہزار کوشش کریں کہ لفظوں سے اس کو آم کی شیرینی سمجھا دیں تو وہ نہ معلوم آم کو کیلے سے کیا سمجھ جائے گا۔ جیسے ایک حافظ جی نے جو آنکھوں کے بھی حافظ تھے (یعنی نابینا) کسی شخص سے جس نے کھیر کی دعوت کی تھی پوچھا کہ کھیر کیسی ہوتی ہے اس نے کہا سفید سفید ہوتی ہے انھوں نے پوچھا سفید کس کو کہتے ہیں کہا جیسے بگلا کہا بگلا کیسا ہوتا ہے اس نے ہاتھ کو بگلے کی شکل بنا کر پیش کر دیا تو آپ ٹٹول کر کہتے ہیں یہ ٹیڑھی کھیر کیسے گلے سے اترے گی۔ یہ جو ٹیڑھی کھیر محاورہ میں مشہور ہے اس کی شان ورود یہی ہے۔ تو حافظ جی نے بوسائط یہ سمجھا کہ بگلا جیسے ٹیڑھا ہے کھیر کی شکل بھی یہی ہو گی۔ تو دیکھئے اس نے ذوقی چیز کو لفظوں سے سمجھانا چاہا تو نوبت کہاں پہونچی۔ بتانے والے نے غلطی یہ کی کہ امور حسیہ کو الفاظ میں ادا کیا حالانکہ کھیر کی حقیقت سمجھنے کیلئے چکھنے کی ضرورت تھی اسی طرح یہ بھی کرنے کی بات ہے اور کرنے کے کام خاموشی کے ساتھ کام

میں لگنے سے سمجھ میں آتے ہیں زبان چلانے سے سمجھ میں نہیں آتے۔ بقول مولانا رح ؎

گرچہ تفسیر زباں روشنگر است لیک عشق بے زباں روشن تر است

یعنی گو عشق کی تفسیر زبان سے بھی ہوتی ہے مگر حقیقت اسی تفسیر سے معلوم ہوتی ہے جو زبان بند کرکے حاصل ہوتی ہے۔ غرض رفع حجاب کا طریق ترک التفات الی الغیر ہے پھر اس ترک التفات الی الغیر کا بھی ایک طریق ہے وہ یہ کہ چند روز کسی محقق کی تعلیم کے موافق خلوت میں بیٹھ جاؤ اور جو وہ بتائے وہ کرو اس کے بعد غیر حق سے بے تعلقی اور خدا سے تعلق پیدا ہوگا اس وقت مشاہدہ حسب استعداد ہوگا اور اس مشاہدہ سے معلوم ہوگا کہ محبت اور عشق کیا چیز ہے اور اس وقت حقیقت وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (اور جو لوگ مومن ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں سخت قوی ہیں) کی منکشف ہوگی اگر کوئی کہے کہ ہم نے مجاہدہ کیا تھا اور یہ بات حاصل بھی ہوگئی تھی مگر چند روز کے بعد وہ حالت اصلیہ پھر عود کر آئی۔ تو اس کی بقا کا طریق بھی معلوم ہونا چاہیے تو میں اس غلطی پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ مجاہدہ کا یہ اثر نہیں ہے کہ جذبات نفسانیہ فنا ہو جاویں جیسا سائل کو شبہ ہوا اور اسی بنا پر عود کا اشکال کیا۔ بلکہ اس کا اثر صرف یہ ہے کہ وہ جذبات مغلوب ہو جاتے ہیں یعنی قبل مجاہدہ جو ہم تقاضائے نفسانی کی مقاومت کرتے تھے تو دشوار ہوتا تھا اور بعد مجاہدہ کے وہ مقاومت کرنا آسان ہو جاتا ہے اور علت اس آسانی کی وہی مجاہدہ ہے۔ پس جب مجاہدہ میں کمی ہوگی عود ضروری ہے اس لئے بقار اس کیفیت مغلوبیہ کا اس پر موقوف ہے کہ مجاہدہ برابر جاری رہے اور عود کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس نے مجاہدہ کے بعد کسی دفعہ تقاضائے نفس کی مقاومت چھوڑ دی پھر ایسا ہی واقعہ پیش آیا پھر مقاومت نہیں کی پھر ایسا ہی ہوا پھر نہیں کی پس چند روز

تک اسی طرح کرتا رہا اس سے مجاہدہ کا اثر مضمحل ہو کے زائل ہو گیا ایسا کوئی مادہ بتاؤ کہ کوئی شخص برابر مقاومت کرتا رہا ہو۔ اور پھر حالت اصلیہ عود کر آئی ہو۔ پس یہ غلطی کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجاہدہ کر کے بے فکر ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ بس اب ہمارے اندر سے رذائل نکل گئے اس کے بعد جو نفس کا تقاضا ہوا تو اس کو رذیلہ نہیں سمجھا بلکہ کوئی اچھی حالت سمجھی حالانکہ رذائل فنا تو ہوتے نہیں مجاہدہ سے مغلوب ہو جاتے ہیں اس لئے بیفکری سے وہ پھر ادھر آتے ہیں۔ اسی کو فرماتے ہیں ؎

نفس اژدرہا ست او کے مردہ است ... از غم بے التی افسردہ است

(نفس اژدہا ہے وہ مرا نہیں ہے بے التی کے غم سے افسردہ ہو گیا ہے)

اور فنائے نفس کا جو مرتبہ مشہور ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ وہ مغلوب ہو گیا اور توجہ الی اللہ غالب ہو گئی لیکن اصل باقی ہے اس لئے اور مجاہدہ کے بعد بے فکری سے عود کا ضرور اندیشہ ہے اس طریق میں بے فکری کی کہاں گنجائش یہ تو عمر بھر کا دھندا ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش ... تادم آخر دمے فارغ مباش

تادم آخر دمے آخر بود ... کہ عنایت باتو صاحب سر بود

(تم کو چاہیئے اس طریق وصول الی اللہ میں ہمیشہ اڈھیر بن میں لگے رہو اور آخری دم تک ایک لحظہ بھی فارغ مت ہو کیونکہ آخری وقت تک کوئی گھڑی ایسی تو ضرور ہو گی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراز اور رفیق بن جائے گی یعنی طلب میں لگے رہو گے تو کسی وقت ضرور وصول الی اللہ ہو جائیگا)

اگر کسی کو مولانا کے دوسرے شعر سے شبہ ہو کہ مولانا تو کامیابی کے احتمال کو وقت موت تک ممتد فرماتے ہیں اور تم کہتے ہو کہ چالیس روز میں حاصل ہو جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک کفایت کا درجہ ہے اور ایک نہایت کا۔ کفایت کا درجہ تو چالیس روز میں کسی محقق کی صحبت میں بیٹھنے سے حاصل

ہو جائے گا جس کی حقیقت یہ ہے کہ طریق کی بصیرت ہو جائے گی راہ پر لگ جاوے گا اس کے بعد درجہ نہایت کا ہے جس کو مولانا فرمارہے ہیں جس کے وہ آثار ہیں جن کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں نِعْمَ الْعَبْدُ صُهَيْبٌ لَوْلَمْ يَخَفِ اللهَ لَمْ يَعْصِهِ یعنی اگر صہیب کو خدا کا خوف بھی نہ ہو تب بھی نا فرمانی نہ کرے یہ درجہ جب ہی حاصل ہوتا ہے جبکہ برابر مجاہدۂ نفس میں مشغول رہے جس سے کسی دن محبت ایسی راسخ ہوگی کہ خوف کی بھی ضرورت نہ رہے گی یہ نہایت ہے اس کی ایسی مثال سمجھو کہ عالم بننے کے لئے ایک درجہ تو کفایت اور ضرورت کا ہے کہ نصاب درس ختم کرلیا جائے۔ اور ایک درجہ نہایت کا ہے کہ برسوں پڑھنے پڑھانے کتب بینی کرنے سے تجربہ کا درجہ حاصل ہو جائے۔ پس میرے دعوے میں جو حافظ کے کلام میں بھی منصوص ہے اور حضرت مولانا رومی کے ارشاد میں تعارض نہ رہا میں اوپر یہ گفتگو کر رہا تھا کہ کراہت طبعی اطاعت کے خلاف نہیں۔ درمیان میں استطراداً دوسرے مضامین اسی کے متعلق آگئے تھے اب میں اسی طرف عود کرتا ہوں کہ اصل اطاعت یہی ہے کہ عقلی کراہت نہ ہو باقی طبعی کراہت نہ رہنا یہ اطاعت کا جزو یا لازم نہیں اور اسی لئے یہ حالت اکثر متوسطین کو پیش آتی ہے کیونکہ متوسطین تو اپنے حال میں اس قدر مغلوب ہوتے ہیں کہ اس وقت لذت طبعیہ اور کراہت طبعیہ کچھ بھی نہیں رہتی غلبہ کیفیت سے امور طبعیہ مغلوب ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ابتدائے ذکر میں زیادہ مزہ آتا ہے کیونکہ اس وقت کیفیت کا ورود غلبہ سے ہوتا ہے جس سے نفس کی کشاکشی مغلوب ہو جاتی ہے یکسوئی کامل ہوتی ہے اور یہی منشاء ہے لذت کا حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی سے ان کے ایک خادم نے شکایت کی کہ حضرت ذکر میں اب ویسا مزہ نہیں آتا جیسا شروع میں آتا تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ میاں تم نے سُنا نہیں کہ پرانی جورو اماں ہو جاتی ہے۔ دیکھو اگر کوئی کسی پر عاشق ہو گیا ہو پھر نکاح ہو جائے تو ہفتہ دو ہفتہ کے بعد وہ

کیفیت نہیں رہے گی جو ابتداء میں تھی۔ اگر کوئی کہے کہ بس جی پھر تو جنت کا مزہ بھی مغلوب ہو جائے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تو مغلوبیت کی وجہ یہ ہے کہ تم نے اس شے کے تمتع اور حسن کا احاطہ کر لیا ہے اگر یہاں بھی حسن غیر محدود ہوتا تو شوق کبھی ختم نہ ہوتا یہاں وہ حسن بھی محدود ہے اور اپنی قوت بھی محدود ہے اور جنت کا حسن بھی غیر محدود ہے اور تمہاری قوت بھی غیر محدود ہو گی پھر شوق کیوں ختم ہو گا وہاں تو یہ حال ہو گا۔

ع یزیدک وجہہ حسنا اذا ما زدتہ نظرا

(جس قدر تیرے چہرہ پر نظر ڈالتا ہوں حسن کو زیادہ پاتا ہوں)

اور یہی وجہ ہے کہ ذکر میں لذت نفسانیہ تو کچھ دنوں کے بعد کم ہو جاتی ہے مگر شوق روحانی کم نہیں ہوتا کیوں کی روح کی قوت نفس سے زیادہ ہے اور محبوب حقیقی کے کمالات حسن وغیرہ غیر متناہی ہیں تو شوق روحانی کا وہ حال ہوتا ہے جس کو حضرت شیخ سعدی فرماتے ہیں ع

دل آرام در بر دل آرام جو لب از تشنگی خشک بر طرف جو
نگویم کہ بر آب قادر نیند کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

(محبوب بغل میں ہے اور محبوب کو ڈھونڈھ رہے ہیں نہر کے کنارہ پر ہیں اور ہونٹ پیاس سے خشک ہیں۔ یہ ہم نہیں کہتے کہ پانی پر قادر نہیں بلکہ دریائے نیل کے کنارے پر جلندر کے بیمار کی طرح ہیں)

اور ایک دوسرے عارف فرماتے ہیں ع

قلم بشکن سیاہی ریز و کاغذ سوز و دم درکش کہ حسن ایں قصۂ عشق است در دفتر نمی گنجد

(قلم توڑ سیاہی بکھیر اور کاغذ جلا اور خاموش رہ حسن یہ عشق کا قصہ ہے دفتر میں نہیں سما سکتا)

اور کسی نے کہا ہے ع

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار گلچیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

(تیرے حسن کے گل بہت ہیں تیرے بہار کے گلچیں کو تلگ دامنی کا گلہ ہے)

اور چونکہ جنت میں روح کی قوت یہاں سے بھی زیادہ ہو گی اس لئے وہاں یہ

شوق یہاں سے بھی زیادہ ہوگا اس مقام پر بعض غیر محقق صوفیہ کو شبہ ہوگیا ہے کہ عشاق کو جنت میں بھی بے چینی رہے گی۔ مگر واقع میں یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ شوق میں ہمیشہ بے چینی ہوتی ہے۔ بے چینی جب ہوتی ہے کہ محبوب کا حصول شوق کے درجہ تک نہ ہو۔ اور وہاں جیسے شوق غیر متناہی ہوگا ایسے ہی حصول بھی غیر متناہی ہے اور ہر درجہ حصول کا اس وقت کے شوق کے موافق ہوگا۔ پھر اس میں کیا استبعاد ہے کہ شوق موجود ہو اور بے چینی نہ ہو اور راز اس میں یہ ہے کہ جس حالت میں جس قدر قرب محبوب کی استعداد ہوگی شوق بھی اسی درجہ کا ہوگا۔ پھر استعداد میں بھی ترقی ہوگی اور اسی قدر شوق میں بھی اور بے چینی اس وقت ہوتی ہے جب استعداد سے کم قرب ہو ان کو دھوکہ ہوا ہے قیاس الغائب علی الشاہد سے کہ آخرت کو دنیا پر قیاس کیا۔ بہرحال سالک کو یہ بات پیش آتی ہے کہ ابتدا میں یہ ابن الوقت ہوتا ہے کہ حالات اس پر غالب ہوتے ہیں اور یہ ان میں مغلوب ہوتا ہے اور انتہا میں ابوالوقت ہوتا ہے کہ حالات پر یہ غالب ہوتا ہے۔ جیسے قرآن یاد کرنے میں ابتدا میں تو قرآن کو رٹنا پڑتا ہے اور جب یاد ہوگیا تو اب کچھ محنت نہیں اب نہ وہ رات دن رٹتا ہے نہ سُناتا ہے۔ اس کی اس حالت کو دیکھ کر کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ یہ حافظ ہے اور رٹنے والے کی حالت کو دیکھ کر سب سمجھ جاتے ہیں کہ یہ حافظ ہے۔ اسی طرح اولیاء کاملین کی حالت انتہا میں کسی کو معلوم نہیں ہوتی کہ یہ کس درجہ کے ہیں۔ بس ایسی حالت معلوم ہوتی ہے جیسے معمولی ناظرہ خواں ہو۔ ہاں مبتدی سلوک کی حالت سب کو معلوم ہوتی ہے کیونکہ وہ تو مثل قرآن حفظ کرنے والے کے ہے کہ رٹ رہا ہے رات دن اور حافظ کا حال کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ بس رمضان آیا اور سُنا دیا پس جس مقام پر صبر کا امر ہے کاملین کو وہاں طبعی ناگواری ہوتی ہے اور وہ اس مقام میں صبر سے کام لیتے ہیں اور مبتدی کو غلبہ حال سے بے چینی ہی نہیں ہوتی اس لئے وہ ہنستا ہے مگر یہ کمال نہیں کمال وہی ہے کہ بے چینی بھی ہو اور پھر

صبر ہو یہ اولیاء کاملین کا حال ہے اور انبیاء کی حالت ان سے بھی بڑھی ہوئی ہے
ہے وہ سب سے زیادہ ادراک بھی رکھتے ہیں پھر اپنے مقامات پر غالب
ہوتے ہیں اور دونوں کا فرق میں ابھی کلورا فارم کی مثال میں بتا چکا ہوں
کہ ایک کلورا فارم سونگھے ہوئے ہے اس کو حس ہی نہیں الم کا اور ایک
ذی ہوش ہے اس کو حس ہے الم کا اور باوجود احساس الم کے پھر اُف نہیں
کرتا بتلایئے دونوں میں کون کامل ہے تو انبیاء کے مقابلہ میں اولیا متوسطین ایسے
ہی ہیں اسی طرح جس کی حسین عورت پر نظر پڑ گئی اور میلان بھی ہوا مگر غیرت
الٰہی کے خوف سے اس طرف التفات نہ کیا اس کی حالت اندھے اکمل وبہتر
ہے جس کو حسن کا ادراک ہی نہیں ہوا۔ اب حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ (گھیر دی گئی
ہے جنت ناگوار چیزوں سے) کی حقیقت خوب منکشف ہوگئی کہ جاڑے میں صبح کی
نماز کے لئے اٹھے سردی کے مارے وضو ناگوار ہے مگر محبت عقلیہ کی وجہ سے
کرتا ہے تو اس میں جو شبہ اطاعت و کراہت کے تنافی کا متوہم ہوتا تھا
وہ دفع ہوگیا۔ غرض ایک تو قانونی اطاعت ہے اور ایک حقیقی جس میں حق تعالےٰ
کی محبت کی بھی چاشنی ہو کہ مستقلاً فرض ہے۔ اب رہی یہ بات کہ وہ محبت
حاصل کیسے ہو اس کی بھی ایک تدبیر ہے وہ یہ ہے کہ اہل محبت کے پاس رہو
اور وہ جو بتلاویں کرو اور جب تک جانا میسر نہ ہو اس وقت تک کے لئے ایک
وقتی نسخہ بتلائے دیتا ہوں وہ یہ کہ چند باتوں کا التزام کرلو۔ ایک یہ کہ کوئی معصیت
اور نافرمانی نہ ہو گو اس میں کلفت ہی کیوں نہ ہو اس میں راز یہ ہے کہ جب ہم نافرمانی
نہ کریں گے تو حق تعالیٰ کی نظر محبت ہم پر ہوگی اور اس سے خود بخود آپ کو حق تعالےٰ
کی طرف کشش ہوگی اور کشش اصل میں اُدھر ہی سے ہوتی ہے اور علت وصول کی یہی ہے
مگر اس سے آپ کی کوشش و اجتناب عن المعصیت کا بیکار ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ وہ کشش
تب ہی ہوتی ہے جبکہ آپ قصد کریں اور قصد یہی ہے اور گو اس میں چند روز تکلیف ہوگی کہ ہر
وقت نفس کی مخالفت کرنا پڑے گی مگر پھر عادت سے سہولت ہو جاویگی۔ ایک بات یہ کیجئے کہ

دوسرے تیسرے دن تھوڑا سا وقت نکال کے خلوت میں بیٹھ کے توجہ کے ساتھ اللہ اللہ کر لیا کیجئے اور اس میں وساوس کے آنے کا اندیشہ نہ کیجئے آپ اللہ اللہ کی طرف نگاہ رکھئے خواہ لکھا ہوا سامنے رکھئے چاہے لکھا ہوا فرض کر لیجئے کہ میں اس لکھے ہوئے کو دیکھ رہا ہوں یا ارادہ کے ساتھ ادا کیجئے محض یاد سے نہیں۔ کہ دھیان ادھر طرف ہو اور لفظ اللہ زبان پر ہو۔ بلکہ دل سے سوچ سوچ کے زبان پر لائیے۔ پھر ادھر توجہ رکھنے کی حالت میں وساوس خود بخود دفع ہو جاویں گے اور اگر نہ بھی دفع ہوں تو کچھ مضر نہیں اور اگر آپ یہ چاہیں کہ خطرات میں بھی حق کی ہی طرف توجہ ہو تو اس کا یہی طریقہ ہمارے حضرت اقدس سرہ نے بتایا ہے کہ یہ سوچئے کہ سبحان اللہ کیا قدرت ہے حق تعالیٰ کی کہ قلب میں بھی دریا کی سی موجیں پیدا کر دیں تو پھر وہ سارے خطرات آئینہ جمال الٰہی بن جاویں گے شیطان نے تو جال پھیلایا تھا حق سے دور کرنے کے لئے مگر اہل اللہ نے اس پر کیسا صیقل کر دیا کہ وہ اپنی سلیٹ کوری لیکر چلا گیا۔ اب اگر وہ دوبارہ آوے گا بھی تو لپیٹ ہو کے آوے گا مگر کہیں اس اطمینان پر آپ نہ لیٹ رہیں۔ اور ایک جزو یہ ہے کہ وقت مقرر کر کے تھوڑی دیر خدا کی نعمتوں کا اور اپنی کوتاہیوں کا مراقبہ کیجئے۔ اور ایک یہ جزو ہے کہ کسی کامل بزرگ سے خط و کتابت رکھئے اور اپنے حالات اُسے لکھئے اور اگر کچھ حالات نہ ہوں تو یہی لکھ دیجئے کہ کوئی حالت نہیں ہے اگرچہ ایسا ہو نہیں سکتا کہ مفید یا مضر کوئی حالت نہ ہو۔ اور ایک جزو یہ ہے کہ اولیاء اللہ کی حکایات مجاہدہ و ریاضت و ترک دنیا کی دیکھا کیجئے مگر ان کی دقیق ملفوظات کا مطالعہ نہ کیجئے ورنہ ایمان برباد ہونے کا اندیشہ ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

نکتہا چوں تیغ فولاد ست تیز … چوں نہ داری تو سپر واپس گریز

(نکتے مثل تلوار ہندی کے تیز ہیں جب تمہارے پاس ڈھال نہیں ہے تو پیچھے ہٹ جاؤ)

سپر سے مراد علم و فہم ہے ؎

پیش ایں الماس بے اسپر میا … کز بریدن تیغ را نبود حیا

(اس تلوار کے سامنے بغیر ڈھال کے مت آؤ اس لئے کہ تلوار کاٹنے سے نہیں شرماتی)

خوب ہی فرمایا ہے کہ تلوار نہیں شرماتی کاٹنے سے۔ آگے مولانا ان لوگوں کی خبر لیتے

ہیں جو ایسے دقیق مضامین بلاضرورت نااہلوں کے سامنے بیان کرتے رہتے ہیں ؎

ظالم آں قومیکہ چشماں دوختند　　　دز سخنہا عالمے را سوختند

(بڑے ہی ظالم ہیں جنھوں نے آنکھیں بند کر کے ایسی باتوں سے ایک عالم کو ویران کر دیا)

یعنی سچی باتیں بھی جب عوام کی فہم سے بالاتر ہوں ان کو عوام سے بیان کرنا ممنوع ہے حضرت شیخ اکبر فرماتے ہیں یَحْرُمُ النَّظَرُ فِی کُتُبِنَا ہماری کتابیں دیکھنا حرام ہیں نہ اس لئے کہ ان کے مضامین مفید نہیں بلکہ اس لئے کہ عوام میں استفادہ کی قابلیت نہیں۔ جیسے طبیب کسی ضعیف المعدہ سے کہے کہ بھنا ہوا گوشت مت کھایا کرو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ فی نفسہ مضر ہے بلکہ فی نفسہ تو وہ لذیذ و مفید ہے مگر اس کے معدہ میں اس کے ہضم کی طاقت نہیں ہے۔ اسی طرح مبتدی کو ایسی کتب کا مطالعہ مناسب نہیں۔ ہاں ایسی کتابیں دیکھئے جیسے روض الریاحین ہے کہ میں نے اس کا ترجمہ اردو میں کرا دیا ہے اور وہ چھپ بھی گیا ہے اس میں اولیاء اللہ کی پانسو حکائتیں تھیں اور پانچسو میں نے دوسری کتب سے ملا دیں اب ہزار ہو گئیں اور اس کا نام رکھا ہے نزہۃ البساتین۔ یہ کتاب خود بھی مطالعہ میں رکھئے اور گھر والوں کو بھی سنایا کیجئے۔ البتہ بعض حکایات اس میں بھی غامض ہیں ان کو چھوڑ دیا کیجئے۔ اس پر نفس پرستوں کو یہ وسوسہ ضرور ہوگا کہ اس سے تو دنیا کا مزہ ہی جاتا رہے گا۔ میں کہتا ہوں خدا کی قسم اس سے تو دنیا میں پہلے سے زیادہ مزہ آنے لگے گا۔ دیکھئے آرام کی لذت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو خود آم بلا شیریں مزہ دار تو اس میں تو محض آم ہی کا مزہ ہے اور ایک صورت یہ ہے کہ محبوب نے آپ کو مزہ دار آم دیا تو اس میں دو لطف ہیں ایک عین کا اور اضافت کا یعنی اس کے انتساب الی المحبوب کا کہ کھاتے ہوئے اس کا بھی مزہ لے رہے ہیں کہ یہ ہم کو محبوب نے بھیجا ہے تو بتلائیے کہ اب مزہ زیادہ ہے یا پہلے زیادہ تھا۔ اسی طرح تعلق مع اللہ سے پہلے آپ گھر میں بیٹھے تو مزے کھا رہے تھے تھوڑی دیر کے بعد تعلق مع اللہ

کے اثر سے آپ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ تو محبوب کا دیا ہوا ہے تو اب جو مزہ آویگا قورمہ میں وہ پہلے ہرگز نہ تھا۔ پہلے صرف قورمہ ہی تھا اور اب محبوب کا دیا ہوا قورمہ ہے۔ تو بتلایئے لطف بڑھے گا یا کم ہوگا۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ محبان حق کو خود دنیا میں بھی جو لطف حاصل ہے دنیا دار اس لطف سے محروم ہیں کیونکہ انھیں اس انتساب کا لطف میسر نہیں اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کو خود قورمہ کا بھی لطف حاصل نہیں کیونکہ وہ جس ظرف میں کھا رہے اس میں مٹی پڑی ہوئی ہے جس سے سارا قورمہ کرکرا ہو رہا ہے وہ ظرف ذہن ہے اور مٹی کدورت و تشویشات و تفکرات دنیا ہیں کہ فلانے نے دعوےٰ کر دیا ہے۔ یا فلانے کے ذمہ اتنا روپیہ ہے دیکھئے وصول بھی ہو یا نہ ہو۔ اہل اللہ کے پیالے میں یہ مٹی نہیں ہے وہاں تو خالص قورمہ ہے میرا یہ مطلب نہیں کہ اہل اللہ کو حوادث و تفکرات پیش نہیں آتے۔ پیش آتے ہیں مگر آپ میں اور ان میں حوادث کی حالت میں بھی فرق ہے وہ یہ کہ آپ حوادث کے متعلق تجویز و رائے رکھتے ہیں کہ اس طرح ہونا چاہیئے اور وہ اختیار میں نہیں اس سے سخت پریشانی میں مبتلا رہتے ہیں اور اہل اللہ اپنی تجویزیں تمام تر مشیت الٰہی میں فنا کر دیتے ہیں اور ان کا مذہب یہ ہو گیا ہے کہ ؎ ع

ہر چہ از دوست میرسد نیکو است (جو کچھ دوست کی جانب سے پہونچتا ہے وہ بہتر ہی ہے)

اور یہ مذہب ہے کہ ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من — دل فدائے یار دل رنجان من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو وہ مجھ کو پسندیدہ ہے۔ میں اپنے یار پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں)

باقی یہ کہ یہ مذہب ان کا کیسے ہو جاتا ہے سو اس طرح ہو جاتا ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے محبوب کے حکم سے ہوتا ہے یہ عقیدہ ان کا حال

بن گیا ہے تو اب ان کی کلفت کی ایسی مثال ہے جیسے محبوب کسی عاشق کو پیچھے سے آکر اپنی آغوش میں زور سے دبالے تو جب تک اس نے محبوب کو دیکھا نہیں اس وقت تک تو جھنجلاتا ہے کہ یہ کون مجھے دبانے لگا مگر پھر جو دیکھا کہ محبوب دبارہا ہے تو اب یہ حالت ہے کہ پہلے سے زیادہ دبانے کی تمنا کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ تکلیف ہوتی ہو تو چھوڑ دوں اور تیرا رقیب چاہتا ہے کہ مجھے دبالو تو میں اس کو دبالوں تو اس وقت وہ عاشق کہتا ہے ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت   سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو جو آپ تلوار سے ہلاک ہو دوستوں ہی کا سر سلامت ہے کہ اس پر آپ خنجر کے وار کریں)

اسی طرح اہل اللہ کی حالت ہے کہ انھیں تکالیف دنیا تو کیا گوارا ہوتیں ان کو تو موت بھی ناگوار نہیں کیونکہ وہ سب ایسی ذات کا تصرف ہے جو ان کا دلربا ہے اس لئے یہ حالت ہے کہ بچہ بھی بیمار ہے مگر جیسی سوچ ان اہل دنیا کو ہوتی ہے کہ ہائے مر گیا تو کیا ہوگا وہاں یہ کچھ بھی نہیں اور اس تمام تر پریشانی و رنج کی جڑ یہ تجویز ہی ہے اور جب تجویز ہی نہ کرے تو رنج کیسا اس لئے کہتا ہوں کہ آپ کے پیالہ میں سے تو قورمہ کا بھی لطف مفقود ہے سو ایک تو آپ کا قورمہ ہے کہ اس میں مٹی ملی ہوئی ہے اور ایک اہل اللہ کا قورمہ ہے کہ بالکل صاف ہے کوئی کہے اہل اللہ کا قورمہ کیسا کیا اہل اللہ بھی قورمہ کھاتے ہیں کیوں کیا ہوا کیا قورمہ کھانا حرام ہے بعض لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ اہل اللہ کو لذائذ حرام ہیں۔ جیسے ایک شخص نے میری نسبت اعتراضاً کہا تھا کہ کپڑا اچھا پہنتا ہے اسی طرح لوگوں نے اہل اللہ کی نسبت سوچ رکھا ہے کہ بس یہ سوکھی روٹیاں کھا دیں تو اہل اللہ ہیں ورنہ نہیں ہیں یہ غلط ہے۔ ہاں اہل اللہ کو قورمہ کی فکر نہیں ہوتی ان کے سامنے جو نعمت بھی آجاوے وہ قورمہ ہی ہے اور جو قورمہ بھی آجاوے وہ اس کو نعمت سمجھ کر کھاتے ہیں لذت نفس کے لئے نہیں کھاتے تو انھیں ایک تو قورمہ کا لطف دوسرے انتساب الی المحبوب کا اور تیسرے یہ کہ وہ کرکرا نہیں ہے۔ کیونکہ نہ وہاں مقدمہ کی فکر ہے نہ بیٹے کا غم اور اس سب کی

وجہ وہی محبت اور محبت واقع میں ایسی ہی چیز ہے ع
از محبت تلخہا شیریں شود (محبت سے ناگوار باتیں بھی گوارا ہیں)
حقیقت میں شاہی زندگی اہل اللہ ہی کی ہے اسی کو فرماتے ہیں مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ط وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿ (جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو بشرطیکہ صاحب ایمان ہو تو ہم اس کو بالطف زندگی دیں گے اور ان کو اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر دیں گے) یعنی عمل صالح کی جزا محض ادھار ہی نہیں ہے جیسے عوام کا خیال ہے بلکہ اس کی ایک جزا دنیا میں بھی ملتی ہے اور وہ حیات طیبہ ہے کہ جس میں کوئی غم و فکر نہیں ہے کسی نے حضرت بہلول دانا سے پوچھا کہ آپ کا مزاج کیسا ہے۔ کہا کیا پوچھتے ہو اس شخص کا مزاج کہ دنیا میں کوئی کام اس کی خواہش کے خلاف نہ ہو۔ اس نے پوچھا یہ کیسے فرمایا دنیا میں جو کام ہوتا ہے یہ تو مسلم ہے کہ وہ خدا کے ارادہ کے خلاف نہیں ہوتا اور میں نے اپنے ارادہ کو ان کے ارادہ میں فنا کر دیا ہے تو جب وہ خدا کے ارادہ کے موافق ہے تو میری بھی خواہش کے مطابق ہوا۔ حضرت سید احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ جو معاصر ہیں حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے فرماتے ہیں جب ارواح کو جمع کیا گیا تو ہر ایک سے پوچھا گیا کیا چاہتے ہو تو جس کی سمجھ میں آیا وہ اس نے مانگا جب اس ناچیز کی نوبت آئی اور پوچھا گیا کیا چاہتے ہو۔ میں نے کہا اُرِيْدُ اَنْ لَّا اُرِيْدَ وَاَخْتَارُ اَنْ لَّا اَخْتَارَ یعنی میں یہی تجویز کرتا ہوں کہ کچھ تجویز نہ کروں۔ اور یہی چاہتا ہوں کہ کچھ نہ چاہوں فَاَعْطَانِيْ مَا لَا عَيْنٌ رَّاَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ اَيْ مِنْ اَهْلِ هٰذَا الْعَصْرِ پس مجھے وہ چیزیں عطا ہوئیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں اور نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی کے دل میں ان کا وسوسہ ہی آیا اس زمانہ والوں سے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کا رتبہ حضرت غوث اعظم سے بھی بڑھا ہوا ہو ممکن ہے کہ اکثر اہل عصر مراد ہوں اور ایک حیثیت سے یہ بڑھے ہوئے ہوں اور ایک حیثیت سے

عہ حضرت سید احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مشہور کتاب "بنیان المشید" ملنے کا پتہ (مکتبہ تھانوی بندر روڈ کراچی) ۱۳

وہ اس بارہ میں گو نص تو ہے نہیں جو کسی ایک شق کا جزم کیا جاوے اور یہی فیصلہ ان صحابہ کے بارہ میں بھی ہے جن کی افضلیت مطلقہ منصوص نہیں ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کہ آپ تو علی الاطلاق سب سے افضل ہیں۔ باقی انبیاء کے تفاضل میں بھی یہی فیصلہ ہے کہ ایک فضیلت کے اعتبار سے ایک افضل ہوں اور دوسری فضیلت کے اعتبار سے دوسرے۔ تو دیکھئے فنا کا ارادہ کیا چیز ہے کہ اتنی بڑی دولت اس کی بدولت ملی۔ ایک منطقی نے اس پر اعتراض کیا کہ جب عدم ارادہ کا ارادہ کیا تو یہ بھی ایک ارادہ ہے تو ارادہ پایا گیا پھر عدم ارادہ کا حکم کیسے صحیح ہوا مگر یہ لوگ خادم الفاظ ہوتے ہیں اور صوفیہ اہل معانی ہیں ابن عطار نے اس کا خوب جواب دیا ہے کہ وہ مطلق ارادہ کے فنا کا دعویٰ نہیں کرتے بلکہ اس ارادہ کے فنا کو کہتے ہیں جو مزاحم رضاء حق ہو اور عدم ارادہ کا مزاحم ارادہ اداءِ حق نہیں تو اس کے ارادہ کی نفی نہیں کرتے معترض تو منہ دیکھ کے رہ گیا ہوگا یہ معقولی لوگ ہمیشہ لفظوں ہی کے گورکھ دھندے میں رہتے ہیں پھر اپنے کو اہل معانی کہتے ہیں۔ ایسا ہی ایک مشہور اور لغو اشکال ہے کلامی ہذا کاذب میں کہ ہذا کا مشار الیہ یہی کلام ہو تو یہ کلام صادق ہے یا کاذب اور پھر اس پر بڑی بڑی بحثوں میں وقت ضائع کیا ہے مگر اے اللہ محاورہ میں کسی نے بھی یہ جملہ آج تک استعمال کیا ہے بس ایک صورت اپنی طرف سے گھڑلی اور اشکال کر دیا چاہے اس کا وقوع ہو یا نہ ہو انھیں صوفیہ تو کیا منہ لگاتے عوام بھی نہیں پوچھتے۔ چنانچہ ایک منطقی طالب علم کسی تیلی کی دوکان پر گئے تیل خریدنے اس کے بیل کے گلے میں گھنٹی بندھی دیکھ کر پوچھا کہ یہ کیوں باندھی ہے اس نے کہا اس لئے تاکہ گھنٹی کی آواز سے یہ معلوم ہو جائے کہ بیل چل رہا ہے آپ نے کہا آواز سے تو بیل کا چلنا لازم نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ وہ کھڑے کھڑے گردن ہلایا کرے۔ اس نے کہا جی ہاں یہ تو سچ ہے مگر میرے بیل نے منطق نہیں پڑھی ہے۔ آپ میرے بیل کو بگاڑنے آئے ہیں مہربانی کر کے تشریف لے جایئے یہ قدر کی منطقی صاحب کی اس تیلی نے تو غرض فناء ارادہ صوفیہ کا ایک

خاص مشرب ہے کہ اس کے بعد وہ ہر حال میں خوش ہیں ہاں الم طبعی رضائے عقلی کے خلاف نہیں۔ تو کیا اچھا نسخہ ہے محبت الٰہیہ جس سے دنیا بھی لذیذ اور دین بھی کامل یہ تو اہل محبت کی جماعت ہے کہ مزے لوٹ رہے ہیں کہ ایک جماعت منکرین کی ہے کہ ان کو مزہ تو کیا نصیب ہوتا خود وجود محبت ہی کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ محبت الٰہیہ کے کوئی معنی ہی نہیں کیونکہ بے دیکھے محبت ہو ہی نہیں سکتی اور حق تعالیٰ کو کوئی دیکھ نہیں سکتا مگر اس شخص نے نہایت بے حسی سے کام لیا ہے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ ہم لوگوں نے آنکھوں سے دیکھا اور نہ اپنے کانوں سے آپ کی باتیں سنیں۔ اور پھر آپ کی محبت مسلمانوں کے دل میں کس قدر ہے کہ جان دینے کو تیار ہیں تو محبت رویت ہی پر موقوف نہیں ہے۔ ہاں محبت کی بعض قسمیں ایسی بھی ہیں جو دیکھنے پر موقوف ہیں۔ لیکن عقلی محبت تو کسی طرح بھی اس پر موقوف نہیں۔ مثلاً ہم لوگوں کو حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے بوجہ ان کے کمالات فقیہ وعبادت وورع کے خاص محبت ہے اگر کسی طرح سے آپ کو دیکھ لیں اور یہ معلوم ہو جاوے کہ آپ حسین نہیں ہیں تو کیا یہ محبت گھٹے گی ہرگز نہیں کیونکہ ہمیں جو محبت ہے وہ تو آپ کے کمالات سے ہے اور اس کا ادراک بصر پر موقوف نہیں۔ تو پھر خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت میں کیا استبعاد رہا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جس کا نام ہے محبت حسن وہ بھی درا صل کمال ہی کی محبت ہے کیونکہ حسن بھی ایک کمال ہے اور اگر کمال سے قطع نظر حسن ہی کو بالذات موثر فی المحبت کہا جاوے تب بھی اگر زیادہ غور کیا جاوے تو جس حسین کی بھی محبت ہو وہ واقع میں حق تعالیٰ ہی کی ہے۔ اب میں منکرین محبت حق پر احتجاج کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ حسن وجمال جس محبوب کی صفت ہے وہ اس کی صفت بالذات ہے یا بالعرض اگر بالذات ہے تو زائل کیوں ہوتی ہے۔ چار دن بخار آیا اور چہرہ زرد پڑ گیا ذرا سی چیچک نکل آئی اور معلوم ہوا کہ مرغ نے گوبریں ٹھونگیں مار دی ہیں اور اسی لئے صفت کی زوال کے ساتھ خود محبت بھی رخصت ہو جاتی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں ؎

عشق با مردہ نباشد پائدار — عشق را با حی و با قیوم دار
عشق ہائے کز پئے رنگے بود — عشق نبود عاقبت ننگے بود
غرق عشقے شو کہ غرق است اندریں — عشق ہائے اولیں و آخریں

(مردہ کے ساتھ عشق کو پائیداری نہیں اس سے اس حی و قیوم کا عشق اختیار کرو جو ہمیشہ باقی ہے جو عشق و محبت محض رنگ و روپ پر ہوتا ہے وہ واقع میں عشق نہیں بلکہ محض ننگ ہوتا ہے یعنی انجام اس کا حسرت ہے عشق حقیقی میں غرق ہو جا اس میں غرق ہونا اولین و

اور جب یہ مجازی حسن و جمال صفت بالذات نہیں بالعرض ہے تو اس کے لئے ما بالذات کی ضرورت ہوگی اور تم جس کو ما بالذات بتاؤ گے اگر وہ فانی و حادث ہے تو یہی کلام اس میں برابر ہوتا رہے گا یہاں تک کہ منتہا ہوگا حق تعالیٰ پر آکر اِلَی اللّٰہِ تُصِیْرُ الْاُمُوْر (یاد رکھو کہ تمام امور اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں) اور چونکہ ہے کمالات مقصودہ سے اس لئے مرجعیت کی صورت اتصاف بالذات ہوگا تو معلوم ہوا کہ حسن و جمال بھی اصل صفت حق تعالیٰ ہی کی ہے مگر کہیں اس سے یہ نہ سمجھے گا کہ یہ صفت خدا تعالے کی صفت اسی ہیئت سے ہے جس ہیئت سے مخلوق میں ظاہر ہے ہرگز نہیں ہرگز نہیں بلکہ بلا تشبیہ اس کی ایسی ناتمام مثال ہے جیسے آفتاب نکلا اور اس کی کرن کسی آئینہ میں سرخ اور کسی میں سبز معلوم ہونے لگی تو کیا آفتاب کو سرخ و سبز کہنے لگیں گے ہرگز نہیں آفتاب کی شعاع کا رنگ تو ایک ہی ہے مگر خصوصیت محل کی وجہ سے یہ فرق ہو گیا ہے۔ اسی طرح حق تعالے کا حسن تو واحد ہے اور اس کی کوئی مثال بھی بیان نہیں کی جا سکتی مگر اس کی شعاعیں مختلف محلوں میں مختلف نظر آتی ہیں اور ناتمام اس لئے کہا کہ مشبہ بہ میں تو حقیقت شعاع کی اور اس کے تعلق با آئینہ کی حقیقت معلوم ہے اور مشبہ میں نہ صفت حق کی حقیقت معلوم نہ اس کے درجہ تعلق بالمظاہر کی۔ مگر جو مقصود ہے تشبیہ سے وہ ظاہر ہے اور وہ مقصود یہ ہے کہ جب عشق حسن پر ہوتا ہے اور وہ اصل میں صفت حق تعالے کی ہے تو وہ درحقیقت حق تعالے ہی کے حسن کا عشق

کسی نے اس مضمون کو ناتمام تعبیر کیا ہے ؎

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردۂ پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردۂ

(اپنے حسن کو حسینوں کے چہرہ سے ظاہر کیا ہے۔ عاشقوں کی آنکھ میں اپنے آپ کو تماشہ بنایا ہے)

پرتو حسنت نگنجد در زمین و آسماں در حریم سینہ حیرانم کہ چوں جاں کردۂ

(آپ کے حسن کا پرتو زمین و آسمان میں نہیں سماتا ہے میں حیران ہوں کہ میرے حریم سینہ میں کیونکر جگہ کرلی ہے)

اور ایک حسن ہی کیا۔ تمام صفات کمال کا یہی حال ہے کہ انسان کا علم فضل عطا جود جبن وغیرہ تمام صفات کمال میں حق تعالیٰ ہی متصف بالذات ہیں پس اگر حسن کی یا اور کسی کمال کی وجہ سے کوئی کسی پر عاشق ہے تو وہ درحقیقت حضرت حق ہی کا عاشق ہے مگر اسے خبر نہیں جیسے دیوار پر آفتاب کی روشنی دیکھ کے کوئی دیوار کا عاشق ہوا تو وہ درحقیقت آفتاب کا عاشق ہے دیوار کا عاشق نہیں مگر اُسے آفتاب کی خبر نہیں۔ اب جو آفتاب غروب ہونے لگا اور روشنی چلی تو چلاتا ہے کہ ہائے میرا محبوب چلا اور اگر اس کو حقیقت معلوم ہوجاتی تو یہ پریشانی نہ ہوتی۔ کیونکہ غروب کے سبب صرف دیوار کے اوپر سے وہ روشنی غائب ہوئی ہے آفتاب سے تو غائب نہیں ہوئی۔ وہاں تو اب بھی موجود ہے اسی طرح علم کو صحیح کرلیا جائے تو پھر کسی محبوب مجازی کے فوت سے غم نہ ہو کیوں کہ اس میں تو محبوب حقیقی کا عکس تھا۔ جب محبوب حقیقی باقی ہے تو یہ کمال بھی باقی ہے پھر رنج کاہے کا۔ پس اگر کسی سے سخاوت کی وجہ سے محبت ہے تو اب بھی وہی ذات پاک محبوب ہے۔ اور اگر علم کی وجہ سے محبت ہے تو وہ بھی وہی محبوب ہے اور حسن کی وجہ سے محبت ہے تو بھی وہی محبوب ہے اسی واسطے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے مدلول کا ایک درجہ عارفین کے نزدیک یہ بھی ہے کہ لَا مَطْلُوْبَ اِلَّا اللہ بلکہ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللہُ (اللہ کے سوا کوئی مطلوب نہیں اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں) مگر شریعت نے اس کے ساتھ حکمت کی رعایت سے اسباب کا بھی لحاظ کیا ہے۔ ورنہ لاموجود الا اللہ کی بناء پر تو بندہ کا کسی پر کچھ احسان ہی نہ ہوتا اور نہ کوئی کسی کا احسان مانتا اور اس سے تمدن برباد ہوجانے کا اندیشہ تھا اسی واسطے بقائے تمدن کے لئے یہ بھی ارشاد فرمایا گیا کہ مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللہ (جو شخص لوگوں کا شکریہ ادا نہ کرے وہ اللہ کے شکریہ سے بھی سبکدوش نہیں)

اگر کوئی احسان کرے تو گو محسن حقیقی تو حق تعالیٰ ہی ہیں اس لئے اصل شکر تو ان کا ہونا چاہیئے مگر یہ ظاہری محسن درمیان میں واسطہ تو ہے اس لئے اس کا بھی شکر کرنا چاہیئے پھر دیکھئے شریعت نے معاملہ بواسطہ میں بھی تعدیل فرمائی ہے کہ یہ بتا دیا کہ مخلوق واسطہ تو ہے مگر ہے انھیں کا بنایا ہوا۔ اس لئے یہاں بھی انتساب الی المحبوب ہی سبب شکر و محبت کا ہونا چاہیئے اور اس کو بھی مرآت جمال حق بنانا چاہیئے یہ نہیں کہ اسی کا عاشق ہو جائے اور اس کو مستقل سمجھ لیا جائے اور یہاں ایک دقیقہ ہے جسے صوفیہ نے سمجھا ہے۔ وہ یہ کہ محبوبوں کی عادت ہے کہ کبھی بے حجاب ہو کے جمال دکھاتے ہیں اور کبھی باریک پردہ چہرہ پر ڈال لیتے ہیں کہ خفیف سی جھلک عاشق کو دکھلائی دے اسی عادت کے موافق سمجھو کہ جس وقت دوسرے کے واسطے سے کوئی احسان ہوتا ہے اس وقت بھی حق تعالیٰ ہی کی تجلی ہو رہی ہے مگر چلمن کے پیچھے سے یا نقاب کے اندر سے اور اس میں بھی ایک لطیف حکمت ہوتی ہے وہ یہ کہ ناسوتی استعداد کے اقتضا سے ایک ہی طرح کی تجلی عاشق کے جذبات محبت بھڑکانے کو کافی نہیں۔ بلکہ گوناں گوں تجلیات سے اس کا شوق زیادہ ہوتا ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں مُشَاهَدَةُ الْاَبْرَارِ بَيْنَ التَّجَلِّيْ وَالْاِسْتِتَارِ (عارفین کا مشاہدہ تجلی اور استتار کے درمیان ہوتا ہے) یہاں مقابلہ کی وجہ سے دوسری تجلی کو استتار کہا کہ اس کے سامنے وہ استتار ہی معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ تجلی وہ بھی ہے گو خفیف ہے تو یوں سمجھئے کہ ایک مرتبہ تو بلا آئینہ کے جمال دکھاتے ہیں اور ایک مرتبہ آئینہ کے اندر سے دکھلاتے ہیں جس میں راز یہ ہے کہ انسان اسی ناسوتی استعداد کی خاصیت سے ایک حالت سے اکتا جاتا ہے اگر یہ استتار یا غیبت بالکل نہ ہوتی تو دوام تجلی کا لطف ہی برباد ہو جاتا ؎

از دست ہجر یار شکایت نمی کنم گر نیست غیبتے نہ دہد لذتے حضور

(محبوب کی جدائی کی شکایت نہیں اگر جدائی نہ ہوتی تو وصل میں لطف و لذت نہ ہوتی)

تو حق تعالیٰ نے واسطہ کے ذریعہ سے سالک کا مزہ بڑھا دیا۔ اور یہاں تفریع کرتا ہوں کہ اب تو سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ جو مزے تصوف کے ہیں وہ شریعت ہی کی

بدولت ہیں یہ بات بھی شریعت ہی کی بدولت تو معلوم ہوئی کہ یہ وسائط مرایا جمال حق کے ہیں ان کا بھی حق ادا کرنا چاہیئے اور اس واسطہ سے بھی مشاہدہ کی لذت حاصل کرنا چاہیئے اب جو لوگ ان وسائط کو درمیان سے اڑانا چاہتے ہیں اور ہر وقت تجلی بلا واسطہ کے طالب ہیں وہ لذت مشاہدہ سے محروم ہیں۔ اسی واسطے جو لوگ کثرت سے سماع سنتے ہیں انھیں کچھ مزا نہیں آتا کیونکہ اب وہ بدون سماع کے جل ہی نہیں سکتے نہ اُن کو نماز میں لطف آتا ہے نہ ذکر میں اور بزرگوں نے جو ایسا کیا ہے اس کے لئے کچھ شرائط مقرر کر دیتے ہیں اور مقصود شرائط کا یہ ہے کہ تقلیل ہو اور تقلیل سے مزہ آوے ورنہ روز کی دال روٹی میں کیا مزہ اور اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ تقلیل کے ساتھ علی الاطلاق اجازت ہے خود اس میں بھی شرائط ہیں۔ جن کی حکمت علاوہ تقلیل کے دوسری مضرتوں سے بچانا بھی ہے جو فاقد شرائط میں مرتب ہو جاتی ہیں۔ مقصود مقام کا یہ ہے کہ کثرت سماع میں اگر بالفرض مضرتیں بھی نہ ہوتیں تب بھی اس لئے واجب الترک تھا کہ یہی مصلحت ہے سماع میں وہ اس میں نہیں پائی جاتیں خیر یہ تو تفریع تھی حکمت واسطہ پر مقصود یہ کہنا ہے کہ ظاہر محسن محض واسطہ ہے باقی اصل میں سارے کمالات حقیقۃً انھیں کے ہیں اس لئے بندہ جس سے جس کمال کی وجہ سے بھی محبت کر رہا ہے حقیقت میں وہ انھیں سے محبت ہے پھر محبت حق کے حاصل کرنے کو جو طرق بتلائے جاتے ہیں ان کی حقیقت یہ ہے کہ محبت تو اس شخص کو خدا تعالےٰ کے ساتھ پہلے سے ہے صرف امالہ کی ضرورت ہے اور اس امالہ کے لئے وہی دستور العمل ہے جو میں نے اوپر بتایا ہے اُسے کر لیجئے اور حیوٰۃ طیبہ لے لیجئے اور اس میں ایک جزء واہل اللہ سے تعلق رکھنا بھی ہے۔ اس کا ایک حق ضروری بھی بتلاتا ہوں وہ یہ کہ جب اہل اللہ کے یہاں پہنچ جائے تو وظیفہ و مطالعہ سب کو الگ کیجئے مگر ضروریات دین کو الگ نہ کیجئے اور اب جو وہ دین اُسے لیجئے اور بالکل ان کے یہاں ایسے ہو جایئے ؎

قال را بگذار مرد حال شو پیش مردے کاملے پامال شو

(قال کو چھوڑو حال پیدا کرو یہ اس وقت پیدا ہوگا جب کسی اہل اللہ کے قدموں جاکر پڑجاؤ)

ہاں یہ شرط ہے کہ وہ مرد کامل ہو مرد کاہل نہ ہو اور پھر مرد ہو مردہ نہ ہو کیونکہ مردہ تو خود ہی پامال ہورہا ہے وہ آپ کو کیا پامال کرے گا اسی واسطے حکیم سنائی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے ؎

عالمت خفتہ و تو ہم خفتہ خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

(پیر تمہارا سویا ہوا ہے اور تم بھی سوئے ہوئے ہو سویا ہوا سوئے ہوئے کو بیدار نہیں کرسکتا)

پیر جی بنایا تو وہ بھی خفتہ اب یہ مرید کیسے بیدار ہوگا۔ اور شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس شعر کو رد کیا ہے کہ ؎

باطل است آنچہ مدعی گوید خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

(یہ جو مدعی کہتا ہے سوئے ہوئے کو سویا ہوا کب بیدار کرسکتا ہے باطل ہے)

اس سے غرض شعر کا رد کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ ظاہر شعر سے احتمال تھا کسی کے تمسک کرنے کا کہ ہمارے علماء بے عمل ہیں اس لئے ہم ان کا اتباع نہیں کرتے اس کو رد فرماتے ہیں چنانچہ شیخ کا شعر سابق اس کا قرینہ ہے ؎

مرد باید کہ گیرد اندر گوش ور نبشت است پند بر دیوار

(آدمی کو ایسا ہونا چاہیئے کہ نصیحت کی بات اگر دیوار پر بھی لکھی ہو تو اس کو بھی حاصل کرلے)

اور غرض سنائی کی نفی کرتا ہے تاثیر کا سو یہ بالکل صحیح اور مشاہد ہے اور میری غرض بھی اس کے لانے سے یہ ہے کہ صاحب تاثیر سے تعلق پیدا کرنا چاہیئے کہ زیادہ نفع ہو۔ اب اس کی تحقیق باقی رہی کہ اس مرد کامل کی پہچان کیا ہے سو اس سے پہلے جلسہ میں شیخ کامل کے علامات بتاچکا ہوں اگر وہ علامات نہ ہوں گی تو پھر پیر المات ہی المات ہیں تو تم بھی المات میں مبتلا ہوجاؤ گے۔ یہاں تک یہ سب بیان تھا معبود کے حقوق اور ان حقوق کی تحصیل و تکمیل کے طریقہ کے متعلق اب ایک مضمون جو اس کا تتمہ ہے باقی رہ گیا اور وہ حقوق ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے

اور گو اب اس کا وقت نہیں رہا مگر دس منٹ میں اس کے متعلق کچھ کہے دیتا ہوں وہ یہ کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نائب کامل اور مظہر اتم ہیں حضرت حق کے اور اس سے زیادہ آپ کا ہم پر کیا احسان ہوگا کہ دین ملا آپ ہی کی بدولت اور ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ (جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا بھی شکریہ ادا نہیں کرسکتا) اور اس کلیہ کے علاوہ خود مستقل حقوق بھی جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآن میں آئے ہیں اور وہ مثل حقوق الہیہ کے تین ہی حق ہیں اطاعت و محبت و عظمت۔ چنانچہ مختصراً و مختلطاً مع بعض فروع کے ان کو عرض کرتا ہوں مثلاً۔ ایک نوع حق محبت کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کا دل دکھانے کی سخت ممانعت فرمائی ہے۔ ارشاد ہے وَمَا کَانَ لَکُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰہِ الآیت (تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا نہ دینی چاہیئے) وَغَیْرُھَا مِنَ الْاٰیَاتِ۔ اس پر میں ایک تفریع کرتا ہوں وہ یہ کہ احادیث میں وارد ہے کہ آپ پر امتیوں کے اعمال پیش ہوتے ہیں تو ہماری بداعمالیوں سے جبکہ ملائکہ آپ کے سامنے پیش کرتے ہوں گے آپ کا کتنا دل دکھتا ہوگا تو اس سے کس قدر احتراز لازم ہوگا اور عظمت کے متعلق آپ کا یہ حق وارد ہے کہ لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تم سبقت مت کیا کرو) اور اسی باب میں فرماتے ہیں۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ (اے ایمان والو اپنی آوازیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے بلند مت کیا کرو) آپ کے آگے چیخ کے مت بولو اور اسی طرح ارشاد ہے وَلَا تَجْھَرُوْا لَہٗ بِالْقَوْلِ کَجَھْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿ (اور نہ ان سے کھل کر بولا کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے سے کھل کر بولا کرتے ہو کبھی تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو) یعنی معمولی طور سے آپ کو پکارو مت کبھی ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال غارت ہو جاویں آگے فرماتے ہیں اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ط وَلَوْ اَنَّھُمْ صَبَرُوْا حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْھِمْ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ یعنی جو لوگ حجروں کے پیچھے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارتے ہیں ان میں اکثر بے عقل ہیں واقعہ یہ ہوا تھا کہ کچھ دیہاتی بیوقوف آئے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت زنانہ میں تشریف رکھتے تھے مگر انہیں یہ نہ معلوم تھا کہ کون سے قطعہ میں ہیں انہوں نے کہا ایک ایک آدمی ایک ایک

حجرہ کے مقابل کھڑے ہو کر پکارے کہیں تو سن لیں گے۔ اس پر حق تعالیٰ نے انھیں آیت بالا میں ڈانٹا۔ اور اس کی یہ اصلاح فرمائی کہ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ یعنی اگر ذرا دیر اور ٹھہرے رہتے یہاں تک کہ آپ خود ہی باہر تشریف لے آتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ یعنی انھیں کیا حق ہے کہ اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پکاریں۔ اس مقام پر میں حضرات سامعین سے تفریعًا و تفریحًا ایک سوال کرتا ہوں کہ جب حجرہ کے باہر سے آپ کو پکارنا جائز نہیں تو ہندوستان سے پکارنا کب جائز ہوگا میں فتویٰ نہیں دیتا آپ سے پوچھتا ہوں یہ تو عظمت کے متعلق کچھ مضمون تھا۔ اسی طرح جیسے حق تعالیٰ کی اطاعت فرض ہے ویسی ہی آپ کی بھی فرض ہے۔ اور اسی طرح جیسے حق تعالیٰ کی محبت فرض ہے ویسی ہی آپ کی بھی فرض ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک سب سے زائد محبوب نہ ہو جاؤں تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا مجھے آپ کے ساتھ سب سے زائد محبت ہے بجز اپنے نفس کے تو آپ نے فرمایا کہ جب تک اپنے نفس سے بھی زیادہ مجھ سے محبت نہ کرو گے مومن نہ ہو گے اس کے بعد انھوں نے عرض کیا کہ اب نفس سے بھی زیادہ آپ کی محبت پاتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ تو بس اب مومن بھی ہو۔ خیر اس حدیث کی ایک شرح بھی ہے۔ جس کا اب وقت نہیں ہے مگر اتنا سنا دیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جاوے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی جان سے بھی زیادہ محبت ہونا چاہیے۔ اگر طبعی نہ ہو تو عقلی تو ہونا ہی چاہیے اور آپ کے ان حقوق کی بجا آوری میں بھی عام کوتاہی ہو رہی ہے حتیٰ کہ جو لوگ آپ کے حقوق کو بزعم خود ادا کر رہے ہیں وہ بھی اُس کوتاہی سے بری نہیں اور وہ اس طرح کہ آپ کے جو تین حق ہیں۔ مطاوعت، عظمت۔ محبت جن کا اوپر بیان ہوا ہے ان میں اکثر لوگوں نے تجزیہ کر رکھا ہے سو بعضوں نے تو صرف مطاوعت کو لے لیا ہے مگر محبت وعظمت کے

ع؎ اس مقام کے متعلق ایک حاشیہ ہے جو وعظ کے اخیر میں ملحق ہے ملاحظہ فرما لیا جاوے ۱۲ اشرف علی

حقوق کو چھوڑ دیا ہے۔ باقی بعض جگہ یہ بھی ہوا ہے کہ واقع میں تو نہیں چھوڑا ہے لیکن دوسرے لوگوں نے اپنی سوء فہمی سے اُسے زبردستی سے موہم گستاخی کا بنالیا تو اس کا ذکر نہیں اور اس کا تو کوئی علاج ہی نہیں ایسے تو اعتراض تو لوگوں نے اللہ تعالےٰ پر بھی کئے ہیں کہ ہائے اللہ میاں قرآن میں مکھی مچھر کا ذکر کرتے ہیں جو حقیر چیزیں ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے۔ اور بعض نے یہ کیا کہ محبت کا تو دم بھرتے ہیں مگر طاعت و عظمت کو بالکل ہی اڑا دیا ہے کہ نہ نماز ہے نہ روزہ نہ دین کے اور کام اور گمان یہ ہے کہ نری محبت سے نجات ہو جاوے گی اور یہ شعر یاد کر لیا ہے ؎

نہ ماند بعصیاں کسے در گرو　　　که دارد چنیں سید پیشرو

(گناہوں کی وجہ وہ شخص نہ رہے گا جو آپ جیسا سردار سربراہ رکھتا ہو)

حالانکہ اس کے ساتھ قرآن کی یہ آیت بھی ملانا چاہیئے كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر نفس کو اس کے اعمال کے بدلے میں قید حبس ہو گی ہاں اتنا ضرور ہے کہ مومن اخیر تک محبوس عذاب نہیں رہیگا شفاعت سے کسی وقت نجات ہو جائے گی تو کیا جہنم کی تھوڑی سی قید آپ کو گوارا ہے۔ صاحبو وہاں کا عذاب تحمل سے باہر ہے اس کے علاوہ میں خود دعوےٰ محبت ہی کے متعلق کہتا ہوں کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی سے محبت ہو اور اس کی اطاعت نہ ہو۔ ایک شخص سے محبت کا تو دعوےٰ مگر نہ اس سے بات کرتے ہیں نہ اس کی طرف دیکھتے ہیں نہ اس سے مصافحہ کرتے ہیں کسی نے کہا ارے یہ کیسی محبت ہے تو کہا ہمیں پاک محبت ہے تو کیا کوئی کہے گا کہ اسے محبت ہے ہرگز نہیں۔ کیونکہ محبت کے لئے تو لازم ہے اقتراب۔ اور یہ شخص اسباب بعد میں مبتلا ہے بلکہ از خود ان اسباب کو اختیار کر رہا ہے پھر محبت کیسی۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعوےٰ ہو اور اطاعت نہ کی جاوے تو یہ کیسی محبت ہے۔ فرض کرو ایک محب سے کسی محبوب نے

کہا کہ دو روپے کے آم لے آؤ اس نے کہا نہ صاحب میں تو نہ لاؤں گا۔ کیونکہ اتنی دیر تک آپ کو کیسے دیکھوں گا ہر شخص یہی کہے گا کہ بس معلوم ہوا کہ یہ محب ہی نہیں۔ ورنہ اطاعت کرتا اور فوراً چل دیتا کیونکہ محب کا تو یہ مذہب ہوتا ہے ؎

اُرِیْدُ وِصَالَہٗ وَیُرِیْدُ ھِجْرِیْ   فَاَتْرُکُ مَا اُرِیْدُ لِمَا یُرِیْدُ

(میں محبوب کے وصال کا خواہاں ہوں اور وہ ہجر کے خواہاں سو میں نے اپنی خواہش کو ان کی خواہش کی وجہ سے ترک کر دیا)

اسی کا ترجمہ حضرت حافظ کرتے ہیں ؎

میل من سوی وصال و میل او سوئے فراق   ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

(میری خواہش وصال کی ہے محبوب فراق کا خواہشمند ہے۔ میں نے اپنی خواہش کو ترک کر دیا محبوب کی خواہش پوری ہو)

یعنی مجھے اپنی مرضی کو محبوب کی مرضی کے آگے فنا کر دینا چاہیئے۔ اگرچہ اس کی مرضی پر چلنے سے ظاہرا بعد ہی ہوتا ہے اور چہ جائیکہ اطاعت سے قرب بھی ہو چنانچہ ارشاد ہے وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (نماز پڑھتے رہئے اور قرب حاصل کرتے رہیئے) اور حدیث میں ہے۔ اَقْرَبُ مَا یَکُوْنُ الْعَبْدُ حِیْنَ یَسْجُدُ فِی الصَّلٰوۃِ یعنی سب سے افضل حالت قرب کی سجدہ ہے اور ہماری یہ حالت ہے کہ ہم نماز سے غافل تو یہ کیسی محبت ہے کہ محبوب تو آپ کو اپنے سے قریب کرنا چاہے اور آپ اس سے دور ہونا چاہتے ہیں اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

تَعْصِی الرَّسُوْلَ وَاَنْتَ تُظْھِرُ حُبَّہٗ   ھٰذَا الْعَمْرِیْ فِی الْفِعَالِ بَدِیْعٌ

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے اور آپ کی محبت کا اظہار کرتا ہے یہ بات تو نادر ہے)

لَوْ کَانَ حُبُّکَ صَادِقًا لَاَطَعْتَہٗ   اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُحِبُّ مُطِیْعٌ

(اگر تیری محبت سچی ہوتی تو آپ کی اطاعت کرتا اس لئے محب جن کو محبوب پسند کرے اسکی اطاعت کرتا ہے)

اور بعض نے محبت اور اطاعت دونوں کو اڑا دیا صرف تعظیم ہی لے لی اور وہ بھی اپنی طرف سے گھڑ کر جو واقع میں تعظیم بھی نہیں۔ اور یہ ان لوگوں نے کیا ہے جنہوں نے آجکل حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کی خاص طرز کی سوانح عمریاں لکھی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اور آپ کے خلفاء میں اعلیٰ انتظام سلطنت کا ثابت کیا اور اپنے نزدیک آپ کی بڑی شان ظاہر کی مگر کمی یہ کی ہے کہ سلطان اور ملک دونوں کی حیثیت سے تو آپ کی عظمت بتائی مگر نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہونے کی حیثیت سے نہیں بتائی معلوم ہوا کہ وہ آپ کی عظمت محض سلطنت کی وجہ سے کرتے ہیں۔ حالانکہ اصل شان آپ کی نبوّت ہی ہے اور سلطنت تو تابع ہے اور پھر اس پر ناز بھی ہے کہ ہم نے ایسی سیرت لکھی اور ویسی لکھی اور کہتے ہیں علماء تو تاریخ لکھنا نہیں آتی واقعی سچ ہے ایسی تاریخ لکھنا تو بے شک ہم کو نہیں آتی ہمارا تو یہ کام ہے ؎

ما قصہ سکندر و دارا نخواندہ ایم　　از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

(ہم نے دارا اور سکندر کے قصے نہیں پڑھے ہم سے سوائے عشق و محبت کی باتوں کے کچھ نہ دریافت کرو)

اس میں شک نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بادشاہ بھی ہیں مگر اصل صفت آپ کی نبوت ہی ہے اور سلطنت تو اس کے تابع ہے یعنی وہ بھی محض اس واسطے عطا ہوئی ہے تاکہ اس سے اغراض نبوت کی تکمیل ہو ورنہ آپ کا اصل جوہر تو یہ ہے کُنْتُ نَبِيًّا وَّاٰدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ کہ میں اس وقت نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) تھا کہ حضرت آدمؑ کے جسد کا خمیر ہی تیار ہو رہا تھا روح بھی اس میں نہ آئی تھی اور اسی طرح اصل کمال آپ کا یہ ہے کہ آپ خاتم ہیں سو آپ کا اصل کمال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے نبی ہیں اور سب کے آخر بھی کسی نے اس اولیت و آخریت میں نکتہ خوب نکالا ہے ؎

پیش از ہمہ شاہان غیور آمدۂ　　ہر چند کہ آخر بظہور آمدۂ

اے ختم رسل قرب تو معلومم شد　　دیر آمدۂ از راہ دور آمدۂ

(پہلے تمام بادشاہوں سے آپ غیور آئے ہر چند کہ آخر ظہور میں آئے اے ختم رسل (صلی اللہ علیہ وسلم)

لہ مراد اس سے محض تاریخ ہے جو کہ ان مدعیان تاریخ نویسی کا مطمح نظر ہے حتیٰ کہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات لکھنے میں بھی ان صاحبوں کے نزدیک یہی حیثیت مقصود ہے اور ہماری نظر جس حیثیت سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات پر ہے وہ حکایات مہر و وفا میں داخل ہے نہ تاریخ محض جو کہ قصہ سکندر و دارا سے مراد ہے ۱۲ منہ عفی عنہ۔

آپ کا قرب تو مجھ کو معلوم ہے دیر میں آئے دور راستے سے آئے)

واقعی نکتہ ہے عجیب وغریب کہ آپ چونکہ بہت دور سے آرہے ہیں اس لئے آنے میں اتنی دیر لگی۔ دوسرے انبیا مسافت قریبہ سے آئے ہیں اس لئے جلدی آگئے ان کو علمی دلیل نہ سمجھئے نشاط کے لئے لطیفہ کے طور پر بیان کر دیا ہے۔ اس پر حضرات خلفاؓ کی فضیلت اور ترتیب کے متعلق بعض نکات یاد آگئے۔ حدیث شریف میں آتا ہے خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ (بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے) لفظ قرنی میں نکتہ یہ کہا گیا ہے کہ اس میں اشارہ ہے زمانہ خلافت نبوت کی طرف کیونکہ خلفاء اربعہ کے نام کے آخری حروف اس میں بہ ترتیب آگئے ہیں یعنی صدیقؓ کا ق اور عمرؓ کی ر اور عثمانؓ کا نون اور علیؓ کی ی۔ اور ایک نکتہ اردو میں بھی کسی نے نظم کیا ہے ؎

بو بکر یکسو علی ایک جانب — خلافت کو گھیرے ہیں با صد صفائی
الف اور ی کی طرح ان کو جانو — کہ محصور ہے جنمیں ساری خدائی
یہ تشبیہ ہے واقعی تو جگہ بھی — الف اور ی نے یہ ترتیب پائی
وہ اول خلیفہ کے اول میں آیا — یہ آخر خلیفہ کے آخر میں آئی

بھلا کوئی شعر کہے ایسے تو کہے۔ غرض بادشاہی سے اغراض نبوت کی تکمیل مقصود تھی وہ خود مقصود نہ تھی اور وہ نبوت کی غرض اصلاح خلق ہے اور اصلاح خلق دوصورتوں سے ہوسکتی ہے۔ ایک حکومت سے دوسرے عقیدت سے یعنی ایک تو یہ کہ بادشاہ کی عقیدت ہے کہ لوگ اُسے بزرگ اور نیک سمجھ کے بڑا مانتے ہیں۔ اور ایک یہ کہ اگر نہ مانیں گے تو تلوار کے زور سے منوایا جائے گا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب حق تعالٰے نے اصلاح خلق کے لئے بھیجا تو دونوں قوتیں آپ میں جمع کردیں کہ جو اہل بصیرت ہیں وہ تو عقیدت سے مانیں گے اور آپ کے کمالات ذاتیہ کو پہچانیں گے اور جو اہل بصیرت نہیں ہیں وہ تلوار کے زور سے مانیں گے کیونکہ تلوار بھی بڑا واعظ ہے ہمارے استاد رحمۃ اللہ علیہ کا شعر ہے ؎

اَلْوَعْظُ يَنْفَعُ لَوْ بِالْعِلْمِ وَالْحِكَمِ — وَالسَّيْفُ اَبْلَغُ وَعَّاظٍ عَلَى الْقِمَمِ

(نصیحت اگر علم وحکمت کے ساتھ ہو تو نفع پہنچاتی ہے اور تلوار سر پر پڑتی نصیحت گروں میں سب سے بلیغ نصیحت گر ہے)

کہ سب سے بڑی وعظ تو تلوار ہے۔ یہ شعر مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا ہے۔ اور قرآن میں اس کا ماخذ یہ آیت ہے۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ (ہم نے اپنے پیغمبروں (علیہم السلام) کو کھلے کھلے احکام دے کر بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب کو اور انصاف کو نازل کیا تاکہ لوگ اعتدال پر قائم رہیں اور ہم نے لوہے کو پیدا کیا جس میں شدید ہیبت ہے)

اس کی تفسیر میں ہمارے مولانا فرمایا کرتے تھے۔ حدید سے مراد ہے نعلدار جوتہ (یعنی فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ کی صفت کے اعتبار سے سلاح مراد ہے جس کی تعبیر اہلِ محاورہ اس عنوان سے کیا کرتے ہیں) کیونکہ جو فہیم کم ہوتے ہیں ان کے لئے جوتہ کی بھی ضرورت ہے۔ بہرحال آپ میں نبوت کی بھی شان ہے اور سلطنت کی بھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سیرت نبویہ میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے کمالات سلطنت بیان نہ کئے جائیں آپ سلطنت کی شان ضرور بیان کیجئے مگر کتاب کو دو باب کیجئے۔ ایک میں سلطنت کی شان بیان کیجئے اور ایک میں نبوت کی۔ جب نبوت کا ذکر ہی نہیں تو اب تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ جو دعویٰ ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمت پہچانی۔ یہ بالکل غلط ہے۔ آپ نے عظمت پہچانی تو مگر ادھوری اور نامکمل اسی طرح ایک صاحب نے حضرت عمرؓ کی سوانح عمری لکھی کہ اس کے دیکھنے سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ حضرت عمرؓ کی سوانح عمری ہے بلکہ اگر حضرت عمرؓ کا نام اس میں چھپا لیا جاوے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نوشیرواں کی یا کسی بڑے مدبر و منتظم بادشاہ کی سوانح عمری ہے کیونکہ اس میں اس کا پتہ ہی نہیں کہ آپ کا تقویٰ کس درجہ کا تھا۔ دین سے آپ کو کس درجہ الفت تھی آپ کا زہد آپ کی ریاضت اور خلق اور شدت علی الکفار اور کرامات وغیرہ کس شان کی تھیں۔ غرض کسی چیز کا پتہ نہیں۔ بس صرف انتظام تمدن کو لئے پھرتے ہیں حالانکہ اتنے بڑے بڑے کمالات کے ہوتے ہوئے صرف سیاست مدن کی تعریف کرنا ایسا ہے ؎

شاہ را گوید کسے جولا ہہ نیست   ایں نہ مدح است او مگر آگاہ نیست

(بادشاہ کو کوئی کہے کہ وہ جولاہہ نہیں تو یہ اس کی تعریف نہیں بلکہ ناواقفی کی بات ہے)

یعنے جیسے بادشاہ کی تعریف میں یہ کہنا کہ یہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ کیونکہ جولاہے نہیں ہیں تو اس درجہ کی ہیں یہ سوا نخمریاں۔ خلاصہ یہ کہ مطاوعت وعظمت محبت یہ تینوں حقوق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ادا کرنا چاہیئے۔ اور آپ سے اول حق تعالےٰ کے یہی حقوق مگر محققین سے اور ان کی کتابوں سے معلوم ہوگا کہ مطاوعت عظمت محبت کی حقیقت کیا ہے۔ تم اپنی طرف سے ان کی تفسیر نہ گھڑنا وہی بتائیں گے۔ اور جنھیں آپ نے عظمت ومحبت وغیرہ سمجھ رکھا ہے ان کی حالت آپ کو بھی معلوم ہوچکی ہے کہ واقع میں وہ مطاوعت وعظمت ومحبت نہیں ہیں۔ بہرحال آپ کے ظاہری وباطنی دونوں قسم کے حقوق کو جمع کرو اور اس جمع کے طریق کو کسی ایسے محقق سے حاصل کرو جس کی جامعیت کی خود یہ شان ہو ؎

برکفے جام شریعت برکفے سندان عشق   ہر ہوسناکے نداند جام وسنداں باختن

(ادھر شریعت کا خیال ادھر عشق کا خیال شریعت اور عشق کے مقتضیٰ پر عمل کرنا ہر ہوسناک کا کام نہیں ہے)

اور یہ طریق جمع کا حاصل کرنا یا تو محققین کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے اگر زماناً ومکاناً قریب ہو یا ان کے حکایات وملفوظات کے مطالعہ سے اگر زماناً بُعد ہو۔ یا ان سے خط وکتابت سے اگر مکاناً بُعد ہو۔ اب ایک[ؔ] بات اور رہ گئی اور اس کے بعد ختم کردونگا وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو شانیں ہیں۔ ایک شان سلطنت دوسری شان نبوت اور دونوں کے حقوق ہیں۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو پردہ میں ہیں۔ مگر آپکی

[ؔ] اس مضمون کے بیان کرنے کی وجہ یہ ہوئی تھی بعض محبان اسلام نے یہ درخواست کی تھی کہ مجلس وعظ میں حضور نظام جعلہ اللہ تعالیٰ معینا للاسلام کے لئے دعا کی جاوے۔ چنانچہ وعظ کے قبل ایک خاندانی حیدرآبادی نوجوان نے ایک مختصر تقریر کے بعد تمام مجمع کے ساتھ دعا کی اور وہ فرمائش ختم ہوگئی مگر احقر کو ختم وعظ کے قریب دوبارہ دعا کا جوش ہوا اور بجائے مستقلاً دعا کرنے کے اس عنوان خاص سے دعا کرتا ہوا اچھا معلوم ہوا جس سے وہ دعا کا مضمون جزو وعظ بھی ہوگیا اور دینی حیثیت سے اس کی ضرورت بھی معلوم ہوگئی اور اغراض دنیویہ کے شائبہ کے ایہام سے خلو بھی رہا۔ والحمد للہ ۱۲ منہ

دونوں شانوں کے مظاہر موجود ہیں چنانچہ شان نبوت کے مظاہر حضرات صوفیہ کرام وعلماء ہیں اور شان سلطنت کے مظاہر مسلمان عادل بادشاہ ہیں اس واسطے مظاہر ہونے کی حیثیت سے ان دونوں جماعتوں کے حقوق ادا کرنا بھی تتمہ ہے حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے حقوق کا۔ پس ہم کو ان کے حقوق بھی ادا کرنا چاہیئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غیبت ظاہری کے بعد انھیں غنیمت سمجھنا چاہیئے ؂ بقول مولانا۔

چونکہ شد خورشید ومارا کرد داغ چارہ نبود در مقامش از چراغ

یعنی خورشید تو چھپ گیا ہے تو اب بجز چراغ کے اور کیا چارہ ہے۔ پس علماء کا حق یہ ہے کہ ان سے دین کے احکام کو پوچھا جائے۔ اور یہ حق علماء کا مسلمان بادشاہوں پر بھی فرض ہے کہ ان کو بھی اپنے احکام جاری کرنے کے قبل علماء سے استفتا کرنا چاہیئے اور مسلمان بادشاہوں کا حق یہ ہے کہ امور انتظامیہ میں ان کی اطاعت کی جاوے حتیٰ کہ علماء کے ذمہ بھی ان امور میں ان کی اطاعت ضروری اور ان دونوں جماعتوں کا مشترک حق سب کے ذمہ یہ ہے کہ ان کی بقاء کی اور ان کی نصرت کی دعا کریں اور یہ بھی دعا کریں کہ حق تعالیٰ ان دونوں کو اپنے اپنے مناصب ادا کرنے کی توفیق دے۔ یعنی یہ دعا کریں کہ حق تعالیٰ علماء سے دین کی خدمت لے۔ اور سلاطین کو امت پر رحیم وشفیق بنا دے۔ اور اپنے لئے یہ دعا کریں کہ حق تعالیٰ انھیں دونوں جماعتوں کی برکات سے منتفع کرے۔ آمین (تمام جماعت کے ساتھ عامہ مسلمین وعلماء وسلاطین خصوص مقامی بادشاہ کے لئے فلاح دنیا ودین کے لئے دعا کی گئی اور جلسہ ختم ہوا)

حاشیہ متعلقہ صفحہ ۵۰۲ من الخطیب

قولہ ۔ اس مقام پر حضرات سامعین سے تفریحًا وتفریحًا ایک سوال کرتا ہوں کہ جب حجرہ کے باہر پاس سے آپ کو پکارنا جائز نہیں تو ہندوستان سے پکارنا کب جائز ہوگا۔ میں فتویٰ نہیں دیتا آپ ہی سے پوچھتا ہوں اھ

اقول ۔ اس مضمون کے متعلق وعظ کے بعد ایک صاحب خوش فہم نے بلدہ ہی

میں مجھ سے ایک سوال تقریراً کیا۔ اور ایک ذی علم نے بعد واپسی وطن میرے ایک رفیق سفر سے ایک خیال کا اظہار تحریراً کیا۔ دونوں کو مع جواب افادہ ناظرین کے لئے نقل کرتا ہوں۔

سوال تقریری ۔ جس کے الفاظ بُعدِ زماں کے سبب یاد نہیں معنے یہ تھے کہ یہ استدلال کس درجہ کا ہے۔

جواب ۔ اس وقت غالباً اتنا عرض کیا تھا کہ عام لوگوں کی سہولت فہم کے لئے اس وقت ایک لطیفہ کے عنوان سے کہہ دیا گیا تھا بعد میں اس کی تکمیل کردی جاوے گی، چنانچہ اس وقت اس وعدہ کو پورا کرتا ہوں۔

تحقیق ۔ اس مضمون کی یہ ہے کہ ندا من وراء الحجرات سے نہی کی علت صرف یہی ہے کہ یہ ندا کمال ادب کے خلاف ہے اور ظاہر ہے کہ اس ندار کا کمال ادب کے خلاف ہونا نہ ایسا جلی تھا کہ اعراب کی عقول بدون تنبیہ یا تامل کے اس کا ادراک کرسکتے اور نہ کسی نص سے اس پر دلالت کی گئی تھی باوجود اس کے اس کو مذموم اور اس کے فاعل کو ملوم قرار دیا گیا اور نداء من البعید جس اعتقاد اور قصد سے اکثر عوام میں شائع ہے وہ یہ کہ آپ کو لزوماً اطلاع بھی ہوجاتی ہے اور آپ اس کی اجابت اور منادی کی اعانت بھی فرماتے ہیں اس سے نہی صریح وارد ہے تو یہ منہی عنہ ہونے میں اس سے اشد واثقل ہوا پھر جب اخف کو جائز نہیں رکھا گیا تو اشد واثقل کیسے جائز ہوجاوے گا۔ سو حاصل اس مضمون کا استدلال بدلالۃ النص ہے جیسے حرمت تافیف سے حرمت ضرب وشتم پر استدلال کیا جاتا ہے پس معنون مضمون علمی وبرہانی ہے گو عنوان بصورت لطیفہ ہونے کے سبب خطابی ہے۔

خیال تحریری ۔ یہ ایک خط ہے جو بعینہ درج کیا جاتا ہے۔

مولوی صاحب السلام علیکم فدوی نے بلدہ میں جناب سے نیاز حاصل کیا ہے اور حضرت اقدس کے جملہ مواعظ کی مجلسوں میں شرکت حاصل کرکے مستفید ہوا اور اب اس وقت اپنے وطن آچکا ہوں بلدہ میں آپ کی روانگی کے بعد مجھ سے ایک مولوی

صاحب سے ملاقات ہوئی غالباً وہ مولوی صاحب بغداد کی طرف کے باشندہ ہیں۔ مگر عرصہ سے بلدہ میں مقیم ہیں۔ اور حضرت اقدس سے ایک وقت ملاقات کئے ہوئے تھے اور دونوں وعظ میں بھی شریک تھے اچھے عالم ہیں محقق و موحد معلوم ہوتے ہیں مولانا کے ثنا خواں ہیں مگر انوار العلوم نام پلی میں جو وعظ ہوا اس کے آخری حصہ میں مولانا نے فرمایا تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ہندوستان سے پکارنا بے ادبی ہے یا نہیں۔ اس پر غور کرو میں فتویٰ تو نہیں دیتا۔ اس پر مولوی صاحب میرے سے یہ تذکرہ فرمارہے تھے کہ اس مقام پر کچھ تشریح ہو جاتی تو بہتر تھا۔ کیونکہ بعض صورتیں پکارنے کی جائز بھی ہیں چنانچہ فرط محبت سے اگر پکارا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس لئے اس خاکسار نے جرارت کر کے اس کیفیت کی اطلاع حضرت اقدس کو دی ہے (یہ مجھ کو یاد نہیں ۱۲ اشرف علی) اور احتیاطاً آپ سے بھی عرض کیا جاتا ہے کہ واقعی مولوی صاحب موصوف کی رائے اگر درست نہیں ہے تو خصوص بلدہ حیدر آباد کے لحاظ کرتے ہوئے منجانب کاتب وعظ یا خود حضرت اقدس کی جانب سے وعظ کے حاشیہ میں اس کی تشریح ہو تو مناسب و بہتر ہوگا۔ مخفی مباد کہ میں نے ایک اہل بدعت کی کتاب میں جملہ قسم ندا کے جواز کا فتوٰی دیکھا۔ مگر میں صرف مولوی صاحب مذکور کی رائے کے موافق چند جائز صورتیں درج ذیل کرتا ہوں اس لئے اگر یہ صورتیں جائز ہیں یا نہیں اس کا علم مجھ کو بھی ہو جائے۔

صورت اول ندا بطریق تعبد ہے۔ مثلاً کوئی شخص سورۂ یاایھا المزمل پڑھتا ہے تو صرف بطریق تعبد تلاوت قرآن کرتا ہے۔ یا التحیات میں بھی بطریق عبادت السلام علیك ایھا النبی۔ جس میں عالم غیب نہیں سمجھا جاتا۔

(۲) کبھی متکلم علم بدیع و فصاحت کے قاعدہ سے شخص غائب کو فرضی طور پر دل میں حاضر تصور کر کے مخاطب کرتا ہے جیسا کہ قصیدہ بردہ وغیرہ میں ہے۔

(۳) کبھی فرط غم و فرط محبت میں اپنے عزیز یا محبوب سے ندا کی جاتی ہے۔

پہلی صورت ندا کی تو ظاہر ہے کہ اس کے جواز میں تو کوئی شبہ ہی نہیں۔ اب رہی دوسری و تیسری صورت اگر فرضی طور پر اس طرح ندا کی جائے اور مخاطب کو در اصل حاضر و ناظر یا عالم الغیب نہ سمجھے تو اس میں کیا حرج ہے آیا یہ صورت جائز ہے یا نہیں۔ براہ کرم مولٰنا کا اس میں کیا ارشاد ہے۔ دریافت فرما کر مطلع فرمائیں یا آپ خود اپنی رائے سے مطلع فرمایئے تو نہایت مہربانی ہوگی۔ بصورت جواز اگر مصلحت معلوم ہو تو وعظ مذکور کے حاشیہ میں تشریح ہو جائے۔

جواب

یہ تفصیل صحیح ہے اور اس سے مجھ کو اتفاق ہے لیکن اس میں اتنے اضافہ کی اور ضرورت ہے کہ اگر صورت ثانیہ و ثالثہ میں خواص کے فعل سے عوام کے فساد عقیدہ کا اندیشہ ہو تو خواص پر واجب ہے کہ عوام پر اپنے فعل کا اظہار نہ کریں فقہاء حنفیہ نے اس مسئلہ کی تصریح فرمائی ہے اور اسی مصلحت سے وعظ میں اس تفصیل کا اظہار مناسب نہ تھا کہ عوام کے لئے حیلہ نہ ہو جائے دوسرے یہ مضمون محض استطراداً بیان میں آ گیا تھا استقلالاً نہ تھا اس لئے بھی تفصیل کی طرف ذہن کو توجہ نہیں ہوئی۔ خیر اب اتفاق سے تفصیل ہو گئی۔

وَاللّٰہُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَھُوَ یَھْدِی السَّبِیْلَ ؕ انتہت الحاشیۃ۔

کتبہا اشرف علی فی اوائل شعبان ۱۳۴۲ھ بعد سنتین ونصف من زمان الوعظ۔

عرض حال و ختم زرسالانہ

اس دسمبر ۱۹۷۹ء کے الابقاء پر آپ کا زرِسالانہ ختم ہو گیا الحمد للہ ثم الحمد للہ الابقاء میں کاغذ عمدہ گلیز۔ لگایا جا رہا ہے اب کاغذ فی ریم تقریباً دس روپے گراں ہو گیا ہے۔ ادھر خرچہ ڈاک دو پیسے کے بجائے پانچ پیسے ہو گیا ان تمام مجبوریوں کی وجہ سے الابقاء کا زرِسالانہ سولہ روپئے ۱۶ ہو گیا لہذا جدید سال ۱۹۸۰ء کے لئے سولہ روپے آج ہی بذریعہ منی آرڈر ارسال فرماویں اور رسالہ الابقاء جاری رکھیں وی پی رجسٹری کا خرچہ ڈاکخانہ نے بڑھا دیا ہے لہذا وی پی روانہ کرنے میں آپ کا دو ۲ روپیہ کا نقصان ہوگا لہذا سولہ ۱۶ روپیہ کا منی آرڈر آج ہی ارسال فرما کر اپنے دو روپیہ کا نقصان نہ ہونے دیں والسلام محمد عبد المنان غفرلہ